خُطباتِ
حکیمُ الاُمّتؒ

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

بسلسلہ خطباتِ حکیم الاُمّت جلد - ۱۵

تسلیم ورضا

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

تصحیح وتزئین

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ



تخریج احادیث

مولانا زاہد محمود قاسمی

عنوانات

قاری محمد ادریس ہوشیارپوری

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ مُلتان پاکستان

(061-4540513-4519240

تسلیم ورضا

تاریخ اشاعت.............. جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ
ناشر.......................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت..................سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔
الحمد للہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔
پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں
تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ....چوک فوارہ...ملتان — مکتبہ رشیدیہ........راجہ بازار........راولپنڈی
ادارہ اسلامیات.........انار کلی.........لاہور — یونیورسٹی بک ایجنسی....خیبر بازار.......پشاور
مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار......لاہور — ادارۃ الانور.........نیو ٹاؤن.........کراچی نمبر 5
مکتبہ رحمانیہ........ اُردو بازار .... لاہور — مکتبۃ المنظور الاسلامیہ....جامعہ حسینیہ....علی پور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K — 119-121- HALLIWELL ROAD
(ISLAMIC BOOKS CENTERE — BOLTON BLI 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۱۵ ''تسلیم ورضا''
جدید اشاعت سے مزین آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
اللہ کے فضل وکرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی عرصہ
سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔
بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو
جائے۔ ادارہ نے زرکثیر خرچ کر کے یہ کام محترم جناب مولانا زاہد محمود
صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے یہ کام کرایا اور فارسی
اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا کام
حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے سرانجام دیا۔
اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ

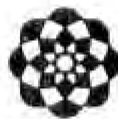
جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ.... بمطابق مئی 2008ء

اجمالی فہرست

فہرست عنوانات

تسلیم و رضا

ارضاء الحق
(حصہ اول)



اِرضاءالحق

(حصہ اوّل)

وعظ موسوم بارضاء الحق (حصہ اوّل) ۷/ جمادی الثانیہ ۱۳۳۹ھ کو بعد نماز جمعہ جامع مسجد تھانہ بھون میں منبر پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا تین گھنٹے تک بیان جاری رہا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو تھی حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ للّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَ مَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔

یہ منافقین تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تا کہ تم تم کو راضی کر لیں حالانکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو راضی کیا جائے۔ (آیت التوبہ: صفحہ نمبر ۶۲)

تمہید

اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے ایک امر واجب پر متنبہ فرمایا ہے جس میں لوگ غفلت کرتے ہیں اور گو واجبات بہت ہیں مگر جن میں غفلت زیادہ ہو وہ زیادہ قابل اہتمام ہیں پھر اُن میں بھی بالخصوص وہ امور زیادہ اہتمام کے قابل ہیں جن میں غفلت کرنا دوسرے واجبات میں غفلت کی اصل ہو۔ چنانچہ اس وقت جس واجب کا بیان کیا جائے گا وہ ایسا ہی ہے کہ اس میں غفلت کرنا، دوسرے واجبات میں غفلت کی اصل ہے اور سب واجبات سے غفلت اسی غفلت کی فرع ہے اور اس واجب کی تعیین ترجمہ آیت سے واضح ہو جائے گی۔

تقدیم رضاء

ترجمہ یہ ہے کہ وہ (یعنی منافقین) تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے تا کہ تم کو

راضی کرلیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو راضی کیا جائے اگر یہ لوگ مومن ہیں۔ یعنی اگر وہ ایمان کے مدعی ہیں۔ تو اُن کو دعوئے ایمان کے لوازم کو اختیار کرنا چاہئے۔ جس کا ایک لازم یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی رضاء کو سب سے مقدم کیا جائے اور میں نے اِنْ کَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ کا ترجمہ اگر وہ لوگ ایمان کے مدعی[1] ہیں اس لئے کیا کہ وہ لوگ واقع میں مومن نہ تھے بلکہ منافق تھے۔ اگر واقع میں مومن ہوتے تو ایسا کیوں کرتے مگر دعوئی کی بناء پر الزام کے طور پر فرماتے ہیں کہ اس دعوئی کے لوازم میں سے یہ امر تھا۔ مگر تم ایسا نہیں کرتے بلکہ تم خدا وَرسول کی رضا کو پس پشت ڈال کر لوگوں کی رضاء کے پیچھے پڑ گئے تو تمہارا دعوئی ایمان بھی صحیح نہیں۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی رضاء کو لوگوں کی رضاء پر مقدم کرنا چاہیئے۔

مرض ارضاءِ خلق

شاید اس جگہ بعض سامعین کو یہ شبہ ہو کہ یہ آیت تو منافقین کی شان میں ہے، مسلمانوں کو کیوں سناتے ہو۔

جواب اس کا یہ ہے کہ منافقین کے ہر فعل پر تو مذمت نہیں ہے بلکہ اُن کے افعال مذمومہ ہی پر مذمت کی جاتی ہے منافقین سے بعضے اچھے کام بھی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ کفار سے بھی اچھے کام ہو سکتے ہیں۔ سوان افعال پر من حیث انہا افعال مذمت نہ ہوگی۔

جیسے کوئی کافر یا منافق رحم دلی اور عدل کرے تو اس کے اس فعل کو مذموم نہ کہیں گے۔ بلکہ کفار کے بعض افعال پر قرآن وحدیث میں مدح وارد ہے۔ قرآن میں ہے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖ اِلَیْکَ

کہ اہل کتاب میں بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک ڈھیر (سونے چاندی کا) امانت رکھ دو اس کو (بجنسہ) ادا کر دیں اس میں بعض اہل کتاب کی (جبکہ اس کو خاص مومنین اہل کتاب کے ساتھ خاص نہ کہا جاوے۔ کما ھو ظاہر الاطلاق) امانت کی تعریف ہے کیونکہ امانت فی نفسہٖ فعل ممدوح ہے اور حدیث میں ہے۔

---

[1] قلت وَ لکنه اختارَ فِی تفسیرہ بیان القران تفسیر المومنین بالصّادِقین فِی الاسلام وَ نصہٗ۔ یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تا کہ تم کو راضی کرلیں حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے مسلمان ہیں تو اس کو راضی کریں۔ فلیا تامل:۔ ۱۲ظ۔ ویمکن الجمع بینھما بالفرق بین الاسلام وَ الایمان فیصح الانزام ۱۲ظ وَالاقرب ان یقال ان معنی مَا فِیْ بیان القرانِ ان ادعوا الصدق فی الاسلام فرجع الٰی مَا ھٰھُنَا ط

لو کان ابن عدی حیا و کلمنی فی هولاء النتنی لترکتهم لهٔ قال الراوی کا نه یشکر له (لم اجدالحدیث فی موسوعة اطراف الحدیث النبوی الشریف)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اساریٰ بدر کے متعلق فرمایا کہ اگر اس وقت مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور ان پلیدوں کی بابت (بطور سفارش کے) کچھ کہتے تو میں ان کی خاطر سب کو (بلا معاوضہ) چھوڑ دیتا۔

راوی کہتے ہیں کہ گویا آپ اُن کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ کیونکہ ایک مرتبہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی پناہ میں لے کر مکہ کے اندر داخل کیا تھا۔ جو فی نفسہٖ فعل ممدوح تھا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی قدر کی۔ جب یہ بات ہے کہ کفار و منافقین کے ہر فعل پر مذمت نہیں ہوتی۔ بلکہ افعال مذمومہ ہی پر ہوتی ہے تو اب جہاں منافقین یا کفار کے کسی فعل پر قرآن و حدیث میں مذمت ہوگی اُس سے معلوم ہوگا کہ یہ فعل فی نفسہٖ مذموم ہے خواہ کسی میں ہو۔

پھر یہ بھی لازم نہیں کہ منافقین و کفار کے ہر فعل کو اُن سے ایسی خصوصیت ہو کہ ان کے سوا وہ کسی میں نہ پایا جائے اور جس میں وہ فعل پایا جائے وہ منافق یا کافر ہی ہو بس کفر و نفاق یہ افعال تو ایسے ہیں جو کفار و منافقین کے سوا کسی دوسرے میں نہیں ہو سکتے باقی اُن کے علاوہ دوسرے افعال میں یہ لازم نہیں کہ وہ منافقین و کفار ہی کا خاصہ ہوں۔ چنانچہ جہنم میں جب کفار سے سوال ہوگا کہ **مَاسَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ** تو وہ جواب دیں گے **لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ** کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے اور ہم مسکین کو کھانا نہ دیتے تھے۔ دیکھئے یہاں کفار نے اپنا ایک فعل ترک صلوٰۃ بھی بیان کیا ہے جو کفار کا خاصہ لازمہ نہیں بلکہ ترک صلوٰۃ مسلمان سے بھی صادر ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے۔ مسکین کو کھانا نہ دینا بھی کفار کا خاصہ لازمی نہیں مسلمان سے بھی اس کا صدور ہو سکتا ہے۔ اتنا فرق ہوگا کہ کفار میں ترک صلوٰۃ کا منشاء کفر ہے اور مسلمان میں اس کا منشا کسل وغیرہ ہوگا۔ اس لئے ترک صلوٰۃ سے وہ کافر نہیں ہوتا۔ کیونکہ منشا وہ نہیں جو کفار میں ہے اور کفار میں عدم اطعام کا منشاء انکار جزا و اجر ہے اور مسلمان میں بخل و طمع ہوگا جیسا کہ افعال حسنہ کفار سے بھی ہوتے ہیں مگر ان کا منشاء ایمان نہیں ہے اس لئے وہ گو دنیا میں ممدوح ہیں اور دنیا ہی میں ان کو ان پر اجر بھی مل جاتا ہے۔ مگر آخرت میں مقبول نہیں اور اگر وہی افعال مسلمان سے صادر ہوں تو احسن ہیں کیونکہ اُن کا منشاء بھی حسن ہے۔

پس افعال مذمومہ جو کافروں سے صادر ہوتے ہیں وہ تو کریلا اور نیم چڑھا کے مصداق

ہیں کہ فعل بھی مذموم ہے اور اس کا منشا بھی خبیث، جیسا کہ منافقین سے ارضاء خلق کا صدور ہوتا تھا کہ یہ فعل بھی مذموم ہے اور اس کا منشا بھی اُن میں مذموم تھا۔ یعنی نفاق کیونکہ منافقین شب و روز اسی فکر میں رہتے کہ ہماری قلعی نہ کھل جائے۔اس لئے جب کوئی بات موجب اشتباہ ان سے صادر ہوتی ہے تو مسلمانوں کے سامنے اپنی براءت کے لئے قسمیں کھاتے تھے تاکہ مسلمان اُن سے خوش رہیں اور اگر کسی مسلمان سے یہ فعل صادر ہوگا تو اس کا منشاء نفاق و کفر نہ ہوگا مگر یہ فعل تو مذموم ہے اس لئے مسلمانوں کو اس آیت کا مضمون سنایا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ارضاء خلق بھی ایک مرض ہے۔خواہ تنہا ہی ہو جو کفر و نفاق کے ساتھ نہ ہو۔

دیکھئے اگر ایک شخص کے سر میں درد ہو اور آنکھوں میں بھی ہو یہ بھی ایک مرض ہے اور تنہا سر ہی میں درد ہو تو وہ بھی مرض ہے اور ہر مرض علاج کے قابل ہے۔

مذمت ارضاءِ خلق

ارضاء خلق کا مرض ہونا تو اس سے ثابت ہوا کہ یہاں حق تعالیٰ نے اس فعل کی مذمت بیان فرمائی کیونکہ اس جگہ صرف یحلفون باللّٰہ پر ذم نہیں ہے اس لئے کہ قسم کھانا مطلقاً برا نہیں قرآن وحدیث میں جا بجا حلف باللّٰہِ وارد ہے اگر یہ فعل مطلقاً مذموم ہوتا تو قرآن وحدیث میں حلف کا استعمال کیوں ہوتا۔ بلکہ یہاں محل ذم لیرضو کم ہے کہ وہ لوگ ارضاء خلق کے لئے قسم کھاتے تھے اور ارضاء حق کو پس پشت ڈالتے تھے۔ چنانچہ آگے اسی پر تشنیع ہے تو یہ فعل مذموم ہے مگر یہ ضرور نہیں کہ وہ منافق ہی کا خاصہ ہو کہ اس کے سوا کسی میں نہ پایا جائے تو اب وہ شبہ جاتا رہا۔

حاصل جواب کا یہ ہوا کہ یہ فعل فی نفسہٖ مذموم ہے اور خاصہ منافقین کا نہیں بلکہ دوسروں میں بھی پایا جاسکتا ہے تو اب ہم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لیں کہ یہ فعل ہم میں ہے یا نہیں؟ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ تقریباً ہر شخص میں اس مرض کا وجود ہے چاہے درجات مختلف ہوں۔افعال دنیا میں تو عموماً اس مرض کا ظہور ہوتا ہے اور کبھی کبھی اعمال دین میں بھی اس کا ظہور ہوتا ہے۔ ہمارے دنیوی افعال یہ ہیں۔ برادری کے تعلقات تقریبات کے مواقع اور مقدمہ بازیاں وغیرہ وغیرہ جملہ افعال میں مخلوق ہی کی رضاء مقصود ہوتی ہے۔

شاید کوئی کہے کہ ہم ساری مخلوق کی رضا کی فکر کب کرتے ہیں پس دو چار برادری کے آدمیوں کی رضا مطلوب ہوتی ہے۔ سو سمجھ لیجئے کہ آیت کا مدلول یہ نہیں کہ تمام مخلوق کے راضی کرنے کا قصد بُرا ہے بلکہ اس کا مدلول یہ ہے کہ مطلق مخلوق کی رضاء کا فکر بھی بُرا ہے کیونکہ

لیر ضو کم سے بالا جماع صحابہ کرام مراد ہیں اور تمام مخلوق صحابہ میں منحصر نہیں اور نہ تمام مخلوق کی ارضاء ممکن ہے پس یہ مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ ارضاء خلق مطلقاً مذموم ہے۔

گناہوں میں ارضاء خلق

اب دیکھ لیا جائے کہ دنیوی تعلقات اور معاملات میں ہم لوگ ارضاء خلق کا قصد کرتے ہیں یا نہیں۔ رات دن یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ آپ کے سامنے کوئی کسی کی غیبت کرنے لگے۔ حالانکہ اس میں کوئی نفع بھی نہیں نہ کچھ مالی فائدہ ہے جو بڑا نفع شمار ہوتا ہے۔ مگر اس بے کار اور فضول گناہ میں بھی لوگوں کو ارضاء خلق کا اہتمام ہے کہ غیبت کرنے والے کو غیبت سے نہیں روکتے بلکہ سنتے رہتے ہیں۔ اور محض اس وجہ سے اس کو نہیں روکتے نہ خود وہاں سے ٹلتے ہیں کہ اس کو ناگوار ہوگا، اور اس کی مطلق پرواہ نہیں کرتے کہ غیبت کا سننا حق تعالیٰ کو ناگوار ہے جب ایک بے کار اور بے منفعت کام میں یہ حال ہے تو جس گناہ میں کچھ دنیوی منافع بھی معلوم ہوتے ہوں جیسے کسی رئیس کی یا دوست کی خاطر جھوٹی گواہی دینا تاکہ وہ ہمارے وقت میں کام آئے۔ وہاں تو یہ کیوں ارضاء خلق کا اہتمام نہ کریں گے ۔اسی طرح رسوم شادی وغمی میں ارضاء خلق کے لئے سب کچھ کرتے ہیں۔ اسی طرح تجارت میں خریداروں کو راضی کرنے کا اہتمام ہوتا ہے۔ چاہے دین ضائع ہوجائے یہ تو دنیا کے قصے تھے۔

دین میں ارضاء خلق

افسوس اس کا ہے کہ دین کے باب میں بھی ارضاء خلق کا خیال کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک سوال کوئی اجنبی کرے تو اس کو صاف صاف مسئلہ بتلایا جائے گا اور وہی سوال کوئی اپنا آشنا کرے جس سے کچھ مصالح وابستہ ہوں۔ مثلاً کوئی رئیس ہمارے مدرسہ میں چندہ دیتا ہو تو وہاں اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ہوسکے اس کے لئے کچھ گنجائش نکالی جائے۔ غرض اس کو مسئلہ نرم بتلائیں گے۔

اور بعضے تو غضب کرتے ہیں کہ نماز میں بھی اس کا خیال کرتے ہیں کہ چودھری یا رئیس ناراض نہ ہوجائے۔ چنانچہ ایک ملا جی نے نماز میں سورۃ الاعلیٰ پڑھی مقتدیوں میں دو چودھری تھے۔ ایک کا نام موسیٰ تھا ایک کا عیسیٰ تو ملا جی نے نماز میں **صُحُفِ اِبْرَاهِيْمَ وَ عِيسٰى وَ مُوسىٰ** پڑھ دیا۔ تاکہ فقط موسیٰ کا نام لینے سے دوسرا چودھری خفا نہ ہوجائے کہ میرا نام نہ لیا۔

خیر یہ تو سنی ہوئی بات تھی اس سے بڑھ کر میں نے خود ایک فتویٰ دیکھا ہے جس میں ایک

مفتی نے ایک ہزارروپیہ لے کر ساس کو حلال کردیا تھا۔ مطلق ساس کی حرمت تو قرآن میں صاف موجود ہے اس میں تو کسی کی چل نہ سکتی تھی اور نہ ایسے فتوے کو کوئی مان سکتا تھا مگر اس مفتی نے ایک خاص ساس کو جائز کیا تھا اور دلیل یہ لکھی کہ ساس تو واقعی حرام ہے مگر ساس کہتے ہیں منکوحہ بنکاح صحیح کی ماں کو اور اس سائل کی بیوی منکوحہ بنکاح صحیح نہیں کیونکہ مسلمان کے نکاح صحیح ہونے کے لئے زوجین کا اسلام شرط ہے اور مسلمان وہ ہیں جس سے کفر کا صدور نہ ہوا ہو۔ اور وہ عورت چونکہ جاہل تھی۔ اس لئے وہ مسلمان نہیں تھی کیونکہ جاہلوں سے عموماً کفریات صادر ہو جاتے ہیں۔ اور نکاح کے وقت عورت کو کلمہ نہیں پڑھائے گئے۔ اسلام کی تجدید نہیں کرائی گئی۔ اس لئے یہ نکاح صحیح نہیں ہوا۔ جب نکاح صحیح نہیں ہوا تو اس عورت کی ماں منکوحہ کی ماں نہیں یعنی ساس نہیں بلکہ موطوءہ کی ماں ہے اور ام موطوءہ کی حرمت منصوص نہیں۔ بلکہ صرف امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے جو حرمت مصاہرت بالزناء کے قائل ہیں۔ باقی آئمہ زناء سے حرمت مصاہرت کے کے قائل نہیں اور امام ابوحنیفہ کی تقلید ہر مسئلہ میں واجب نہیں۔ پس اس شخص کے لئے اس کی (برائے نام) بیوی کی ماں حلال ہے۔

دیکھئے اس ظالم نے طمع دنیا اور ارضاء خلق کے لئے کس ہیر پھیر سے ایک غریب مسلمان عورت کو کافر بنانے کی کوشش کی۔ بھلا کوئی اس سے پوچھے کہ اس احتمال سے کہ جاہلوں کی زبان سے عموماً کفریات کا صدور ہو جاتا ہے کسی خاص جاہل کے کفر کا یقین کر لینا تم کو کیونکر جائز ہو گیا۔ افسوس یہ حالت ہے مسلمانوں کی کہ دین میں بھی ان کی نظر مخلوق پر رہتی ہے۔

مذمت ریاء

اس واقعہ میں تو بددینی کھلی ہوئی تھی مگر ارضاءِ خلق کی ایک فرد اور بھی ہے جس کو دین کے کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے اور اکثر لوگ اس سے غافل ہیں اس کا نام ریاء ہے یہ بھی ارضاءِ خلق ہی کا ایک شعبہ ہے کیونکہ ریاء کے معنی ہیں مخلوق کو دکھلانے کے لئے کام کرنا، اس پر قرآن و حدیث میں سخت وعید وارد ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

انا اغنی الشرکاء عَنِ الشرکِ فمن عمل لی عملاً اشرک فیه غیری فانا منه بریٌ وَ هوالذی اشرک (قلت رواه ابن ما جه واللفظ لهٗ و رواته ثقات وَ اخرجه ابن خزیمة فی صحیحه کذا فِی الترغیب و فیه ایضا عن ابی سعید بن ابی فضالةَ مرفوعا اذا جمع الله الاولین والاخرین لیوم القیمة.لیوم لا ریب فیه نادی منا دمن کان اشرک

فی عملہ للہ اِحدا فلیطلب ثوابہ من عندہٖ فانَّ اللّٰہَ اغنے الشرکاء
عن الشرک (رواہ الترمذی فی التفسیر من جامعہ وابن مَاجہ وابن حبان فی
صحیح اھ (ص ۱۴، ۱۵) (اتحاف السادۃ المتقین8:263،276،63:10)

ترجمہ: میں سب سے زیادہ ساجھے سے مستغنی ہوں تو جس نے میرے واسطے کوئی عمل کیا ہو اور اس میں میرے غیر کو شریک کیا ہو تو میں اس سے بے زار ہوں اور وہ اسی کے لئے ہے جس کو شریک کیا گیا۔ (اور ایک روایت صحیح میں ہے کہ قیامت کے دن ایک پکارنے والا پکارے گا کہ جس نے اپنے عمل میں جو اللہ کے واسطے کیا تھا کسی غیر کو شریک کیا ہو تو وہ اس کا ثواب اسی سے مانگے کیونکہ اللہ تعالیٰ سب شرکاء سے زیادہ شرک سے مستغنی ہیں)

خدا تعالیٰ کو ساجھے کی چیز کی ضرورت نہیں ساجھے کی چیز تو محتاج کو چاہیے اور اللہ تعالیٰ تو غنی ہیں تو یہ ریا سخت چیز ہے اور اس کا منشاء بھی ارضاء خلق ہی ہے۔

وقت ریاء

حضرت بایزید بسطامیؒ نے ایک مرتبہ سورہ طٰہٰ پڑھی پھر خواب میں دیکھا کہ نامہ اعمال میں سورہ طٰہٰ پوری لکھی ہوئی تھی۔ مگر ایک آیت کی جگہ خالی ہے۔ آپ نے فرشتوں سے پوچھا کہ اس آیت کی جگہ کیوں خالی رہی۔ میں نے تو اس کو بھی پڑھا تھا۔ جواب ملا کہ جس وقت تم نے اس آیت کو پڑھنا چاہا۔ اس وقت ایک شخص اس جگہ سے گزر رہا تھا تو تم نے اس کو سنانے کو یہ آیت، ذرا بنا سنوار کر پڑھی جس سے ریاء ہوگیا۔ اس لئے اس آیت کی تلاوت قبول نہیں ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ریاء کس قدر دقیق ہے کہ بعض دفعہ عارفین کاملین کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ ریا ہوگیا۔ اس لئے اس کا علاج اور علاج کے بعد ہمیشہ نفس کی نگہداشت ضروری ہے ورنہ بعض دفعہ ریاء ایسا بڑھ جاتا ہے کہ انسان مخلوق سے گزر کر خالق کے ساتھ ریاء کرنے لگتا ہے اور تمام عادات ذمیمہ کی یہی حالت ہے کہ جب ان کی جڑ جم جاتی ہے تو خالق کے ساتھ بھی ان عادات کو استعمال کرتا ہے۔

اس پر شاید سامعین کو تعجب ہوا ہوگا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ریاء کرنے کی کیا صورت ہے۔ سنئے مثلاً ایک شخص مختصر نماز پڑھ رہا تھا پھر اس وقت اس کا کوئی معتقد آگیا تو اس نے نماز لمبی کردی۔ یہ تو کھلی ریاء ہے جو ریاء مع الخالق ہے۔ پھر اس نے خلوت میں نماز پڑھی تو اب بھی نماز کو لمبی کرتا ہے اس خیال سے کہ مخلوق کے سامنے تو پھر بھی طویل ہی نماز پڑھنا ضروری ہے۔ سو کبھی حق تعالیٰ یوں نہ کہیں کہ مخلوق کے سامنے تو لمبی نماز پڑھتا ہے اور میرے سامنے مختصر پڑھتا

ہے تو یہ لمبی نماز خدا کے لئے نہیں ہے بلکہ مخلوق کے سامنے ریاء باقی رکھنے کے لئے ہے۔ یہ ریاء مع اللہ ہے۔ ایسے ہی تکبر میں جب غلو ہو جاتا ہے اور اس کی جڑ پختہ ہو جاتی ہے تو یہ شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی تکبر کرنے لگتا ہے۔ مثلاً دعا میں عاجزی اور خشوع کر رہا ہے۔ رونے کی سی صورت بنا کر گڑگڑا رہا تھا کہ سامنے سے کوئی دوسرا شخص آ گیا تو اب گڑگڑانا چھوڑ دیا کہ دیکھنے والے کی نظر میں سبکی نہ ہو یہ تکبر مع اللہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی اور ذلت کی صورت بنانے سے بھی دوسروں کی نظر میں ذلت و عار آتی ہے۔

اس سے تصوف کا یہ مسئلہ بھی ثابت ہو گیا کہ مخلوق کے لئے عمل کرنا بھی ریاء ہے اور ترک کرنا بھی ریاء ہے۔ مخلوق کے لئے کسی عمل عبادت کو ترک کرنا تکبر تو ہے ہی جیسا کہ اوپر کی مثال میں گزرا ریاء اس لئے ہے کہ عین اشتغال بالعبادت کے وقت مخلوق پر اس کی نظر رہی اور اس کی نظر میں معظم رہنا چاہا۔

اخفاء میں ریاء

ایک فرع تو اس مسئلہ کی یہ تھی یہ تو کھلی ہوئی ہے ایک شعبہ ریاء کا اور ہے جو بہت دقیق ہے وہ یہ محققین کے نزدیک عبادات کے اخفاء کا اہتمام کرنا بھی ریاء ہے۔ یہ شعبہ ایسا دقیق ہے کہ اہل ظاہر نے اس کو ریاء نہیں سمجھا مگر مبصرین طریق کے نزدیک یہ بھی ریاء ہے وہ کہتے ہیں کہ اخفاء عن الخلق کا اہتمام وہی کرے گا جس کی نظر مخلوق پر ہو اور جس کی نظر مخلوق سے اٹھ جائے اور اپنے سے بھی اُٹھ جائے کہ عبادت کو اپنا عمل نہ سمجھے بلکہ محض توفیق حق سمجھے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے کام لے رہے ہیں۔ میں خود کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اخفاء کا اہتمام نہ کرے گا۔ کیونکہ جب وہ مخلوق کو لاشے محض سمجھتا ہے تو اُن سے اخفاء کیوں کرے گا۔ اور جب اپنے عمل کو اپنا عمل ہی نہیں سمجھتا بلکہ فضل حق سمجھتا ہے تو کسی کے دیکھنے سے اس پر عجب کا اثر کیوں ہوگا۔ لیکن اس شعبہ کا ریاء ہونا پہلے شعبہ کے برابر نہیں پہلی صورت تو مطلقاً ریاء ہے اور دوسری صورت یعنی اخفاء عمل کبھی ریاء ہے اور کبھی ریاء نہیں۔ مثلاً جس شخص کے لئے شیخ نے اخفاء عمل کو تجویز کر دیا ہو اُس کے لئے اخفاء عمل ریاء نہیں یا یہ شخص خود مجتہد ہو اور اس کے نزدیک اپنے لئے اخفاء عمل کی ضرورت ہو اس کے لئے بھی اخفاء عمل ریا نہیں مگر مجتہد وہ ہے جس کا مبصر ہونا کسی مبصر کے قول سے معلوم ہوا ہو ورنہ خود اپنے اعتقاد سے یا عوام کے معتقد ہو جانے سے کوئی مبصر نہیں ہو سکتا۔ صائب نے خوب کہا ہے۔

عیسیٰ نتواں گشت بہ تصدیق خرے چند   بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را

یعنی چند جاہلوں کی تعریف سے تم عیسیٰ نہیں ہو سکتے یعنی صاحب کمال اور مبصر نہیں ہو سکتے بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے اولاً مجاہدہ کی اور کسی مبصر کی جوتیاں سیدھی کرنے کی۔ پھر وہ جب یہ کہہ دے کہ تم مبصر ہو گئے اس وقت تمہارا اجتہاد قبول ہوگا۔

نفس کی نگہداشت

پھر شیخ کی تصدیق کے بعد بھی اس کی ضرورت رہتی ہے کہ نفس کا امتحان کرتا رہے۔ بے فکر و مطمئن نہ ہو جائے کیونکہ مجاہدہ وغیرہ سے نفس شائستہ تو ہو جاتا ہے مگر شائستہ ہو جانے کے یہ معنی نہیں کہ کبھی شرارت ہی نہ کرے۔ آخر شائستہ گھوڑا بھی تو کبھی شوخی سے شرارت کیا کرتا ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ زیادہ شرارت نہیں کرتا۔ اور کبھی کرتا ہے تو ذرا سے اشارہ سے سیدھا ہو جاتا ہے۔ مگر اشارہ بھی تو جب ہی کرو گے جب اُس کی نگہداشت سے غافل نہ ہو۔ اور اگر بے فکر ہو کر بیٹھ گئے تو ممکن ہے کبھی نفس شرارت کرے اور تم اُس کو دبانے کی کوشش نہ کرو تو اس وقت یقیناً وہ تم کو پٹک دے گا۔ جیسے سوار غافل اور بے فکر ہو کر شائستہ گھوڑے پر سوار ہو تو اس حالت میں اگر کبھی اس نے شوخی کی تو سوار ضرور زمین پر گرے گا۔ اس مثال سے واضح ہو گیا ہوگا کہ مجاہدہ بے کار بھی نہیں کیونکہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ نفس کی شرارت پہلے سے کم ہو جاتی ہے اور اگر کبھی شرارت کرتا ہے تو ذرا سے اشارہ میں سیدھا ہو جاتا ہے اور پہلے اشارہ تو کیا سخت مقاومت سے بھی قابو میں نہ آتا تھا۔

اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مجاہدہ کے بعد بھی نگہداشت کی ضرورت ہے۔ بے فکری جائز نہیں۔ ایک شخص نے اپنے نفس کا خوب امتحان کیا کہ ایک مجمع میں ایک مولوی صاحب کی خدمت میں پانچ سو روپیہ پیش کئے لوگوں نے بہت تعریف کی۔ ہر طرف سے واہ واہ ہونے لگی اُس نے نفس سے کہا کہ تجھے یہ تعریف اچھی لگی ہوگی۔ اچھا اب میں تجھے اس سے زیادہ گالیاں سنواؤں گا۔ جتنی واہ واہ سنی ہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا اور مولوی صاحب سے کہا کہ یہ رقم میری والدہ کی تھی اور انہوں نے مواقع خیر ہی میں صرف کرنے کے لئے رکھی تھی۔ اس لئے میں دلالتہً اذن سمجھ کر یہ رقم آپ کو دے گیا۔ اب جو میں نے اپنے فعل کی ان کو اطلاع کی تو وہ خفا ہوئیں لہذا یہ رقم واپس فرما دیجئے۔ مولوی صاحب نے رقم واپس کر دی۔ اب تو لوگوں نے خوب صلواتیں سنائیں۔ کہ اول تو نام کرنے کے لئے پانچ سو روپے دیدیئے پھر دل دکھا ہوگا۔ اس واسطے ماں کا بہانہ کر کے واپس لے گیا، مگر اس شخص کو ان گالیوں میں مزا آ رہا تھا کیونکہ اس کا

مقصود ارضاء حق تھا۔ ارضاء خلق مقصود نہ تھا۔ پھر رات کو خلوت میں جا کر وہ رقم مولوی صاحب کو دی اور کہا یہ رقم میری ہی تھی۔ مگر میں نے والدہ کا بہانہ کر کے اس لئے واپس لی کہ مجمع میں دینے سے میرے نفس کو لوگوں کی تعریف اچھی معلوم ہوئی تھی تو میں نے اس کی اصلاح کرنا چاہی۔ اب خلوت میں دیتا ہوں اور کسی سے اس کے تذکرے کی ضرورت نہیں۔

شرطِ ارادت

مگر یہ وہی کر سکتا ہے جس نے اپنے نفس کو کسی کامل کے سامنے پامال کر دیا ہو اور اپنے ارادہ و اختیار کو فنا کر دیا ہو اور آج کل تو یہ حالت ہے کہ مرید پہلے ہی دن پیر کا بھی پیر بننا چاہتا ہے۔

مولانا گنگوہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کے مریدوں کی وہ حالت ہے جیسے ایک شخص کسی گرو کے پاس گیا۔ اور کہا مجھے اپنا چیلا بنا لو اس نے کہا کہ چیلا بننا تو بہت دشوار ہے تو وہ کہتا ہے پھر گرو ہی بنا لو۔ اس طرح آج کل کے مرید گرو وہ بنانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ارادت کی اول شرط یہ ہے کہ اپنے ارادہ و تجویز کو فنا کر دے۔

حدیث[1] میں آیا ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے مکان پر سے گزرے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو بلند آواز سے قراءت کر رہے ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پست آواز سے۔ صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اے ابوبکر تم بالکل آہستہ کیوں پڑھ رہے تھے۔ **قال کنت اسمع من اناجیه** کہا یا رسول اللہ میں حق تعالیٰ کو سُنا رہا تھا اور اُن کے سننے کو جہر و خفض دونوں برابر ہیں)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وجہ پوچھی کہ تم بلند آواز سے کیوں پڑھ رہے تھے۔ **قال کنت اطرد الشیطان وَ اوقظ الوسنان**۔ کہا میں شیطان کو بھگانا اور اونگھنے والوں کو جگانا چاہتا تھا۔ دونوں حضرات نے اپنے اپنے فعل کی معقول وجہ بیان کر دی۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر یہ فیصلہ فرمایا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

یا ابا بکر ارفع من صوتک قلیلا

کہ تم ذرا اپنی آواز بلند کر دو۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا

اخفض من صوتک قلیلا (کہ تم ذرا اپنی آواز کو پست کر دو)

اب اس کی توجیہ میں اختلاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو یہ حکم کیوں

---

[1] لم أجد الحديث فى موسوعة اطراف الحديث النبوى الشريف

فرمایا۔ علماء ظاہر نے تو مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ لیکن ابن عطاء اسکندری فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو اپنی رائے اور تجویز سے ہٹانا چاہا اور دونوں کے ارادوں کو فنا کرنا مقصود تھا کہ تم اپنی رائے سے کوئی کام نہ کرو۔ بلکہ ہر کام میں ہمارے اتباع کا قصد کرو۔ یہی تفویض ہے اور اسی کا نام فنا ہے۔

فنا کی حقیقت

فنا سے یہ مراد نہیں کہ سوائے حق تعالیٰ کے کوئی چیز حساً بھی نظر نہ آئے اور اپنی ذات سے بھی نظر اٹھ جائے گو کبھی غلبہ حال میں ایسا بھی ہو جاتا ہے جیسا کہ جامی فرماتے ہیں،

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی — ہر چہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

میری جان فداء اور چشم بیدار میں تو ہی بسا ہوا ہے جو کچھ دور سے ظاہر ہوتا ہے تجھ کو گمان کرتا ہوں۔

اور اسی کو ایک شاعر اس طرح ادا کرتا ہے۔

جب کوئی بولا صدا کانوں میں آئی آپ کی

تو یہ غلبہ حال ہے ورنہ فنا کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اپنے ارادہ وتجویز کو فنا کردے۔ یعنی اپنے ارادہ وتجویز کو ارادہ وتجویز حق کے تابع کردے۔ جس کو سید احمد رفاعیؒ نے ایک دفعہ اس طرح بیان فرمایا کہ اپنے ایک مرید سے دریافت فرمایا کیف تری شیخک تم اپنے شیخ کو کس درجہ کا سمجھتے ہو۔ اس نے کہا میں آپ کو قطب سمجھتا ہوں۔ فرمایا: نزہ شیخک عن القطبیۃ کہ اپنے شیخ کو قطبیت سے پاک سمجھو کہا تو شاید آپ غوث ہیں فرمایا نزہ شیخک عن الغوثیۃ اپنے شیخ کو غوثیت سے بھی پاک سمجھو۔ اور یہ بات تحدث بالنعمۃ کے لئے فرمائی کہ حق تعالیٰ کا اپنے اوپر جو انعام ہے اس کو ظاہر کریں جس سے مرید کا دل خوش کرنا بھی مقصود تھا کہ اس کی تسلی ہو کہ حق تعالیٰ نے مجھے ایسا شیخ دیا۔

اب مرید نے پوچھا کہ حضرت پھر آپ ہی اپنا مقام بتلایئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے تمام اولیاء کی ارواح کو ایک مقام میں جمع فرمایا اور سب سے فرمایا کہ مانگو کیا مانگتے ہو۔ کسی نے قطبیت مانگی اس کو قطب کردیا گیا۔ کسی نے غوثیت مانگی وہ غوث بنا دیا گیا۔

علیٰ ھذا حتّٰی دارت النوبۃ الی ھذا الا شیٔ احمد فقلت یا رب ارید ان لا ارید واختاران لا اختار فاعطانی مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر من اھل ھذا العصر۔

یہاں تک کہ اس ناچیز احمد کی نوبت آئی تو میں نے عرض کیا یارب میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کچھ بھی

نہ چاہوں اور یہ پسند کرتا ہوں کہ کچھ بھی پسند نہ کروں (بلکہ جو آپ چاہیں میں اسی کو چاہتا ہوں) اس پر حق تعالیٰ نے مجھے وہ دولت دی جو کسی آنکھ نے نہ دیکھی اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی شخص کے دل پر اس کا خطرہ گزرا۔ یعنی اس زمانہ کے لوگوں میں سے۔ بس یہ ہے فنا کی حقیقت کہ اپنے ارادہ کو فنا کردیں۔

فناءارادہ

اس پر ایک طالب علمانہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ جب ارادہ نہ کرنے کا ارادہ ہوا تو یہ بھی تو ایک ارادہ ہے۔ پھر فناء ارادہ کہاں ہوا، یہ اشکال تمام مدارس میں لے کر گھوم جاؤ، تسلی بخش جواب نہ ملے گا کیونکہ وہ تو محض اصطلاحات کے چکر میں رہتے ہیں جس کی وجہ سے حقیقت تک ان کی نظر نہیں پہنچی۔ اس لئے انکی بات سے تسلی نہیں ہوتی اور اہل اللہ کی نظر صحیح حقائق پر ہے۔ سچے معانی ان کے پیش نظر ہیں۔ وہ ہر بات کا صحیح جواب دیتے ہیں اور ان کی بات جی کو لگ جاتی ہے۔ اہل اللہ نے اس اشکال کا جواب یہ دیا ہے کہ فناء ارادہ سے مراد مطلق ارادہ کا فنا کرنا نہیں ہے بلکہ اُس ارادہ کا فنا کرنا مقصود ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو۔ یعنی جو ارادہ حق کے خلاف اور تجویز حق کے مزاحم ہو اور لا ارید کا ارادہ حق تعالیٰ کو پسند ہے تو یہ فناء ارادہ کیخلاف نہیں ہے۔ اصطلات کے چکر میں رہنے پر ایک مسئلہ یاد آ گیا جس پر بڑا طومار باندھا گیا ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ ایک اہل معقول نے موجود کی دو قسمیں کی ہیں ایک موجود فی الخارج و اعراض ظاہرہ اور ایک موجود فی الذہن چنانچہ ظاہر ہے اب اشکال یہ ہے کہ ذہن خود خارج میں موجود ہے تو اس میں جو چیزیں موجود ہیں وہ بھی موجود فی الخارج ہوئیں۔ جیسے روپیہ صندوقچی میں ہو اور وہ صندوقچی صندوق میں ہو تو وہ روپیہ بھی صندوق میں ہوا۔ اس اشکال کے جواب میں اہل معقول نے ورق کے ورق سیاہ کردیئے۔ حالانکہ اس کا سہل جواب یہ ہے کہ موجود فی الخارج کے معنی یہ ہیں جو بلا واسطہ خارج میں ہو اور موجود فی الذہن جو ذہن کے خارجی ہونے سے موجود فی الخارج ہے (بواسطہ خارج میں ہے نہ کہ بلا واسطہ اس کی ایسی مثال۔ ہے جیسے یوں کہا جائے۔

اَلدُّرُ فِی الْحُقَّۃ وَالْحُقَّۃُ فِی الصُّنْدُوْقِ

جس سے لازم آتا ہے اَلدُّرُ فی الصُّنْدُوْقِ پھر ایک شے کا ایک آن میں دو محل میں موجود ہونا لازم آئے گا مگر جواب یہی ہے کہ الد ر فی لصندوق میں حکم بواسطہ ہے۔ والدُّرُ فِی الْحُقَّۃِ میں بلا واسطہ ہے اب کچھ اشکال نہیں اسی طرح فناء کے باب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فنا کے منافی وہ ارادہ ہے جو بلا واسطہ ہو اور جو ارادہ بواسطہ لا ارید کے ہو وہ فنا کے منافی نہیں۔

اور بعض عارفین نے ایک اور جواب دیا ہے کہ لا ارید میں راسخ ہونے کے بعد جوارادہ ہوتا ہے وہ بندے کا ارادہ نہیں ہوتا بلکہ وہ حق تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے خلاصہ یہ کہ فناء ارادہ بالاختیار کے بعد جوارادہ بندے کے قلب میں پیدا ہوتا ہے وہ گویا بالاضطرار جانب حق سے ہوتا ہے گو ظاہر میں اس کا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔

حضرت بہلول نے کسی عارف سے پوچھا تھا کہ کیا حال ہے فرمایا اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو، جس کی مشیت کے خلاف عالم میں کچھ بھی نہیں ہوتا انہوں نے پوچھا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ فرمایا یہ تو تم کو بھی معلوم ہے کہ بدوں مشیت حق کے کچھ نہیں ہوتا، کہا ہاں! فرمایا میں نے اپنے ارادہ کو ارادہ حق میں فناء کردیا ہے تو اب جو کچھ ہوتا ہے وہ جس طرح ارادۂ حق کے موافق ہوتا ہے۔اسی طرح میرے ارادۂ مشیت کے موافق بھی ہوتا ہے۔اس کا یہی مطلب ہے کہ میرے دل میں وہی پسندیدہ ہوتا ہے جو حق تعالیٰ چاہتے ہیں اس کے خلاف استحسان آتا ہی نہیں۔

ثمر فناء ارادہ

اسی کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دوسرے عنوان سے جو کہ بوجہ اتحاد ارادتین کے پہلے عنوان کے لئے لازم ہے بیان فرماتی ہیں۔ **ما اری ربک الایسارع فی ھواک**

(سنن أبی داوٗد کتاب التطوع باب، 26، الدر المنثور للیسوطی 207:4)

کہ میں دیکھتی ہوں کہ حق تعالیٰ آپ کی خواہش کے پورا کرنے میں سبقت فرماتے ہیں۔

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں　　　مید ہد یزداں مراد متقیں

تو جو چاہتا ہے وہی اللہ کرتا ہے حق تعالیٰ متقیوں کی مدد پوری فرماتے ہیں۔

کہ آپ جو چاہتے ہیں حق تعالیٰ وہی کردیتے ہیں دراصل اس کا راز یہی تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارادہ کو ارادۂ حق میں فنا کردیا تھا۔اب جوارادہ آپ کے دل میں پیدا ہوتا تھا وہ دراصل ارادۂ حق ہوتا تھا مگر ظاہر میں لوگ اُس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعادہ سمجھتے تھے اور جب حق تعالیٰ اس کے موافق حکم فرماتے تو یوں کہتے حق تعالیٰ آپ کی خواہش پورا کرنے میں مسارعت وسبقت فرماتے ہیں مگر حقیقت میں یوں کہنا چاہیے یا یوں کہا جائے مَا ارلک **الاتسارع فی ھوی ربک** خوب سمجھ لو۔

محققین نے فرمایا ہے کہ فناء ارادہ کے بعد بندہ کا ارادہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اس حدیث کا مصداق ہوجاتا ہے **بی یبصر و بی ینطق و بی یبطش و بی یمشی** (میرے اذن سے دیکھتا ہے اور میرے اذن سے پکڑتا ہے اور میرے اذن سے چلتا ہے) اور اسی سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ **بی یرید** کیونکہ جب اس کے وہ افعال بھی جو بلا واسطہ فعل حق نہیں ہوسکتے جیسے مشی وغیرہ باذن حق ہوتے ہیں تو اس کا ارادہ جو بلا واسطہ بھی فعل ہے باذن حق کیوں نہ ہوگا۔

فانی کی دعاء:

اب یہاں سے معلوم ہوگیا کہ فانی کی زبان سے دعا وہی نکلے گی جو حق تعالیٰ اس کی زبان سے نکلوانا چاہئیں گے یہ بدوں مشیت وارادہ حق کے دعا بھی نہیں کرتا اور ان کی دعا مستجاب ضرور ہوگی کیونکہ اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے حاکم ضلع ہم سے خود کہے کہ ہمارے یہاں اس مضمون کی درخواست پیش کرو۔ اس کے منظور ہونے میں بھلا کیا شبہ ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

چوں خدا از خود سوال و گدکند — پس دعائے خویشتن چوں رد کند

(حق تعالیٰ شانہٗ جب سوال کرنے کی خود فرمائش فرماتے ہیں تو اپنی طلب دعا کی فرمائش پر دعا کو کب رد کرینگے)

اور فرماتے ہیں

ماچو چنگیم و تو زخمہ مے زنی — زاری از ما نے تو زاری میکنی

اے اللہ ہماری مثال چنگ کی سی ہے اور آپ گویا مضراب مار رہے ہیں (یعنی ہمارے افعال کے آپ ہی تو خالق ہیں گو ظاہر میں افعال ہم سے سرزد ہورہے ہیں مگر مؤثر حقیقی واقع میں آپ ہی تو ہیں) تو اس بناء پر ہم اگر زاری کریں تو یہ ہماری طرف سے حقیقۃً نہیں ہیں (بلکہ گویا آپ اس آپاس فضل کو کر رہے ہیں بہ اعتبار مؤثر خالق ہونے کے)

اور فرماتے ہیں

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے — یک دہاں پنہاں است درلب ہائے وے

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما — ہائے وہوئے درفگندہ در سماء

ہم بانسری کی طرح دو منہ رکھتے ہیں ایک منہ تو اس لبوں میں پوشیدہ ہے اور ایک منہ تمہاری طرف نالاں ہوکر آسمان کی طرف پائے ہوئے ڈالے ہوئے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ دعا کے وقت ہمارے دو منہ ہوتے ہیں۔ ایک منہ سے تو دعا کرتے ہیں اور دوسرے منہ سے وہاں سے دعا اخذ کرتے ہیں۔ گویا ایک حیثیت سے انہیں سے اُس کا صدور ہورہا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کے افعال محلل بالاغراض ہونے کے سبب خود مقصود بالذات ہیں۔ پس اس بناء پر وہ دعا ہی مقصود بالذات ہے۔

اجابتِ دعاء

اب یہاں سے یہ شبہ دفع ہوگیا کہ بعض دفعہ اولیاء کی دعاء بھی قبول نہیں ہوتی حالانکہ اوپر کی تقریر کا مقتضا یہ ہے کہ ان کی دعا کبھی رد نہ ہو کیونکہ وہ تو درحقیقت حق تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

جواب یہ ہے کہ وہ دعا ہر حال میں مقصود بالذات ہے اور اسی کا مرضی و پسندیدہ ہونا بھی اُس کی استجابت ہے پھر تو کبھی حق تعالیٰ ان کی زبان سے دعا اس لئے نکلواتے ہیں تاکہ اس کے ثمرہ کا ظہور کردیں

اور بعض دفعہ اس لئے نکلواتے ہیں ان کی باتیں سنیں ان کا عجز و نیاز دیکھیں اور عارف کو دعا سے بجز دعا کے کچھ مقصود نہیں ہوتا تو اس کی دُعا ہر حال میں مستجاب ہے کیونکہ مدعا ہر حال میں حاصل ہے۔

علامتِ قبولیت

اور یہ جواب وہی ہے جو ایک بزرگ کو ہاتف غیب نے دیا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ ایک بزرگ ذکر و شغل کیا کرتے رات کو تہجد میں اٹھتے تھے، شیطان نے ان کو دھوکہ دیا کہ تم بے فائدہ سر مارتے ہو اُدھر سے تو نہ پیام ہے نہ سلام ہے نہ جواب ہے نہ کوئی قاصد ہے بس یہ حال ہے ۔

نہ قاصدے نہ صبائے نہ مرغ نامہ برے　　　کسے ز بے کسی ما نہ می برد خبرے

نہ کوئی قاصد ہے نہ کوئی صبا اور نہ کوئی مرغ نام لے جانے والا ہے ہماری بے کسی کی وجہہ سے ہم کو کوئی خبر نہیں ہے۔

شاعر نے تو نمی برد کہا ہے یہاں یہ تو صحیح نہیں کیونکہ حق تعالیٰ کے پاس سب خبریں پہنچتی بھی ہیں اور خود بھی وہ سب کچھ جانتے ہیں یہاں نمی آرد خبرے مناسب ہے مگر شعر کا وزن ٹوٹے گا۔ (لیکن اگر نمید ہد ہو تو وزن بھی رہتا ہے اور مراد نمی د ہد مارا ہوگا) بہر حال شیطان نے یہ دھوکہ دیا اور وہ بزرگ اس سے مغلوب ہو گئے وہ بھی چکر میں آ گئے کہ واقعی جب وہاں سے کچھ نامہ ُ پیام نہیں تو میری محنت فضول ہے۔

یہ کہہ کر ذکر شغل و تہجد چھوڑ کر سو رہے۔ رات کو خواب میں کسی فرشتے نے حق تعالیٰ کی طرف سے سوال کیا کہ کیوں صاحب؟ آج آپ نے ہم کو یاد کیوں نہیں کیا آج ہمیں چھوڑ کر کیوں سو رہے۔ انہوں نے وہی شیطانی شبہ پیش کیا کہ حضرت کئی برس تو آپ کو یاد کیا جب آپ کی طرف سے کچھ جواب ہی نہ ملا تو میں نے کہا کہ اس طرح یاد کرنا فضول ہے۔ کہ ہم تو ہمیشہ یاد کریں اور وہاں سے کچھ بھی نہ ہو اس پر فرشتے نے منجانب اللہ جواب دیا۔ ۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست　　　ویں نیاز و سوز و ورت پیک ماست

کہ میاں تمہارا ایک دفعہ اللہ کہہ کر دوبارہ اللہ کہنا یہی تو ہمارا جواب ہے اگر ہم کو تمہارا پہلی دفعہ اللہ کہنا پسند نہ ہوا ہوتا تو دوبارہ کہنے سے زبان کو بند کر دیتے پھر کیا مجال تھی کہ تم ایک گھنٹہ دو گھنٹہ تک ذکر کر سکتے اور اللہ اللہ کرنے سے جو تمہارے دل میں رقت و طمانیت اور برد و حلاوت پیدا ہوتی ہے یہ ہمارا قاصد ہے اگر ذکر مقبول نہ ہوتا تو یہ آثار کیونکر مرتب ہوتے بلکہ کثرتِ ذکر سے بھی قساوت ہی بڑھتی۔ (چنانچہ ارشاد ہے وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (اور ہم قرآن میں ایسی چیز بھی نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں سبق و رحمت ہے اور ظالموں کو اس سے اور نقصان بڑھتا ہے) اور ایک ارشاد ہے وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا پس ذکر اللہ سے اگر شوق میں ترقی اور حب الٰہی میں زیادتی ہو تو سمجھ لو کہ ذکر مقبول ہے اور یہی شوق و ازدیاد حب حق

تعالیٰ کی طرف سے تمہاری طرف قاصد ہے تو جب ہماری طرف سے جواب بھی موجود ہے اور قاصد بھی برابر آ رہا ہے پھر اس کے کیا معنی کہ ادھر سے نامۂ و پیام وسلام کلام کچھ نہیں۔ اب ان بزرگ کو تنبہ ہوا اور سمجھے کہ وہ وسوسۂ شیطانی تھا اس سے توبہ واستغفار کر کے بدستور مشغول ذکر ہو گئے۔

مقصودیت ذکر

تو اس جواب سے معلوم ہو گیا کہ ذکر خود مقصود بالذات ہے اور کسی کی زبان وقلب سے ذکر اللہ کا جاری رہنا خود بھی دولت ہے اور یہ مسئلہ کچھ اسی حکایت ہی پر موقوف نہیں بلکہ علماء سے بھی منقول ہے شیخ ابن عربی نے لکھا ہے کہ اجابتِ دعاء کے معنی یہ ہیں کہ جب بندہ حق تعالیٰ سے دعا کرتا ہے تو وہاں سے فوراً جواب آتا ہے۔ **لبیک عبدی ادعونی استجب لکم** (میرے بندے میں حاضر ہوں، میں تمہاری دعا قبول کروں گا)

میں جس اجابت کا وعدہ ہے وہ یہی ہے اور عاشق کے واسطے یہی بہت بڑی بات ہے وہ تو محبوب کے ایسے جواب سے زندہ ہو جاتا ہے اور ذکر کے بارہ میں تو منصوص ہے۔

فَاذْ كُرُوْ نِیْ اَذْكُرْ كُمْ

تم مجھے یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔ جس کی تفصیل حدیث میں ہے۔ **مَنْ ذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسی و من ذکرنی فی مَلاٍ ذَکرتُهٗ فِی مَلاء خیر منه.** (مسند احمد 261:6)
(جو شخص مجھ کو اپنے دل میں یاد کرتا ہے میں اس کو اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور جو شخص مجھ کو مجلس میں یاد کرتا ہے میں ایسی مجلس میں اس کو یاد کرتا ہوں جو اس سے بہتر ہے)

پس ذکر اس واسطے مقصود نہیں کہ اس پر کیفیات وحالات کا ترتب ہو۔ بلکہ محض اس لئے مقصود ہے کہ بندہ کے ذکر سے حق تعالیٰ اس کو یاد کرتے ہیں عاشق کے لئے کیا یہ تھوڑی بات ہے کہ محبوب اس کو یاد کرے (ہائے ۔ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے ۱۲)

بہر حال عارفین خود ذکر ودعا ہی کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں وہ خود دعا ہی کو اجابت اور ذکر ہی کو نعمت سمجھتے ہیں۔

معنی اجابت

باقی آج کل جس چیز کو اجابت سمجھا جاتا ہے اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے ایک بزرگ نے عاقبت بخیر وسلامتی ایمان کی تفسیر کی تھی۔ پانی پت میں مولوی غوث علی صاحب ایک درویش تھے۔ بڑے ظریف تھے ان کے سامنے کسی نے کسی کو یہ دعا دی کہ عاقبت بخیر ہو ایمان کی سلامتی۔ مولوی صاحب نے کہا جانتے بھی ہو عاقبت بخیر وسلامت ایمان کا کیا مطلب ہے اس نے کہا جی یہی کہ انجام

بخیر ہواور ایمان سلامت رہے۔فرمایا یہ تو ظاہری مطلب ہے اُس نے کہا حضرت پھر دوسرا مطلب آپ بیان کر دیجئے۔فرمایا ایمان کی سلامتی یہ ہے کہ دونوں وقت کھانے کو روٹی ملتی رہے اور عاقبت بخیر یہ ہے کہ دونوں وقت اجابت آسانی سے ہو جائے۔مطلب یہ تھا کہ تم جیسوں کے لئے تو یہی خیر اور سلامتی ہے ایسے ہی عام لوگ اجابت دعا کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ جو ہم نے مانگا ہے وہ مل جائے۔

کما و رد فی الحدیث ان وفد بنی تمیم قدموا علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال لھم یا بنی تمیم اقبلوا البشری فقالوا ابشرتنا فاعطنا ثم جاءہٗ وفد الاشعر بین فیما احسب قال یَا معشر الاشعر یین اقبلوا البشری اذردہٗ بنو تمیم فقالوا البشر نا یَا رَسول اللّٰہ ۱۲)(الصحیح للبخاری4:135، سنن الترمذی3161)

حدیث میں وارد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں بنی تمیم کا وفد حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اے بنی تمیم بشارت کو قبول کرو انہوں نے عرض کیا کہ آپ بشارت دینے کی بجائے ہم کو کچھ عطا کیجئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اشعرئین حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اشعرتم بشارت کو قبول کرو اس لیے کہ بنی تمیم نے اسکو رد کر دیا انہوں نے عرض کیا یارسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے بشارت کو قبول کیا۔

اہل اللہ کا دعا سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ جو مانگا ہے وہ مل جائے اسی واسطے ظہور اثر دعا میں تاخیر ہونے سے وہ پریشان نہیں ہوتے کیونکہ ان کا مقصود تو خود دعا ہی ہے بلکہ بعض دفعہ وہ اس کی تمنا کیا کرتے ہیں کہ ابھی دعا کا اثر ظاہر نہ ہو ورنہ پھر کس بہانہ سے مانگا کریں گے اور کس بہانہ سے باتیں کریں گے۔

جیسے ایک مریض طبیب پر عاشق ہو گیا تھا تو وہ اپنے لئے طول مرض کی دعا کرتا تھا تا کہ اس بہانہ ہی سے محبوب کی زیارت ہوتی رہے۔

حقیقی اجابت

غرض حقیقی اجابت یہی ہے حق تعالیٰ ان کو اس دعائے مرضی کا مظہر بنا دے جس کو مولانا فرماتے ہیں۔جیسا اوپر مذکور ہوا۔

چوں خدا از خود سوال و کد کند   پس دعائے خویشتن چوں رد کند

حق تعالیٰ شانہٗ جب سوال کرنے کی خود فرمائش کرتے ہیں تو اپنی طلب ودعا کی فرمائش کو کب رد کریں گے۔

ما چو چنگیم وتو زخمہ می زنی   زاری ازمانے تو زاری میکنی

اے اللہ ہماری مثال چنگ کی سی ہے اور آپ گویا مضراب مار رہے ہیں تو اس بناء پر ہم گریہ وزاری کریں وہ بھی حقیقۃً ہماری طرف سے نہیں ہے۔

اسی لئے ایک بزرگ نے لکھا ہے کہ اوروں کی مظہریت تکوینی ہے (کہ ان کے وجود

سے صرف تکوین حق کا ظہور ہوتا ہے) اور اہل اللہ کی مظہریت تشریعی بھی ہے کہ اُن کے وجود سے احکام شرعیہ کا ظہور ہوتا ہے یعنی ان سے انہی اعمال کا ظہور ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کو پسند ہوتے ہیں غرض ارادہ کا فنا نہ کرنا اور اپنے لئے کچھ تجویز کرنا یہی غلطی ہے۔ ارضاء خلق اسی کا شعبہ ہے۔

طریق فناء

اگر ارضاء خلق اور ریاء سے بچنا چاہتے ہو تو فنا کا طریق اختیار کرو۔ بدوں کامل کے ریاء سے حفاظت نہیں ہوسکتی۔ جیسا مفصلاً مذکور ہوا۔ اور ایسا شخص فناء خلق میں ضرور گرفتار رہے گا جس کے بعض مراتب ایسے ہیں جو توحید واجب کے بھی خلاف ہے۔ مثلاً ارضاء خلق کے لئے شرائع کو موخر کر دینا یا ترک کر دینا یہ سخت حالت ہے۔ یہ تو مقصود تھا۔

اب آیت کے متعلق کچھ فوائد ہیں جن کو اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔

ارضاء مطلوب

(۱) فائدہ تو یہ ہے کہ آیت میں یَحْلِفُوْنَ لَکُمْ میں لکم (تم سے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں) سے مراد کون لوگ ہیں؟ ظاہر ہے کہ صحابہؓ مراد ہیں صحابہ مع الرسول مراد نہیں کیونکہ آگے وَاللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ (اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو راضی کریں) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مستقل طور پر ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ منافقین حضرات صحابہؓ کے راضی کرنے کی فکر کرتے تھے۔ مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ روایات میں مصرح ہے کہ وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کر جھوٹی قسمیں کھاتے تھے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے خوش رہیں اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصود مسلمانوں کو راضی کرنا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنا نہ تھا۔ سو بات یہ ہے کہ آپ کی رضاء ایک تو بحیثیت عدم تعرض کے ہے کہ آپ اُن سے تعرض نہ کریں قتل نہ کریں۔ غلام باندی نہ بنائیں اس اعتبار سے آپ کی رضاء مثل دوسرے مسلمانوں کی رضا کے ہے اور دوسری رضا دل سے ہے کہ آپ کا دل ہم سے خوش اور صاف رہے اس اعتبار سے آپ کی رضاء مثل رضا اللہ تعالیٰ کے ہے اور منافقین کا قصداً ارضاء پہلی حیثیت سے تھا اور مطلوب دوسری حیثیت ہے جو ان میں مفقود تھی۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کا خوش کرنا اور راضی رکھنا وہ شخص چاہے گا جس کو محبت و اخلاص حاصل ہو اور منافقین حبِ رسول ہی سے محروم تھے۔ اخلاص تو کہاں ہوتا۔ پس وہ تو یہ چاہتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری برتاؤ میں فرق نہ آئے اور ہماری بات بنی رہے چاہے باطناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو کیسی ہی کلفت پہنچتی رہے۔

خلاصہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دو شانیں تھیں ایک شان سلطنت اور دوسری شان نبوت و محبوبیت حق پس روایات میں جو آتا ہے کہ منافقین جھوٹی قسموں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنا چاہتے تھے۔ وہاں ارضاء بحیثیت شان سلطنت مراد ہے اور اس اعتبار سے آپ کی رضاء مثل مسلمانوں کی رضاء کے تھی اور یہاں جو آیت سے معلوم ہوا کہ وہ آپ کو راضی کرنے کا قصد نہ کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شان نبوت و رسالت کا لحاظ کر کے آپ کو راضی کرنے کی فکر نہ کرتے تھے کیونکہ اس حیثیت سے آپ کو راضی کرنا تو عین ارضاءِ حق ہے اور وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان نبوت و رسالت کا کچھ پاس نہ کرتے تھے اور چونکہ حضور میں غالب شان نبوت تھی اور وہی آپ کی بعثت سے مقصود تھی شان سلطنت مقصود نہ تھی۔ بلکہ شان نبوت کے تابع تھی تا کہ اجراء احکام میں سہولت ہو اور منافقین نے اس شان مقصود سے آپ کے ارضاء کا قصد نہ کیا تھا تو گویا آپ کے ارضاء کا بالکل ہی قصد نہ تھا۔ کیونکہ شان غیر مقصود سے قصد ارضاء عند اللہ غیر معتبر و کالعدم ہے۔ ۱۲۔ جامع)

طریقت کا مرض

یہ تو اشکال کا جواب تھا۔ اب میں اس پر ایک مسئلہ کی تفریع کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے منافقین کے اس فعل پر تشنیع کی ہے کہ وہ حضرات صحابہؓ کے ارضاء کا قصد کرتے ہیں اور یہ ارضاء وہی ہے جو خلاف شرع ہے کیونکہ وہ اس کے ساتھ اللہ و رسول کے ارضاء کا قصد نہیں کرتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ حضرات صحابہؓ کا درجہ اقطاب و اغواث سب سے بڑھا ہوا ہے جب اُن کا ارضاء بھی مطلقاً محمود نہیں بلکہ اس کے بعض افراد مذموم و شنیع ہیں۔ یعنی صحابہؓ کا وہ ارضاء جو ارضاء اللہ و ارضاء رسول سے خالی ہو تو اقطاب و مشائخ کا ارضاء مطلقاً کیسے محمود ہو سکتا ہے۔؟

یہاں سے مرض معلوم ہو گیا اُن مدعیان طریقت کا جو مشائخ کی تعظیم میں ایسا غلو کرتے ہیں کہ چاہے خدا اور رسول کے احکام فوت ہو جائیں مگر پیر کے احکام فوت نہ ہوں۔ چنانچہ مجھ سے ایک شخص نے خود یہ کہا کہ میں شیخ کے بتلائے ہوئے وظیفہ کو کبھی نہیں چھوڑتا چاہے نماز و جماعت چھوٹ جائے۔ استغفر اللہ! حکم شیخ کی اتنی عظمت یہ بھی ارضاء خلق میں داخل ہے اور منافقین کے فعل کے مشابہ ہے۔

اسی طرح ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ایک پیر نے مرید سے پوچھا کہ تو خدا کو جانتا ہے اس نے کہا میں خدا کو کیا جانوں۔ میں تو آپ کو جانتا ہوں۔ نعوذ باللہ نعوذ باللہ۔ اب اس پر کوئی عالم ایسے لوگوں کی تکفیر کرے تو بتلائیے اس کی کیا خطا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے یہ حکایت میں نے بیان کر کے کہا کہ یہ مرید تو کافر ہو گیا ہوگا۔ تو مولانا نے فرمایا نہیں کافر کیوں کہتے ہو۔ تم ہی بتلاؤ کیا تم خدا کو پورا پورا جانتے ہو۔ مولانا کا مقصود ایک احتمال نکالنا تھا یعنی ممکن ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ میں حق تعالیٰ کو ایسا نہیں جانتا جیسا پیر کو جانتا ہوں پھر کافر کیونکر ہوا۔ خیر یہ تو علماء کی

رحمت ہے کہ مسلمان کے اقوال میں تاویل کر لیتے ہیں ورنہ ان الفاظ کے سنگین ہونے میں کیا شبہ ہے؟

تقلید کی تفسیر

اسی طرح بعض اہل تعصب کو آئمہ کی تقلید میں ایسا جمود ہوتا ہے کہ وہ امام کے قول کے سامنے احادیث صحیحہ غیر معارضہ کو بے دھڑک رد کر دیتے ہیں۔ میرا تو اس سے رونگٹا کھڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک ایسے ہی شخص کا قول ہے قال قال بسیار است مرا قال ابوحنیفہ درکار است۔

اس جملہ میں احادیث نبویہ کے ساتھ کیسی بے اعتنائی اور گستاخی ہے۔ خدا تعالیٰ ایسے جمود سے بچائے ان لوگوں کے طرز عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ ہی کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں۔ اب اس تقلید کو کوئی شرک فی النبوت کہہ دے تو اس کی کیا خطا ہے۔ مگر یہ بھی غلطی ہے کہ ایسے دو چار جاہلوں کی حالت دیکھ کر سارے مقلدین کو شرک فی النبوت سے مطعون و متہم کیا جائے۔ خدا نہ کرے سب مقلد ایسے کیوں ہوتے میرے دل میں تو تقلید کی تفسیر یہ ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث وارشادات پر عمل کرتے ہیں۔ اس تفسیر پر جو امام ابوحنیفہؒ نے بیان کی ہے کیونکہ وہ ہمارے نزدیک درایت وفقہ حدیث میں اعلیٰ پایہ پر ہیں۔ اور اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کیونکہ امام صاحب کا فقیہ الامت ہونا تمام امت کو تسلیم ہے اور اُن کے علوم اس پر شاہد عدل ہیں۔ اب بتلایئے اس تفسیر کی بنا پر تقلید میں شرک فی النبوت کیونکر ہو گیا۔ اس لئے کہ جس کے نزدیک تقلید کا یہ درجہ ہوگا۔ اس کے نزدیک اتباع حدیث مقصود بالذات ہوگا۔ اور امام ابوحنیفہ محض واسطہ فی التفہیم ہوں گے۔ جو شخص بلا واسطہ عمل بالحدیث کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ حدیث کا اتباع اپنی فہم کے ذریعہ سے کرتا ہے اور جو شخص کسی امام مسلم کا مقلد ہے وہ ایک بڑے شخص کی فہم کے واسطہ سے حدیث کا اتباع کرتا ہے اور یقیناً سلف صالحین کی فہم وعقل وورع وتقویٰ ودیانت وامانت وخشیت واحتیاط ہمارے اور آپ سے زیادہ تھی تو بتلایئے عمل بالحدیث کس کا کامل ہوا آپ کا جو اپنی فہم کے ذریعہ سے حدیث پر عمل کرتے ہیں یا مقلد کا جو سلف کے ذریعہ سے حدیث پر عمل کرتا ہے۔ اس کا فیصلہ اہل انصاف خود کر لیں گے۔ بہر حال تقلید کی جو تفسیر میں نے بیان کی ہے یہ علم عظیم ہے اس کو یاد رکھئے۔

احناف کا عمل بالحدیث

رہا مدعیان عمل بالحدیث کا یہ اعتراض کہ تمہارے سامنے ایک حدیث پیش کی جاتی ہے۔ اور تم اُس کو نہیں مانتے محض اس وجہ سے کہ تمہارے امام کا قول اس کے خلاف ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم کو تقلید حدیث مقصود بالذات نہیں بلکہ تقلید قول امام مقصود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے اس میں احادیث مختلف ہوتی ہیں۔ جس حدیث کو تم ہمارے سامنے پیش کرتے ہو ہمارا عمل اگر اس پر نہیں تو اس مسئلہ میں دوسری حدیث پر ہمارا عمل ہے اور تم اس

حدیث کونہیں مانتے جس کوہم مانتے ہیں پھر ہمارے ہی اوپر کیا الزام ہے تم پر بھی تو الزام ہے۔

رہا تمہارا یہ کہنا کہ ہماری حدیث راجح ہے تمہاری مرجوح ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ طریق ترجیح کا مدار ذوق پر ہے تمہارے ذوق میں ایک حدیث راجح ہے اور امام ابوحنیفہ کے ذوق میں دوسری راجح ہے اور ہمارے نزدیک امام کا ذوق تمہارے ذوق سے اسلم وارجح ہے پھر تمہارا اپنے آپ کو عامل بالحدیث کہنا اور مقلدین کو عامل بالحدیث نہ کہنا محض ہٹ دھرمی ہے۔

اسی کو میں دوسرے عنوان سے کہتا ہوں کہ عمل بالحدیث کے معنی آیا۔

عمل بکل الاحادیث ہے یا عمل بعض الاحادیث.؟

اگر کہو عمل بکل الاحادیث مراد ہے سو یہ تو تم بھی نہیں کرتے اور یہ ممکن بھی نہیں کیونکہ آثار مختلفہ واحادیث متعارضہ میں سب احادیث پر عمل نہیں ہوسکتا یقیناً بعض پر عمل ہوگا۔ اور بعض کا ترک ہوگا اور اگر عمل ببعض الاحادیث مراد ہے تو اس معنی کے ہم بھی عامل بالحدیث ہیں پھر تم اپنے ہی کو عامل بالحدیث کدھر سے کہتے ہو۔

ضرورت تقلید

دوسری بات یہ ہے کہ مسائل منصوصہ تو بہت کم ہیں زیادہ مسائل اجتہادیہ ہیں اور ان میں مدعیان عمل بالحدیث بھی حنفیہ کی کتابوں سے فتوے دیتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ (یا اور کسی امام کے قول کو لیتے ہیں) تو زیادہ مسائل میں آپ بھی مقلد ہوئے تو یہ کیا بات کہ تقلید کرنا تو حرام نہیں صرف تقلید کا نام لینا ہی ناجائز اور شرک ہے اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ تمام مسائل میں احادیث منصوصہ پر ہی عمل کرتا اور فتوے دیتا ہے تو وہ ہم کو اجازت دیں کہ معاملات وعقود و فسوخ وشفعہ ورہن وغیرہ کے چند سوالات ہم ان سے کریں اور ان کا جواب وہ ہم کو احادیث منصوصہ صریحہ صحیحہ سے دیں قیامت آجائے گی اور احادیث سے وہ کبھی جواب نہ دے سکیں گے۔ اب یا تو وہ کسی امام کے قول سے جواب دیں گے یہ تو تقلید ہوئی یا یہ کہیں گے کہ شریعت میں ان مسائل کا کوئی حکم نہیں یہ **الیوم اکملت لکم دینکم** (آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کردیا) کے خلاف ہوگا۔

جواز قیاس

اور یہیں سے قیاس واستنباط کا جواز بھی معلوم ہوگیا، کیونکہ جب حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

دین کو کامل کر دیا گیا تو چاہئے کوئی صورت ایسی نہ ہو جس کا حکم شریعت میں نہ ہو اور ظاہر ہے کہ احکام منصوصہ بہت کم ہیں تو اب تکمیل دین کی صورت بجز اس کے کیا قیاس واستنباط کی اجازت ہو کہ انہی مسائل منصوصہ پر غیر منصوصہ کو قیاس کر کے ان کا حکم معلوم کریں یہاں سے ان مدعیان عمل بالا حادیث کی غلطی بھی ظاہر ہوگئی جو قیاس واستنباط کو مطلقاً رد کرتے ہیں۔ اور بعض احادیث میں جو قیاس کی مذمت ہے وہ وہ قیاس ہے جو اصول شریعت کے خلاف ہو یعنی جس کی اصل نص میں موجود نہ ہو بلکہ اس کا مبنی محض اپنی رائے ہو اور جس قیاس کی اصل نص میں موجود ہو اس کی مذمت ہرگز نہیں ورنہ دین کا نقص لازم آئے گا۔

تقلید میں غلو

یہ تو غیر مقلدوں کے اعتراضات کا جواب تھا جو استطراداً ذکر کر دیا گیا میرا مقصود دراصل مقلدین کو ان کی اس غلطی پر متنبہ کرنا ہے کہ اُن میں سے بعض کو تقلید میں ایسا غلو ہوتا ہے کہ آیات واحادیث کو بے دھڑک یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ ہم ان کو نہیں جانتے ہم تو اپنے امام کے قول کو جانتے ہیں یہ طرز نہایت خطرناک اور شنیع ہے اور قرآن میں اس پر سخت وعید وارد ہے گویا یہ لوگ اس آیت کا مصداق ہیں۔

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمُنْکَرَ یَکَادُوْنَ یَسْطُوْنَ بِالَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ عَلَیْھِمْ اٰیٰتِنَا ط

ترجمہ: اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں آپ کافروں کے چہروں میں تغیر محسوس کرینگے قریب ہے کہ وہ لوگ ان لوگوں پر حملہ کر بیٹھیں جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں۔

الفاظ میں ادب کا پاس

حضرات صحابہؓ کی تو یہ حالت تھی کہ حدیث[1] کے ساتھ صورت معارضہ کو بھی سخت نفرت کے ساتھ دیکھتے اور اس پر برسوں مخاطب سے بول چال بند کر دیتے تھے۔ گو مخاطب کا مقصود معارضہ نہ ہو۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر تمہارے گھر کی عورتیں مسجد میں جانے کے لئے اجازت مانگیں تو ان کو روکو نہیں اجازت دے دیا کرو۔ (اس پر ان کے ایک صاحبزادہ بولے واللہ لنمنعھن بخدا ہم تو انہیں ضرور روکیں

---

[1] مسند احمد 2:354

گے۔)اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو بہت سخت غصہ آیا کہ ''میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کر رہا ہوں کہ ان کو روکو نہیں اور تم اس کے مقابلہ میں یہ کہتے ہو کہ ہم ضرور روکیں گے۔ بخدا میں تم سے کبھی نہ بولوں گا۔''

سواس جگہ ان کے صاحبزادہ نے واقعہ میں معارضہ کا قصد نہ کیا تھا۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اپنے زمانہ کے لئے تھا اور اس زمانہ میں شرور وفتن ظاہر ہو گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آج کل کے واسطے نہیں مگر چونکہ صورت معارضہ کی تھی۔ اس لئے حضرت عبداللہ بن عمر کو غصہ آ گیا اور ایسا غصہ آیا کہ بول چال بند کر دی۔ اگر وہ صاحبزادہ ادب سے پوچھتے کہ حضرت یہ حدیث عام ہے یا حضور کے زمانہ خیر کے ساتھ خاص ہے تو وہ حدیث کا مطلب بیان فرما دیتے مگر مقابلہ کی سی بات سن کر اُن سے نہ رہا گیا کیونکہ بات ہی تو سب کچھ ہے اسی سے ادب ہوتا ہے اور اسی سے بے ادبی ہوتی ہے۔

چنانچہ ایک بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ اس کے سب دانت گر پڑے ہیں صبح کو ایک معبر سے یہ خواب بیان کیا اس نے تعبیر دی کہ آپ کا سارا خاندان آپ کے سامنے مر جائے گا۔ بادشاہ کو اس تعبیر سے غصہ آ گیا۔ اور فوراً اس کو جیل خانہ بھجوا دیا پھر دوسرے معبر کو بلوایا اور وہی خواب اُس سے بیان کیا اس نے یہ تعبیر دی کہ حضور کی عمر اپنے خاندان میں سب سے زیادہ ہوگی اس کو خلعت وانعام دیا گیا۔ مطلب اس کا بھی وہی تھا جو پہلے کا تھا مگر عنوان اس کا لطیف تھا اور پہلے کا کثیف تھا۔

شریعت نے بھی الفاظ کے ادب اور شائستگی کی بہت تعلیم دی ہے کہ ایسے الفاظ استعمال نہ کرو جن میں بے ادبی اور گستاخی کا ابہام بھی ہوتا ہو۔ چنانچہ **عبدی و امتی** (میرا غلام اور میری لونڈی) کہنے کی ممانعت ہے اس کی بجائے فتائی وفتاتی کہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ راعنا (لفظ راعنا کہا کرو سلکنی ہمیں دیکھئے) کہنے کی ممانعت ہے۔ اس کی جگہ **انظرنا** (ہماری طرف نظر فرمائیے) کہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ **و علیٰ هذا**۔

حضرات صحابہؓ کا ادب

اور اس تعظیم کی برکت سے حضرات صحابہؓ بڑے مؤدب تھے۔ چنانچہ ایک صحابی سے کسی نے پوچھا کہ تم بڑے ہو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی عمر کس کی زیادہ ہے تو وہ صحابی فرماتے ہیں **رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اکبر منی و انا اسنّ منه (الصحیح للبخاری 128:4)** کہ بڑے تو حضور ہی ہیں ہاں عمر میری زیادہ ہے۔ سبحان اللہ! کیسا ادب ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ حضور[1]صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ فرما رہے تھے۔ مسجد میں کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خطاب کر کے فرمایا اجلسوا بیٹھ جاؤ اسی وقت ایک صحابی دروازہ مسجد پر پہنچے تھے اور اندر آنا چاہتے تھے مگر حضورؐ کا امر اجلسوا سن کر وہ دروازہ ہی پر بیٹھ گئے۔ حالانکہ حضورؐ کا مقصود ان لوگوں کو خطاب کرنا تھا جو مسجد میں کھڑے تھے۔ یہ مطلب نہ تھا کہ دروازہ سے بھی اندر نہ آؤ۔ اور دروازہ ہی پر بیٹھ جاؤ۔ مگر صحابی کا ادب دیکھئے کہ حکم کے سنتے ہی فوراً بیٹھ گئے۔ سننے کے بعد آگے قدم نہیں بڑھایا۔ اور یہ ادب ہی بڑی چیز ہے اسی سے ساری دولت حاصل ہوتی ہے۔

اہل اللہ کا ادب

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ مولانا محمد قاسم صاحب کو جو علوم عالیہ عطاء ہوئے تھے اس کی کیا وجہ ہے ان میں کیا بات تھی کہ جس کی وجہ سے یہ علوم ان سے ظاہر ہوئے مولانا نے اس کے چند اسباب بیان فرمائے منجملہ ان کے ایک سبب یہ بھی بیان فرمایا کہ مولانا میں ادب بہت تھا۔ واقعی مولانا بڑے مؤدب تھے۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک مرتبہ ایک مضمون نقل کے واسطے مولانا کو دیا۔ اس میں ایک جگہ املا کی غلطی تھی۔ (جو حضرت سے غالباً سہواً لکھی گئی) تو مولانا کا ادب دیکھئے کہ نہ تو اس لفظ کو غلط نقل کیا کہ یہ تو علم کے خلاف اور عمداً خطا تھی اور نہ اس کو صحیح نقل کیا کیونکہ اس میں حاجی صاحب کے کلام میں اصلاح تھی بلکہ اس لفظ کی جگہ خالی چھوڑ دی اور حضرتؒ سے عرض کیا کہ یہ لفظ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لئے جگہ خالی چھوڑ دی۔ حضرت نے دیکھ کر فرمایا یہ تو غلط لکھا گیا پھر حضرت نے اس کو خود ہی درست کر دیا اسی طرح حضرات اہل اللہ بات چیت میں بھی ادب کا بہت لحاظ فرماتے ہیں۔

نعمت بلاء

ہمارے حضرت حاجی صاحب ایک مرتبہ بلاء کے نعمت ہونے پر تقریر فرما رہے تھے اس وقت یہ مسئلہ ہم لوگوں پر منکشف ہو رہا تھا۔ اور سب بلائیں نعمت معلوم ہوتی تھیں۔ اسی وقت دفعتاً ایک شخص آیا جس کا ایک ہاتھ زخم کی وجہ سے گلا ہوا تھا۔ اور اُس نے آ کر دعا کی درخواست کی کہ مجھے اس بیماری سے بہت تکلیف ہے۔ اللہ تعالیٰ سے شفاء کی دعا فرمایئے۔ اس وقت ہم لوگوں کو فکر ہوئی کہ حضرتؒ نے ابھی بلاء کا نعمت ہونا بیان فرمایا ہے۔ اب دیکھیں اس کے لئے رفع بلاء کی کیونکر دعا فرمائیں گے کیونکہ رفع بلاء کی دعا کرنا تو اس تقریر کی بناء پر زوال نعمت کی دعا کرنا ہے۔ مگر عارفین کسی موقع پر نہیں رُکتے کیونکہ ان کے سامنے حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ حضرت نے فوراً فرمایا کہ سب صاحب دُعا کریں اور پُکار کر یہ دعا فرمائی کہ یَا اَللّٰہ ! اگر چہ ہم جانتے ہیں کہ یہ بلاء بھی نعمت ہے مگر یہ لوگ اپنے ضعف کے سبب اس نعمت کا تحمل نہیں

---

[1] کنز العمال: 2353، اتحاف السادة المتقین 5:116

کر سکتے، اس لئے درخواست کرتے ہیں کہ اس نعمت کو نعمت عافیت سے مبدل فرما دیجئے یہ طرز دعا سن کر ہماری آنکھیں کھل گئیں کہ سبحان اللہ! کس طرح ضدین کو جمع کیا ہے کہ بلاء کا نعمت ہونا بھی باقی رکھا اور اس کے رفع کی دعا بھی فرمادی اور کس خوبی سے اس وقت کا ادب ملحوظ رکھا۔ اور حسیات میں اس کا مشاہدہ ہے کہ بُھنا گوشت نعمت ہے۔ مگر ضعیف المعدہ اس کا تحمل نہیں کرسکتا اور اس کو ساگودانہ دیا جاتا ہے۔

بلاء و مصیبت میں فرق

دوسرے بلاء اور مصیبت میں بھی فرق ہے۔ بلاء کے معنی امتحان کے ہیں اور مصیبت وہ جس سے پریشانی ہو اور حضرت حاجی صاحب نے بلاء کو نعمت فرمایا تھا نہ کہ مصیبت کو کیونکہ مصیبت تو قمت ہوتی ہے اور اس کا سبب معاصی ہوتے ہیں۔ اور بلاء سے محبین کا امتحان مقصود ہوتا ہے جو رفع درجات کا سبب ہے اس لئے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ بلاء فرمایا ہے۔

اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل. (شرح السنة للبغوی 270:5، الدر المنثور 166:6) (لوگوں میں شدید ترین ابتلاء کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام ہیں پھر وہ لوگ جوان کے زیادہ مماثل ہیں پھر وہ لوگ جوان کے زیادہ مماثل ہیں)

لفظ مصیبت اختیار نہیں فرمایا تو اب بلاء کا نعمت ہونا بالکل ظاہر ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں گو صورت بلاء اور صورت مصیبت یکساں ہو مگر حقیقت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بخار تھا۔ ایک صحابی نے جو ہاتھ رکھ کر دیکھا تو بہت تیز بخار تھا۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی وجہ دریافت کی فرمایا کہ مجھے دو آدمیوں کے برابر بخار ہوتا ہے اس لئے کہ اجر بھی مضاعف ہے۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیماری سے کیا مصیبت ہوتی جب کہ وہ جانتے ہیں کہ اس سے اجر بڑھ رہا ہے اور حق تعالیٰ کی رضا میں ترقی ہو رہی ہے۔ اسی بناء پر عارف شیرازیؒ موت پر مسرت ظاہر فرماتے ہیں۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم	راحت جاں طلبم وزپئے جاناں بُردم
نذر کردم کہ گرآید بسرایں غم روزے	تادر میکدہ شاداں و غزالخواں بردم

یعنی وہ دن مبارک ہیں جس روز ہم دنیائے فانی سے کوچ کریں راحت جاں طلب کریں اور محبوب حقیقی کے پاس جائیں میں نے یہ نذر کی ہے کہ جس دن یہ غم تمام ہو جائے یعنی موت کا وقت آئے تو محبوب کے دربار تک خوش و خرم اور شعر پڑھتا ہوا جاؤں۔

جب ان حضرات کے نزدیک موت بھی نعمت و راحت ہے جو عام لوگوں کے نزدیک اشد المصائب ہے تو اور بلاؤں کا تو کیا پوچھنا۔

موت سے قوتِ روحانی میں اضافہ

شاید کوئی کہے کہ یہ ساری مستیاں موت سے پہلے ہی تھیں جب موت آئی ہوگی نانی یاد آگئی ہوگی تو حضرت یقین رکھئے کہ ان کو نہ نانی یاد آئی نہ دادی بلکہ حق تعالیٰ ہی یاد آئے اور اسی مستی کے ساتھ اُن کو موت آئی۔ چنانچہ ایک نقشبندی بزرگ نے مرتے ہوئے وصیت فرمائی تھی کہ ہمارے جنازہ کے ساتھ ایک شخص یہ شعر پڑھتا ہوا چلے ۔

مفلسا نیم آمدہ در کوئے تو　　شیاً للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما　　آفرین بردست و بربازوئے تو

آپ کے دربار میں مفلس ہوکر آئے ہیں اپنے جمال کے صدقہ میں سے کچھ عنایت کیجئے ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھایئے اپ کے دست وبازو پرآفرین ہے۔

چشتیہ کا مذاق تو جلنا مرنا ہے ہی ان کے یہاں تو اخفاء حالات ہے ہی نہیں مگر کبھی کبھی نقشبندیہ بھی اپنا جوش ظاہر کردیتے ہیں کیونکہ محبت وعشق تو سب ہی میں ہے گوالوان مختلف ہیں۔ تو جس کو مرتے ہوئے نانی یاد آتی ہے اس کو ایسی وصیتوں کی مستی نہیں سوجھا کرتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو موت کے وقت وہی انشراح وانبساط وجوش وخروش تھا جو زندگی میں تھا۔

اور واقعات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو موت کے بعد بھی یہ انبساط وجوش باقی رہتا ہے اور قاعدہ کے موافق ہونا بھی چاہئے کیونکہ موت سے قویٰ باطنیہ ضعیف نہیں ہوتیں بلکہ قوتِ روحانی بڑھ جاتی ہے چنانچہ حضرت سلطان جی کے جنازہ کے ساتھ ایک مرید نے غلبہ حزن میں جو شیخ کے انتقال کے وقت مریدوں پر طاری ہوتا ہے۔ یہ اشعار پڑھے ۔

سروسیمینا بصحرامی روی　　سخت بے مہری کہ بے مامی روی
اے تماشا گاہِ عالم روئے تو　　تو کجا بہر تماشا می روی

اے محبوب آپ جنگل میں جارہے ہیں سخت بے میری ہے کہ اپ بغیر ہمارے جارہے ہیں اے محبوب آپ کا رخ انور جہاں کا تماسہ گاہ ہے آپ تماسہ کیلئے کہاں جارہے ہیں۔

اس نے جس وقت یہ اشعار پڑھے تو سلطان جی کے جنازہ پر وجدی کیفیت طاری ہوگئی اور ہاتھ کفن سے باہر نکل کر بلند ہوگیا پھر لوگوں نے اس مرید کو اشعار پڑھنے سے روکا کہ نہ معلوم کیا ہوجائے گا بس خاموش رہو۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ موت کے بعد بھی مطمئن رہتے ہیں۔

اہل اللہ کو موت سے راحت

حدیث میں میت کی نسبت آتا ہے مستریح او مستراح منہ (تاریخ بغداد للخطیب 7:4) کہ میت تو مستریح ہے یعنی خود راحت پانے والا ہے یا دوسروں کو اس سے راحت

ہو جاتی ہے۔ اگر نیک ہے تو مستریح ہے اور اگر بد ہے تو مستراح منہ ہے کہ لوگوں کو اس کے مرنے سے راحت و چین ہو جاتا ہے۔

غرض یہ حضرات موت سے بھی راحت ہی میں رہتے ہیں۔ کلام سلسلہ در سلسلہ بہت بڑھ گیا۔ اصل مضمون یہ تھا کہ مخلوق کو مقصود بالذات نہ سمجھنا چاہئے اسی کی ایک فرع یہ تھی کہ علماء بھی متبوع بالذات نہیں اسی کی ایک فرع یہ ہے کہ مشائخ بھی متبوع و مقصود بالذات نہیں۔

وصال نبویؐ کا دین پر اثر

اسی فرع کی بناء پر میں ان لوگوں کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں جو کسی شیخ سے مرید ہیں کہ ان کو ان کی موت کے وقت زیادہ از خود رفتہ اور حواس باختہ نہ ہونا چاہئے اور نہ یہ سمجھنا چاہئے کہ اب دینی فیض بند ہو جائے گا تم اپنے شیخ پر دین کا مدار نہ سمجھو کسی کی موت سے دین کا کام بند نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی نہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے دین میں کمی نہیں ہوئی تو اب اور کسی کے مرنے سے تو کیا کمی ہوگی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اگر دیکھا جائے تو دین کو زیادہ ترقی ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تو صرف جزیرۂ عرب ہی میں اسلام تھا اور آپ کے وصال کے بعد شرق و غرب جنوب و شمال میں ہر طرف اسلام پھیل گیا۔ جس کا ایک ظاہری سبب یہ ہے کہ آپ کی حیات تک تو سب مسلمان بے فکر تھے لوگ اپنے ذمہ کام کم سمجھتے تھے تنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت روحانی سے کام ہو رہا تھا اور آپ کے وصال کے بعد ہر شخص کو فکر ہو گیا ہر ایک کی قوت روحانیہ کام کرنے لگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی قوت وصال کے بعد بھی کام کر رہی ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات دوسروں کی سی وفات نہیں۔ اس کے لئے بعض اہل لطائف نے ایک آیت سے استیناس کیا ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو دوسروں کی وفات سے جدا بیان کیا ہے۔

غرض یہ مسئلہ مسلم ہے کہ انبیاء علیہم السلام بعد وفات کے بھی ایک خاص حیات کے ساتھ زندہ رہتے اور عالم کون میں روحانی تصرف فرماتے رہتے ہیں تو وفات نبوی سے حضور کی قوت روحانی کی فیض رسانی کم نہیں ہوئی اور ادھر سب مسلمانوں کی قوت رحانی بھی کام کرنے لگی تو اب ترقی زیادہ ہوئی۔ جب حضور کے وصال سے دین میں کمی نہیں آئی تو اب مریدوں کو اپنے مشائخ کی وفات پر رنج و غم میں زیادہ غلو نہ کرنا چاہئے۔ طبعی غم کا تو مضائقہ نہیں۔ مگر یہ نہ سمجھیں کہ اس کے بعد دین کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں انشاء اللہ دین کا کام قرب قیامت تک بخوبی چلتا رہے گا اور ہر زمانہ میں کوئی

نہ کوئی کامل ضرور رہے گا جو حق کا راستہ واضح کرے گا، اس لئے دین کا کام بند ہونے کی فکر نہ کریں۔

حقیقت پیر مُغاں

اور اسی فرع کی بناء پر اس پر بھی متنبہ کرتا ہوں کہ زمانہ حیات میں بھی اس کی تعظیم و اطاعت میں ایسا غلو نہ کریں جیسا عارف شیرازی کے اس شعر کی تفسیر میں غلو کیا گیا ہے ۔

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید　　　　که سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسمِ منزلہا

(امر مباح جو بظاہر طریقت کے خلاف ہونے سے منکر معلوم ہوتا ہے اگر مرشد بتلا دے تو اس پر عمل کرے کیونکہ شیخ کو اسکے نشیب و فراز کا زیادہ تجربہ ہے)

اس کا مطلب جہلاء صوفیہ نے یہ سمجھا ہے کہ اگر شیخ خلاف شریعت بھی امر کرے تو اس کے حکم کی تعمیل کرے یہ بالکل غلط ہے۔ عارف کی مراد یہ ہرگز نہیں جو بظاہر سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ ہے اور سجادہ وغیرہ ان کی خاص اصطلاح ہے مے سے طریق عشق مراد ہے اور سجادہ سے طریق عبادت وتکثیر نوافل۔ مطلب یہ ہے اگر شیخ تمہارے لئے طریق عشق تجویز کرے جس میں غلبہ حالات و کیفیات وشورش کی وجہ سے عبادات نافلہ کم ہوتی ہیں۔ اور تمہارا دل طریق تکثیر نوافل کو چاہے تو شیخ کے ارشاد پر چلو اور اپنی رائے اور تجویز کو چھوڑ دو کیونکہ وہ راستہ سے واقف ہے۔ جانتا ہے کہ تمہارے لئے کون سا طریق جلد کامیاب کرنے والا ہے۔ یہ مراد نہیں کہ شیخ شراب نوشی کا امر کرے تو شراب پینے لگو۔ کیونکہ یہ تو معصیت ہے اور معصیت کا مانع وصول ہونا اور سبب غضب حق ہونا منصوص ہے اس میں شیخ کی مشیخت کیا چل سکتی ہے۔

درجاتِ اتباع

نیز یہ مطلب بھی ہے کہ اگر شیخ تم کو کسی ایسی بات کا امر کرے جو تمہارے خیال میں بظاہر خلاف شرع ہے مگر اس کا خلاف شرع ہونا منصوص نہیں، نہ مصرح ہے بلکہ اس میں اجتہاد کی گنجائش ہے اور شیخ کامل متبع شریعت ہے تو ایسے اجتہادی مسائل میں بات بات پر شیخ سے بدظن نہ ہو بلکہ یوں سمجھو کہ گو ہم کو یہ امر خلاف شرع معلوم ہوتا ہے مگر شیخ خود بھی تو محقق اور متبع شریعت ہے اس کی فہم ہماری فہم سے عالی ہے اور مسئلہ اجتہادی ہے منصوص نہیں تو ممکن ہے اس کے نزدیک شرعاً اس میں گنجائش ہو مگر یہ صورت وہاں ہو سکتی ہے جہاں پہلے شیخ کا محقق ومتبع شریعت ہونا تجربہ اور جانچ سے اچھی طرح معلوم ہو چکا ہو۔

اسی لئے اہل طریق کی وصیت ہے کہ اول طلب شیخ میں پوری احتیاط لازم ہے پھر جب

تفتیش و تجربہ سے اس کا متبع شریعت و محقق ہونا ثابت ہو گیا تو اب اجتہادی مسائل میں بات بات پر اس سے بدظن نہ ہو۔ البتہ اگر بیعت کے بعد اس سے کوئی ایسی بات دیکھی جائے جو کہ صراحۃً خلاف شرع ہو۔ جس میں اجتہاد کی بالکل مجال نہ ہو تو اس کے متعلق تین قسم کا معاملہ کرنے والے لوگ ہیں۔ بعض تو اُس کو چھوڑ دیتے ہیں اور یہ خلاف اصول طریقت ہے اور بعض اس کے فعل میں بھی تاویل کر لیتے ہیں اور اگر وہ ان کو بھی اس فعل کا امر کرے تو اس کا ارتکاب بھی کر لیتے ہیں اور یہ خلافت طریقت بھی ہے اور خلاف شریعت بھی اور سب میں اچھا تیسری قسم کا معاملہ کرنے والا شخص ہے وہ یہ کہ اگر اس کو امر نہ کرے تو بدظن نہ ہو اور اس کے فعل میں یقیناً یا ابہاماً تاویل کرے اور اگر تاویل پر قدرت نہ ہو تو سمجھ لے کہ شیخ کے لئے عصمت لازم نہیں، آخر وہ بھی بشر ہے اور بشر سے کبھی غلطی ہو جانا ممکن ہے۔ اور اگر اس کو بھی امر کرے تو اتباع نہ کرے بلکہ ادب سے عذر کر دے اگر وہ اس عذر کو قبول کر لے اور پھر اس کو مجبور نہ کرے تو اس شیخ کو نہ چھوڑے اور اگر وہ اس عذر پر مرید سے خفا ہو جائے تو سمجھ لے کہ یہ شیخ کامل نہیں اس کو چھوڑ کر دوسرے کے یہاں چلا جائے اور اس دوسرے سے جا کر صاف کہہ دے کہ میں پہلے وہاں بیعت تھا اور اس وجہ سے الگ ہوا اگر وہ بھی یہ سن کر ناخوش ہو تو اس کو بھی چھوڑے اور اگر ناخوش نہ ہو تو اس سے تعلق پیدا کرے مگر اس حالت میں بھی پہلے شیخ کے ساتھ گستاخی نہ کرے کیونکہ اس طریق کا مدار ادب پر ہے۔ اور جب اس کو پہلے شیخ سے تعلق رہ چکا ہے اور اس کو طریق کا وسیلہ بنا چکا ہے تو طریق کا ادب یہ ہے کہ اس کے ادب کا ہمیشہ لحاظ رکھے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

طرق العشق کلھا اداب ادبوا النفس ایھا الاصحاب

(عشق کے کل طریق آداب ہیں صاحبو نفس کو ادب کا خوگر بناؤ)

اور اگر کوئی شیخ اس کو قبول نہ کرے یا اور کوئی شیخ ہی نہ ملے تو اب اس کو چاہئے کہ قرابا دین طریق کا مطالعہ کرے جیسے اکسیر ہدایت اور احیاء العلوم وغیرہ وغیرہ اور بزرگان سلف کے تذکرے اور ملفوظات کا مطالعہ کرے اور ان کو دیکھ کر عمل شروع کرے انشاء اللہ تعالیٰ محروم نہ رہے گا۔

ارضاتِ شیخ

غرض مشائخ کی تعظیم و اطاعت میں ایسا غلو کرنا کہ وہ خلاف شرع بات کا حکم کریں۔ جب بھی ان کی اطاعت کی جائے یہ بھی ارضائے خلق میں داخل ہے جس کی مذمت حق تعالیٰ نے اس آیت میں فرمائی ہے اور خوب سمجھ لو میں جو ارضاءِ خلق سے منع کر رہا ہوں اس سے مراد وہی ہے جو

ارضاءِ حق کے معارض ہو اور جو معارض نہ ہو بلکہ ارضاءِ حق میں معین ہو وہ مراد نہیں پس اگر ارضاءِ حق کے لئے شیخ کو راضی کیا جائے تو یہ عین توحید ہے اور مذموم نہیں بلکہ ایک درجہ میں مطلوب ہے کیونکہ طریق باطن بغیر رفیق کے طے نہیں ہو سکتا اور اس کا رفیق شیخ ہی ہے فریدؒ عطار فرماتے ہیں ؎

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق　　　عمر بگذشت و نہ شد آگاہ عشق

بغیر مرشد کے جس نے طریق میں قدم رکھا ہے اس نے عمر ضائع کی اور عشق سے آگاہ نہ ہوا۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

یار باید راہ راتنہا مرد　　　بے قلاؤ زاندریں صحرا مَرَؤ

راہ سلوک میں یار (رہنما مرشد) چاہیے اس میں تنہا قدم نہ رکھو بلاء رہنما (مرشد) کے وادی عشق میں نہ چلو۔

آگے مولانا ایک شبہ کا جواب بطور دفع دخل مقدر کے دیتے ہیں۔ شبہ یہ ہے کہ بعض اویسی النسبت ہوتے ہیں جن کے لئے ظاہر میں کوئی شیخ نہیں ہوتا تو وہ تنہا کیونکر واصل ہو گئے۔

فرماتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں راہ را برید　　　ہم بعون ہمت مرداں رسید

اتفاقاً جس شخص نے تنہا اس راہ سلوک کو قطع کیا ہے وہ بھی مردان خدا کی توجیہ سے کیا ہے۔

ایک جواب تو لفظ نادر میں دیدیا کہ ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔ اور نادر پر حکم نہیں لگایا جا سکتا نہ قاعدہ اکثر یہ ایسے نادرات سے منقوض ہو سکتا ہے دوسرے یہ کہ وہ بھی تنہا نہیں پہنچے بلکہ کسی مردِ طریق کی ہمت سے پہنچے ہیں، گو تمہیں اس کی خبر نہ ہو مگر کسی کامل کی ان پر نظر ضرور پڑی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ ان کا کوئی شیخ نہیں حالانکہ باطن میں ان پر کسی شیخ کی نظر ہے۔ غرض بدوں شیخ کے اس راستہ میں کام نہیں چل سکتا حتیٰ کہ اگر کوئی مرید شیخ سے بھی بڑھ جائے تو وہ بھی شیخ ہی کی برکت سے بڑھا ہے اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک مرغی کے نیچے قاز اور بطخ کے انڈے رکھ دیئے جائیں تو گو بچہ نکلنے کے بعد قاز اور بطخ مرغی سے بڑی اور قوی سیر فی الہوا و فی الماء پر قادر ہو گی مگر اس کی یہ ترقی مرغی ہی کی بدولت ہے اور جیسے بعض لوگ پودے سے ہوتے ہیں اور ان کے بیٹے لمبے تڑنگے مضبوط بہادر ہوتے ہیں تو کیا ان کے وجود میں اس پودے سے باپ کو دخل نہ ہوگا؟ غرض جو کچھ ہے شیخ کی برکت سے ہے اس لئے اس کا ارضاء جب کہ ارضاء حق کے معارض نہ ہو مقصود طریق ہے۔ مگر اس کو راضی کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو مکدر کرنے سے بچے اور اس کے دل کو میلا نہ کرے۔ اگر وہ خدمت سے راضی ہو تو خدمت کرے اور خدمت نہ کرنے سے راضی ہو تو خدمت نہ کرے۔

ارضاءِ مسلم

اس طرح پر شیخ کا راضی کرنا عین ارضاء حق ہے بلکہ شیخ ہی کی کیا تخصیص ہے ہر مسلم کی ارضاء عین ارضاءِ حق ہے۔ حدیث میں ہے۔

تطییب قلب مومن کی جا بجا تاکید ہے اور اسی لئے تھا **دوا تحابوا** (الصحیح للبخاری 3:178، الصحیح لمسلم کتاب الایمان باب 24 رقم :100، سنن أبی داوٗد:4689، سنن الترمذی:2625، سنن النسائی 8:64) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ باہم ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو۔ اس سے محبت باہم پیدا ہوگی۔ اور اس سے محبت پیدا ہونے کا راز وہی ہے کہ ہدیہ سے تطییب قلب ہوتی ہے جو محبت کی طرف مفضی ہوجاتی ہے۔

اس مقام پر مجھے ایک مسئلہ یاد آیا جس میں مجھ کو بہت شبہ تھا وہ یہ کہ بعض لوگ قاریوں سے قرآن سنانے کی فرمائش کرتے ہیں اور اس پر قراء خوب بنا بنا کر قرآن پڑھتے ہیں کہ ویسا خود اپنی تلاوت کے وقت نہیں پڑھتے تھے مجھے شبہ تھا کہ یہ تو ریاء ہوئی مگر الحمدللہ کئی سال کے بعد ایک حدیث سے اشکال حل ہوا۔

حدیث[1] میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے فرمایا کہ رات ہم نے تمہارا قرآن سنا تو اللہ تعالیٰ نے تم کو صوت داؤدی سے حصہ دیا ہے۔ اس پر حضرت ابوموسیٰ نے عرض کیا۔

لو علمت بک یَا رسول اللّٰہ لحبرته لک تحبیرا

یَا رسول الله! اگر مجھے یہ خبر ہوتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سُن رہے ہیں تو میں اور زیادہ بنا بنا کر پڑھتا۔

اس جواب پر حضورؐ نے انکار نہیں فرمایا جو کہ تقریر سکوتی ہے تو اگر کسی شخص کے لئے بنا سنوار کر قرآن پڑھنا مطلقاً ریاء میں داخل ہوتا تو حضرت ابوموسیٰ کی یہ تحبیر بھی ریاء میں داخل ہوتی اور ریاء حرام ہے۔ گو حضورؐ ہی کے دکھلانے کے واسطے ہو کیونکہ ریاء حضورؐ کے سامنے بھی حرام ہے کسی قاعدہ سے یہ تخصیص نہیں معلوم ہوتی کہ حضورؐ کے دکھلانے کے واسطے کام کرنا جائز ہے اور وہ ریاء نہیں بہرحال یہ تحبیر بھی ناجائز ہوتی حالانکہ حضورؐ کا انکار نہ فرمانا اس کے جواز کو ظاہر کر رہا ہے تو یہی کہنا پڑے گا کہ یہاں اس تحبیر سے حضورؐ کو دکھلانا بالذات مقصود نہیں بلکہ حضورؐ کے سنانے سے مقصود آپ کی تطییب قلب کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کو راضی کرنا تھا۔

اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص آئینہ میں سے محبوب کا جمال دیکھے تو مقصود آئینہ

---

[1] مسند أحمد 3:177، کنز العمال:70

نہیں ہے بلکہ اس واسطہ سے رویت جمال محبوب مقصود ہے پس اسی طرح اگر قراء اس نیت سے بنا سنوار کر قرآن سنائیں کہ اس سے لوگوں کا دل خوش ہوگا اور مسلمان کا جی خوش کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب ہے تو یہ ریاء میں داخل نہیں بلکہ طاعت ہے تو جب ہر مسلمان کا راضی کرنا عین ارضاءِ حق ہے تو شیخ کا تو بہت زیادہ حق ہے۔

ارضاء بوجۂ اندیشۂ ضرر

فائدہ دوم:۔ ایک بات یہ بھی معلوم کرنے کی ہے کہ ارضاء خلق کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی شخص کو کسی سے اندیشۂ ضرر کا ہو اس لئے اس کو راضی کرنے کی فکر کرے تو یہ حقیقت میں ارضاء نہیں بلکہ تحرز عن ضرر عدم الارضاء ہے جو بوجہ اندیشۂ مضرت کے اختیار کیا گیا ہے۔ تو یہ جائز ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ ارضاء و عدم ارضاء کے درمیان میں ایک واسطہ بھی ہے یہ تقسیم حاصر نہیں ایک صورت ایسی بھی نکل سکتی ہے جو نہ ارضاء خلق میں داخل ہے نہ عدم ارضاء میں بلکہ تحرز عن عدم الارضاء میں داخل ہے جس کو صورۃً کوئی ارضاء کہہ سکتا ہے مگر حقیقت کے لحاظ سے وہ ارضاء میں داخل نہیں کیونکہ ارضاء مقصود نہیں اور منافقین جو حضرات صحابہ کے راضی کرنے کی فکر کرتے تھے ان کا مقصود تحرز عن عدم الارضاء بھی نہ تھا۔ کیونکہ صحابہ کی طرف سے ان کو کچھ مضرت پہنچنے کا اندیشہ تھوڑا ہی تھا کیونکہ اگر وہ کفر ظاہر کرتے اور قتل و غارت ہوتے تو یہ ضرر اپنے کفر سے خود ہی وہ اپنے کو پہنچاتے۔

اتحاد ارضائین

الغرض! ارضاء خلق دنیوی ناجائز غرض سے ممنوع ہے جیسے منافقین کی ناجائز ہی اغراض تھیں اور اگر غرض دنیوی مباح ہو تو وہ ناجائز نہیں مثلاً جواز سوال کے موقع پر۔ یا کسی جائز نوکری کی توقع پر کسی غنی کو سلام کرنا یہ مذموم ارضاء خلق میں داخل نہیں۔ اور اگر کسی مخلوق کو ارضاء حق کے لئے راضی کیا جائے وہ تو ارضاء حق ہی ہے اسی لئے آیت میں **وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ** (اللہ اور اُس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو راضی کیا جائے) فرمایا ہے۔ **وَاللّٰهُ وَ مُحَمَّدٌ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ** (اللہ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو راضی کیا جائے) نہیں فرمایا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں دو جہتیں ہیں ایک نسبت مع اللہ ایک خصوصیت ذات اور مقصود فی الدین آپ کا راضی کرنا بحیثیت رسالت ہے نہ بلحاظ ذات گو یہ ارضاء بہ لحاظ نسبت رسالت کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ بھی محبت کو مستلزم ہوگا اور اس وقت آپ کی ذات من حیث ہی کے ارضاء کو بھی دل چاہے گا۔ مگر واسطہ اس ثانی کا بھی وہ اوّل ہی

ہے۔غرض بہ لحاظ نسبت رسالت کے آپ کا ارضاء عین ارضاء حق ہے اور اسی
عینیت رضائین بناءً علی اعتبار النسبة (اعتبار نسبت کے اعتبار سے ہر دونوں رضا کی عینیت ہے)
یُرْضُوْهُ میں ضمیر واحد کی لائی گئی ہے جو راجع ہے حق تعالیٰ کی طرف اور یہاں عین سے
مراد معنی فلسفی نہیں جس میں اتحاد من کل وجہ کا تحقق مثل انسان وحیوان ناطق کے شرط ہے بلکہ یہ
صوفیہ کی خاص اصطلاح ہے ان کے نزدیک حق کا عین وہ ہے جس کو وصول الی الحق میں دخل ہو
اور غیر وہ ہے جو وصول الی الحق میں مخل ہو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

اصلا حائیست مرابدال را (ابدال کی خاص اصطلاحات ہیں)

اب لوگ ان اصطلاحات کو تو جانتے نہیں اور بزرگوں کے اقوال کو غیر محمل پر حمل کر کے
اپنا اور مخلوق کا دین برباد کرتے ہیں۔

حقائق ابنِ عربیؒ ومغربیؒ

اسی لئے ابن عربیؒ پر کفر کے فتوے لگائے گئے کیونکہ ان کی اصطلاحات کو خلاف مقصود
پر حمل کیا گیا حالانکہ وہ خود فرماتے ہیں :یحرم النظر فی کتبنا علی من لم یعرف ما
خذنا۔(اس شخص کو ہماری کتابیں دیکھنا حرام ہے جو ہمارے مآخذ سے ناآشنا ہے)
مگر اب یہ لوگ ان کی عبادت کا مطلب خود ہی بیان کرتے اور خود ہی اُن پر فتوے لگاتے
ہیں۔اسی طرح ان کے مقابل دوسرے لوگ بڑا ظلم کرتے ہیں جو مغربیؒ کے ان اشعار کو ؎

زدریا موج گوناگوں برآمد زبیچونی برنگ چوں برآمد
(دریا سے طرح طرح کی موجیں نکلیں بے مانند سے مآخذ کے رنگ میں نکلیں)

قوالی اور سماع میں پڑھ دیتے ہیں اور مخلوق کا ایمان تباہ کرتے ہیں کیونکہ وہ لوگ اس کا مطلب یہ
سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ واجب اور ممکنات کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے دریا اصل میں ایک شئے واحد بالشخص
ہے۔ پھر اس میں موجیں اٹھتی ہیں تو ایک حصہ کو دوسرے سے افتراق وامتیاز ہو جاتا ہے مگر مادہ مشترک رہتا
ہے۔یا اُسی پانی کو مختلف برتنوں میں بھر لیا جائے تو تغائر معلوم ہوتا ہے مگر مادہ مشترک رہتا ہے۔
اسی طرح یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ حق تعالیٰ مخلوق متحد بالحقیقۃ ہیں اور یہ افتراق وکثرت
محض عوارض کی وجہ سے ہے حالانکہ مغربی کا یہ مقصود ہرگز نہیں کیونکہ عقیدۂ حلول واتحاد کفر ہے اور
عارف اس سے منزہ ہیں مگر جہال اس کا یہی مطلب سمجھتے ہیں۔مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

ہر چہ گیرد علتی علت شود (علتی جو کچھ لیتا ہے وہ علت ہی ہوتا ہے)

اوران کے حقائق کے متعلق فرماتے ہیں ۔

نکتہ ہاچوں تیغ پولادست تیز　　چوں نہ داری تو سپروا پس گریز
پیش ایں الماس بے اسپر میا　　کز بریدن تیغ رانبود حیا

بہت سے باریک مضامین تیغ فولادی کی طرح تیز ہوتے ہیں اگر تیرے پاس میرا (فہم) نہ ہوتو پیچھے ہٹنا چاہئے اس تیغ ابدار (مسائل دقیقہ) کے روبرو بغیر سپر (فہم) نہ آنا چاہئے کیونکہ تلوار کاٹنے سے نہیں شرماتی (اس طرح مضامین جب غلط ذہن میں آجائیں تو ایمان کو تباہ کردیتے ہیں)

مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو فہم سلیم حاصل نہیں اور تم ان حقائق کو نہیں جانتے تو ایسے اقوال کا مطالعہ و نقل نہ کرو اور ایک مقام پر ان لوگوں کو بہت برا بھلا کہا ہے جو ایسے اقوال کو نااہلوں کے سامنے نقل کرنے اور ان کا غلط مطلب بیان کرتے ہیں ۔

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند　　از سخنہا عالمے راسو ختند

(بڑے ظالم تھے جنہوں نے آنکھیں بند کر کے ایسی باتوں سے ایک عالم کو ویران کردیا ان ظالموں سے مراد فرقہ باطلہ ہیں)

بہت لوگ رسول کو عین حق اسی معنی کر سمجھتے ہیں جو فلاسفہ کے نزدیک معنی عین کے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ حضور احد بصورت احمد ہیں۔ استغفراللہ یہ لوگ حضور کا ادب اور تعظیم اس کو سمجھتے ہیں کہ خدا اور رسول دونوں کو گڈ مڈ کر کے ایک سمجھیں مگر اس طرح اگر حضور کی تعظیم کی تو کیا کی اور اس بناء پر اتباع کیا تو کیا کمال کیا۔ اور اس اتباع میں کیا خاک مجاہدہ ہوا۔

اِطاعتِ بشر

اس طرح تو رسول کی اطاعت کچھ بھی دشوار نہیں کیونکہ یہ تو خدا کی اطاعت ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حق تعالیٰ کو تم نے ایک سمجھ لیا تو یوں کہو کہ تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت و تعظیم کرتے ہو۔ حضور کی کچھ بھی نہیں کرتے تو کمال تو یہ ہے اور یہی بڑا مجاہدہ ہے کہ رسول کو بشر سمجھ کر پھر آپ کی اطاعت و تعظیم کی جائے۔ کیونکہ اس صورت میں حضور ہمارے ہم جنس ہیں اور ہم جنس کی اطاعت بہت دشوار ہے۔ یہی بشریت تو وہ چیز ہے جو ابوجہل وابولہب اور کفار سابقین کو انبیاء کی اطاعت سے روکتی تھی وہ کہتے تھے۔

مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا: کہ تم تو ہمارے ہی جیسے بشر ہو۔ پھر ہم تمہاری اطاعت کیوں کریں اس کے جواب میں انبیاء علیہم السلام نے اپنی بشیرت کی نفی نہیں کی بلکہ اس کا اثبات کے پھر جواب دیا ہے فرماتے ہیں:

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ ۔

کہ واقعی ہم تمہارے ہی جیسے بشر ہیں لیکن حق تعالیٰ نے ہمارے اوپر ایک احسان کیا ہے کہ ہم کو وحی و نبوت سے سرفراز فرمایا۔ سو ایک طرف تو یہ جماعت تھی جو بشریت کی وجہ سے انبیاء کی منکر تھی۔ اور دوسری طرف وہ جماعت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر سمجھتے ہیں اور بشر سمجھ کر آپ کی ایسی اطاعت کرتے ہیں کہ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گراتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلوؤں سے اپنی آنکھیں ملتے ہیں۔ اپنے باپ ماں اور آبرو کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا کرتے ہیں۔ حضرت حسان فرماتے ہیں ؎

فان ابی ووالدی و عرضی بعرض محمد منکم وقاء

(بلاشبہ میرا باپ میری ماں اور میری آبرو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو پر تم سے بچاؤ ہے)

عورتوں کی یہ کیفیت تھی کہ جب حضرت جہاد سے واپس تشریف لاتے تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت سُن کر اپنے مردوں اور بچوں اور باپ بھائیوں کے قتل سے بھی بے فکر ہو جاتی تھیں اور کہتیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سلامت رہیں چاہے سب فنا ہو جائیں۔

صاحبو! حضور گو بشر تھے مگر بشریت کے ساتھ آپ میں کشش ایسی تھی کہ ایسے ایسے سرکش عربوں کے سر نیچے کرا دیئے جو تلوار و تفنگ کے سامنے بھی سر نیچا نہیں کرتے تھے اور وہ کشش ان کمالات کی وجہ سے تھی جو حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائے تھے۔ کوئی ظاہری ثروت وغیرہ اس کا سبب نہ تھی کیونکہ حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے گھر میں پیدا کیا تھا جہاں نہ ثروت تھی۔ نہ مال و دولت تھا، نہ زمینداری تھی، ہاں یہ ضرور ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو ایک شریف اور عالی خاندان میں پیدا کیا۔ جس میں مذاق مکلفین کی رعایت اور ان کی مصلحت پر نظر تھی کیونکہ عرب نیچے کے خاندان والے کی اطاعت نہیں کرتے تھے ورنہ کمالاتِ نبوت کے لئے فی نفسہٖ اس کی بھی ضرورت نہ تھی ؎

ز عشق نا تمام ما جمال یار مستغنی است ۔۔۔ بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

(جمال محبوب ہمارے عشق و عرفان ناقص سے بے پرواہ ہے جس طرح زیبا صورت کو رنگ و روپ اور خط و خال کی احتیاج نہیں ہے)

کیونکہ شرافت نسب ایسی چیز نہیں جس پر مدار ولایت و نبوت ہو جیسا کہ عام لوگ اس میں غلو کرتے ہیں۔ غرض تمام کمالات جتنے بشر کے لئے ممکن ہیں آپ میں سب ہی موجود تھے مگر بایں ہمہ

بشریت بھی تھی اب اس اعتقاد کے ساتھ جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے وہ بڑا مجاہد ہے۔

ذکرِ رسول سے امتحان

اور یہیں سے ایک اشکال کا حل ہو گیا وہ یہ کہ درود شریف طاعتِ مقصودہ ہے۔ حالانکہ وہ ذکر اللہ کی فرد نہیں بلکہ ذکر رسول کی فرد ہے اور ذکر رسول کا طاعت مقصود ہونا بظاہر خلاف ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ درود شریف کو طاعت مقصودہ بنانے سے مجاہدہ عظیمہ سے بندوں کا امتحان کرنا مقصود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا بڑا اور معظم بھی سمجھو کہ آپ کے ذکر میں مشغول رہو مگر اس کے ساتھ ہی ان کو ہمارا بندہ اور محتاج بھی سمجھو میں اس جواب کو زیادہ مفصل نہیں کرسکتا یہ ذوقی علم ہے جس کا وجدان قلب میں بہت زیادہ ہے مگر زبان سے میں اس ذوق کو پوری طرح واضح نہیں کرسکتا۔ (نشر الطیب میں اس سے کچھ زیادہ مبسوط تقریر ہے)

الغرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارضاء اس حیثیت سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہیں عین ارضا حق ہے اور اسی حیثیت سے شیخ کا ارضاء بھی عین ارضا حق ہے کیونکہ رسول نائب حق ہے اور شیخ نائب رسول ہے، شیخ کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت حق تعالیٰ کی اطاعت ہے ایسے ہی ارضاء شیخ ارضاء الرسول ہے اور ارضاء رسول ارضاء حق ہے مگر اسی حیثیت کے ساتھ جب کہ ان کو راضی کرنے سے خدا تعالیٰ کو راضی کرنا مقصود ہو۔

غرض مباح کے لئے ارضاء

فائدہ سوم: اَحَقُّ افعل التفضیل کا صیغہ بتلا رہا ہے کہ موخر درجہ میں ارضاء خلق بھی ماذون فیہ ہے وہ جبکہ نہ موصل الی ارضاء الحق ہو کیونکہ وہ تو عین ارضاء حق ہے اور نہ مانع و منافی ہو کیونکہ وہ لِیُرْضُوْکُمْ میں محل وعید ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ غرض مباح کے لئے ارضاء خلق سے مذموم نہیں اب میں ختم کرتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا مذموم کے لئے کسی کو راضی نہ کرو بس خدا کو راضی کرنے کا فکر کرو اور جس کو بھی راضی کرو اسی کے لئے راضی کرو۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنی رضاء کی توفیق عطا فرمائیں۔ اور مرضیات پر عمل نصیب ہو۔

(اٰمین ثم اٰمین)

وَ صَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِہٖ
وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
تَمَّ بِحَمْدِاللّٰہِ الَّذِیْ وَجَلَالہ و عزتہ تتم الصّٰلِحٰتِ۔

اِرضاءالحق

(حصہ دوم)

۱۵ ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ کو مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں جمعرات کے روز صبح کے وقت عبداللطیف صاحب مدرس اول مظاہر العلوم سہارنپور کی درخواست پر بیان ہوا۔ جو پانچ گھنٹے تک جاری رہا۔ سامعین کی تعداد تقریباً چالیس (۴۰) تھی۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلَّمْ. **اَمَّا بَعْدُ** اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَکُمْ لِیُرْضُوْکُمْ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْہُ اِنْ کَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ

یہ منافقین تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں تا کہ تم کو راضی کرلیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو راضی کیا جائے۔ (التوبہ آیت:۶۲)

عملِ قبیح

یہ ایک آیت ہے جس میں منافقین کے ایک عمل کا ذکر ہے جس پر ان کو ملامت و تشنیع ہے اور ظاہر ہے کہ وہ عمل قبیح ہوگا اس لئے تو ملامت و تشنیع کی گئی ہے، اس وقت اس کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ اس عمل کو دیکھا جائے کہ ہم میں تو اس کا شائبہ نہیں۔ اگر ہو تو اس کی اصلاح کی جائے۔ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ہم میں اور ان میں کیا نسبت وہ منافق ہیں اور ہم مومن ہیں، پھر جو مضمون کافروں و منافقوں کے متعلق ہے وہ ہم کو کیوں سنایا جاتا ہے جواب یہ ہے اگر ہم میں اس عمل کا شائبہ ہوگا تو ہم منافقوں سے زیادہ ملامت کے مستحق ہوں گے۔ کیونکہ ہم بہ نسبت اُن کے زیادہ مکلّف ہیں وہ تو صرف ایمان کے مکلّف ہیں فروع کے مکلّف نہیں اور ہم فروع کے بھی مکلّف ہیں تو ہم میں اگر منافقین کے عمل کا شائبہ ہوا تو ہم اس وجہ خاص سے زیادہ ملازمت و تشنیع کے مستحق ہوں گے۔

ہاں ایک شبہ اور ہوسکتا ہے وہ یہ کہ اگر ہم منافقوں کا سا کوئی عمل کریں تو ہم میں وہ عمل اس درجہ کا نہ ہوگا۔ جس درجہ کا منافقین میں ہوگا کیونکہ اُن کے عمل کی بناء نفاق و کفر ہوگی اور ہمارے عمل کی یہ بناء نہ ہوگی۔ مثلاً ترک صلوٰۃ کی بناء پر منافقین میں نفاق و کفر ہے کہ وہ فرضیت

صلوٰۃ ہی کے منکر ہیں اور کوئی مسلمان نماز نہ پڑھے تو اس کے عمل کا منشاء کفر نہ ہوگا۔ اس کی بناء کسی عقیدہ فاسدہ پر نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا منشا مومن میں صرف کسل ہوگا یا اس کے مثل اور کوئی وجہ ہوگی۔ مگر اس فرق کا حاصل یہ ہوا کہ آپ کو اس حیثیت خاصہ سے تشنیع اُس درجہ کی نہ ہوگی جس درجہ کی منافقین کو ہے مگر تشنیع ضرور ہوگی کیونکہ وہ عمل تو منافقوں کا ہے جو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ اور کسی دلیل سے یہ بات ثابت نہیں کہ مبنی اس کے قبح کا صرف کفر و نفاق ہے بلکہ دلیل سے اس کے خلاف ثابت ہے یعنی دوسرے دلائل سے خود اس عمل کا فی نفسہٖ بھی قبح ثابت ہے اور منافقین کا شعار ہونے سے ایک قبح تشبہ بالمنافقین کا اس میں اور بڑھ جائے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس عمل کے ساتھ انضمام عقیدہ فاسدہ سے قبح اور زیادہ ہو جائے گا اور عقیدہ فاسدہ کا انضمام نہ ہو تو اُس درجہ کا قبح نہ ہوگا مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ قبح ہو ہی نہیں۔ بہر حال ایک توجیہ میں تو مسلمان سے اس عمل کا صدور (جس کا یہاں ذکر ہے) اشد ہوگا اور دوسری توجیہ کا مقتضا یہ ہے کہ اشد نہ ہو۔ مگر مجموعہ کا حاصل یہی ہے کہ وہ عمل تشنیع کے قابل ضرور ہے اور اسی کے قریب قریب ہے یعنی عمل کافر کے کہ مجموعہ میں بھی تفاوت ہوگا۔ مگر دونوں قریب قریب ضرور ہیں اور قرب کی کوئی حد نہیں۔

مقتضائے محبت

پھر محبت کا مقتضاء یہ ہے کہ ناراضی محبوب کی حد دریافت نہ کی جائے عاشق کبھی یہ نہیں پوچھتا کہ اس عمل سے محبوب کتنا ناراض ہوگا اور وہ کبھی یہ قصد نہیں کرسکتا۔ کہ اگر تھوڑی سی ناراضی ہو زیادہ نہ ہو تو میں اس عمل کو کرلوں گا۔ بلکہ محبت کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ اگر ناراضی بھی نہ ہو صرف اتنی بات ہو جائے کہ پہلا سا برتاؤ نہ رہے۔ لطف وعنایت میں کچھ کمی ہو جائے تو وہ اس کا بھی تحمل نہیں کرسکتا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا واقعہ افک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برتاؤں کو یوں ہی بیان فرماتی ہیں کہ مجھ کو یہ بات بہت قلق و اضطراب میں ڈال رہی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا میرے ساتھ پہلا سا برتاؤ نہیں پہلا سا لطف نہیں۔ حضرت عائشہؓ کو ناراضی کا یا عدم لطف کا شبہ نہ تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ بار بار اُن کی مزاج پُرسی فرماتے تھے گھر والوں سے پوچھتے تھے کیف تیکم (الصحیح للبخاری 13:1، الصحیح لمسلم کتاب الایمان32، سنن الترمذی :2606) کہ عائشہؓ کا مزاج اب کیسا ہے مگر اُن کی قلت لطف کا شبہ تھا اور اسی سے ان کی جان نکلتی تھی۔

حکمتِ قبض

اسی طرح سالکین کو جو اہل محبت ہیں بعض دفعہ آثار سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ حضرت حق کا

ہمارے ساتھ پہلا سا لطف نہیں تو اُن کے اوپر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔

بر دل سالک ہزاراں غم بود　　گر نہ باغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم وارد ہوتے ہیں اگر قلبی حالت میں کچھ بھی کمی پاتا ہے)

حالانکہ وہ آثار عدم رضا عدم لطف کی علامت خاصہ نہیں ہیں کیونکہ سالکین کو محض قبض سے اس کا شبہ ہوتا ہے اور قبض کا سبب صرف عدم رضائے حق نہیں بلکہ بعض دفعہ حکمتوں کی وجہ سے قبض طاری کیا جاتا ہے سالک کی اصلاح کے لئے یا سنبھالنے کے لئے بسط کو سلب کرلیا جاتا ہے۔ مگر اس کی یہ حالت ہے کہ مرا جاتا ہے کیونکہ بچہ یہ سمجھتا ہے کہ ماں دودھ پلانے کے وقت تو مجھ پر مہربان ہے اور حجامت کے وقت دشمن ہے۔ خصوصاً حجامت عربیہ کے وقت یعنی پچھنے لگوانے میں، کیونکہ عربی میں پچھنے لگانے کو بھی حجامت کہتے ہیں، سر مونڈنے کو نہیں کہتے تو پچھنے لگوانے میں یا ختنہ کرانے کے وقت تو بچہ یہ سمجھتا ہے کہ ماں باپ سے زیادہ میرا کوئی دشمن نہیں کہ زندہ کھال پر چھریاں لگوا رہے ہیں، مگر حقیقت میں وہ عین لطف ہے۔

طفل می لرزد زنیش احتجام　　مادر مشفق ازآں غم شاد کام

(بچہ جراح کے نشتر لگانے سے ڈرتا ہے شفیق ماں اس سے خوش ہوتی ہے کہ اب اس کو آرام ہوجائیگا)

سب جانتے ہیں کہ یہ علامت عدم رضا ہرگز نہیں کیونکہ ایک حکمت کے لئے ماں باپ نے ایسا کیا ہے جس کا نفع بچہ ہی کو پہنچے گا مگر وہ نفع سے بے خبر ہے حکمت سے ناواقف ہے۔ اس لئے ناخوش ورنجیدہ ہوتا ہے۔

اسی طرح حق تعالیٰ بعض دفعہ آئندہ کے انتظام واصلاح کے لئے سالک پر قبض وارد کرتے ہیں تاکہ عجب وکبر میں مبتلا نہ ہو۔ پس قبض ایسا اثر نہیں جس سے ناراضی یا عدم لطف کا یقین حاصل ہوجائے بلکہ ایسا اثر ہے جو لطف کے ساتھ بھی جمع ہوتا ہے۔ مگر جن کو پیش آتا ہے ان سے پوچھئے کہ اس وقت ان کی جان پر کیسی بنتی ہے اور کیسی گھٹن ہوتی ہے۔ بعض نے تو اس حالت میں خودکشی کرلی ہے محض اس لئے کہ پہلا سا برتاؤ پہلا سا لطف ان کے خیال میں نہ رہا تھا تو جب محبت کا مقتضاء یہ ہے کہ قلت لطف کا بھی تحمل نہیں ہوسکتا تو ناراضی کا تحمل محبت سے کیونکر ہوسکتا ہے۔ چاہے ناراضی قلیل ہی ہو۔

معنئے رضاء وعدم رضاء

اب مجھے تعجب ہوتا ہے اس سوال پر کہ کیا یہ گناہ بہت بڑا گناہ ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ چھوٹا گناہ ہو تو کرلیں گے۔

ارے ظالمو! کیا تم اپنے چھپر میں دیا سلائی لگا سکتے ہو؟ اور اگر کوئی یہ کہے کہ یہ تو ذرا سی دیا سلائی ہے کوئی بڑا انگارا تو نہیں۔ اُس کو اجازت دے سکتے ہو۔ کہ تمہارے چھپر میں دیا سلائی رکھ دے۔ ہرگز نہیں کوئی اس کو گوارا نہیں کرسکتا۔ اور ایک دیا سلائی سے بھی کوئی بے فکر نہیں

ہے۔ ابھی ایک خط میں خبر آئی ہے کہ ایک معمولی چنگاری سے ساری بستی جل گئی تو کیا خدا کی ناراضی ایک چنگاری سے بھی کم ہے۔ جو اس سے اتنی بے فکری ہے۔

صاحبو! ناراضی حق بہت سخت چیز ہے جیسے رضاء الٰہی کے بارے میں ارشاد ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ (اور اللہ تعالیٰ کی رضا بہت بڑی چیز ہے)

ایسے ہی اُس کی ناراضگی کی بھی یہی حالت ہے کہ **سخطة من اللّٰہ اکبر واھول** (اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سخت اور ہولناک چیز ہے) عارف فرماتے ہیں ؎

از فراق تلخ می گوئی سخن — ہر چہ خواہی کن ولیکن ایں مکن

(جدائی کی تلخ باتیں مت کرو جو کچھ کرو مگر یہ جدائی اختیار مت کرو) اور فرماتے ہیں ؎

شنیدہ ام سخنِ خوش کہ پیر کنعاں گفت — فراق یار نہ آں می کند کہ بتواں گفت

حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظِ شہر — کنا تیست کہ از روزگارِ ہجرات گفت[1]

(میں نے سنا کہ پیر کنعاں نے اچھی بات کہی کہ محبوب کی جدائی ایسا اثر کرتی ہے جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا واعظ شہر نے قیامت کے ہولناک اور دہشتناک حالات کا جو بیان کیا ہے اس کو زمانہ ہجر کا ایک کنایہ کہنا چاہئے)

اور حق تعالیٰ کا فراق یہی ناراضی تو ہے اور ان کا وصال رضا ہی تو ہے وصال کے یہ معنی تو نہیں کہ وہ نعوذ اللہ کسی کو گود میں لے لیتے ہیں، وہاں تماس و اتصال کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ واجب و ممکن میں تو اس قدر بعد ہے کہ معتزلہ تو رویت الٰہیہ کو بھی ممکن نہ کہہ سکے کیونکہ اُن کی عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ ممکن واجب کو کس طرح دیکھے گا اور سمجھے تو ہم بھی نہیں مگر نصوص ناطقہ کی وجہ سے اس کے قائل ہیں کہ رؤیت ضرور ہوگی باقی یہ نہیں کہہ سکتے کہ کیونکر ہوگی کس طرح ہوگی یعنی کیف معلوم نہیں۔

اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ کیف ہے اور مجہول ہے، جس سے یہ لازم آئے کہ مجہول الکیف رویت ہوگی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہاں کیف ہی نہیں کیونکہ حق تعالیٰ کیف سے منزّہ ہیں۔ کیف مقولات ممکن سے ہے۔ پس حقیقت میں وہ رویت معدوم الکیف ہے، جس کو کبھی مجہول الکیف سے تعبیر کردیتے ہیں۔

بعض صوفیہ نے معتزلہ کے استبعاد کا ایک جواب دیا ہے کہ تجلی ذات حق تو فی نفسہٖ کیف اور جہت سے مقید نہ ہوگی۔ مگر رائی کو مکیف اور ذو جہت ہو کر مرئی ہوگی اور یہ کیف و جہت کا وجود مرئی میں نہ ہوگا،

---

[1] قدورد فی الصحیح فیقول ادم ان ربّیٰ قد غضب الیوم غضباً لَمْ یغضب قبلہ مثلہ و لن یغضب بعدہٗ مثلہٗ و انہ نہا نی عن الشجرۃ فعصیۃ نفسی نفسی اذھبوا الی غیری اذھبوا الی نوح فیجیب نوح و کذالک و ابراھیم کذالک و موسیٰ کذالک و عیسیٰ کذالک الاانہ لا یذکر لہ دنیا۔ اخرجہ مسلم ص ۱۱۱ ج ۱ مطولاً فھذا ای غضب الرب جل و علا ھو القیمۃ و ھو الطابۃ الکبری ولو لا ذالک۔

بلکہ رائی میں ہوگا جیسے پانی کا فی نفسہٖ کوئی رنگ نہیں لیکن ظرف کے اعتبار سے وہ ملون معلوم ہوتا ہے
اور بعض نے اس سے بھی آگے ایک بات کہی ہے۔ مگر ان جوابوں کو علماء نے بلکہ صوفیائے محققین
نے بھی پسند نہیں کیا۔ صوفیہ میں بعضے غیر محقق بھی ایک وقت میں غیر محقق ہوتا ہے۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ
ماں کے پیٹ ہی سے محقق بن کر نکلتا ہے بلکہ تحقیق کا درجہ رفتہ رفتہ حاصل ہوتا ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ
جن حضرات کا محقق ہونا مسلم ہے اُن کے بھی بعض اقوال غیر محقق ہوتے ہیں، سو یہ اقوال زمانہ تحقیق سے
پہلے کے ہیں بعد کے نہیں پس یہ جواب جو بعض صوفیہ نے دیا ہے یا تو کسی غیر محقق کا قول ہے یا محقق کا
ہے تو زمانہ تحقیق سے پہلا ہے۔ بہرحال یہ جواب مسموع نہیں بلکہ اسلم یہ ہے کہ اس میں سکوت کیا جائے
اور اپنی طرف سے کوئی شق معین نہ کی جائے کہ رویت کس طرح اور کیونکر ہوگی۔ پس اجمالاً رویت پر ایمان
لایا جائے اور کیف میں گفتگو نہ کی جائے اور یہ اعتقاد بھی رکھا جائے کہ ذات حق کیف سے اور جہت وغیرہ
سے منزہ و مبرا ہے اور بایں ہمہ پھر رویت ہوگی کیونکہ نصوص میں وارد ہو چکا ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ
وصال و فراق حق کے معنے رضا و عدم رضا کے سوا کچھ نہیں کیونکہ اتصال و انفصال کی وہاں گنجائش نہیں اب
میں کہتا ہوں کہ جب ایک چنگاری کا ہم کو تحمل نہیں تو حق تعالیٰ کی ناراضی کا تحمل کیونکر ہوگا۔

شہیدِ محبت

مولانا اسی کو بطور شکایت کے فرماتے ہیں ؎

ایکہ صبرت نیست از فرزندوزن — صبر چوں داری نہ رب ذوالمنن

ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں — صبر چوں داری زنعم الماہدون

(اے شخص تجھ کو بیوی بچہ سے صبر نہیں تو حق تعالیٰ سے تجھ کو کیونکر صبر آ گیا اے شخص تجھ کو
دنیا سے صبر نہیں تو اللہ تعالیٰ سے جو نعمتیں دیتے ہیں کیونکر صبر آ گیا)

حیرت ہے کہ ہم کو بیوی کی ناراضی کا تو تحمل ہی نہیں بشرطیکہ چاہنے والے ہوں ورنہ بیوی نمک
ہی بڑھواتی پھرے گی۔ پھر حق تعالیٰ کی ناراضی پر کسی طرح چین آتا ہے۔ بس یوں کہئے کہ حق تعالیٰ کی
معرفت ہی نہیں ورنہ اہل معرفت نے تو ناراضی کے شبہ پر خودکشی تک کر لی ہے۔ گو یہ غلطی تھی کیونکہ خود
کشی میں ناراضی زیادہ ہے قبض میں تو احتمال ہی احتمال ہے کہ شاید وہ ناراض ہیں خودکشی میں ناراضی
متیقن ہے مگر اس وقت اضطراب اور گھٹن ایسا ہوتا ہے کہ ان مقدمات کی طرف خیال ہی نہیں جاتا۔ اس
لئے ممکن ہے کہ یہ خودکشی کرنے والے معذور ہوں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کی معرفت ناقص تھی کامل نہ
تھی اسی لئے سارے پہلوؤں پر نظر نہ گئی۔ محقق کی نظر وسیع ہوتی ہے وہ ہر پہلو پر نظر رکھتا ہے۔ اس لئے
وہ سخت گھٹن میں ہوتا ہے کہ نہ جینے دیتے ہیں نہ مرنے دیتے ہیں۔ وہ اس وقت یوں کہتا ہے ؎

اے حریفاں راہ بست یار آہوئے لنگیم واو شیر شکار
غیر تسلیم و رضا کو چارۂ در کفِ شیر نر خونخوارۂ
(دوستو محبوب نے راستہ بند کردیا ہے ہم لنگڑے ہرن کی طرح ہیں اور وہ شیر کی مانند۔
سوائے تسلیم ورضا کے چارہ نہیں گویا ہم شیر خونخوار کے پنجہ میں گرفتار ہیں)

اس وقت عارف محقق تسلیم و رضا سے کام لیتا ہے اور اگر اس گھٹن اور بے چینی میں خود بخود اس کی جان نکل جائے تو یہ شہید اکبر ہوگا۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک ایسے ہی شخص کی نسبت فرمایا تھا کہ اگر اس حالت میں مرگیا تو شہید ہوگا کیونکہ مقتول فی سبیل اللہ کو جو شہید اکبر کہتے ہیں اس کی وجہ بھی محبت ہی تو ہے کیونکہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے عاشق محبّ ہی جان دے سکتا ہے۔ جب بناء شہادت محبت پر ہے تو محبّ عاشق خواہ بستر ہی پر مرے وہ شہید ہی ہوگا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جامع الکمالات ہونا تو مسلم ہے آپ تو جملہ کمالات انبیاء علیہم السلام کے جامع میں پھر کمالات اولیاء کے جامع کیوں نہ ہوں گے اور منجملہ کمالات اولیاء کے شہادت بھی ہے تو کیا آپ کو شہادت نہیں ملی۔ یقیناً ملی ہے ورنہ معاذ اللہ! آپ کی جامعیت میں نقص لازم آئے گا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ آپ حساً شہید نہیں ہوئے تو ضرور ہے کہ معنیً شہید ہوں۔ اب وہ بناء دریافت کرنا چاہئے جس سے آپ کو معنوی شہادت حاصل ہوئی۔ سو حدیث میں ہے کہ تمنائے شہادت بھی شہادت ہے اور حضور کو تمنائے شہادت تھی چنانچہ حدیث میں ہے۔

وَدَدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ

(مسند أحمد 1:172، المصنف لابن أبي شيبة 10:264، كنز العمال: 3610)

اور تمنائے قتل فی سبیل اللہ محبت ہی سے ناشی ہے معلوم ہوا کہ اصل بنائے شہادت محبت وعشق ہے۔

سماع میں موت

اسی کو بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ شمشیر حدید کا مارا ہوا شہید ہوا اور شمشیر عشق ومحبت کا مارا ہوا شہید نہ ہو یہ نہیں ہوسکتا بلکہ کشتۂ خنجر عشق ضرور شہید ہے اسی لئے بعض اہل عشق نے خاص حالت کے ساتھ سزائے موت کی ہے۔ یعنی یہ تمنا کی ہے کہ ہم کو حالت سماع میں موت آئے کیونکہ سماع میں محبت وعشق کو خاص ہیجان ہوتا ہے۔ گویا اس وقت محبت کی تلوار بہت تیز ہوجاتی ہے تو سماع کا مارا ہوا شہید شمشیر محبت ہے اس وقت موت نہایت لذت کے ساتھ آتی ہے جیسے جہاد میں تلوار کی ضرب سے موت میں لذت آتی ہے بس دونوں میں ایسا فرق ہے جیسے کسی نے شربت فالسہ پی لیا اور کسی نے شربت انار پی لیا۔

چنانچہ حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو تمنا تھی کہ مجھے سماع میں موت آئے یعنی سماع مباح میں کیونکہ یہ حضرات غیر مشروع طریق سے سماع نہ سنتے تھے چنانچہ شیخ کی یہ تمنا پوری ہوئی اور ایک دفعہ سماع میں تین روز تک اس شعر پر وجد رہا ہے۔

کشتگانِ خنجر تسلیم را............ ہر زمان از غیب جان دیگر است

(خنجر تسلیم کے کشتوں کے ہر زمانہ میں ایک اور جاں عطا ہوتی ہے)

قوال بھی تین روز تک اسی کو بار بار پڑھتے رہے کیونکہ یہ بات آداب سماع میں سے ہے کہ جس شعر پر کسی کو وجد ہو اسی کو مکرر پڑھتے رہیں جب تک کہ وجد کو سکون نہ ہو ورنہ صاحب وجد کو قبض شدید ہو جاتا ہے۔ جس سے بعض دفعہ موت کی نوبت آجاتی ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ بھی آداب میں سے ہے کہ جب صاحب وجد کھڑا ہو تو سب کھڑے ہو جائیں تا کہ موافقت سے اس کو بسط ہو اور مخالفت سے قبض نہ ہو، غرض تین دن تک شیخ کو اس شعر پر وجد رہا۔ تین دن کے بعد وصال ہو گیا مگر سماع میں موت آنا مطلقاً دلیل شہادت نہیں اور اگر کسی کو سماع محرم میں موت آجائے، تو یہ جواد سماع مذکور کی دلیل نہ ہوگا کیونکہ کسی شے کے ساتھ عورت کا مقترن ہو جانا اس کی فضیلت یا جواز کی دلیل نہیں کیونکہ بعض دفعہ موت کا اقتران ایسی حالت کے ساتھ ہوا ہے جو بالاتفاق حرام تھی۔

نیز بعض دفعہ موت کا اقتران سماع سے صرف ظاہری ہوتا ہے اور حقیقت میں سبب موت بسط نہیں ہوتا بلکہ ضعف قلب وغیرہ ہوتا ہے چنانچہ بعض قوالوں کے گانے پر ایسے رند لوگوں کی جان نکل گئی ہے جن کو بسط وقبض کی ہوا بھی نہیں لگی۔ غرض بعض اہل محبت نے سماع میں موت آنے کی تمنا اس لئے کی ہے کہ اس وقت محبت کو ہیجان ہو جاتا ہے اور موت لذت کے ساتھ آتی ہے لیکن جو حضرات محقق و مقتداء ہیں وہ ہر پہلو پر نظر رکھتے ہیں اس لئے وہ اس کی تمنا نہیں کرتے۔ بلکہ تفویض سے کام لیتے ہیں اور خود کوئی صورت تجویز نہیں کرتے۔

(سوے ما تمناه الرسول صلى الله عليه وسلم من موتة القتل في سبيل الله فان تمنيه مطلوب و محمود شرعًا والا لكان ثلمثة في الايمان كماورد ۱۲)

یہ گفتگو درمیان میں استطراداً آگئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ لوگوں کو معرفت نہیں ہے اسی لئے ناراضیٔ حق کا ان کو تحمل ہے۔ ورنہ اہل معرفت نے تو شبہ ناراضی میں یعنی قبض میں جان دیدی ہے اور ظاہر ہے کہ ایمان کے لئے معرفت حق لازم ہے پس مومن من حیث ہو مومن ناراضیٔ حق کا تحمل نہیں کر سکتا۔ اور جس وقت وہ سبب ناراضی حق کا ارتکاب کرتا ہے اس وقت مومن نہیں ہوتا۔

اور یہ قول ایسا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لَا یَزْنِی الزَّانِیُ حِیْنَ یَزْنِیُ وَ ھُوَ مُؤْ مِنٌ الخ (فتح الباری95:11، جمع الجوامع:5208، الدر المنثور356:5)

(کوئی زانی نہیں زنا کرتا جبکہ وہ زنا کرتا ہے اس حالت میں کہ وہ مومن ہو)

جو تاویل حدیث میں کرو گے وہی میرے اس قول میں کر لینا۔ مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر میں اس شخص سے ایمان کی نفی کردی ہے جو عمداً خدا کی ناراضی کا ارتکاب کرتا ہے تو ہمیں بھی یہ کہنے کا حق ہے پس یہ سوال نہایت سخت ہے کہ کیا یہ گناہ بہت بڑا گناہ ہے یا کہ صغیرہ ہے۔ بہرحال یہاں منافقین کا ایک عمل مذکور ہے اور میں نے بتلا دیا ہے کہ مومن کا اس میں مبتلا ہونا ایک حیثیت سے اشد ہے گو دوسری حیثیت سے احف ہے مگر چونکہ مدعی محبت بھی ہیں اس لئے جہت اشدیت ہی کا لحاظ اہم ہے کیونکہ محبت کے ساتھ ادنیٰ درجہ بھی ناراضی حق کا گوارا نہیں ہوسکتا۔

رعایت مصلحت کف

اب سنئے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَکُمْ لِیُرْضُوْکُمْ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْہُ اِنْ کَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ یہ منافقین تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو راضی کردیں حالانکہ اللہ اور اس کا رسول اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ ان کو راضی کریں اگر مومن ہیں۔

یہ آیت غزوۂ تبوک کے متعلق ہے کہ منافقین نے اس غزوہ میں مسلمانوں کے خلاف سازشیں کی تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلا بھیجا اور ان سازشوں کے متعلق گرفت فرمائی تو وہ قسمیں کھا گئے کہ بخدا ہم نے کچھ نہیں کیا اور جس نے یہ خبر آپ کو پہنچائی ہے اس نے غلط کہا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور بھی مختلف مواقع پر بہت سی آیتیں نازل ہوئی ہیں جن سے منافقین کے اقوال بھی معلوم ہوگئے ہیں۔

یَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَی الْمَدِیْنَۃِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْھَا الْاَذَلَّ

کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ مدینہ لوٹ کر عزت والے ذلیلوں کو مدینہ سے باہر کردیں گے۔ وغیرہ وغیرہ اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ جو اپنی براءت کے لئے قسمیں کھاتے ہیں یہ سب جھوٹی تھیں۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پھر اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کو قتل نہ کیا اور یہ زہریلا مادہ فنا نہ کیا گیا وجہ اس کی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم تھا کہ منافقین کے ساتھ ظاہری برتاؤ مسلمانوں جیسا کیا جائے۔

اور اس میں حکمت یہ تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بیان فرمائی ہے کہ دور والے یوں نہ کہیں

اِنَّ مُحَمَّدًا یَقْتُلُ اَصْحَابَہٗ

کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے اصحاب کو قتل کرتے ہیں کیونکہ دور والوں کو کیا خبر کہ مدینہ میں کتنے تو حضورؐ کے صحابہ اور مخلص مسلمان ہیں اور کتنے منافقین ہیں وہ تو سب کو مسلمان ہی سمجھتے تھے کیونکہ منافقین بھی ظاہر میں اسلام کے مدعی تھے۔ اب اگر ان کے ساتھ سختی کی جاتی اور ان کو قتل وقید کیا جاتا تو دور والوں کو اسلام سے توحش ہوتا اور یوں کہتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو اسلام کے بعد بھی اپنی جماعت کے ساتھ ایسا برتاو کرتے ہیں تو ہم کس بھروسہ پر مسلمان ہوں نہ معلوم ہمارے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جائے تو اس حکم میں اسلامی مصلحت تھی اور اسلامی مصلحت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی مصلحت تھی اور مسلمانوں سے مراد حقیقی مسلمان نہیں کیونکہ اُن کو تو منافقوں کی خوب حالت معلوم تھی ان کو منافقوں کے قتل وقید سے کچھ بھی شبہ نہ ہوتا بلکہ مجازی مسلمان ہیں جن کو باعتبار مایول کے مسلمان کہا جاسکتا ہے یعنی جو لوگ اس وقت دُور و دراز پر موجود ہونے کے سبب حقیقت واقعہ سے بے خبر تھے اور آئندہ اسلام لانے والے تھے منافقوں کے ساتھ تشدد کرنے سے وہ متوحش نہ ہوں اور اسلام سے نہ رکیں اور اس دولت سے محروم نہ رہیں۔ تو درحقیقت اس حکم میں کفار ہی کی مصلحت تھی جس کو مجازاً اسلامی مصلحت کہہ دیا جاتا ہے پس یہ شبہ تو مرتفع ہوا۔

رضائے معتبر

ہاں! اس جگہ ایک شبہ یہ ہوسکتا ہے کہ منافقین تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رضاء کے واسطے قسمیں کھاتے تھے پھر وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ (اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ انکو راضی کریں)

میں رسول کا ذکر کیوں کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنے کا اہتمام نہ کرتے تھے۔

اس شبہ کا جواب سمجھ لیجئے مشہور جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا حق تعالیٰ کی رضاء کو مستلزم ہے۔ تو جب انہوں نے حق تعالیٰ کو راضی کرنا نہیں چاہا تو گویا حضورؐ کو بھی راضی کرنا نہیں چاہا، کیونکہ انتفاء لازم سے ملزوم کا انتفاء لازم ہے۔

دوسرے چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی شرارتوں سے واقف تھے اس لئے آپ ظاہر میں بھی ان سے راضی نہ ہوتے تھے لیکن ان کی قسموں کے بعد آپ گرفت کو موقوف کردیتے تھے وہ لوگ اسی کو کافی سمجھتے تھے ورنہ دل میں وہ بھی جانتے تھے۔ کہ حضورؐ ہماری قسموں سے راضی نہیں ہوئے۔

مگر میرے نزدیک سہل جواب یہ ہے کہ رسول کی ارضاء کی دو حیثیتیں ہیں ایک ارضاء بہ حیثیت سلطنت، دوسرای ارضاء بہ حیثیت نبوت و رسالت اس کے بعد سمجھئے کہ منافقین کا قصد یہ تو ضرور تھا کہ حضور ہم سے راضی رہیں مگر یہ قصد محض بہ حیثیت سلطنت اس غرض سے تھا کہ اُن کے اموال و انفس محفوظ رہیں اور اس حیثیت سے آپ کی رضا مثل دوسرے مسلمانوں کی رضاء کے رضائے خلق تھی اور یُرْضُوْکُمْ میں داخل نہ کہ رضائے خالق اور حضور میں جو دوسری حیثیت رسالت اور مظہر حق ہونے کی تھی اور اسی حیثیت سے آپ کی رضا عین رضاء حق ہے اُس کی ان کو پرواہ نہ تھی۔

خلاصہ یہ کہ وہ مخلوق کی رضاء کو رضائے خالق پر ترجیح دیتے تھے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بحیثیت مخلوق محض ہونے کے راضی کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاء شرعاً بہ حیثیت نائب حق ہونے کے مطلوب ہے جس کی منافقوں کو پرواہ نہ تھی اسی لئے

وَاللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ

(اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ انکو راضی کیا جائے)

میں رسول کا ذکر کیا گیا ہے اور بتلا دیا گیا کہ جس حیثیت سے تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنا چاہتے ہو وہ مطلوب نہیں اور جو مطلوب ہے اس حیثیت سے تم اُن کو راضی نہیں کرنا چاہتے۔ پس اللہ و رسول من حیث هو رسول اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم ان کو راضی کرو پس اب اشکال رفع ہوگیا۔

اور یہاں سے معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاء محبت وہی مطلوب ہے جو اس حیثیت سے ہو کہ آپ رسول اور مظہر حق ہیں۔ دوسری حیثیت سے آپ کی رضاء و محبت مطلوب نہیں۔ ہاں اگر پہلی حیثیت کے ساتھ دوسری حیثیات بھی جمع ہو جائیں تو نورٌ علٰی نور ہے ورنہ صرف دوسری حیثیات کافی نہیں مثلاً ابو طالب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت تھی مگر وہ صرف اس حیثیت سے تھی کہ آپ اُن کے بھتیجے تھے یا بعض کفار کو آپ سے اس لئے محبت تھی کہ آپ عاقل کامل تھے اور اب بھی بعض مصنفان یورپ آپ کی عقل و ہمت و استقلال وغیرہ کی تعریف، بہت شد و مد کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان حیثیات سے آپ کی محبت و رضا شرعاً کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ رسول ہونے کی حیثیت سے آپ کے ساتھ محبت کی جائے اور اس ہی حیثیت سے آپ کی رضا شرعاً مطلوب ہے۔

عینیت عُرفیہ

اور اس ہی حیثیت میں صوفیہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عین حق فرما دیتے ہیں مگر یہاں عین کا استعمال عرف کے موافق کیا گیا ہے اصطلاح فلسفیہ کے موافق نہیں اور محاورہ میں عین اس کو کہتے ہیں جو اجنبی

نہ ہو جیسے کہا کرتے ہیں کہ تم کوئی غیر تھوڑا ہی ہو ہم تم تو ایک ہی ہیں حالانکہ اصطلاح فلسفہ کے موافق وہ یقیناً غیر ہے مگر محاورہ میں غیریت کی نفی کی جاتی ہے کیونکہ مطلب یہ ہے کہ تم اجنبی نہیں ہو۔

یہاں مجھ کو ایک لطیفہ یاد آ گیا کہ ایک فرقہ ضالہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت بلا فصل ایک حدیث سے ثابت کی ہے جس میں حضرت کی نسبت **لحمک لحمی و دمک دمی** (مسند احمد 227:4) (تیرا گوشت میرا گوشت ہے اور تیرا خون میرا خون ہے) آیا ہے اور استدلال اس طرح کیا ہے کہ حضرت علی عین الرسول ہیں، اس لئے ان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو خلافت کا استحقاق نہیں تھا۔

اسکا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں دوسرے میں کہتا ہوں کہ اگر اس سے عینیت حقیقہ مراد ہے تو اسے تو حضرت علیؓ کی خلافت ہی کی نفی ہوتی ہے کیونکہ خلیفہ تو غیر ہی ہونا چاہئے کوئی شخص خود اپنا خلیفہ نہیں ہوا کرتا بس بہت سے بہت تم یہ کہہ سکتے ہو کہ حضرت ابو بکرؓ جیسے حضورؐ کے خلیفہ تھے حضرت علیؓ کے بھی خلیفہ تھے تو اس میں ہم تم سے نزاع نہ کریں گے۔

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گزشتی ۔۔۔ گومشت خاک ماہم بر باد رفتہ باشد

(میں خوش ہوں کہ تو رقیبوں سے دامن بچا کر گزر گیا، اگرچہ ہماری مٹھی بھر خاک بھی برباد چلی جائیگی)

مگر ان کا مدعی تو باطل ہو گیا۔

اور ایک جواب دوسرے علماء نے دیا ہے کہ حضرت علی عین رسول ہیں تو حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کیساتھ ان کا نکاح کیسے ہوا۔ یہ تو حضرات حسنینؓ کے حق میں معاذ اللہ سخت گالی ہوگی اور اگر عینیت حقیقہ مراد نہیں اور یقیناً مراد نہیں بلکہ صرف عینیت عُرفیہ مراد ہے جیسا کہ صوفیہ حضورؐ کو اس معنی کر عین حق کہتے ہیں تو پھر یہ حضرت علی کے ساتھ خاص نہیں اسی معنی کر تو ہر صحابی عین رسول تھا کیونکہ حضورؐ سے سب کو ہی تعلق تھا کسی کو بھی اجنبیت نہ تھی۔

اور یہی عینیت مصطلحہ معنی ہیں۔ ھمہ اوست کے یہ بھی محاورہ کے موافق بالکل صحیح ہے۔ جیسے ایک دیہاتی کلکٹر کے پاس فریادی گیا اس نے کہا کہ پولیس میں رپٹ لکھواؤ اور ایک وکیل مقرر کر کے باقاعدہ دعویٰ کرو تو وہ کہتا ہے کہ اجی ہماری تو پولیس بھی تم ہی ہو وکیل بھی تم ہی ہو۔ یہاں کوئی اشکال نہیں کرتا کہ کلکٹر ہی پولیس اور وکیل کیونکر ہو گیا۔ بس صوفیہ ہی اشکال کے واسطے رہ گئے ہیں ان کی اصطلاح میں عین کہتے ہیں تعلق والے کو اور غیر کہتے ہیں بے تعلق کو۔

اسی سے ضیاء القلوب کے ایک مضمون سے اشکال رفع ہو گیا۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ذکر لا الہ الا اللہ میں لا کے ساتھ یہ تصور کرے کہ میں نے سب غیر اللہ کو نکال دیا۔ اس پر ایک عالم کو شبہ ہوا وہ

مجھ سے کہنے لگے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی نفی کرے میں نے اس کا یہی جواب دیا کہ غیر کہتے ہیں اجنبی بے تعلق کو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو واسطہ وصول الی الحق ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیر نہیں۔

اور ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ نے تو اس حیثیت سے یعنی واسطۂ وصول کی حیثیت سے وساوس غیر کو بھی جو واقعی وساوس غیر ہوں موصل الی الحق بنادیا ہے۔ فرماتے تھے کہ جب وساوس کسی طرح بند نہ ہوں تو اب یہ سوچے کہ اللہ اکبر حق تعالیٰ کی بھی عجیب قدرت ہے کہ میرے دل میں ایک دریا خیالات کا پیدا کر دیا ہے جو میرے روکے نہیں رکتا برابر چلا آرہا ہے۔ اس طرح یہ وساوس مرآۃ قدرت حق بن جائیں گے تو پھر مضر نہ ہوں گے بلکہ ذریعۂ معرفت بن جائیں گے اور اسی حیثیت سے ایک عارف کہتے ہیں ؎

ہر چہ بینم درجہاں غیر تو نیست   یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(تمام عالم آپ کے صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے گیر وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے)

کیونکہ تمام اشیاء عالم حق تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں اگر اُن پر اس حیثیت سے نظر کی جائے کہ یہ حق تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اور مصنوع سے قدرت وحکمت صانع پر استدلال کیا جائے تو پھر کوئی چیز غیر نہیں کیونکہ اس حیثیت سے ہر چیز کو صانع سے تعلق ہے اور وہ عین حق ہے (بالمعنی المذکور)

تفکر فی الاغیار

اسی ایصال الی الحق کے درجہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ (بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات دن کے آجانے میں عقلمندوں کیلئے دلائل ہیں)

اور ارشاد ہے۔ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا (اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں اور ہمارے پروردگار آپ نے اس کو لایعنی پیدا نہیں کیا) اور فرماتے ہیں۔

اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ، وَاِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ وَاِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ. وَاِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ۔ (کیونکہ کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح پیدا کیا گیا اور آسمانوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بلند کیا گیا اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح کھڑے کئے گئے اور زمین کو کہ کس طرح بچھائی گئی)

وغیرہ ھامن الآیات جن میں تفکر فی الاغیار کا مراقبہ تعلیم کیا گیا ہے کہ زمین وآسمان چاند سورج اور ستاروں اور پہاڑوں اور اونٹوں کی خلقت میں غور کرو مگر نہ بحیثیت حوادث من حیث ہی حوادث کے بلکہ حیثیت سے ان کا مراقبہ کرو کہ یہ حوادث موصل الی المحدث اور مصنوعات مرآۃ جمال صانع ہیں اس حیثیت سے تمام عالم میں کوئی شے غیر نہیں کیونکہ ہر شے واسطہ وصول ہے

اس درجہ میں کوئی چیز مانع عن الوصول نہیں (قال الشیخ الشیر ازیؒ سے)

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار　　　　ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

(ہر پتہ عقلمند کی نظر آدمی کی نظر میں معرفت الٰہی کیلئے دفتر ہے)

جب واسطۂ وصول کی حیثیت سے کوئی نئی شی غیر نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیونکر غیر ہونگے کہ آپ تو مبعوث ہی ہوئے ہیں ایصال کے لئے اس درجہ میں آپ غیر نہیں۔

اور اسی لئے اس آیت میں وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسکے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو راضی کیا جائے) بضمیر مفرور فرمایا ہے يُرْضُوْهُمَا نہیں فرمایا۔ حالانکہ واقع میں اللہ و رسول دو ہیں مگر جس حیثیت سے ارضاء رسول مطلوب ہے، اس حیثیت سے مرجع ضمیر میں اتحاد ہے اب چاہے يُرْضُوْهُ کی ضمیر حق تعالیٰ کی طرف راجع کرو یا رسول کی طرف ہر ایک دوسرے کو مستلزم ہے خدا کو راضی کرنا رسول کو راضی کرنا ہے اور رسول کو راضی کرنا خدا کو راضی کرنا ہے۔ عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف　　　　گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے عجب

(خوش قسمتی سے اگر اس کا دامن ہاتھ آ جائے وہ کھینچ لے تب بھی مقصود حاصل ہے اور ہم کھینچ لیں تب بھی مقصود حاصل ہے)

اسی درجہ میں ارشاد ہے۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

(جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی)

عقلی و طبعی محبت

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کسی نے لعل سے پوچھا کہ تجھے آفتاب سے زیادہ محبت ہے یا اپنے سے۔ اس نے کہا کہ اس سوال سے مجھے معاف کرو اگر میں کہتا ہوں کہ اپنے سے محبت ہے تو وہ آفتاب ہی کی محبت ہے کیونکہ میرے اندر جو خوبی موجب محبت ہے وہ اسی کی وجہ سے ہے اور اگر میں کہتا ہوں کہ آفتاب سے محبت ہے تو یہ اپنی ہی محبت ہے کیونکہ اُس سے اس لئے محبت ہے کہ اس نے میری ذات کو ایسا بنا دیا ہے۔ اس لئے میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

بس حیثیت وصول و ایصال میں حق تعالیٰ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی تعلق ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت و رضا آپ کی محبت و رضاء کو مستلزم ہے کیونکہ آپ واسطہ وصول ہیں اور آپ کی محبت و رضاء حق تعالیٰ کی محبت و رضا کو مستلزم ہے کیونکہ آپ سے اسی لئے تو محبت ہے کہ آپ مظہر کمالاتِ الٰہیہ ہیں۔

اور یہی وہ بات ہے جو حضرت رابعہ بصریہؒ سے بوجہ غلبہ عشق کے مخفی رہی اور ان کی نظر یہاں تک نہ پہنچی۔ گو ان کا درجہ عشاق میں بہت عالی ہے اور ان کے عشق کی شان عجیب تھی۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپ ایک ہاتھ میں آگ اور ایک ہاتھ میں پانی لئے ہوئے نہایت جوش و غضب میں بھری ہوئی جا رہی تھیں کسی نے پوچھا کہاں جا رہی ہو۔ کہاں میں آج جنت و دوزخ کا فیصلہ کرنے جا رہی ہوں۔ اس آگ سے جنت کو پھونکوں گی اور پانی سے دوزخ کو ٹھنڈا کروں گی۔ کیونکہ ساری مخلوق جنت و دوزخ کے طمع و خوف سے عبادت کر رہی ہے۔ میرے محبوب کو (خالصاً مخلصاً) کوئی یاد نہیں کرتا۔ اس واقعہ سے ان کے عشق کا حال معلوم ہو گیا ہوگا کہ کس درجہ کا ہے حضرت رابعہ کے کمال عشق میں کچھ شبہ نہیں مگر یہ مسئلہ اُن سے مخفی رہا کہ رسول میں ایک حیثیت ایسی بھی ہے جس کے اعتبار سے وہ غیر حق نہیں ہیں اور اس درجہ میں خدا کی محبت رسول کی محبت ہے اور رسول کی محبت خدا تعالیٰ کی محبت ہے۔

چنانچہ آپ نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو ندامت سے آنکھیں نیچی کر لیں اور کہا یا رسول اللہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت شرمندہ ہوں کہ خدا کی محبت نے دل میں اتنی جگہ کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی جگہ نہ چھوڑی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی دی کہ غم نہ کرو اللہ تعالیٰ کی محبت ہماری ہی محبت ہے الحمد للہ بزرگوں کی برکت سے جس بات کی طرف حضرت رابعہ کا ذہن نہ گیا وہ ہم جیسوں کو سہولت سے معلوم ہو گئی۔ اور یہ خدا کی عطا ہے جس کو چاہے دے، بات یہ ہے کہ محبت کی دو قسمیں ہیں ایک عقلی ایک طبعی اور مطلوب محبت عقلیہ ہے اور حضرت رابعہؒ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت عقلیہ حاصل تھی کیونکہ وہ احکام شرعیہ کی متبع تھیں اور حضورؐ ہی کے اتباع میں فنا تھیں اور محبت عقلیہ اسی کا نام ہے کہ محبوب کے احکام کی اطاعت کرے اور اپنی خواہش و ارادہ کو اس کے احکام کے سامنے فنا کر دے اور اس کے حکم پر کسی چیز کو ترجیح نہ دے گا مگر طبعی محبت (یعنی میلان و انجذاب و وابستگی) اُن کو حق تعالیٰ سے زیادہ تھی اور قاعدہ ہے کہ محبت طبعیہ خاص درجہ میں ایک ہی سے ہو سکتی ہے دو سے ایک درجہ کی نہیں ہو سکتی اور یہ امر غیر اختیاری ہے کیونکہ اس کا مدار مناسب طبع پر ہے جو بندہ کے اختیار میں نہیں اسی لئے محبت طبعیہ مامور بہا نہیں بلکہ مامور بہا اور مطلوب محبت عقلیہ ہے جو امر اختیاری ہے رہی طبعی محبت تو وہ بعض کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہوتی ہے اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے شرمندہ ہوتے ہیں اور بعض کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ہوتی ہے یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شرمندہ ہوتے ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تسلی فرماتے ہیں کہ تم کو جب خدا سے محبت ہے تو ہم سے بھی محبت ہے۔ اسی طرح پہلی قسم کے لوگوں کی اللہ تعالیٰ تسلی فرماتے ہیں کہ جب تم کو رسولؐ سے محبت ہے۔ تو ہم سے بھی محبت ہے کیونکہ رسولؐ کے ساتھ جس حیثیت سے

محبت ہے اس حیثیت سے وہ غیر حق نہیں۔ پس محبت عقلیہ ان دونوں قسم کے لوگوں کو اللہ و رسول ؐ دونوں سے ہے کیونکہ اُس کا مبنی تو اطاعت احکام ہے۔ پھر شرمندگی کی کیا وجہ ہے۔ پس حضرت رابعہؒ کی نظر اس پر نہ پہنچی کہ مطلوب محبت عقلیہ ہے نہ کہ طبعیہ۔ نیز یہ مقدمہ بھی ان کی نظر سے مخفی رہا کہ رسول ؐ میں ایک حیثیت ایسی ہے جس میں وہ غیر حق نہیں اس لئے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شرمندہ تھیں۔ اور یہی محبت عقلیہ مراد ہے اس حدیث میں۔

لَا یُؤْ مِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ نَفْسِہٖ وَمَا لَہٗ وَاَھْلِہٖ وَوَلَدِہٖ اَجْمَعِیْنَ (اوکما قال) (مسند احمد 4:227) کہ کوئی تم میں سے اس وقت تک مومن نہ ہوگا جب تک میں اس کو اپنی جان و مال واہل وعیال سب سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ اَنْتَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ کُلِّ شَیْ ءٍ اِلَّا نَفْسِیْ۔

کہ یارسول اللہ! آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں بجز میری جان کے کہ مجھے اپنی جان زیادہ محبوب معلوم ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں اے عمر! جب تک تمہاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوں اس وقت تک مومن نہ ہوگے۔ اس کے بعد اسی مجلس میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ یارسول اللہ! میں اب دیکھتا ہوں کہ آپ میرے نفس سے بھی اَحَبُّ ہیں یہاں دو شبہے ہوتے ہیں ایک یہ کہ حضرت عمرؓ کی اتنی جلدی کایا پلٹ گئی کہ اسی مجلس میں کچھ سے کچھ ہوگیا دوسرے یہ کہ اگر کسی مومن کی وہ حالت ہو جو حضرت عمرؓ کی حالت اولاً تھی تو کیا وہ مومن نہ ہوگا۔

پہلے شبہے کا جواب گو یہ ہوسکتا ہے کہ ایک ہی مجلس میں حضرت عمرؓ کی کایا پلٹ ہوجانا ممکن ہے کیونکہ جب فاعل و منفعل دونوں کامل ہوں تو ایسا ہو جانا کچھ بعید نہیں مگر چونکہ اشکال دوسرا ابھی ہے اس لئے یہ جواب مجھے پسند نہیں بلکہ تحقیقی جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اول یہ سمجھے کہ حضور کی مراد احبیت طبعیہ ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تکرار ارشاد سے وہ سمجھ گئے کہ مراد محبت عقلیہ ہے اور محبت عقلیہ ہر مومن کو اللہ و رسول سے زیادہ ہے حضرت عمرؓ کو تو کیوں نہ ہوتی کیونکہ وہ تو ہر وقت اللہ و رسول کے لئے اپنی جان دینے کو تیار تھے گو طبعاً اپنی جان سے محبت زیادہ ہو مگر وہ اللہ و رسول کے لئے سب سے محبوب چیز کو قربان کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ تھے۔ پس سمجھ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد احبیت عقلیہ ہے اور محبت عقلیہ مجھے سب سے زیادہ اللہ و رسول کے ساتھ ہے۔ اپنی جان سے نہیں۔

مکالماتِ صحابہؓ کا رنگ

اور حضرات صحابہؓ کے مکالمات و مناظرات کا رنگ یہی تھا کہ تکرار حق سے اُن پر حق واضح ہو

جاتا تھا بحث وتمحیص کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ مناظرہ جمع قرآن ومناظرۂ قتال مرتدین اس کی دلیل ہے کہ جمع قرآن کے لئے جب حضرت عمرؓ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کومشورہ دیا تو حضرت صدیق اکبر نے فرمایا کہ میں ایسا کام کیونکر کرسکتا ہوں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ اس کے جواب میں حضرت عمر نے کوئی دلیل بیان نہیں کی صرف بار بار یوں کہتے رہے کہ واللہ انہ لخیر بخدا یہ کام اچھا ہے۔ چنانچہ اس کے تکرار ہی سے حضرت صدیق اکبر کوشرح صدر ہوگیا۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلایا اور ان کو جمع قرآن کا حکم دیا انہوں نے بھی وہی شبہ کیا جو حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت عمرؓ کے سامنے کیا تھا مگر حضرت صدیقؓ نے بھی زید بن ثابتؓ کے سامنے کوئی دلیل بیان نہیں کی وہ بھی بار بار یہ کہتے رہے کہ یہ کام اچھا ہے۔ کہ یہ کام اچھا ہے۔ اس کے تکرار ہی سے حضرت زید بن ثابت کوشرح صدر ہوگیا۔ اور انہوں نے جمع قرآن کا کام شروع کردیا۔ اسی طرح قتال مرتدین کے بارے میں جب حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے جازم ہوگئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ فَمَنْ قالھا فقد عصم منی ما بہ و دمہ او

کما قال (السنن الکبری للبیھقی 100:6، مجمع الزوائد 172:4، کنز العمال: 397بدون لفظ: الا)

مجھ کو لوگوں سے قتال کا امر کیا گیا ہے جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہیں۔ جب اس کا اقرار کرلیں تو ان کے انفس واموال محفوظ ہو جائیں گے۔ اور ان مرتدین میں ایک جماعت وہ ہے جو توحید ورسالت کی مصدق ہے اور ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتی ہے اور ہمارا ذبیحہ کھاتی ہے صرف فرضیت زکوٰۃ میں تاویل کرتی ہے تو اس سے آپ کیونکر قتال کریں گے۔ اس کے جواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ نہیں کیا کہ حضرت عمرؓ کی دلیل کا جواب بیان کریں۔ بلکہ یہ فرمایا۔

واللّٰہ لو منعونی عناقا او عقالا کانو ا یؤ دونھا الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا قا تلنھم علیہ۔ (الدر المنثور 255:2، الترغیب والترھیب 557:2)

بخدا اگر یہ لوگ ایک بکری کا بچہ یا ایک رسی بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ادا کرتے تھے تو میں اس پر بھی ان سے جہاد کروں گا۔ بس اسی سے حضرت عمرؓ پر حق واضح ہوگیا چنانچہ فرماتے ہیں۔

فوا اللّٰہ ما رأیت اَلَّا ان اللّٰہ قد شرح صدر ابی بکر للقتال فعرفت انہ الحق

(الدر المنثور 255:2، الترغیب والترھیب 557:2) تو جب حضرات صحابہ کی باہم یہ حالت تھی کہ دوسرے کے تکرار قول سے حق ان پر واضح ہوجاتا تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تکرار سے عمرؓ پر حق

واضح کیا نہ ہوتا، پس حالت میں کایا پلٹ ماننے کی حاجت نہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ حضورؐ کے تکرار قول سے حضرت عمرؓ پر مراد واضح ہوگئی اور وہ سمجھ گئے کہ محبت طبعیہ مطلوب نہیں کیونکہ وہ اختیاری نہیں اور امور طبعیہ سب غیر اختیاری ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔
(اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی حیثیت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے)

ذوق ومناسبت

اور راز اس کا وہی ہے جو اوپر اجمالاً مذکور ہوا کہ محبت طبعیہ کا مدار مناسبت باطنی پر ہے اور مناسبت باطنی کسی کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ہے کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہے۔
وهذا هوا لا كثر لا سيما في العوام ١٢۔)

اور بعض کو کسی سے بھی مناسبت نہیں وہ محض خشک لکڑی ہیں جیسے نجدی مگر ان کو بھی ناقص نہ سمجھو کیونکہ ذوق ومناسبت کا نہ ہونا کچھ قصور نہیں ذوق شرط مقبولیت نہیں ہاں نعمت ضرور ہے کیونکہ اس سے عمل میں سہولت ہو جاتی ہے۔ مگر اس کی ایسی مثال ہے جیسے حُسن ظاہری نعمت تو ہے مگر شرط قبول نہیں، گنجے بدصورت کو بھی قرب حق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ذوق ومناسبت ایک حُسن باطنی ہے۔ اگر کسی کو حاصل ہو جائے تو نعمت ہے۔ لیکن کسی کو اگر حاصل نہ ہو تو کوئی نقص نہیں، کیونکہ قرب ورضائے حق کا مدار محبت عقلیہ پر ہے۔ یعنی اطاعت حکام پر ذوق پر اس کا مدار نہیں اگر کسی شخص کو ذوق باطن بالکل نہ ہو لیکن احکام کو پوری طرح بجالاتا ہو وہ ناقص نہ ہوگا بلکہ کامل ہے۔

اب یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جن میں جوش وخروش نہیں ہوتا اور وہ اس کے نہ ہونے سے مغموم ہوتے ہیں اور غضب یہ کہ بعض مشائخ غیر محقق بھی گو محق ہوں ایسے لوگوں سے کہہ دیتے ہیں کہ تم کو طریق سے مناسبت نہیں ہے۔ تمہاری قسمت میں طریق باطن نہیں ہے۔ یہ شیخ قابل عزل ہے میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہر مومن کو طریق باطن حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ طریق باطن ذوق وشوق کا نام نہیں ہے بلکہ مداومت ذکر واطاعتِ احکام وملکات باطنہ مثل توکل ورضا وشکر وغیرہ کا نام ہے اور ان ملکات میں ہر ایک کے دو درجے ہیں ایک طبعی ایک عقلی اور درجہ عقلی اختیاری کسبی ہے۔ یہ ہر ایک کو حاصل ہو سکتا ہے۔ دوسرا جواب اس سے ترقی کر کے یہ ہے کہ میں یہی تسلیم نہیں کرتا کہ کوئی مومن ایسا بھی ہے جس کو اللہ ورسول سے محبت طبعیہ نہ ہو۔ بلکہ ہر مسلمان کو اللہ ورسول سے طبعی محبت بھی ہے۔ اور عقلی بھی ہے۔ حق تعالیٰ نے ہر شخص میں ملکات عقلیہ کو فطری اور طبعی بھی بنا دیا ہے مگر بعض میں طبیعت کو عقل پر غلبہ ہے اور بعض میں عقل کو طبیعت پر غلبہ

ہے لیکن محبت طبعیہ سے خالی کوئی نہیں ہے دیکھوتم جو اندھیری رات میں سردی کے وقت نماز کو آتے ہو اور وضو کر کے نماز پڑھتے ہو کیا یہ مجرد ارادہ واختیار سے ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں ارادہ واختیار میں اتنی قوت نہیں ہے کہ ایسی حالت میں نماز کے واسطے گھر سے نکال دے ارادہ سے دو چار دن ایسا ہوسکتا ہے دواماً نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ اثر ہے اُس داعیہ کا جو قلب میں پیدا ہو گیا ہے۔

جس کی حالت یہ ہے ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست　　　　می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

(محبوب حقیقی نے یہ حرکات پیدا کر دیئے ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کر دیتے ہیں)

اور داعیہ وہی فطری اور طبعی شئے ہے جو حق تعالیٰ نے ہمارے قلوب میں پیدا کر دی ہے۔ عادت اللہ یہ ہے کہ جب مسلمان کسی عمل شرعی کا اہتمام کرتا ہے تو حق تعالیٰ چند روز کے بعد اُس کو طبعی بنا دیتے ہیں کہ دل میں ایک داعیہ ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو اس سے بالاضطرار کام کراتا رہتا ہے اور میری اس تحقیق سے کہ دوام عمل داعیہ جذب الٰہیہ سے ہوتا ہے عجب وکبر کی بھی جڑ کٹتی ہے۔

صاحبو! تم اپنے عمل کو اپنا عمل نہ سمجھو تمہارے ارادۂ واختیار میں اتنی قوت نہیں جو دواماً یہ اعمال صادر ہوسکیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ تم سے کام لے رہے ہیں کہ ایک داعیہ ایسا پیدا کر دیا ہے جو تم کو بے چین کیئے رہتا ہے اور بالاضطرار تم سے کام لیتا ہے پس جو لوگ نماز و ذکر وغیرہ کے پابند ہیں۔ وہ اس کو اپنا کمال نہ سمجھیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ کا فضل وانعام سمجھیں۔ بہرحال اگر کسی میں ذوق و شوق کی کمی ہو تو وہ مغموم نہ ہو بلکہ مطمئن رہے کہ قربِ حق اس کو بھی حاصل ہوسکتا ہے، ذوق وشوق خود مطلوب نہیں اور باوجود غیر مطلوب ہونے کے وہ بھی اس کے اندر موجود ہے جس کی دلیل داعیہ کا موجود ہونا ہے گو دوسروں کی طرح غلبۂ ذوق وشوق کے آثار اس کے اندر نہ ہوں۔

اور جن پر اس وقت غلبہ نہیں ہے ان پر بھی بعض دفعہ غلبہ ہو جاتا ہے۔ جب کوئی محرک پایا جائے۔ مثلاً خدانخواستہ خدا ورسول کی شان میں کوئی کافر گستاخی کرے تو اس وقت ہر مسلمان کو جوش آتا ہے اور جان لینے اور دینے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ محبت طبعی بھی ہر مسلمان میں ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ بعض میں ہر وقت اس کا ظہور ہوتا ہے اور بعض میں کسی محرک قوی لیکن خالی کوئی نہیں ہے۔

امور غیر اختیاریہ

اور اگر بالفرض کوئی خالی بھی ہو جب بھی مغموم نہ ہو کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ یہ مطلوب نہیں کیونکہ امر غیر اختیاری ہے اور امور غیر اختیاریہ کے فقدان سے مغموم ہونا ممنوع ہے۔ یہی مطلب

ہے لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ کا میں اس سے سے بقرینہ شان نزول کے یہی سمجھتا ہوں کہ امور غیر مکتسبہ کی تمنا نہ کرو جن کا حصول اختیاری نہیں بلکہ محض وہبی ہے چنانچہ شان نزول آیت کا یہ ہے کہ حضرت اُمِ سلمہؓ نے تمنا کی تھی کہ ہم مرد ہوتے تو ہم بھی مردوں کی طرح جہاد کرتے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس تمنا سے منع کیا گیا ہے کیونکہ مرد و عورت ہونا امر کسبی نہیں ہے اور تمنا سے اس لئے منع کیا گیا کہ اس سے غم بڑھے گا اور غم سے ہمت شکستہ ہوتی ہے۔

اسی لئے حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غم سے منع فرمایا ہے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ۔

کہ آپ کو کفار کی تبلیغ احکام کیجئے اور ان کے اعراض سے مغموم نہ ہوجے حالانکہ آپ کا حزن شفقت کی وجہ سے تھا اور شفقت سے تبلیغ زیادہ ہوتی ہے تو ظاہر میں شبہ ہوتا ہے کہ یہاں حضورؐ کو تبلیغ کی زیادت سے روکا گیا ہے لیکن حقیقت میں زیادت سے نہیں روکا گیا بلکہ اس کی تقلیل سے منع کیا گیا ہے کیونکہ غم سے طبیعت پژمردہ ہوجاتی ہے۔ اور اس سے تعطل ہوجاتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تبلیغ کے وقت خود نفسِ تبلیغ کو مطلوب سمجھئے ترتب ثمرات کو مقصود نہ سمجھئے کیونکہ جو شخص ثمرات کو مقصود سمجھ کر عمل کرے گا اس کو عدم ترتب ثمرہ سے رنج و غم ہوگا اور حزن و غم کی خاصیت ہے کہ اس سے طبیعت شکستہ پژمردہ ہوجاتی ہے پھر کام نہیں ہوتا۔

اب بتلاؤ یہاں زیادت تبلیغ سے منع کیا گیا ہے یا اس کی تقلیل سے روکا گیا ہے ظاہر ہے کہ جو شخص خود عمل کو مقصود سمجھے گا اور ثمرہ پر نظر نہ کرے گا وہ اُس شخص سے زیادہ کام کرے گا جو ثمرہ پر نظر کر کے کام کرتا ہے۔ کیونکہ یہ دوسرا شخص جب ثمرہ مرتب ہوتا نہ دیکھے گا عمل میں کوتاہی کردے گا بخلاف پہلے شخص کے کہ وہ ہر حال میں برابر کام کرتا رہے گا کیونکہ اس کا مقصود عمل ہی ہے اور وہ ہر وقت حاصل ہے کیونکہ اپنے اختیار میں ہے تو یہاں بھی حق تعالیٰ نے حضورؐ کو امر غیر اختیاری پر نظر کرنے سے منع کیا ہے کہ جو کام آپ کے اختیار میں ہے یعنی تبلیغ آپ اس میں مشغول رہیں اور اسی کو مقصود سمجھیں اور جو آپؐ کے اختیار میں نہیں یعنی (ترتب ثمرہ) اُس پر التفات نہ کریں بلکہ اس کو ہمارے حوالے کیجئے۔

اس تقریر سے یہ اشکال بھی رفع ہوگیا کہ حزن و سرور تو غیر اختیاری ہے اور امور غیر اختیاریہ میں امر و نہی وارد نہیں ہوا کرتی پھر یہاں لَا تَحْزَنْ کیوں فرمایا گیا۔

جواب کا حاصل یہ ہے یہاں حقیقت میں حزن پر نہی وارد نہیں ہے۔ بلکہ اسباب حزن سے

روکنا مقصود ہے۔ اور اسباب حزن اختیاری ہیں گو حزن اختیاری نہ ہو۔ چنانچہ میں نے بتلا دیا کہ تبلیغ میں حزن کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ثمرہ پر نظر کی جائے اور ثمرہ کو مقصود سمجھ کر عمل کیا جائے اس سے ممانعت مقصود ہے اور یہیں سے سالکین کو سبق لینا چاہئے۔ کہ وہ جو ذکر و شغل اور اطاعت و عبادت کرتے ہیں اس میں خود عمل کو مقصود سمجھا کریں جو اختیار میں ہے ثمرات کو مقصود نہ سمجھیں جو غیر اختیاری ہیں ورنہ جو شخص ثمرات کو مقصود سمجھ کر چند روز کے بعد وہ عمل میں کوتاہی کر دے گا جبکہ ثمرات کا ترتب نظر نہ آئے گا۔ اور جو ثمرات پر نظر نہ کرے گا وہ برابر کام میں لگا رہے گا اور روز بروز ترقی کرتا چلا جائے گا کیونکہ مدار ترقی عمل ہے۔ احوال و مواجید پر ترقی کا مدار نہیں، خوب سمجھ لو۔ البتہ امور اختیاریہ موضوع ہیں ترقی کے لئے ان کے اکتساب کا حکم فرمایا گیا چنانچہ اس کے آگے ہی ارشاد فرمایا:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ۔

(مردوں کیلئے انکے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کیلئے انکے اعمال کا حصہ ثابت ہے)

بہر حال امور غیر اختیاریہ کی تمنا سے اس لئے منع کر دیا گیا کہ تمنا سے عدم حصول کے وقت غم بڑھتا ہے اور غم سے تعطل تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ ہاں امور غیر اختیاریہ میں اتنی اجازت ہے۔

وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو) کہ حق تعالیٰ سے ان امور غیر اختیاریہ کے لئے دعا کرو مگر اس تفصیل سے کہ جن چیزوں کا سوال نصوص میں وارد ہے، ان کا تو با تعیین سوال کرو اور جن کا سوال وارد نہیں ان کی مجملا دعا کرو کہ اے اللہ! ہمیں بھی ذوق باطن یا شوق و خوف عطا فرما دیجئے مگر اس طرح تعیین نہ کرو کہ شوق[1] کا غلبہ ہو یا خوف کا غلبہ وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ بچہ کو غذا مانگنے کا تو حق ہے تعیین کا حق نہیں ہے۔ کہ بوٹی دیدو یا روٹی دیدو یا پلاؤ دے دو۔ دینے والے کے اختیار پر ہے جو مصلحت سمجھیں گے دیدیں گے اور دعا کے بعد بھی اگر کسی میں بھی مصلحت نہ ہوگی تو کچھ بھی نہ دیں گے۔ اسی لئے فرماتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا (بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں) مطلب یہ کہ اگر دعا کے بعد بھی کچھ قبول کے آثار ظاہر نہ ہوں تو مغموم نہ ہونا بلکہ سمجھ لینا کہ شاید میرے حق میں ذوق کا عطا ہونا مصلحت نہیں یا اس وقت مصلحت نہیں اور مرنے کے قریب عطا ہو۔

---

[1] (فان قلت) یرد علیه الحدیث واسئلک شوقا الی لقاءِ ک فی غیر ضراء مضرة ولا مضله الخ ففیه طلب الذوق بالتعیین وکذا وردالدعا مجهول الخوف والیقین اللّٰهُمَّ الا ان یحمل کل ذلک علی العقلی دون الطبعی(قلت) لا یرد لا ن الوارد سوال نفس الشوق والخوف غلبته حد هما بالیقین. ۱۲ منه. (تفسیر الطبری63:7، اتحاف السادة المتقین407:8 بلفظ : شحا مطاعا")

جہاں جن امور غیر اختیاریہ میں نص سے تعیین کی اجازت ہے وہاں تعیین کے ساتھ دعا کرنا جائز ہے جیسے کچھ مثالیں گزر چکیں کچھ اور بھی عرض کرتا ہوں مثلاً وارد ہوا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْجَنَّةَ وَمَا قرب الیھا من قول او عمل (المصنف لابن ابی شیبۃ393:3)

اور اس طرح جنت کے جو مختلف درجے ہیں اُن میں سے جنت الفردوس کی تعیین بھی جائز ہے کیونکہ حضورؐ نے اس کی اجازت دی ہے باقی اس سے زیادہ تعیین جائز نہیں کہ جنت کا وسط ہو یا یمین و یسار ہو۔ یا قصر ابیض ہو یا اخضر ہو۔

اب یہاں ایک سوال ہوسکتا ہے وہ یہ کہ اگر دنیا میں کسی کو 100 روپیہ کی ضرورت ہو تو کیا سو روپیہ کی دعا کرنا جائز ہے اگر جائز ہے تو اس کے تعیین کا جائز ہونا نا کس نص سے جائز ہوا اور اگر نص نہیں تو بدوں نص کے یہاں تعیین کیونکر جائز ہوئی اور یہاں تعیین جائز ہے۔ اور اس میں اور امور باطنہ ذوقیہ میں تعیین بدوں نص کیوں جائز نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تعیین جائز ہے اور اس میں اور امور باطنہ ذوقیہ میں فرق یہ ہے کہ ذوق کا حصول چونکہ شرط قبول نہیں اس لئے اس سے وہاں کلیتہً بھی قطع نظر ہوسکتی ہے پھر فرد معین سے نظر کا قطع کرلینا کیا مشکل ہے، بخلاف معاملات دنیا کے یہاں بعض حوائج چونکہ ظاہر میں خاص مقدار دراہم و دنانیر پر موقوف ہوتے ہیں اس لئے اس مقدار سے انسان قطع نظر نہیں کرسکتا۔ پس یہاں تعیین کی اجازت ہے اور چونکہ روپیہ حوائج دنیویہ کے لئے اسباب عادیہ سے ہے اس لئے روپیہ مانگنے کی بھی اجازت ہے ورنہ قاعدہ کا مقتضاء یہ تھا کہ مقصود کا سوال جائز ہوتا۔ روپیہ کا سوال جائز نہ ہوتا۔ مثلاً کسی کو مکان بنانے کی ضرورت ہے، تو اُس کو یہ سوال جائز ہوتا کہ اے اللہ مجھے گھر دیدے مگر نہیں چونکہ روپیہ عادۃً ان حوائج کا سبب ہے اس لئے دونوں باتیں جائز ہیں کہ چاہے مقصود کا سوال کرو یا روپیہ کا اور مقدار کی تعیین بھی جائز ہے بلکہ یہاں تک ارشاد ہے کہ نمک کے لئے بھی دعا کرو اور جوتا کا تسمہ ٹوٹ جائے تو تسمہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو کیونکہ یہ سب اسباب عادیہ سے ہیں بلکہ ارشاد ہے۔

فلیغرم المسئلة اور ان اللّٰه یحب الملحین فی الدُّعا

(لم اجد الحدیث بھذہ الالفاظ فی موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی الشریف)

کہ دعا خوب پختگی اور اصرار سے کرے البتہ جب کوشش کے ساتھ دعا کر چکے پھر بھی سو روپیہ یا ہزار روپیہ نہ ملیں یا مریض کو شفاء نہ ہوئی تو اب حکم ہے کہ اس مقدمہ کو ذہن میں حاضر کرو کہ میرے لئے یہی مصلحت تھی اس کے خلاف میں مصلحت نہ تھی۔ اور میں کہتا ہوں۔

اور علاوہ اس کے حکم ہونے کے دوسری مصلحت بھی اسی میں ہے وہ یہ کہ ناکامی کے بعد اب تسلی بھی اسی سے ہوگی اور اگر اس کو منحصر نہ کیا جائے تو عمر بھر بھی حسرت سے نجات نہیں ہو سکتی۔ جب یہ خیال آئے کہ علاج میں طبیب سے غلطی ہوگئی تھی یا مجھ کو دوستوں نے فلاں تجارت کا مشورہ دیا تھا میں نے ان کا مشورہ قبول نہ کیا اور نقصان اُٹھایا کاش! میں ان کا مشورہ قبول کر لیتا یا اپنے مریض کا علاج اس حکیم سے نہ کراتا دوسرے لائق طبیب سے کراتا تو اب تسلی اسی میں منحصر ہے کہ۔ الخیر فی ما وقع ۔ کہ مصلحت وحکمت اسی میں تھی جو ہو گیا۔

حاصل یہ ہوا کہ اس آیت میں بندہ کی تربیت اس ترتیب سے کی گئی ہے کہ امور اختیاریہ کی تمنا تو مطلقاً جائز ہے خواہ امور باطنہ ہوں یا ظاہرہ اور اُن پر عمل وسعی کا امر ہے اور امور غیر اختیاریہ کی تمنا مطلقاً ممنوع ہے۔ ہاں دعا جائز ہے پھر اگر وہ امور غیر اختیاریہ یا باطنہ ہوں تو وہاں یقین کے ساتھ دعا کرنا بدوں ورود نص کے جائز نہیں کیونکہ باطن میں امور غیر اختیاریہ پر کوئی مقصود موقوف نہیں نہ وہ حصول مقصود کے لئے اسباب عادیہ سے ہیں اور امور غیر اختیاریہ ظاہرہ ہوں تو اگر وہ حصول مقصود کے لئے اسباب عادیہ سے ہوں تو ان کے لئے دعا تعیین کے ساتھ بھی جائز ہے مگر ناکامی کے بعد ہر حال میں۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں) کا استحضار لازم ہے یہ مضمون درمیان میں آ گیا تھا جس کو تفصیل سے بیان کر دیا گیا، اصل میں میں یہ کہہ رہا تھا کہ امور غیر اختیاریہ کے نہ ہونے سے غم نہ کرو، ان میں کمی ہونا یا ان کا بالکل نہ ہونا موجب حرمان ونقص نہیں ہاں کسی کا بہت ہی دل چاہے تو ان امور کے لئے دعا کر سکتا ہے، البتہ جو امر اختیاری ہو اُس میں کوتاہی کرنا موجب تشنیع ہے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت طبعیہ کسی میں کم ہو تو مضائقہ نہیں۔ ہاں محبت عقلیہ میں کمی نہ ہونا چاہئے۔ اور محبت عقلیہ کی کمی یہ ہے کہ مخلوق کی رضا کو اللہ تعالیٰ کی رضا پر ترجیح دی جائے، اسی کا اسی آیت میں بیان ہے۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ (تمہارے سامنے یہ منافقین اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو راضی کر لیں) پس اس جگہ منافقین پر اسی وجہ سے تشنیع ہے کہ وہ رضائے خالق پر ترجیح دیتے تھے پس اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم بھی مستحق ملامت ہوں گے۔

مقاومت بے جا کا اثر

اب آج کل ہر شخص اپنی حالت پر غور کرے کہ اُس میں یہ مرض موجود ہے یا نہیں جہاں تک دیکھا جاتا ہے یہ مرض قریب قریب ہر شخص میں موجود ہے (الا مَنْ عصم الله) کہ جب

رضائے خلق ورضائے حق میں تزاحم ہوتا ہے تو یہ رضائے خلق راجح کرتا ہے اور بعض تو ایسے ہیں جو لکھے پڑھے ہیں کہ وہ اس کو کھینچ تان کر رضائے حق پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور گو اُن کے دل میں کھٹک بھی ہوتی ہے کہ یہ کام رضائے حق کے لئے نہیں ہے بلکہ رضائے خلق کے لئے ہے لیکن وہ بار بار ایسی ہی دلیلوں سے اس کھٹک کی مقاومت کرتے ہیں جن کا دلیل نہ ہونا ان کو خود معلوم ہے اگر وہ دلیل کچھ دلیل ہوتی تو اس سے اول ہی اطمینان حاصل ہوتا جب اطمینان نہیں ہوا بلکہ کھٹک موجود ہے تو معلوم ہوا کہ وہ دلیل کا نہیں بلکہ ضاد کے ساتھ ضلیل ہے لیکن اس مقاومت مجہول کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز میں وہ کھٹک بھی جاتی رہتی ہے اور دل مردہ ہو جاتا ہے جس سے یہ خوش ہوتا ہے کہ بس اب شرح صدر ہو گیا کہ یہ فعل رضائے حق کے لئے ہے حالانکہ کھٹک کا زائل ہونا شرح صدر کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس مقاومت بے جا کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ قلب کا یہ قاعدہ ہے کہ ناجائز فعل سے اول وہلہ میں اس کو جس قدر کراہت ونفرت ہوتی ہے دوسری مرتبہ میں ویسی نفرت نہیں ہوتی اور اس میں جو کھٹک اول وہلہ میں پیدا ہوتی ہے اگر اس پر عمل نہ کیا گیا۔ بلکہ اس کو دبا دیا گیا تو پھر یہ کھٹک کمزور ہو جاتی ہے۔ اور بار بار کے دبانے سے بالکل جاتی رہتی ہے جو قلب کے سیاہ وبے حس ومردہ ہو جانے کی دلیل ہے کہ اب قلب کو گناہ سے الفت ہو گئی ہے۔ اس لئے کھٹک نہیں رہی مگر یہ شخص سمجھتا ہے کہ مجھ پر حق واضح ہو گیا اور شرح صدر ہو گیا ہے اسی لئے کھٹک موقوف ہو گئی ہے۔ یاد رکھو یہ حالت سخت خطرناک ہے۔

فرشتہ غیبی

تاریخ میں لکھا ہے کہ جب حضرت یوشع علیہ السلام عمالقہ پر جہاد کرنے تشریف لے گئے تو عمالقہ میں بلعم باعور ایک عابد زاہد مستجاب الدعوات تھا وہ لوگ اس کے پاس گئے کہ یوشع علیہ السلام اور ان کی قوم پر بددعا کرو اس نے انکار کیا کہ وہ نبی ہیں اور نبی پر بددعا کرنا کفر ہے لوگوں نے اس کی بیوی کو مال وزر کا لالچ دیا کہ کسی طرح بلعم باعور کو بددعا پر آمادہ کرے بیوی نے اس پر زور دیا تو اس نے اس کو وہی جواب دیا کہ نبی کے مقابلہ میں بددعا کرنا کفر ہے ہرگز بددعا نہ کروں گا، بیوی نے کہا کہ اچھا تم اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرو وہ احمق استخارہ پر راضی ہو گیا حالانکہ یہ بات محل استخارہ نہ تھی کیونکہ استخارہ اُن امور میں مشروع ہے جس کی دونوں جانبیں اباحت میں مساوی ہوں اور جس فعل کا حسن یا قبیح دلائل شرعیہ سے متعین ہو ان میں استخارہ مشروع نہیں۔

در کارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست ہم در شر در حاجت ہیچ استخارہ نیست

(نیک کام میں استخارہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے برائیوں کے چھوڑنے میں استخارہ کی کچھ بھی ضرورت نہیں ہے)

پہلی حماقت تو اس نے یہ کی کہ اس امر میں استخارہ کو حجت سمجھا پھر جب استخارہ کیا تو اس کو بذریعہ کسی فرشتہ کے غیب سے سخت تنبیہ کی گئی کہ اگر تو نے بد دعا کی تو سب عبادت و مجاہدہ وغیرہ غارت ہو جائے گا اور تو مردود ہو جائے گا۔ اس نے بیوی سے بیان کیا کہ مجھے سخت تنبیہ کی گئی ہے اور میں بد دعا نہ کروں گا۔ اس نے کہا کہ ایک دفعہ کا استخارہ حجت نہیں ممکن ہے کہ تمہارے خیال میں جو بات جمی ہوئی ہے وہی استخارہ میں مختلط ہوگئی ہو چند بار اور استخارہ کرو چنانچہ دوسری دفعہ پھر کیا اور اب بھی سخت تنبیہ کی گئی تیسری بار پھر کیا اس دفعہ بھی سخت ملامت و زجر ہوا چوتھی بار استخارہ کیا تو اب کچھ تنبیہ نہ ہوئی بیوی نے کہا کہ بس معلوم ہو گیا کہ یہ فعل جائز ہے اور تین مرتبہ جو تم کو تنبیہ و زجر کا انکشاف ہوا ہے یہ وہی خیال منکشف ہوا ہے جو پہلے سے دل میں جما ہوا تھا۔ اگر یہ فعل ناجائز ہوتا تو چوتھی بار میں تنبیہ کیوں نہ ہوئی۔

اس کمبخت نے دوسری حماقت یہ کی کہ وہ بھی یہی سمجھ گیا کہ چوتھی دفعہ میں تنبیہ نہ ہونا اس کے جواز کی علامت ہے اور بد دعا کے لئے آمادہ ہو گیا۔ یہ نہ سمجھا کہ تنبیہ و زجر بقدر ضرورت ہوا کرتا ہے اور تین بار تنبیہ ہونا تو قدر ضرورت سے بھی زیادہ تھا جب تو نے تین بار اس کو دفع کیا اور اُس سے متاثر نہ ہوا تو اب حق تعالیٰ کو بار بار تنبیہ کی کیا ضرورت تھی یہ ان کا تھوڑا فضل و احسان تھا کہ جس کام کے لئے استخارہ مشروع بھی نہ تھا اس میں تجھ کو تین دفعہ استخارہ ہی میں متنبہ کیا جب تو نے بار بار اعراض کیا تو ادھر سے بھی اعراض ہو گیا، چنانچہ کمبخت نے نبی کے مقابلہ میں بد دعا کی۔ اور ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ بد دعا کرتے ہی ایمان سلب ہو گیا۔ اور دنیا میں ہی یہ عذاب نازل ہوا کہ بد دعا کے ساتھ ہی زبان کتے کی طرح باہر لٹک گئی۔

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْن

(جس سے دنیا و آخرت دونوں کھو بیٹھا یہی کھلا نقصان ہے)

تو حضرت یہ کھٹک بھی ایک فرشتہ غیبی ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے آپ کو متنبہ کرتا ہے جب بار بار تم اس کو دباؤ گے تو وہ خاموش ہو جائے گا اور یہ سخت بات ہے۔

دل کی کھٹک

بعض لوگ ممکن ہے یوں کہیں کہ جب ہم نے قواعد شرع کے بموجب ایک کام کیا ہے تو پھر کھٹک پر توجہ کرنے کی کیا ضرورت ہے ان سے میں کہتا ہوں کہ شریعت کا یہ بھی تو ایک فائدہ ہے۔

الا ثم ما حاک فیٔ صَدْرِکَ۔

کہ گناہ وہ ہے جس سے تمہارے دل میں کھٹک پیدا ہو پھر تم نے اس قاعدہ پر عمل کیوں نہ کیا اور جب کسی عمل کے متعلق دل میں کھٹک پیدا ہوئی تھی اس کو کیوں نہ چھوڑا۔

میرے ایک دوست نے خوب کہا ہے کہ جب علماء کسی فعل کے جواز وعدم جواز میں اختلاف کرتے ہیں اور کوئی اُسے واجب وضروری نہ کہے تو اسے ترک کردینا چاہئے۔ واقعی ایمان کی سلامتی اسی میں ہے کیونکہ جس بات کے جواز وعدم جواز میں اختلاف ہو اس کو کرتے ہوئے دل میں کھٹک ضرور ہوگی اور جس بات میں کھٹک ہو وہ حدیث[1] کی رو سے گناہ کا فرد ہے مگر آج کل حالت یہ ہے کہ میں نے کان پور میں بعض رسوم وبدعات کے رد میں بیان کیا تو ایک انسپکٹر صاحب وعظ کے بعد مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ تو گیارہویں شریف سے منع کرتے ہیں اور دوسرے بزرگ اس کو جائز کہتے ہیں تو ہم کیا کریں۔ میں نے کہا کہ یہ سوال شبہ کی وجہ سے ہے یا اعتراض کی بناء پر۔ کہنے لگے نہیں اعتراض مقصود نہیں بلکہ اپنی تسلی چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کو تحقیق حق مقصود ہے تو ایمان سے کہئے کبھی اُن بزرگ سے بھی آپ نے یہ سوال کیا ہے کہ حضرت آپ تو اس کو جائز کہتے ہیں اور فلاں اس کو ناجائز کہتا ہے۔ کہا نہیں۔ میں نے کہا آخر اس بے انصافی کی کیا وجہ ہے کہ اُن کے قول سے میرے قول میں تو آپ کو شبہ پیدا ہوا اور میرے قول سے اُن کے قول میں شبہ پیدا نہ ہوا۔ اس کی دو ہی وجہ ہو سکتی ہیں یا تو آپ کو اتنا علم حاصل ہے جس سے قوت فیصلہ آپ میں پیدا ہوگئی۔ کہ اُن کے دلائل کی قوت اور ہمارے دلائل کا ضعف آپ کو معلوم ہوگیا اگر یہ ہے تو آپ خود محقق ہیں پھر مجھ سے تحقیق کیوں چاہتے ہیں اور اگر یہ نہیں تو بس اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ کا دل گیارہویں کرنے کو چاہتا ہے اس لئے جس کی بات دل کی موافق ہوئی اس میں شبہ پیدا نہیں ہوا اور جس کی بات دل کی مرضی کے خلاف ہوئی اس میں شبہ پیدا ہوا تو آپ اور جس کی بات دل کی مرضی کے خلاف ہوئی اس میں شبہ پیدا ہوا تو آپ نہ اُن مولوی صاحب کے متبع ہیں نہ ہمارے بلکہ اپنی رائے کے متبع ہیں اور یہ حالت شان اسلامی کے خلاف ہے یہ تو وہ بات ہے جو قرآن میں منافقوں کے متعلق بیان کی گئی ہے۔

یَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ ھٰذَا فَخُذُوْہُ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْتَوْہُ فَاحْذَرُوْا

یہ منافقین کی حالت تھی کہ وہ خدا اور رسول سے اپنی غرض کے واسطے استفتاء کرتے تھے اگر موافق رائے جواب ملا تو مولانا روشن دماغ ہیں زمانہ شناس ہیں اور خلاف رائے جواب ملا تو تاریک خیال پست خیال۔ قوم کو پستی کی طرف لے جانے والے کا خطاب ملتا ہے۔

میں گیارہویں کرنے والوں سے پوچھتا ہوں کہ جو علماء اس کو جائز کہتے ہیں کیا وہ اس کو

---

[1] مسند أحمد 6:58، اتحاف السادة المتقين 2:71

واجب وفرض بھی کہتے ہیں ہرگز نہیں تو پھر تم یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ ایک طرف تو یہ فتویٰ ہے کہ جائز ہے مگر واجب نہیں اور دوسری طرف یہ فتویٰ ہے کہ ناجائز ہے بدعت ہے اور اس صورت میں اس کا کرنا کھٹک سے خالی نہیں مگر کھٹک پیدا ہو جو خالی الذہن ہو کر غور کرے اور جس کے دل میں پہلے ہی سے یہ بات جمی ہوئی ہے کہ کرنا چاہئے اُس کو جواز کے فتوے میں کیوں کھٹک ہوگئی۔

رضاءِ خلق کی ترجیح

اور اگر یہ کہا جائے کہ گو واجب تو نہیں مگر باعث برکت ہے تو میں کہتا ہوں کہ جن کی گیارہویں تم کرتے ہو وہ خود کس چیز سے بابرکت ہوئے تھے کیا وہ بھی اپنی گیارہویں کرتے تھے یقیناً نہیں تو پھر تم وہ کام کیوں نہیں کرتے جس سے وہ گیارہویں والے بابرکت ہوئے تھے اور جو بزرگ اُن سے پہلے ہوئے ہیں یعنی صحابہ وتابعین کیا وہ بدوں گیارہویں کے ناقص تھے۔ کچھ نہیں یہ سب باتیں وہی ہیں جن سے کھینچ تان کرنا جائز کو جائز بنایا جاتا ہے۔

اسی طرح مجھ کو یہ بھی گراں ہے کہ بعض لوگ نہایت اہتمام سے حزب البحر کی اجازت لیتے پھرتے ہیں یہ بھی پیرجیوں کے ڈھکوسلے ہیں کیا حزب البحر سے پہلے قرب حق کا کوئی طریقہ نہ تھا جو آج قرب حق اُسی پر موقوف ہوگیا۔ آخر خود ملہم حزب البحر (شیخ ابوالحسن شاذلیؒ) اس کے الہام ہونے سے پہلے اس قابل کیونکر ہوگئے کہ ان کو یہ دُعا الہام ہوئی پھر تم وہی عمل کیوں نہیں کرتے جو وہ اس کے الہام ہونے سے پہلے کرتے تھے ممکن ہے پہلے یہ اعمال مندوبات ہوں مگر اب تو یہ سب قابل ترک ومنع ہیں کیونکہ لوگ غلو کرنے لگے اور حد سے بڑھنے لگے ہیں چنانچہ عام طور پر قلوب میں اعتقاداً حزب البحر کی ایسی وقعت ہے کہ ادعیہ ماثورہ کی وہ وقعت نہیں اور اس کا غلو ہونا ظاہر ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج کل عام طور پر رضائے خلق کو رضاء حق پر ترجیح دی جارہی ہے اور جو لکھے پڑھے ہیں وہ کھینچ تان کر اُن کو رضاء حق پر منطبق کرتے ہیں مگر جس انطباق کے لئے یہ تاویل اور کھینچ تان کی ضرورت ہو وہ انطباق نہیں ہمارے ماموں صاحب کا مقولہ ہے "کلامیکہ محتاج یعنی باشد لا یعنی است" (جو کلام یعنی کا محتاج ہو وہ لایعنی ہے) مطلب یہ ہے کہ جس مراد کا انطباق کلام پر ظاہر نہ ہو اور اس کے تطبیق کے لئے تاویل بعید یا تحریف سے کام لیا جائے اور یعنی یعنی کے ساتھ اس کو بیان کیا جائے وہ لایعنی ہے۔

معیارِ تاویل

جیسے آج کل کی ایک شخص نے سورہ بقرہ کی تفسیر لکھی ہے وہ مفسر اس قابل ہے کہ بقرہ کی طرح

ہی ذبح کر دیا جائے ظالم نے تمام عبادات کو سیاسیات پر محمول کیا ہے کہ نماز روزہ سب سیاست کے واسطے ہے نماز میں پریڈ کی تعلیم ہے تا کہ افسر کی اطاعت کرنا آ جائے اگر وہ اٹھنے کو کہے اٹھو بیٹھنے کو کہے بیٹھو، جھکنے کو کہے جھک جاؤ، اسی واسطے نماز میں امام مقرر کیا جاتا ہے تا کہ سب اس کے افعال کی اطاعت واتباع کریں جس سے پریڈ کے افسر کی اطاعت سہل ہوگی۔ روزہ اس واسطے مشروع ہے تا کہ جنگ میں فاقہ کا تحمل ہو سکے کیونکہ جنگ میں بعض دفعہ کھانے کو نہیں ملتا حج بھی اسی واسطے ہے تا کہ مسلمان سفر کے عادی ہوں اور گھر بار چھوڑنا اُن پر گراں نہ رہے اور احرام بھی اسی واسطے ہے تا کہ ترک زینت کی عادت ہو ایک لنگی ایک چادر سردی گرمی کے تحمل کے عادل ہوں وغیرہ وغیرہ گویا کوئی عبادت خدا کی یاد اور عبادت و بندگی کے لئے مشروع نہیں ہوئی۔ بس ساری شریعت میں ملک گیری اور سیاست ہی کی تعلیم ہے یہ ہے اس مقولہ کا مصداق۔ کلامیکہ محتاج یعنی باشد لایعنی است'' کیونکہ نماز روزہ اور حج سے آج تک بلا خصوص کسی نے نہ سمجھا تھا۔ یہ باتیں فرصت میں بیٹھ کر اسی شخص نے گھڑی ہیں اور کھینچ تان کر نصوص کو اُن پر منطبق کیا ہے جیسے بعض شعراء نے قرآن کی بعض آیتوں کو کھینچ تان کر اوزان شعر پر منطبق کیا ہے اور اس شخص نے یہ تفسیر لکھ کر گویا مخالفین اسلام کو یہ سبق پڑھایا ہے کہ وہ مسلمانوں کی نماز روزہ اور حج وزکوٰۃ کو بھی خطرہ کی نظر سے دیکھیں کیونکہ ان سب میں مقابلۂ اعداء کا طریقہ سکھلایا جاتا ہے اور یہ نماز نہیں بلکہ چاند ماری ہے مگر مسلمان ہیں کہ اس تفسیر پر لٹو ہیں کیونکہ وہ چکنے کاغذ پر چھپی ہوئی ہے۔ اور جلد بھی خوبصورت ہے اور آج کل کی کتاب کی خوبی اسی میں رہ گئی ہے کہ عمدہ چھپی ہوئی ہو ٹائٹل خوب صورت ہو۔ اس لئے بہت لوگ اس کو خریدتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے اندر کیا بھرا ہے، اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے ایک صندوق نقش و نگار سے مزین ہو اور اس کے اندر سانپ بند ہو خریدنے والا اوپر کے نقش و نگار سے فریفتہ ہو کر اُسے خریدتا ہے مگر جب کھولے گا اس وقت حقیقت منکشف ہوگی اور میں سچ کہتا ہوں کہ اس مصنف کا دل بھی خود جانتا ہے کہ نماز روزہ حج زکوٰۃ کے جو مقاصد اس تفسیر میں لکھے ہیں وہ قرآن کا مفہوم ہرگز نہیں۔ یہ محض ایجاد بندہ ہے جس سے محض یہ مقصود ہے کہ اُس تحریک کی تائید قرآن سے کی جائے جس میں یہ شخص اور اس کی جماعت ایک زمانہ میں پیش پیش تھے۔ قرآن کی تفسیر ہرگز مقصود نہیں تھی مگر مخلوق کو دھوکہ دینے کے لئے اس کو قرآن کی تفسیر میں ٹھونسا گیا ہے سو یاد رہے۔

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام ۔۔۔ در غلط انداز تا ہر خاص و عام
کارہا با خلق آری جملہ راست ۔۔۔ با خدا تزویر و حیلہ کے رواست

(میں نے فرض کیا کہ اگر تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر خدا تعالیٰ کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے۔ مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں خدا تعالیٰ کے ساتھ مکر وحیلہ کب جائز ہے)

یہ ممکن ہے کہ تم ان تاویلوں سے مخلوق کو دھوکہ میں ڈال دو مگر خدا کے سامنے یہ تاویلیں نہ چلیں گی۔ اس لئے ؎

کارہا او راست باید داشتن رایت اخلاص و صدق افراشتن

(حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ سب کام درست رکھنے چاہئیں اور سچائی کا علم بلند کرنا چاہئے)

تاویل وہ کرو جو خدا کے سامنے بھی بیان کرسکو اور بس میں سب کو یہی معیار بتلاتا ہوں کہ جس بات سے دل میں کھٹک پیدا ہو اور تم تاویل سے اس کو رضائے حق پر منطبق کرنا چاہو تو دل سے یہ پوچھ لو کہ یہ تاویل خدا تعالیٰ کے سامنے بھی بیان کرسکتا ہے۔ یقیناً غلط تاویل کے متعلق دل ایک بار تو یہ ضرور کہہ دے گا کہ خدا کے سامنے یہ بات نہیں چل سکتی۔ بس اسی سے سمجھ جاؤ کہ یہ بات بنائی ہوئی ہے اور اگر اب نہیں سمجھو گے تو وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جس میں اچھی طرح ان تاویلوں کی حقیقت سمجھا دی جائے گی۔

فسوف تری اذا انکشف الغبار افرس تحت رجلک ام حمار

(عنقریب جب غبار ہٹ جائے گا تو پھر معلوم ہو جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر یعنی آنکھ بند ہوتے ہی پتہ چل جائیگا کہ تم نے اچھا کیا یا برا)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ (جس روز سب کی قلعی کھل جائے گی پھر انسان کو نہ خود مدافعت کرنے کی قوت ہوگی اور نہ کوئی اس کا حمایتی ہوگا)

گھبراؤ نہیں انکشاف سرائر کا وقت بھی عنقریب آنے والا ہے اس وقت ان تاویلوں کو بیان کرنا جن سے آج تم دل کی کھٹک کو دبا رہے ہو پس سلامتی اسی میں ہے کہ جس کام میں کھٹک ہو اور جس میں علما کا اختلاف ہو اس کو ترک کرو جبکہ جواز وعدمِ جواز ہی میں اختلاف ہو اور اگر فرض وحرام میں اختلاف ہو تو وہاں اُس شخص کا اتباع کرو جس پر زیادہ اعتقاد ہو۔ فاتحہ خلف الامام کہ اس میں صوفیہ حنفیہ اپنے امام کے قول کو نہیں چھوڑتے کیونکہ گو امام شافعی قرأت خلف الامام کو فرض کہتے ہیں مگر امام ابوحنیفہ مکروہ تحریمی کہتے ہیں باقی جن مسائل میں جواز و عدمِ جواز کا اختلاف ہو ان میں صوفیہ کا بھی عمل یہی ہے کہ وہ اس فعل کو ترک کر دیتے ہیں اسی واسطے کہا جاتا ہے کہ الصوفی لا مذھب لہ یہ مطلب نہیں کہ صوفی لاء مذہب ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ محتاط ہوتا ہے اور ہر مسئلہ میں احتیاط کی جانب کو اختیار کرتا ہے ورع اور تقویٰ اسی

کا نام ہے ہمارے فقہاء نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔

رعایۃ الخلاف والخروج منہ اولیٰ ما لم یرتکب مکروہ مذھبہ۔

کہ اختلاف سے نکلنا مستحب ہے جب تک اپنے مذہب کے کسی مکروہ کا ارتکاب نہ ہو

تعلیل قلب

پس جو لوگ تاویلیں کر کے ناجائز کو جائز بنا لیتے ہیں اور دل کی کھٹک پر توجہ نہیں کرتے اور وہ خوش ہیں کہ جب ہم نے قواعد شرعیہ کے موافق کام کیا ہے تو پھر کھٹک پر کیوں توجہ کریں وہ یاد رکھیں کہ۔
الاثم ماحاک فی صدرک۔ (العلل المتاھیۃ 254:1) (جو دل میں کھٹک پیدا کردے گناہ ہے)

بھی قاعدہ شریعہ ہے اس پر بھی تو عمل کرو اس کی کیا وجہ ہے کہ روپیہ حرام مال کا آیا اور دل میں اس سے کھٹک پیدا ہوئی اور تم تاویلیں کر کے اس کو لینا چاہتے ہو اور نفس چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کا لینا ہی جائز ہو جائے۔ اور کسی عالم نے اس کو حرام کہہ دیا تو اس کے فتوے پر عمل نہیں کیا جاتا بلکہ دوسرے اور تیسرے عالم سے استفتاء کیا جاتا ہے۔ اگر کسی نے اُس کو جائز کہہ دیا تو اب دل کی کھٹک کو اس فتوے سے دفع کرتے ہیں، سو یہ تاویل باطل ہے۔

یاد رکھو: تاویل حق وہ ہے جو بے ساختہ قلب میں آ جائے اور اُس کے لئے کوشش نہ کی جائے، اور کوشش کو جاری نہ رکھا جائے اور جس تاویل کے لئے کوشش کرنا اور اس کو جاری رکھنا پڑے وہ تاویل نہیں بلکہ تعلیل ہے۔ یعنی دل کا بہلانا پھسلانا ہے ورنہ چاہئے تھا کہ جب تمہارے دل میں از خود کھٹک تھی تو اس مسئلہ میں اسی عالم کا قول اختیار کیا جاتا جو اُس روپیہ کو حرام بتلاتا ہے کیونکہ اُس کا فتویٰ تمہارے دل کے فتوے کے مطابق ہے مگر حالت یہاں یہ ہے کہ فتویٰ حرمت کے بعد بھی اس کی کوشش ہے کہ کوئی عالم اس کو جائز کردے تو ایک بہانہ روپیہ لینے کے لئے ہاتھ آ جائے پس یہ تاویل نہیں بلکہ بہانہ ہے جس کا منشاء اتباع ہوائے نفس ہے جس کا علاج ضروری ہے اور اس کا علاج صرف یہ ہے کہ کسی محقق کی جوتیاں سیدھی کرو

نفس نتواں کشت الا ظل پیر دامن آں نفس کش را سخت گیر
ایں ہوارا نشکند اندر جہاں ہیچ چیزے ہمچو سایہ ہمرہاں

نفس کی خواہش بدوں سایہ ہمرہاں طریق کے نہیں ٹوٹ سکتی۔
(نفس کی خواہشات وک بجز سایہ پیر کے نہیں تور سکتے اس نفس کچکنے کا دامن مضبوط پکڑو۔ نفس کی خواہشات کو سوائے سایہ رفقائے طریق کے اور کوئی نہیں توڑ سکتے)

محق و محقق و پیر

مگر پیر کے واسطے ضرورت ہے محق ہونے کی اور محقق ہونے کی محق ہونے کے تو معنی یہ

ہیں کہ اس کے عقائد صحیح ہوں متبع سنت ہو اور محقق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وساوس نفس پر اس کی نظر گہری ہو بدوں ان دونوں کے پیر کامل نہ ہوگا پیر اگر محق ہوا اور محقق نہ ہوا تو اس کی نیت تو درست ہوگی مگر نگاہ دور تک نہیں پہنچے گی۔

محقق و محق و مبطل کی حقیقت ایک مثال سے آپ پر واضح ہو جائے گی مثلاً ایک پیر کی دعوت کی گئی اور جس وقت آدمی بلانے آیا اس وقت اُس کے پاس مریدوں کا مجمع تھا وہ بھی ساتھ ہو لئے۔ اگر وہ مبطل ہے تو اس کو اس کی طرف التفات ہی نہ ہوگا کہ دوسروں کو ساتھ لینا حرام ہے بلکہ وہ تو اصرار کر کے سب کو ساتھ لے جاتا ہے اور بعض اُن میں سے یہ تاویل کر لیتے ہیں کہ جب ہماری دعوت کی گئی ہے تو مریدوں کی بھی دعوت کی گئی ہے کیونکہ الشی اذا ثَبَتَ ثَبَتَ بلوازمہ اور مرید ہمارے لوازم میں سے ہیں تو یہ بھی مدعو ہیں جیسے بہت لوگ اسی تاویل سے دعوت میں اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔

ایک شخص کے اولاد نہ تھی اس نے ایک بچھڑا پال رکھا تھا وہ اپنے ساتھ دعوت میں بچھڑے کو لے گیا، لوگوں نے کہا یہ کیا حرکت ہے سب لوگ اپنے اپنے بچوں کو بدوں بلائے ساتھ لائے ہیں میرے کوئی لڑکا نہیں ہے یہی بچھڑا بجائے اولاد کے ہے میں اس کو ساتھ لے آیا تو کیا گناہ ہوا۔

اور اگر محق ہوا تو اس کو مریدوں کے ساتھ ہونے سے کھٹک تو ضرور پیدا ہوگی مگر وہ بہت سے بہت یہ کرے گا کہ ظاہر حدیث[1] پر عمل کرے گا کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تھی ایک شخص آپؐ کے ساتھ ہولیا جب آپ داعی کے گھر پر پہنچے تو داعی سے فرمایا کہ یہ شخص بدوں بلائے ہمارے ساتھ ہولیا ہے اب اگر تم اجازت دو گے تو یہ اندر آجائے گا ورنہ لوٹ جائے گا۔

یہ محق بھی اسی پر عمل کرے گا کہ داعی کے گھر پہنچ کر اس سے کہہ دے گا کہ یہ مجمع میرے ساتھ آگیا ہے اگر تم اجازت دو تو یہ بھی کھانے میں شریک ہو جائیں ورنہ واپس ہو جائیں مگر محقق کہے گا کہ حدیث تو صحیح ہے لیکن محق نے اس کی مراد کو محق کر دیا ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ضرور ہے کہ مدار جواز اذن پر ہے مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کہنے کے بعد یہ لوگ ہمارے ساتھ آگئے ہیں داعی جو اجازت دیتا ہے تو آج کل اس سے اجازت ہوتی ہے یا نہیں؟

جوازِ اذن

سو حقیقت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بعد صحابی کا اجازت دینا تو اذن تھا اور آج کل پیر صاحب کے کہنے کے بعد مرید کا اجازت دینا اذن نہیں کیونکہ اذن کے لئے

---

[1] الصحیح لمسلم کتاب البر والصلۃ باب 40 رقم: 130، کنز العمال: 5924

طیب نفس شرط ہے۔حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَاِنْ طِبْنَ لَکُمْ عَنْ شَیْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَکُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا (ہاں اگر وہ بیبیاں خوش دلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر میں کا کوئی جزو تم تو اس کو کھاؤ خوشگوار سمجھ کر)

یہ آیت ازواج کے متعلق ہے کہ اگر وہ اپنے مہر میں سے کچھ تم کو طیب نفس کے ساتھ دیدیں تو اس کا کھانا اور لینا جائز ہے۔ظاہر ہے کہ میاں بیوی کا تعلق کیسا کچھ ہوتا ہے کہ اس تعلق سے زیادہ کوئی تعلق بے تکلفی کا نہیں ہوسکتا۔جب یہاں بھی طیب نفس کی شرط ہے تو اور جگہ طیب نفس کی ضرورت کیوں نہ ہوگی۔اور حدیث میں ہے۔

الا لا یحل مَال امرء هو مسلم الا بطیب نفس منه (العلل المتناهیة254:1)

(یادرکھو کہ کسی مسلمان کا مال بغیر اس کی طیب خاطر کے حلال نہیں)

اور اذن بطیب نفس کی حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کو عدم اذن پر بھی قدرت ہو اور تجربہ یہ ہے کہ یہاں مرید پیر کے استیذ ان کے بعد عدم اذن پر قادر نہیں ہوتا۔اس لئے یہ اذن معتبر نہیں۔

شاید کوئی فلسفی دماغ یہ کہیں کہ پھر صحابہ بھی حضورؐ کے استیذ ان کے بعد عدم اذن پر قادر نہ ہوں گے اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اپنے ساتھ ایسا بے تکلف اور آزاد کر رکھا تھا کہ وہ دل کی بات کو آپؐ کے سامنے ظاہر کرسکتے تھے۔صحابہؓ کے واقعات اس پر شاہد عدل ہیں چنانچہ حدیث میں ایک صحابی کا قصہ آتا ہے جو فارسی تھے اور شوربا اچھا پکاتے تھے انہوں نے ایک مرتبہ حضورؐ کی دعوت کی اور کہایا رَسُوْلَ اللہ! میں نے آج گوشت عمدہ پکایا ہے اور جی چاہتا ہے کہ آپ بھی نوش فرمائیں۔آپؐ نے فرمایاوَعَائشَه کہ حضرت عائشہؓ کی بھی دعوت کرو تو وہ صحابی صاف کہتے ہیں لا کہ نہیں حضرت عائشہؓ کی دعوت منظور نہیں حضورؐ نے فرمایا کہ پھر ہم کو بھی منظور نہیں وہ صحابی یہ سن کر سیدھے ہی چلے گئے کچھ دور جاکر پھر محبت کا جوش ہوا اور واپس آئے اور کہایا رسول اللہ تشریف لے چلئے فرمایا اور عائشہؓ بھی کہا نہیں،حضورؐ نے فرمایا پھر ہم بھی نہیں، یہ سن کر وہ پھر لوٹ گئے اور کچھ دور جاکر پھر واپس آئے اور کہایا رَسُوْل اللہ چلئے بھی، فرمایا اور عائشہؓ بھی کہا ہاں عائشہ بھی تو حضورؐ تشریف لے گئے تو حضور صحابہؓ کے ساتھ اتنے بے تکلف تھے کہ دل کی بات کو صاف صاف عرض کردیتے تھے جب تک خود اُن کے دل نے حضرت عائشہؓ کی دعوت منظور نہیں کی اس وقت تک برابر انکار کرتے رہے یہ نہیں کہ حضورؐ کے ارشاد سے شرما کر پہلی ہی مرتبہ میں قبول کر لیتے۔

اور سنئے حضرتؓ بریرہؓ کا واقعہ حدیثوں میں آتا ہے کہ جب اُن کو حضرت عائشہؓ نے آزاد

---

[1] سنن ابن ماجة:3892، اتحاف السادة المتقین5:115، الدر المنثور 154:1

[2] المعجم الکبیر للطبرانی2:5، سنن الترمذی:183، کنز العمال:14980

کر دیا تو قانون اسلامی کے مطابق حضورؐ نے اُن کو اختیار دیا کہ جس شخص سے تمہارا نکاح غلامی کے زمانہ میں ہو چکا ہے۔ اب چاہو تم اُس کو باقی رکھو خواہ فسخ کرو۔ حضرت بریرہؓ نے فسخ نکاح کو اختیار کیا اُن کے شوہر کو اس کا صدمہ ہوا اور وہ ان کے پیچھے پیچھے روتے ہوئے پھرا کرتے تھے۔ حضورؐ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ اے عباس دیکھتے ہو کہ مغیث کو بریرہؓ سے کیسی محبت ہے اور بریرہؓ کو اُس سے کیسی نفرت ہے۔ اس کے بعد حضورؐ نے بریرہؓ سے فرمایا کہ اے بریرہؓ تم مغیث سے پھر نکاح کر لو تو اچھا ہے تو وہ پوچھتی ہیں یا رسول اللہ! یہ حکم ہے یا شفاعت ہے فرمایا شفاعت ہے حکم نہیں ہے۔ تو کہا میں اس شفاعت کو منظور نہیں کرتی۔

بھلا آج تو کوئی مرید ایسا کر کے دیکھے کہ پیر کی شفاعت کو رد کر دے کہ وہ خود ہی مردود ہو جائے گا مگر حضرت بریرہؓ کے اس فعل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرا ناگواری نہیں ہوئی کیونکہ امر اور شفاعت کا درجہ صحابہؓ کو بتلا دیا گیا تھا کہ اس امر کی اطاعت واجب ہے اور شفاعت میں قبول وعدم قبول کا اختیار ہے پھر جب وہ اس اختیار سے کام لیتے اور کسی معاملہ میں حضورؐ کی شفاعت قبول نہ کرتے تو آپ کو مطلقاً ملال نہ ہوتا تھا۔ اگر آج کل بھی کسی پیر نے اپنے مریدوں کو اپنے ساتھ ایسا آزاد کر دیا ہو کہ وہ اس کے سامنے اپنے دل کی بات کو صاف کہہ سکتے ہوں اور اس کی شفاعت کو بھی کسی وقت رد کر دیتے ہوں اس کو یہ جائز ہے کہ اپنے ساتھ دعوت میں کسی کو لے جائے اور داعی سے کہہ دے کہ میں اس کو ساتھ لایا ہوں اگر اجازت دو تو یہ کھانے میں شریک ہو ورنہ لوٹ جائے اور جس نے اتنا بے تکلف اور آزاد نہ کیا ہو اس کو یہ حق حاصل نہیں کیونکہ اُس کے استید ان کے بعد مرید کو عدم اذن پر قدرت نہ ہوگی اور اس صورت میں طیب نفس کا تحقق نہ ہوگا وہ شرما کر اجازت دیدے گا اور قلب میں گرانی ہوگی۔

بے جا عناد

اس موقع پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا وہ یہ کہ میں نے حدیث بریرہؓ کا مضمون ایک دفعہ اہل بدعت کے جلسہ میں بیان کیا تو وہ لوگ کہنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی گئی کہ ایک باندی نے جب آپ کی شفاعت کو رد کر دیا تو حق تعالیٰ تو قیامت کے دن (نعوذ باللہ) آپ کی شفاعت کیوں قبول کریں گے تو گویا شفاعت کا ابطال کیا گیا ہے۔ یہ مضمون میرے متن پر حاشیہ تھا یہ نتیجہ اس حدیث سے انہوں نے ہی نکالا کہ نعوذ باللہ حق تعالیٰ بھی آپ کی شفاعت کو رد کر دیں گے الخ۔ میرے تو وہم میں بھی یہ بات نہ تھی اور اب میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کیونکہ قیامت میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمائیں گے تو حق تعالیٰ کے اس ارشاد کے بعد فرمائیں گے۔

سَلْ تُعْطَهُ وَاشْفَعْ تُشَفَّعِ (کنز العمال :3648 ، اتحاف السادة المتقین 604:9) کہ آپؐ مانگیے جو چاہو گے دیا جائے گا اور آپؐ سفارش کیجئے آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی تو جو شفاعت حق تعالیٰ کے حکم اور وعدہ قبول کے بعد ہوگی اس میں رد کا احتمال کیونکر ہو سکتا ہے اور حضورؐ نے جو بریرہؓ سے مغیث کی سفارش فرمائی تھی وہ انہوں نے اس لئے رد کر دی کہ یہ شفاعت بریرہؓ کے اذن اور قبول کے بعد نہ تھی تو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا اس واقعہ سے شفاعت قیامت کے محتمل رد ہونے پر استدلال کرنا محض غلط تھا جس کا منشا بجز عناد کے کچھ نہ تھا کہ عنایت فرماؤں نے مجھے بدنام کرنا چاہا کہ اس نے ایسی بات بیان کی ہے جس سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے مگر یہ نہ سمجھا کہ جتنی بات میں نے بیان کی تھی وہ تو احادیث میں مصرح ہے اگر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے تو یہ مجھ پر اشکال نہ ہوا بلکہ حدیث صحیح پر اشکال ہوا۔ مگر خدا ناس کرے عناد کا کہ اس سے عقل مسخ ہو جاتی ہے چنانچہ بہت لوگ بہشتی زیور پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں شرمناک مسائل ہیں۔ حالانکہ وہ مسائل عالمگیری اور ہدایہ و شامی وغیرہ سے لکھے گئے ہیں۔ یہ معترض اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ اعتراض بہشتی زیور تک نہیں رہتا۔ بلکہ دور تک پہنچتا ہے۔

غرض آج کل تو ایسی صورت میں طیب نفس سے اذن نہیں ہوتا چاہے لہجہ کتنا ہی کڑاکے کا ہو کیونکہ بے ساختہ لہجہ کی اور شان ہوتی ہے اور بنائے ہوئے لہجہ کی اور شان ہوتی ہے۔ پرکھنے والے اس کو پرکھ لیتے ہیں جس کے دل میں انشراح نہ ہو وہ چاہے کتنے ہی کڑاکے سے اجازت دے مبصر اس کے دل کی حالت کو تاڑ لے گا۔

باطنی مفتی

دیکھو بعض دفعہ بچہ بھی بہت کڑاکے سے روتا ہے مگر محلّہ والے جان لیتے ہیں کہ بچہ رو رہا ہے بڑا آدمی نہیں رو رہا جیسے ان کو باوجود کڑاکے کی آواز کے ضعف کا احساس ہو جاتا ہے ایسے ہی مبصر کو ایسے موقع میں ضعف قلب کا احساس ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ شہادت قلب سے کام لے ایسے ہی مواقع کے لئے تو ارشاد ہے۔

استفت قلبک و لو افتاک المفتون (اپنے دل سے فتویٰ لو اگرچہ مفتی فتویٰ دے دیں)

(الصحیح للبخاری 107:8، الصحیح لمسلم کتاب الذکر والدعاء باب:10، رقم :31 سنن الترمذی :3467، مشکوۃ المصابیح : 2298)

حضرت جب دل کو لگتی ہے اس وقت جواز کے سارے فتوے رکھے رہ جاتے ہیں اور اس وقت تک چین نہیں ملتا جب تک کھٹک کی بات کو دور نہ کیا جائے۔ مولانا محمد منیر صاحب نانوتہ میں ایک بزرگ تھے ایک دفعہ ان کے ہاتھ سے مدرسہ دیوبند کی ایک امانت ضائع ہو گئی تھی، سفر میں کسی نے چرالی اور رقم

ذرا زیادہ تھی۔ انہوں نے فوراً مدرسہ میں اطلاع کردی کہ وہ امانت میرے پاس سے چوری ہوگئی لیکن میں ضمان ادا کروں گا۔ مدرسہ والوں نے چاہا کہ مولوی صاحب سے ضمان نہ لیں کیونکہ ان کی دیانت پر پورا اعتماد تھا کہ انہوں نے قصداً حفاظت میں کوتاہی نہیں کی اور ایسی حالت میں شرعاً امین پر ضمان نہیں۔

چنانچہ اُن سے کہا گیا تو انہوں نے اس کو منظور نہ کیا اور کہا مجھے بدوں ضمان دیئے چین نہ آئے گا۔ مدرسہ والوں نے مولانا گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ حضرت مولوی منیر صاحب نہیں مانتے مدرسہ کا ضمان ادا کرنا چاہتے ہیں اگر آپ فتویٰ لکھ دیں تو وہ شاید مان جائیں۔ کیونکہ مولانا گنگوہیؒ کو ساری جماعت بڑا مانتی تھی اور مولانا کے فتوے پر ہر شخص کو پورا اعتماد تھا۔ حضرت نے فتویٰ لکھ دیا کہ جب امین نے حفاظت میں کوتاہی نہ کی ہو تو اس پر شرعاً ضمان نہیں۔

مدرسہ والوں نے یہ فتویٰ مولانا محمد منیر صاحب کو لا کر دکھلا دیا سو حالانکہ مولوی محمد منیر صاحب مولانا گنگوہیؒ کا بڑا ادب کرتے تھے۔ مگر اس وقت یہ فتویٰ دیکھ کر اُن کو بڑا جوش آیا اور ہم عمری کے سبب ناز کے لہجہ میں کہا بس میاں رشید احمد نے سارا فقہ میرے ہی واسطہ پڑھا تھا ذرا وہ اپنے کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں کہ اگر اُن کے ہاتھ سے مدرسہ کی امانت ضائع ہو جاتی تو کیا وہ خود بھی اس فتوے پر عمل کرتے یا بدوں ادا کیئے چین نہ ملتا۔ لے جاؤ میں کسی کا فتویٰ نہیں دیکھنا چاہتا۔ حضرت انہوں نے نہیں مانا اور زمین بیچ کر یا نہ معلوم کس طرح مدرسہ کی رقم ادا کی جب چین پڑا۔

ایک اور قصہ تاویل کا سنئے۔ میں نے ایک دفعہ مراد آباد میں اثنا وعظ میں چندہ بلقان کی تحریک کی لوگوں نے چندہ دینا شروع کیا۔ ایک تحصیلدار صاحب نے بھی جو قدرے مخبوط الحواس بھی تھے سو روپیہ دیئے۔ اس وقت تو میں اُن کے چندہ سے خوش ہوا کیونکہ الدّال علی الخیر کفاعلہ کے موافق تحریک کرنے والے کو بھی ثواب ملتا ہے لیکن بعد میں اس نے مجھے بتلایا کہ جیسے ثواب ملتا ہے کبھی سوء استعداد مدلول سے عذاب بھی ملتا ہے۔ گو دنیوی ہی سہی واقعہ یہ ہوا کہ اس شخص نے مجلس ہلال احمر مراد آباد سے یہ درخواست کی کہ میرے سو روپیہ کی رسید قسطنطنیہ سے الگ منگا کردو۔ اراکین مجلس نے اس سے انکار کیا کیونکہ وہاں سو روپیہ کو پوچھتا کون ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب دس بارہ ہزار جمع ہوگئے اس کی ایک قسط بھیج دی گئی۔ وہاں سے اس قسط کی رسید آگئی الگ الگ سو پچاس کی رسید نہیں آ سکتی۔ جب اراکین مجلس نے اس سے انکار کیا تو اُس نے مجھے نوٹس دیا کہ میں نے آپ کی تحریک پر چندہ دیا تھا اب یا تو آپ میرے سو روپیہ کی الگ رسید منگوا کر دیں ورنہ میں دعویٰ کروں گا۔ میں نے مراد آباد میں اپنے احباب کے پاس سو روپیہ اپنے پاس سے بھیج دیئے کہ یہ اُن تحصیلدار صاحب کو دیدو

اور اُن سے باقاعدہ رسید لے لوتا کہ وہ پھر کچھ نہ کہہ سکے۔ دوستوں نے مجھے لکھا کہ آپ پر یہ تاوان کیوں ڈالا جائے ہم اپنے پاس سے چندہ کر کے یہ سوروپیہ ادا کردیں گے۔ اور آپ کی رقم واپس ہے۔ جب وہ سوروپیہ میرے پاس واپس آ لئے تو میں نے منظور نہ کئے۔ بلکہ دوبارہ اُن ہی کو واپس کردیئے کہ اب میں ان کو واپس نہ لوں گا۔ اسی طرح چند بار لوٹ پھیر ہو کر جانبین کے اتفاق سے وہ رقم ایک نیک مصرف میں لگا دی گئی اس دوران میں ایک عالم صاحب میرے پاس آئے ہوئے تھے جو صاحب درس بھی تھے صاحب فتوی بھی وہ کہنے لگے کہ آپ نے اپنے پاس سے یہ رقم کیوں بھیجی آخر آپ کے پاس اس مد کی اور بھی تو رقم ہوگی میں نے کہا ہاں موجود ہے۔ کہنے لگے بس اسی میں سے یہ تاوان ادا کردیا ہوتا۔ میں نے کہا سبحان اللہ! جن لوگوں نے اس چندہ میں مجھے رقم دی ہے وہ ترکوں کو بھیجنے کے لئے دی ہے یا اس واسطے دی ہے کہ میں اس سے ناگہانی تاوان بھی ادا کیا کروں وہ تاویل سے اس کو جائز کرنے لگے اور وہ تاویل یہ تھی کہ اگر وہی رقم تحصیلدار کی محفوظ ہوتی تو اس کا واپس کرنا تو جائز تھا ہی۔ اور چونکہ مد متحد ہے اس لئے اس مد کی تمام رقمیں اس رقم کے ساتھ متحد ہیں۔ میں نے کہا ان گندی تاویلات سے مجھے معاف کیجئے۔ خیر یہ تاویل تو بہت ہی صریح البطلان تھی لیکن جہاں محتمل الصحۃ بھی ہو۔ مگر دل قبول نہ کرے وہاں بھی اس پر عمل نہ کیا جائے ایسے ہی مواقع کے لئے یہ حکم ہے۔

استفت قلبک و لوا فتاکَ المفتون. (اپنے دل سے فتویٰ لو اگر چہ مفتی فتویٰ دیدیں)
(مسند أحمد 5:334 ، المستدرک للحاکم 2:413، الدر المنثور 5:177،
الترغیب و الترھیب للمنذری 4:558)

کہ باطنی مفتی کے خلاف ظاہری مفتی کا قول نہ لیا جائے خصوصاً جب کہ مفتی خود ہی مفتون ہو وہاں تو فتوؤں پر اعتماد کرنا ہی نہ چاہئے بلکہ فتویٰ کے ساتھ اپنے دل کو بھی دیکھو کہ وہ کیا کہتا ہے۔

اذنِ بخیل

اس لئے آج کل اذن پر بھی بدوں شہادت قلب کے عمل نہ کیا جائے ہاں جہاں قلب شہادت دے کہ دوسرے نے خوشی سے اجازت دیدی ہے، وہاں اجازت ہے بلکہ اگر دل گواہی دے کہ اس شخص کو میرا بدوں اذن کے کھانا بھی ناگوار نہ ہوگا بلکہ خوش ہوگا وہاں بدوں اذن کے کھانا بھی جائز ہے بلکہ چھین کر بھی کھا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ دوست سخی ہو بخیل نہ ہو کیونکہ بخیل کو کسی سے محبت نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو مال کی برابر نہیں ہوتی۔

چنانچہ بخیلوں کی حکایات اس بارے میں کثرت سے سنی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مال سے زیادہ اُن کو کسی چیز سے محبت نہیں ہوتی۔

ایک بخیل کی حکایت ہے کہ وہ شہد کھا رہا تھا کہ اتنے میں اس کا دوست آ گیا اُس نے روٹی تو چھپا دی اور تواضع کے طور پر پوچھا کہ شہد کھاؤ گے کہا ہاں اور یہ کہہ کر کھانا شروع کیا، بخیل نے تو اول یہ سمجھ کر تواضع کی ہوگی کہ روکھا شہد کون کھاتا ہے شاید یہ انکار کردے گا جب اس نے انکار نہ کیا تو یہ سمجھا کہ شاید دو چار چمچے کھا کر بس کردے گا مگر اُس نے بس ہی نہ کی تو اس سے رہا نہ گیا۔ کہنے لگا۔

ما هذا انه يحرق القلب

کہ میاں زیادہ نہ کھاؤ شہد بہت گرم ہوتا ہے۔ دل کو پھونک دیتا ہے۔ قال نعم ولکنْ قلبک کہا ہاں سچ کہتے ہو لیکن وہ تمہارے قلب کو کھاتا ہے میرے دل کو نہیں۔

اسی طرح ایک بخیل انجیر کھا رہا تھا کہ سامنے سے ایک اعرابی آ گیا اس نے اُس کو آتا ہوا دیکھ کر انجیر چادرہ سے چھپا دیئے وہ سمجھ گیا جب وہ آ کر بیٹھا تو بخیل نے ٹالنے کے طور پر کہا کہ کچھ قرآن جانتے ہو کہا ہاں کچھ پڑھو تو اس نے پڑھا۔ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَ طُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِالْاَمِيْنِ (قسم ہے انجیر، زیتون، طور سینا اور اس زمین کے شہد کی)

بخیل نے کہا اَيْنَ وَالتِّيْنِ کہا گیا۔ اس نے کہا هُوَ تَحْتَ كَسَاءِ كَ کہ وہ تو تیری چادر کے اندر موجود ہے۔ تین عربی میں انجیر کو کہتے ہیں تو بخیلوں سے چھین کر کھانا جائز نہیں۔ بلکہ اس کی تو اجازت بھی مشکوک ہوتی ہے ہاں سخی دوستوں سے اگر پوری بے تکلفی ہو تو چھین کر بھی کھانا جائز ہے کیونکہ شہادت قلب موجود ہے اور جہاں تک قلب شہادت نہ دے وہاں ہرگز ہاتھ نہ بڑھاؤ بلکہ واپس کردو اور جب تک کھٹک دور نہ ہو ہرگز نہ لو۔

نظر بر تقدیر

اور یہ مت سمجھو کہ اگر اس رقم کو واپس کردیں گے تو پھر کہاں سے آئے گی اگر وہ تقدیر میں ہے تو پھر آئے گی اور اگر تقدیر میں نہیں ہے تو اس کی جگہ دوسری رقم آ جائے گی خدا سے ایسے نا امید کیوں ہو گئے کہ بس ایک دفعہ دے کر وہ پھر نہ دیں گے۔

بدگمانی کردن و حرص آوری　　کفر باشد پیش خوانِ مہتری

(بدگمانی اور حرص خوان خداوندی کے سامنے کفر کی باتیں ہیں)

ابن عطاء سکندری رحمۃ اللہ نے کچھ الہامات الٰہیہ میں لکھے ہیں، ان میں سے ایک الہام یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے میں ایسا روزی دینے والا ہوں کہ اگر تو یہ دعا بھی کیا کرے کہ اے اللہ مجھے رزق نہ دیجیو تو جب بھی میں دوں گا اور تیرے مانگنے پر تو بھلا کیوں نہ دوں گا۔

صاحبو! پھر حق تعالیٰ سے ایسی بدگمانی کیوں ہے کہ وہ آج دے کر وہ پھر نہ دیں گے آخر تقدیر بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ پھر تقدیر پر صابر وشاکر کیوں نہیں رہتے۔

امیر شاہ خان صاحب نے ایک حکایت لکھوائی ہے کہ دہلی میں ایک بزرگ پہنچے اور اُن کو کئی دن کا فاقہ پیش آیا کئی روز کے بعد ایک قاب میں نہایت نفیس پلاؤ آیا، انہوں نے کھایا مگر پورا نہ کھایا گیا بلکہ آدھا بچ گیا، اب نفس کے ساتھ کشاکشی ہوئی نفس کہتا تھا کہ اس کو شام کے واسطے رکھ لو اور لمۂ خیر کہتا تھا کہ فقیروں کو دیدو شام کو اللہ تعالیٰ پھر دیں گے، نفس نے کہا کیا خبر ہے شام کو دیں گے یا نہیں لمہ خیر نے کہا خدا تعالیٰ نے رزق کا وعدہ فرمایا ہے کہا ہاں وعدہ تو ہے مگر اس میں کچھ وقت کی تو تعیین نہیں کیا خبر کب دیں گے۔ لمۂ خیر نے کہا پھر کیا حرج ہے ان کو اختیار ہے جب چاہیں دیں بالآخر لمۂ خیر غالب آیا اور وہ بچا ہوا کھانا کسی فقیر کو دیدیا، سامنے سے ایک مجذوب نظر آیا اور یہ کہتا ہوا گزر گیا واہ بے سالے واہ خوب سمجھا یہ بات ٹھہر چکی تھی کہ اگر یہ بچا ہوا کھانا شام کے واسطے رکھے تو سالے کو بھوکا مارو اور عمر بھر کچھ کھانے کو نہ دو واہ بے سالے واہ، خوب سمجھا اب دروازہ کھل گیا۔

صاحبو! یاد رکھو بعض دفعہ ایک روپیہ ایسا رکھنا جس سے دل میں کھٹک تھی رزق سے محرومی کا سبب ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا امتحان کیا کرتے ہیں کہ اس کو ہم پر بھروسہ ہے یا اسباب پر نظر ہے، اس لئے بعض دفعہ ایسی چیز بھیجتے ہیں جس میں شبہ ہو جس کے متعلق اُس کے متعلق دل میں کھٹک پیدا ہو، اب اگر اس نے کھٹک کی وجہ سے اس کو واپس کر دیا تو حق تعالیٰ فتوحات کا دروازہ کھول دیتے ہیں ورنہ باب مسدود ہو جاتا ہے اب آج کل یہ حالت ہے کہ جو کچھ آ گیا اس کو یہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہمارے واسطے بھیجا ہے پھر اس کو کیوں واپس کریں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ شاید امتحان کے واسطے بھیجا گیا ہو بس اس کا منشا وہی بدگمانی اور تقدیر پر نظر نہ کرنا ہے۔

خرچ کی برکت

اگر انسان تقدیر پر نظر رکھے تو اس کے نزدیک جمع کرنا اور واپس کرنا یکساں ہو جائے بلکہ خرچ کرنے کو زیادتِ رزق کا سبب سمجھے گا تقلیل کا سبب نہ سمجھے گا۔

حضرت رابعہ بصریہ کا واقعہ ہے کہ ایک دن ان کے یہاں کچھ مہمان آ گئے گھر میں سوائے دو سوکھی روٹیوں کے کچھ نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد ایک سائل آیا انہوں نے وہ روٹیاں اٹھا کر مسکین کو دیدیں۔ مہمانوں نے دل میں شکایت کی کہ یہی دو روٹیاں کھا لیتے وہ بھی خرچ کر ڈالیں۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص نے آواز دی پوچھا کون ہے کہاں فلاں شخص نے آپ کے واسطے کھانا بھیجا ہے

آپ نے قبول کیا اور روٹیوں کو گننا شروع کیا تو وہ اٹھارہ تھیں فرمایا کہ یہ کھانا واپس لے جاؤ یہ میرے واسطے نہیں دیا ہوگا کسی دوسرے کو دیا ہوگا لانے والے نے کہا نہیں حضرت آپ کا ہی نام لے کر کہا تھا ۔فرمایا یہ تو بے حساب ہے کیونکہ میں نے خدا کی راہ میں روٹیاں خیرات کی ہیں اور حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ایک کے بدلے میں کم از کم دس ملیں گی تو اس حساب سے بیس روٹیاں ہونا چاہئیں اور یہ اٹھارہ ہیں اور میرا محبوب وعدہ خلاف نہیں پس یہ کھانا میرے واسطے نہیں ہوسکتا۔ لانے والے نے کہا کہ حضرت آپ کا حساب صحیح ہے واقعی بیس ہی روٹیاں تھیں دو میں نے چرالی ہیں اور میں ان کو بھی لاتا ہوں آپ کھانا واپس نہ کیجئے، یہ قصہ معلوم کر کے آپ کو اطمینان ہوا اور کھانا رکھ لیا۔

واقعی اہل اللہ کے مال میں تو چوری بھی نہیں چھپتی تو دیکھئے ان بزرگ کا یہ اعتقاد تھا کہ خرچ کرنے سے روزی کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہے اور ایسا پختہ اعتقاد تھا کہ خرچ کرنے کے بعد حساب سے دس گنے کی منتظر رہتی تھیں اور اس میں کمی ہوتی تو واپس کر دیتیں کہ یہ میرے واسطے نہیں ہے۔ کیونکہ بے حساب ہے مگر ہمارا منطقی نفس یوں کہتا ہے کہ یہ جو بعد میں آیا ہے یہ تو آتا ہی کیونکہ مقدر تھا اس کے ساتھ پہلا مال بھی جمع رہتا تو میزان کل بڑھ جاتا۔ مگر یہ غلط ہے اس کے رہنے سے یہ سارا میزان گل ہو جاتا۔ اس لئے ہم کو تقدیر پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ اور شبہ کا مال کبھی نہ لینا چاہئے۔ خصوصاً جہاں دعوت قبول کرنے میں علم کی توہین وتذلیل ہوتی ہو وہاں تو ہرگز نہ جانا چاہئے۔

تعظیم علم

کانپور میں جب میرا قیام تھا تو وہاں بھی پہلے یہی قاعدہ تھا کہ طلبہ دعوت میں جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں بھی طلبہ کے ساتھ جا رہا تھا راستہ میں ایک شخص نے مجمع کو دیکھ کر کہا کہ خدا خیر کرے معلوم نہیں آج کس کے یہاں چڑھائی ہے یہ کلمہ میرے دل کے پار ہو گیا اور سخت تکلیف ہوئی، خیر میں نے وہ دعوت تو مصیبت کے ساتھ کھائی۔ مگر وہاں سے آتے ہی یہ قانون مقرر کر دیا کہ طلبہ کسی کے گھر پر دعوت کھانے نہ جائیں گے جس کو دعوت کرنا ہو مدرسہ میں کھانا بھیج دیا کرے۔ کارکنان مدرسہ نے کہا کہ اس قانون سے دعوتوں میں کمی ہو جائے گی اور دعوتوں سے مدرسہ کو بہت بڑی امداد ملتی ہے۔ میں نے کہا کہ رزاق اللہ تعالیٰ ہیں کانپور والے رزاق نہیں ہیں اور ایسی دعوتوں کا کم ہونا ہی اچھا ہے جن سے اہل علم اور علم کی تذلیل ہوتی ہے۔

بئسَ المطاعم حین الذل تکسبھا القدر مرتفع والقدر مخفوض

(وہ کھانے برے ہیں جن کے حاصل کرنے میں ذلت پیش آئے ہانڈی چڑھی ہو اور عزت گری ہو)

مگر بحمد اللہ اس قانون سے کچھ کمی نہیں ہوئی۔ اول اول تو لوگوں کو یہ قاعدہ ناگوار ہوا اور کہنے لگے کہ مولوی بڑے دماغدار ہوگئے ہیں کہ ان کے واسطے مدرسہ میں کھانا لاؤ مگر پھر سب لوگ سیدھے ہوگئے اور پہلے سے زیادہ دعوتیں ہونے لگیں کیونکہ پہلے تو جو شخص دعوت کرتا اس کو یہ فکر ہوتی تھی کہ کھانا کم نہ ہو جائے اور بعض مرتبہ عین وقت پر دوبارہ کھانا پکوانا پڑتا تھا اور اب آزادی تھی کہ جتنی جس کو توفیق ہوئی ایک دیگ یا دو دیگ وہ مدرسہ میں بھیج دیں کہ اس کو طلبہ میں تقسیم کردو اب امیر وغریب سب کو دعوت کرنے لگے۔

اسی زمانہ میں ایک دفعہ انسپکٹر صاحب نے طلبہ کی دعوت کو کہلا کر بھیجا، معترضین منتظر تھے کہ دیکھیں کہ ان کو کیا جواب ملتا ہے۔ آیا ان کے مکان پر طلبہ جائیں گے یا ان سے بھی مدرسہ میں کھانا منگایا جائے گا بہت لوگوں کا یہ خیال تھا کہ آج یہ قانون ٹوٹ جائے گا۔ مگر میں نے ان کو بھی صاف جواب دیدیا کہ طلبہ کسی کے گھر جا کر دعوت نہیں کھا سکتے کیونکہ بعض مصالح سے یہی قانون مقرر کردیا گیا ہے تو وہ انسپکٹر صاحب بہت اہل تھے انہوں نے کہلا کر بھیجا کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے قانون کو توڑا جائے جو مصالح کی بناء پر مقرر کیا گیا ہے لیکن اب مجھے یہ بتلایا جائے کہ اگر کوئی شخص طلبہ کی خدمت کرنا چاہے تو اس کے لئے دوسری صورت کیا ہے میں نے رقعہ میں لکھ دیا کہ اگر آپ دعوت کرنا چاہتے ہیں تو کھانا مدرسہ میں بھیج دیں انہوں نے خوشی کے ساتھ منظور کیا حالانکہ ان کا گھر مدرسہ سے بہت دور تھا مگر وہیں سے انہوں نے دیگیں بھجوائیں اور اپنے ملازموں کو اور ایک لڑکے کو ساتھ بھیجا کہ تم خود طلبہ کو کھانا کھلاؤ اور جس چیز کی ضرورت ہو فوراً اطلاع دو اب لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں کہ یہ قاعدہ غریبوں ہی کے واسطے نہیں بلکہ اُمراء اور حکام کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے پھر کسی کو یہ قاعدہ ناگوار نہیں ہوا اور سب بے تکلف مدرسہ میں بھیجنے لگے تو صاحبو! حق تعالیٰ رزاق ہیں اگر تم ایک رقم کو شبہ کی وجہ سے واپس کردو گے وہ دوسری جگہ سے اس سے زیادہ بھیج دیں گے وہی رقم اس حالت میں واپس آئے گی کہ اب شبہ نہ رہے گا پھر تم باوجود شبہ اور کھٹک کے تاویل کر کے اس کو کیوں رکھنا چاہتے ہو یہ برا مرض ہے۔

جائز تاویل

ان تاویلوں کو چھوڑ دینا چاہئے مگر میں ہر تاویل سے منع نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ کون سی تاویل جائز ہے اور کون سی ناجائز۔

وہ معیار یہ ہے کہ اگر کسی رقم سے دل میں کھٹک ہوا اور اول ہی سے نیت یہ ہو کہ کسی طرح یہ مل ہی جائے اور اس کا لینا جائز ہو جائے اس کے بعد استفتاء کیا جائے تو اب چاہے کتنے ہی فتوے جواز کے آجائیں اُس کو ہرگز نہ لو۔ اور اگر اول سے یہ نیت ہو کہ خدا کرے اس کا لینا جائز نہ ہو اس کے بعد

استفتاء کیا جائے تو اب اگر فتوے سے اجازت ہو جائے تو لے لو یا کم از کم دونوں جانبین مساوی ہوں نہ لینے کی نیت ہو نہ واپس کرنے کی بلکہ یہ نیت ہو کہ فتوے سے جو ثابت ہو جائے گا ویسا ہی کریں گے۔ تب بھی لینا جائز ہے اگر فتوے سے اجازت ہو جائے مگر یہ تو بہت ہی بے جا حالت ہے کہ اول سے لینے کی نیت ہو اور جس شخص کو اپنی نیت پر اطلاع نہ ہوتی ہو اور اس معیار سے بھی فیصلہ نہ کر سکے تو وہ کسی شیخ محقق سے تعلق پیدا کرے اور اُس کو جزئیات احوال کی اطلاع دیا کرے اور اس کے جواب پر عمل کیا کرے محقق کی تعلیم پر عمل کرنے میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے بصیرت حاصل ہو جائے گی یہ تو اہل عمل کے لئے جواب ہے کیونکہ وہ عمل کر کے اس کی تصدیق مشاہدہ سے کریں گے۔

شیخ نورانی

اور اہل فلسفہ کے لئے یہ جواب ہے کہ محقق اپنے جواب میں دلیل کی طرف بھی اشارہ کرے گا جس سے مخاطب کے علم میں روز بروز ترقی ہوگی اس طرح کچھ عرصہ میں یہ شخص خود صاحب بصیرت اور محقق ہو جائے گا اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

شیخ نورانی زراہ آگہ کند ۔۔۔ درکلامش نور راہ ہمراہ کند

(شیخ نورانی راہ سلوک سے خبردار کرتا ہے اور اپنے کلام میں نور کو ہمراہ کرتا ہے)

اس نور میں وہ دلیل بھی داخل ہے جس کی طرف محقق اشارہ کرتا ہے اور اس نور کا احساس اہل عمل کو اچھی طرح ہوتا ہے پھر چند روز عمل کر کے تو یہ اثر ہوتا ہے کہ

اے لقائے تو جواب ہر سوال ۔۔۔ مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

(آپ ایسے بابرکت ہیں کہ آپ کی ملاقات ہر سوال کا جواب ہی ہے اس سے بلاشبہ ہر مشکل اسان ہو جاتی ہے)

پھر سوال کی بھی نوبت نہیں آتی اشکال دل میں لے کر گئے اور محقق کی صورت دیکھ کر سب مشکلیں حل ہو گئیں ہم نے مولانا گنگوہیؒ کے یہاں اس کا مشاہدہ کیا ہے کہ مجھ کو حضرت سے صرف ایک دو باتیں ہی پوچھنے کی نوبت آئی پھر تو اکثر یہ ہوتا تھا کہ سوالات دل میں لے کر گئے اور پاس بیٹھتے ہی سب حل ہو گئے۔

ہر زمانہ میں ایک دو بزرگ ایسے ضرور ہوتے ہیں کہ جن سے انکار تو انکار عدم تعلق بھی موجب عتاب اور باعث حرمان برکات ہوتا ہے۔ گو عذاب کا سبب نہ ہو۔ میں حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کو ایسا ہی بزرگ سمجھتا ہوں کہ ان سے تعلق نہ ہونا بھی موجب حرمان برکات تھا اور انکار کا تو کیا پوچھنا۔
چنانچہ مولانا کی حیات میں ایک صالح شخص کا انتقال ہوا اُن کو خواب میں دیکھا گیا اور پوچھا گیا

کیا معاملہ ہوا کہا بخش دیا مگر مولانا گنگوہیؒ سے عدم تعلق پر عتاب ہوا۔ گو عذاب نہیں ہوا مگر اس پر عتاب ہوا کہ ایسے مقبول شخص سے تم کو تعلق کیوں نہیں تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ یا تو اس معیار سے اپنی تاویلوں میں فیصلہ کرو جو اوپر مذکور ہوا اور جو اس معیار سے بھی فیصلہ نہ کر سکے وہ کسی محقق کا دامن پکڑے یہ تو بہت ہی برا ہے کہ مسلمان ہو کر لا دریت و لا تلیت کا مصداق ہو کہ نہ خود محقق ہو نہ محقق کا اتباع کرے۔

آج کل ہماری تاویلوں کی یہ حالت ہے کہ ہم خود جانتے ہیں کہ تاویل ہے مگر اس پر نازاں ہیں کہ ہم نے تاویل سے بات بنالی اور یہ مرض تاویل کا ہمارے اندر سے ابتدائے طالب علمی سے پیدا ہوتا ہے۔ مجھے خود اپنے بچپن کا واقعہ یاد ہے جب کہ میں دیو بند کے مدرسہ میں ابتدائی کتابیں عربی کی پڑھتا تھا۔ اس زمانہ میں ایک دفعہ میرٹھ والد صاحب کے پاس گیا اور اس وقت میرٹھ میں نوچندی کا میلہ تھا۔ میں بھی بچپن کی وجہ سے میلہ دیکھنے چلا گیا جب واپس آیا تو حافظ عبدالکریم صاحب رئیس کے بڑے صاحبزادے شیخ غلام محی الدین صاحب نے دفتر میں مجھے اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ نوچندی کے میلہ میں جانا کیسا ہے میں سمجھ گیا کہ اس سوال سے مجھ پر اعتراض مقصود ہے تو بجائے اس کے کہ میں اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا میں نے بات بنائی اور تاویل کے ساتھ جواب دیا کہ نوچندی کے میلہ میں ایسے شخص کو جانا جائز ہے جو کسی وقت مقتدا بننے والا ہے اور اس وقت اس غرض سے جاتا ہے کہ میلہ کے مفاسد معلوم کر لے تا کہ بعد میں جب لوگوں کو اس سے منع کرے تو اس کے مفاسد ان کے سامنے بیان کر سکے اس جواب پر شیخ صاحب موصوف بہت ہنسے۔ کہ مولوی گناہ بھی کرتے ہیں تو اُس کو جائز بنا کر۔ خیر یہ تو بچپن کی بات تھی افسوس یہ ہے کہ پچپن سال میں بھی ہماری یہی حالت ہے یہاں تک کہ عوام نے یہ سمجھ لیا ہے کہ بس دین مولویوں کے قبضہ کا ہے جس چیز کو چاہیں یہ حرام کر لیں اور جس چیز کو چاہیں حلال کر لیں۔

لکھنؤ میں ایک طوائف نے جو بڑی مالدار تھی اپنی جائیداد جو بڑی قیمتی تھی مولانا محمد نعیم صاحب کو دینا چاہی اور مولانا کی یہ حالت تھی کہ بہت تنگدستی کے ساتھ گزر ہوتا تھا مگر متقی بزرگ تھے۔ انہوں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا پھر اُس نے ایک قومی عربی مدرسہ والوں کو وہ زمین دینا چاہی اہل مدرسہ نے نہ معلوم کیا تاویل کر لی ہوگی۔ انہوں نے وہ جائیداد لے لی۔ اس کا عوام پر یہ اثر تھا کہ لکھنؤ کے شہدے بھی علماء مدرسہ پر ہنستے تھے۔ اور باہم دل لگی کے طور پر کہتے تھے کہ بھائی مولوی محمد نعیم صاحب تو اکیلے تھے وہ ڈر گئے کہ میں اکیلا اس بوجھ کو کیونکر اٹھاؤں گا اس لئے انکار کر دیا اور مدرسہ والے بہت سے ہیں انہوں نے سوچا کہ تھوڑا تھوڑا بوجھ بانٹ آئے

گا سب مل کر اٹھالیں گے۔اس واسطے انہوں نے منظور کرلیا۔

حقیقی تفقہ

میں کہتا ہوں کہ اگر بالفرض علماء مدرسہ نے کسی صحیح تاویل سے اس کو جائز بھی سمجھا ہوتب بھی اُن کو اس کا لینا جائز نہ تھا کیونکہ جس مباح سے فساد عوام کا اندیشہ ہو اُس مباح کا ترک واجب ہو جاتا ہے۔خصوصاً ایسا مباح جس کے کرنے سے دین پر حرف آتا ہو۔

اس پر اپنے ہم وطن ایک عالم کی حکایت یاد آئی کہ انہوں نے کسی ہندو پر عدالت میں دعویٰ کیا اور جس سب جج کے یہاں دعویٰ تھا وہ بھی مولوی تھے کیونکہ پہلے یہ عہدے علماء ہی کو ملتے تھے تو سب جج نے مولوی صاحب کے موافق ڈگری کی اور مع سود کے جس کی مقدار آٹھ سو روپیہ تھی ڈگری دی مولوی صاحب نے باوجود سخت حاجت کے سود کے لینے سے انکار کردیا تو سب جج نے کہا کہ مولوی صاحب آپ کیوں نہیں لیتے درّ مختار میں تو لکھا ہے کہ

لا ربوا بين المسلم والحربى فى دار الحرب

(دارالحرب میں مسلم اور حربی کے درمیان سود نہیں ہوگا)

مولوی صاحب نے کہا کہ میں عوام کو سمجھانے کے لئے درمختار کہاں بغل میں لئے لئے پھروں گا۔مشہور تو یہی ہوگا کہ مولوی صاحب نے سود لیا۔

صاحبو! یہ علم ہے اور اس کا نام ہے تفقہ کہ اگر کوئی چیز قاعدہ سے جائز بھی ہو مگر اس سے دین پر حرف آتا ہو تو اس کو بھی ترک کردیا جائے مگر آج کل مدارس میں عموماً اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ہر شخص کا چندہ بے تکلف لے لیا جاتا ہے۔

یک کار ازیں دو کار

جس کا راز یہ ہے کہ آج کل اہل مدارس نے مخترع ثمرات کو مطلوب سمجھ رکھا ہے کہ ہمارا مدرسہ بارونق ہو اُس میں پانچ سو ہزار طلبہ ہوں پچاس سو مدرس ہوں اور ایسی عمارت ہو اور ہر سال اس میں سے اتنے طلبہ فارغ ہوں اور یہ باتیں بدوں زیادہ رقم کے نہیں ہوسکتیں۔تو اب ہر وقت ان کی نظر آمدنی پر رہتی ہے اور جہاں سے بھی چندہ آتا ہے رکھ لیا جاتا ہے واپس کرتے ہوئے یہ خیال ہوتا ہے کہ حرام اور مشتبہ مال کو واپس کرنا شروع کریں تو اتنی آمدنی کس طرح ہوگی جو اتنے بڑے کارخانہ کو کافی ہوسکے بس یہی جڑ ہے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے رضائے حق مقصود

نہیں۔اس جڑ کو اکھاڑ پھینکو اور ثمرات پر ہرگز نظر نہ کرو نہ زیادہ کام کو مقصود سمجھو بلکہ رضائے حق کو مقصود سمجھو چاہے مدرسہ رہے یا نہ رہے۔اور اگر یہ نہیں ہوسکتا تو پھر دینداری اور علم کا نام مت لو نہ خدا سے محبت کا دعویٰ کرو۔افسوس خدا سے محبت اور غیر پر نظر ۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن بہ رضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیار می باید کرد

(سرمدؒ شکوہ شکایت نہ کرنا چاہئے دو کاموں میں سے ایک کام کرنا چاہئے یا تو تن دوست کی خوشنودی میں دے دینا چاہئے یا دوسرت سے قطع نظر کر لینی چاہیے)

تعیین ثمرات کا نقصان

حضرت مولانا گنگوہیؒ اس قدر مضبوط اور قوی القلب تھے کہ بڑے سے بڑے فتنہ وفساد کے وقت بھی مستقل رہتے اور از جارفتہ نہ ہوتے تھے اس کا راز یہی تھا کہ وہ صرف ایک ذات کی رضا پر نظر رکھتے تھے۔ثمرات پر نظر نہ کرتے تھے ایک زمانہ مدرسہ دیو بند کے خلاف دیو بند میں بڑی شورش تھی اور اہلِ قصبہ کا مطالبہ وہی تھا جو آج کل ہو رہا ہے کہ ایک ممبر ہماری مرضی کے موافق ممبران مدرسہ میں بڑھا دیا جائے۔مولانا گنگوہیؒ اس کو منظور نہ فرماتے تھے۔

یہ فتنہ اس قدر بڑھا کہ اس زمانہ میں جو میرا دیو بند جانا ہوا تو مجھے مدرسہ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوا میں نے حضرت کو ایک خط لکھا کہ اس وقت اگر شہر والوں کا مطالبہ مان لیا جائے تو مدرسہ کا کچھ نقصان نہ ہوگا کیونکہ مجلسِ شوریٰ میں کثرت آپ کے خدام کی ہے اور کثرتِ رائے سے ہی فیصلہ ہوا کرتا ہے اُن کے ایک ممبر کی رائے سے فیصلہ پر کچھ اثر نہیں ہوسکتا اور مطالبہ نہ ماننے میں مجھے مدرسہ کے بند ہو جانے کا اندیشہ ہے تو حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ:

ہم کو مدرسہ مقصود نہیں رضاء حق مقصود ہے اور نا اہل کو ممبر بنانا معصیت ہے جو خلاف رضائے حق ہے۔اس لئے ہم اپنے اختیار سے ایسا نہیں کریں گے کیونکہ اس پر ہم سے مواخذہ ہوگا۔اگر اہل شہر کے فتنہ سے مدرسہ بند ہو گیا تو اس کے جوابدہ وہ قیامت میں خود ہوں گے۔ کیونکہ ان کے ہی فعل کا یہ نتیجہ ہوگا ہم سے اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔

الحمد للہ جو بات مجاہدوں سے برسوں میں بھی حاصل نہ ہوتی وہ بزرگوں کی جوتیوں کے طفیل ایک ساعت میں حاصل ہوگئی حضرتؒ نے اس تحریر میں جس علم کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ بہت بڑا علم ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ ثمرات مقصود نہیں ہیں صرف رضائے حق مقصود ہے نہ مدرسہ مقصود ہے نہ طلبہ کی

کثرت مطلوب ہے نہ عمارت مقصود ہے صرف رضاء مطلوب ہے اگر رضائے حق کے ساتھ یہ کام چلتے رہیں تو چلاؤ اور حسب ہمت وطاقت ان میں کام کرتے رہو اور جو کام طاقت سے زیادہ ہو اس کو الگ کرو۔

واللہ! اس علم سے، بہت سے پریشان حالوں کی پریشانیاں اور وساوس قطع ہوگئی ہیں اس علم سے اعمال میں کام لے کر دیکھو تو اس کی قدر ہوگی۔ مثلاً کسی کا بچہ بیمار ہوا تو دوا دارو کرو مگر ثمرہ متعین نہ کرو کہ یہ اچھا ہی ہوجائے بلکہ معالجہ محض رضائے حق کے لئے کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کا یہ حق رکھا ہے کہ بیماری میں اُن کی خدمت کرو علاج کرو ثمرہ پر نظر نہ کرو۔ اسی طرح مدرسہ جاری کرو اور رضائے حق پر نظر رکھو یہ ثمرہ متعین نہ کرو کہ ہمارا مدرسہ ایسا ویسا ہونا چاہئے۔ یہ دُھن کہاں کی لگائی، یہ دُھن نہیں بلکہ کھن ہے پھر وہ جس حال میں راضی رہیں تم خوش رہو ایسے ہی ذکر و شغل میں لگو تو رضائے حق پر نظر رکھو لذت و شوق وغیرہ کو مطلوب نہ سمجھو اگر قبض ہو تو خوش رہو بسط ہو تو خوش رہو کیفیات نہ ہوں تو خوش رہو کیفیات ہوں تب خوش رہو بتلایئے اس شخص سے زیادہ مستقل مزاج کون ہوگا جس کی حالت یہ ہے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ‏ ‏ ‏ ‏ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں تو آپ پر فدا ہوں دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں میں آپ سے راضی ہوں) اور جس کی حالت یہ ہے کہ ؎

نا خوش تو خوش بود برجان من ‏ ‏ ‏ ‏ دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کے خلاف اور ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان پر رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

پس جس حال میں وہ راضی رہیں اُسی میں خوش رہو۔

اس پر شاید کوئی فلسفی یہ سوال کرے کہ اگر وہ بے ایمان رکھنے میں راضی رہیں تو کیا اس پر بھی خوش رہے تو یہ اگر ایسا ہے جیسے قاضی ابو یوسف کے مجلس املاء میں ایک شاگرد بالکل خاموش تھا امام نے فرمایا تم بھی کچھ پوچھا کرو اس کے بعد امام نے مسئلہ بیان کیا کہ یقینی غروب کے بعد پھر افطار میں تاخیر کرنا مکروہ ہے تو وہ فرماتے ہیں کہ کیوں حضرت! اگر کسی دن آفتاب غروب ہی نہ ہو تو روزہ کب افطار کرے۔ امام نے فرمایا بس تم خاموش رہو۔ تمہارا سکوت ہی اچھا تھا۔ میں نے خواہ مخواہ تم سے کہا کہ تم بھی سوال کیا کرو۔

واقعی بعض لوگوں کا نہ بولنا ہی بہتر ہوتا ہے جیسے ایک بہوتھی جس کی ماں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ ساس کے گھر جا کر زبان سے ایک حرف نہ نکالنا، خاموش ہی رہنا۔ چنانچہ ہر وقت چپ رہتی، ساس نے ہر چند چاہا کہ یہ بھی کچھ بولے بات کرے مگر وہ کچھ نہ بولتی تھی۔ ایک دن ساس حسرت سے کہنے لگی کہ میری بہو تو بہت اچھی ہے صورت و سیرت سب بہتر ہے مگر بس اتنی کسر ہے

کہ بولتی نہیں ہے، بہو نے کہا مجھے میری اماں نے بولنے سے منع کر دیا ہے۔ اس لئے میں نہیں بول سکتی۔ ساس نے کہا کہ تمہاری اماں پاگل ہے، بیٹی بہو کے بولنے بات کرنے ہی سے گھر میں رونق ہوتی ہے۔ تم ضرور بات چیت کیا کرو۔ بہو نے کہا اچھا بولوں تو تم بُرا تو نہیں مانو گی۔ ساس نے کہا میں کیوں بُرا مانتی میں تو اللہ سے چاہتی ہوں کہ تو بولے، کہاں میں یہ پوچھتی ہوں کہ اگر تمہارا لڑکا مر جائے تو تم میرا دوسرا بیاہ بھی کر دو گی یا یوں ہی بٹھائے رکھو گی۔ ساس نے کہا بیٹی! واقعی تیری ماں کی رائے درست تھی اور میری رائے غلط تھی تیرا خاموش ہی رہنا بہتر ہے، تو بولنے کے لائق نہیں۔

اسی طرح میں اس سائل سے کہتا ہوں کہ تمہارا خاموش ہی رہنا بہتر ہے یہ بھی کوئی سوال کی بات ہے کہ اگر وہ بے ایمان رکھنے پر راضی ہوں آخر وہ بے ایمان رکھنے پر کیوں راضی ہوں گے وہ تمہیں کیوں کافر بنانا پسند کریں گے۔ اس کی کوئی وجہ بھی جبکہ صاف ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ معلوم ہوا کہ رضا کا تعلق کفر سے ہو ہی نہیں سکتا۔ پس یہ اگر لغو ہے اور اس کے بعد ایسے سارے اگروں کا جواب یہ ہے کہ ہاں اگر وہ اس پر راضی ہوں تو تم اس میں بھی راضی رہو جس حال میں بھی رضا کے ساتھ رکھیں راضی رہو پھر اب رضا کی مقصودیت کے بعد یہ وسوسہ کیوں ہے کہ مشتبہ مال کے واپس کرنے سے مدرسہ کا چندہ کم ہو جائے گا اور فلاں بات کے نہ ماننے سے مدرسہ ٹوٹ جائے گا اور یہ فکر کیوں ہے کہ مدرسہ کی آمدنی کس طرح بڑھانا چاہئے کیا تدبیر کرنا چاہئے۔ ارے چھوڑو! اس فکر کو تم نے یہ گھن کہاں کا لگایا تم سے فکر کرنے کو کس نے کہا ہے۔ وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ چاہیں گے تمہارے کئے سے کچھ نہ ہوگا۔ بس خدا پر نظر کر کے بے فکر رہو اور خوش رہو اور چین سے بیٹھو۔

حریفاں ہلا مے پرستی کنید بنو شید جو شید و مستی کنید

(دوستو ضرور مے پرستی کرو یعنی عشق محبوب حقیقی اختیار کرو اور جوش وخروش میں آؤ اور مستی کرو)

فکر لذیذ

ہاں ایک فکر البتہ لذیذ ہے وہ جان کو لگاؤ یعنی فکر آخرت اور واللہ میں قسم کھاتا ہوں اور پھر قسم کھاتا ہوں یہ فکر اگر پیدا ہوگئی تو ساری فکریں گم ہو جائیں گی۔ یہ عصائے موسیٰ ہے جو اژدہا بن کر سب سانپوں کو نگل جائے گا اور جس کی جان کو دوسری فکریں لگی ہوئی ہیں واللہ اس کو اس فکر کی ہوا بھی نہیں لگی ورنہ اس فکر کی تو مستی ایسی ہے جو دنیا بھر سے یک سو کر دیتی ہے۔

خود قوی تر می شود خمر کہن خاصہ آں خمریکہ باشد من لدن

(پرانی شراب میں خود تیزی بڑھتی جاتی ہے خاص کر وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہو)

ثمراتِ خانہ ساز

اسی لئے حق تعالیٰ نے اول تو مسلمانوں کو یہ حکم دیا تھا کہ مرتے وقت یا مرنے سے پہلے اپنے مال کے متعلق وصیت کردے کہ کس کو کتنا دیا جائے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ الخ

(تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب کسی کو موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو کچھ کچھ بتلا دے والدین کے لیے)

یہ ابتدا میں حکم تھا کہ جب عامۃ المسلمین کے قلوب میں یکسوئی کم تھی اور وہ تعلقات سے گھبراتے نہ تھے پھر جب نورانیت زیادہ ہوئی اور تعلقات وافکار سے اُن کا دل گھبرانے لگا تو اس وقت یہ حکم نازل ہوا کہ تم اپنے بعد کی فکر نہ کرو ہم اس کا انتظام خود کئے دیتے ہیں اور آیت میراث نازل ہوئی۔

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ الآية

(اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے باب میں کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصہ کے برابر ہے)

مسئلہ میراث کا حاصل یہی ہے کہ تم مرنے کے بعد کی فکر نہ کرو تو اس میں بڑی راحت کی تعلیم ہے کہ تم پاؤں پھیلا کر سو رہو ہم تمہاری جائیداد وغیرہ کو اقارب میں خود مناسب طور پر تقسیم کر دیں گے تم بے فکر رہو چنانچہ اٰبَاۤؤُكُمْ وَاَبْنَاۤؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا (تمہارے اصول وفروع جو ہیں تم پورے طور پر نہیں جان سکتے کہ ان میں کون سا شخص تم کو نفع پہنچانے میں نزدیک تر ہے) میں اس کی تصریح ہے ۔ افسوس! ایسی راحت کا تو حکم اور آج کل بہت لوگ وقف علی الاولاد کو اس پر ترجیح دیتے ہیں۔ منشاء اس کا یہ ہے کہ یہ لوگ مسئلہ میراث کو خلاف حکمت سمجھتے ہیں کہ اس سے جائیداد کا تجزیہ اور حصے بخرے ہو جاتے ہیں جس سے کچھ دنوں میں زمینداری جاتی رہتی ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک رئیس کے سوال پر فرمایا تھا کہ مسئلہ میراث کو خلاف حکمت سمجھ کر وقف علی الاولاد کرنا کفر ہے۔ شیطان اسی واسطے کافر ہوا تھا کہ اس نے حکمِ خداوندی کو خلاف حکمت سمجھا تھا۔ خداوند تعالیٰ مولانا محمد یعقوب صاحب کی قبر کو ٹھنڈا کرے کہ اُن کی اس بات کا یہ اثر ہوا کہ بعد میں جو شبلی نے دوبارہ پریوی کونسل میں اس کے لئے کوشش کی اور علماء سے وقف علی الاولاد کے جواز پر دستخط کرائے تو میں نے اس پر دستخط نہ کئے اس وقت مجھے مولانا کا یہ مقولہ یاد آ گیا بڈھے کی بات جوان تھی کہ اُس نے میری دستگیری کی ورنہ میں بھی دوسرے علماء کی طرح اس پر دستخط کر دیتا۔

میں کہتا ہوں کہ تم جو وقف علی الاولاد کو جو مسئلہ ظنیہ ہے مسئلہ میراث پر جو قطعی ہے ترجیح دیتے ہو

تو اس کا بڑا سبب اولاد کے لئے اپنے بعد کا انتظام ہے سو اول یہی ثابت کردو کہ اولاد کے لئے اپنے بعد کا انتظام کرنا مطلوب ہے، اس پر کوئی دلیل قائم نہیں بلکہ مشائخ کا تو اس میں خاص مذاق ہے۔ حضرت شیخ عبدالقدوس نے وصیت کی ہے کہ اپنے بعد کے لئے اولاد کی فکر فضول ہے کیونکہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ صالح ہوں گے تو صلحاء کو حق تعالیٰ ضائع نہیں کریں گے یا بد ہوں گے تو خدا کے نافرمانوں کے لئے تم نافرمانی میں معین کیوں بنتے ہو۔ اس فکر اولاد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابھی ایک شخص کا انتقال ہوا ہے جو ساری عمر موروثی کاشت کی آمدنی کھاتا رہا۔ میں نے خاص اپنے ایک معتمد کی معرفت مرتے ہوئے اسے نصیحت کی کہ اب تمہاری عمر ختم ہوگئی دنیا میں اب تم کو رہنا نہیں۔ اس لئے اس وقت تو موروثی زمین چھوڑ دو اور سب سے استعفاء داخل کردو کہا میرے بچہ پھر کہاں سے کھائیں گے میرے سفیر نے کہا بچوں کے رازق تم نہیں ہو خدا رازق ہے وہ ان کے لئے کوئی دوسری صورت پیدا کردے گا۔ اور جس اولاد کا تم خیال کر رہے ہو وہ قیامت میں تمہارے کام نہ آئے گی۔ اپنے ہی عمل کام آئیں گے اگر تم نے موروثی زمین کا قبضہ نہ چھوڑا تو مرنے کے بعد عذاب کا اندیشہ ہے کہا اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے میں توبہ کرلوں گا معاف کردیں گے۔ سفیر نے کہا کہ توبہ سے حق العباد معاف نہ ہوگا۔ کہا اللہ تعالیٰ بندوں سے بھی معاف کرادیں گے، غرض ظالم نے نہیں مانا اور اولاد کی فکر میں اپنی گردن پر بوجھ لے گیا خبر نہیں اب کیا گزرتی ہوگی۔ ان سب باتوں کی منشاء وہی ہے کہ رضائے خلق کو رضائے حق پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور ثمرات خانہ ساز پر نظر کی جاتی ہے۔ رضائے حق پر نظر نہیں ہے۔

نفع متعدی کا دھوکہ

اسی کا یہ اثر ہے کہ علماء بھی گناہوں میں تاویلیں کرتے ہیں اور مشائخ بھی تاویلیں کرتے ہیں پھر عوام کا تو کیا پوچھنا۔ حیرت تو علماء پر ہے اور ان سے بڑھ کر مشائخ پر۔ کیونکہ عارفین کا اصل مذاق تو یہ ہے کہ وہ ثمرات آخرت پر بھی نظر نہیں کرتے۔ مگر یہ اُنہی حضرات کا درجہ تھا ہم کو ثمرات آخرت سے استغناء نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اول تو یہ دعویٰ بہت بڑا ہے (ہم اس کے اہل نہیں اور وہ حضرات اہل تھے کیونکہ اپنے کو فنا کرچکے تھے وہ دعویٰ سے پاک تھے) دوسرے یہ کہ وہ حضرات تو افکار سے خالی ہوکر ذکر اللہ سے بھر گئے تھے اُن کے قلب میں حق تعالیٰ کا ذکر و فکر بھرا ہوا تھا اور ہمارا قلب ابھی تک ذکر و فکر حق سے پُر نہیں ہوا۔ اگر ہم نے ثمرات آخرت کی فکر بھی دل سے نکال دی تو بالکل کورے ہی رہ جائیں گے۔ اور یہ حالت سخت خطرناک ہے دل کو خالی نہ چھوڑنا چاہیے۔ اگر ذکر حق سے پر نہ ہو تو مباحات سے ہی پر رکھو۔ ورنہ میدان خالی دیکھ کر شیطان قبضہ جمالے گا۔ تو خیر آج کل کے مشائخ اگر ثمرات آخرت سے قطع نظر نہ کرسکیں تو کم از کم ثمراتِ

دنیا سے تو قطع نظر کرلیں کہ یہ تو اس طریق میں قدم رکھنے کی شرط اول ہے مگر افسوس اُن کی نظر بھی ثمراتِ دنیا پر ہی ہے اور اس کے لئے وہ تاویلیں کرتے رہیں ہیں چنانچہ بعض مشائخ کو اپنا مجمع بڑھانے کی فکر ہوتی ہے اور اس کے لئے تدابیر کرتے ہیں اور تاویل یہ کرلی ہے کہ ہمارا مجمع زیادہ ہوگا تو مخلوق کو نفع زیادہ ہوگا۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ گھڑ لیا ہے کہ نفع متعدی نفع لازمی سے افضل ہے۔

صاحبو! یاد رکھو کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ یہ قاعدہ اس شخص کے لئے ہے جو نفع لازمی سے فارغ ہوگیا ہو اور نفع متعدی میں مشغول ہونا اُس کے لئے نفع لازم میں خلل انداز نہ ہوتا ہو، اور جس کی یہ حالت نہ ہو اس کے لئے نفع لازمی نفع متعدی سے افضل ہے۔ دیکھو امامت نفع متعدی ہے اور اقتداء نفع لازمی ہے تو اب بتلاؤ کیا ہر شخص کے حق میں امامت افضل ہے ہرگز نہیں بلکہ ایسے تھوڑے افراد ہیں جن کے واسطے امامت افضل ہو زیادہ وہی ہیں جن کے واسطے مقتدی ہی بننا افضل ہے۔ اور دیکھو تعلیم دینا نفع متعدی ہے اور پڑھنا نفع لازم ہے تو کیا ہر شخص کے لئے پڑھانا افضل ہے پڑھنے سے ہرگز ہرگز نہیں بلکہ پڑھانا اسی کے واسطے افضل ہے جو پڑھنے سے پوری طرح فارغ ہو چکا ہو اور اس کو اساتذہ کہہ دیں کہ اب تم اس لائق ہو کہ دوسروں کو پڑھاؤ اور جو خود ہی پڑھ رہا ہے، ہنوز فارغ نہیں ہوا وہ ہرگز دوسروں کو پڑھانے کے لائق نہیں ورنہ اس کے واسطے تعلیم و تدریس افضل پس یہ کلیہ غلط ہے نفع متعدی نفع لازمی سے افضل ہے اور جن لوگوں کے حق میں نفع متعدی افضل ہے وہ بھی اس لئے نہیں کہ نفع متعدی نفع لازم سے فی نفسہٖ افضل ہے بلکہ اس لئے افضل ہے کہ اس کے نفع متعدی سے بہت سے لوگ نفع لازم میں مشغول ہوں گے یعنی اپنی اصلاح و تکمیل کریں گے پس نفع متعدی میں فضیلت اسی واسطے ہے کہ وہ نفع لازم کا ذریعہ ہے اسی لئے جس وقت نفع متعدی سے نفع لازم کا ذریعہ ہونے کی امید نہ ہو اس وقت نفع متعدی کے ترک کا حکم ہے۔ حدیث میں ہے۔

حتی اذا رأیت شحًا عاد هوی متبعا و دنیا موثرة واعجاب کل ذی رائے برأیه فعلیک بخاصة نفسک ودع امر العامته.

(مسند احمد 315:2، الترغیب و الترھیب393:2، اتحاف5:5)

(جس وقت لوگوں میں حرص اور خواہش نفسانی کا تابع اور دنیا کو مختار اور ہر شخص کو اپنی رائے کا پسند کرنے والا دیکھو بس اس وقت نفس کی اصلاح میں مشغول ہو جاؤ اور عامہ کو ترک کردو)

اگر نفع متعدی میں خود فی نفسہٖ فضیلت ہوتی تو نفع لازم کے عدم ترتب سے اس کو کیوں بند کیا جاتا۔ دوسرے خلوت نفع متعدی میں مشغول ہونے کے بعد نفع لازم میں مشغول ہونے کی ضرورت ہی نہ رہتی، کیونکہ افضل کے ہوتے ہوئے مفضول کی کیا ضرورت ہے مگر نصوص شاہد ہیں کہ نفع لازم سے کسی وقت کسی کو بھی استغناء نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل الخلق ہیں حکم ہے۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ

کہ تبلیغ سے فارغ ہو کر اپنے کام میں محنت کیجئے اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جایئے۔
اور اہل طریق کا اجماع ہے کہ جو شخص دوسروں کی تربیت کرتا ہو اس کے لئے لازم ہے کہ ایک وقت اپنے لئے یکسوئی اور خلوت کا ضرور مقرر کرے ورنہ نسبت مع اللہ ضعیف ہو جائے گی معلوم ہوا کہ اصل مقصود نفع لازم ہے اور نفع متعدی مقصود نہیں بلکہ مقصود کا ذریعہ ہے خوب سمجھ لو اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں۔ بعض سالکین اس نیت سے ذکر و شغل کرتے ہیں تاکہ اپنی تکمیل کے بعد مخلوق کی اصلاح کریں گے۔ یاد رکھو یہ خیال طریق میں راہزن ہے اور اس نیت کے ساتھ کچھ حاصل نہ ہوگا، ابھی سے بڑے بننے کا شوق ابھی پوری طرح بیٹے تو بنے نہیں اور باپ بننے کی فکر ہونے لگی گئے آمدی و گئے پیر شدی

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی　　تا راہ بیں نہ باشی کے راہبر شوی
در مکتب حقائق پیش ادیب عشق　　ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

(اے بے خبر کوشش کر کہ خبردار ہو جائے جب تک تو راستہ دیکھنے والا نہ ہوگا راہبر کیسے بن سکتا ہے۔ اے لڑکے حقائق کے مدرسہ میں ادیب عشق کے سامنے سعی و کوشش کر کہ کسی روز باپ (مصلح) بھی ہو جائے گا)

علماء بھی نفع متعدی کی افضلیت کے مسئلہ سے دھوکہ میں ہیں، واعظین سمجھتے ہیں کہ بس ہم کو کچھ محنت کرنے کی ضرورت نہیں تمام سامعین کی گٹھڑیاں قیامت میں ہم کو ہی مل جائیں گی جی ہاں! دیکھنا کیسی ملتی ہیں اسی طرح اہل مدارس دھوکہ میں ہیں کہ بس ہم مدرسہ کی خدمت کر رہے ہیں جس سے نفع متعدی ہے یہی ہم کو کافی ہے اور کچھ ضرورت نہیں۔

ضرورت نظرِ صحیح

صاحبو! یہ بہت بڑا دھوکہ ہے جس کا منشا یہ ہے کہ سب نے نفع متعدی کو مطلقاً افضل و مقصود سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ کلیہ نہیں جیسا کہ میں نے تفصیلاً بتلا دیا۔ رہا یہ کہ پھر ہم کو کیسے معلوم ہو کہ اس وقت ہمارے لئے نفع متعدی میں مشغول ہونا افضل ہے اور اس وقت نفع لازم ہی میں اشتغال ضروری ہے اور نفع متعدی میں مشغول ہونا مضر ہے تو اس کے لئے نظر صحیح کی ضرورت ہے یا تو نظر صحیح پیدا کرو ورنہ کسی صاحب نظر کا دامن پکڑو اور اس کے تابع ہو جاؤ اور اس سے ہر موقع پر استفتاء کرو، واللہ اس کی سخت ضرورت ہے نظر صحیح میں بھی یوں ہی پیدا ہوگی بدوں اس کے بہت کم پیدا ہوتی ہے، بلکہ میں کہتا ہوں کہ جو شیخ صاحب نظر صحیح ہو وہ بھی اپنے واسطے کسی کو شیخ تجویز کرے کہ اپنے احوال خاصہ میں اس کی رائے سے عمل کیا کرے اپنی رائے سے عمل نہ کرے کیونکہ اپنے حالات و واقعات میں اپنی نظر تو ایک ہی پہلو پر جاتی ہے اور دوسرے کی نظر ہر پہلو پر جاتی ہے اور جس شیخ کو کوئی دوسرا شیخ نہ ملے تو وہ اپنے چھوٹوں ہی سے مشورہ کیا کرے۔ اس طرح بھی غلطی سے محفوظ رہے گا۔

جب میں مشائخ کے لئے بھی اس کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ وہ بھی کسی کو اپنا بڑا بنائیں اور اپنے معاملات خاصہ میں محض اپنی رائے سے عمل نہ کیا کریں تو غیر مشائخ کے لئے تو اس کی ضرورت بہت زیادہ ہے پس ہر شخص کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی رائے سے اپنے کو نفع متعدی کا اہل سمجھ لے اور اسی پر کفایت کر لے اور مبتدیان سلوک اور متوسطین کے لئے تو یہ بہت ہی مضر اور سدِ راہ ہے ان کا تو یہ مذاق ہونا چاہئے۔

احمد تو عاشقی بہ مشیخت تراچہ کار　　دیوانہ باش سلسلہ شد شد نہ شد نہ شُد

(احمد رحمہ اللہ تعالیٰ تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا تو محبوب کا دیوانہ ہو جا سلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو)

بہر حال بعض مشائخ اپنا مجمع بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں اور اُس میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہمارا مجمع زیادہ ہوگا تو مخلوق کو نفع زیادہ ہوگا۔ سو میں نے بتلا دیا ہے کہ وہ دھوکہ میں ہیں۔

علامتِ اخلاص

اور یہ گفتگو تو اس وقت ہے جب کہ اس تاویل کو تسلیم کر لیا جائے کہ وہ واقعی اس نیت سے مجمع بڑھانے کی فکر کرتے ہیں تا کہ مخلوق کو نفع ہو اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تاویل بھی فاسد ہے اگر اُن کو نفع خلق مطلوب ہے تو اس کی علامت یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص اُن سے زیادہ کامل آ جائے جس سے نفع خلق کی زیادہ امید ہے تو یہ حضرت شیخ اپنی مسند کو چھوڑ کر الگ ہو جائیں اور لوگوں سے صاف کہہ دیں کہ اب میری ضرورت نہیں رہی۔ فلاں بزرگ کے پاس جاؤ وہ مجھ سے زیادہ کامل ہیں۔ مگر وہ لوگ جو نفع خلق کی تاویل سے اپنا مجمع بڑھا رہے ہیں ذرا وہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ کیا وہ ایسا کر سکتے ہیں کہ اُن کی بستی میں دوسرا بزرگ اسی کام کا کرنے والا آ جائے تو یہ اس کام کو اس کے حوالے کر کے خود دوسرا کام سنبھالیں ہرگز نہیں۔ اب تو یہ حالت ہے کہ خانقاہ والے دوسری خانقاہوں کو نہیں چاہتے اور مدرسہ والے دوسرے مدارس کو نہیں چاہتے، واعظین دوسرے واعظین کو نہیں چاہتے پھر یہ کیا اخلاص ہے اس حالت کو دیکھ کر بعضے دردمند بے ساختہ دربار رسالت کی طرف متوجہ ہو کر اس طرح فریاد کرتے ہیں۔

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب　　خیز کہ شد مشرق مغرب خراب

اے اللہ! جب علماء و مشائخ کی یہ حالت ہے تو اب عوام کی اصلاح کیونکر ہو۔ افسوس مات کا مات ہی خراب ہے۔ **ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ** ۔ خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ انکو چکھاوے تا کہ وہ باز آئیں۔

مسلمانو! سنبھلو اور اپنی حالت کو سنوارو کہ ہم راستہ سے بہت دور پہنچ گئے ہیں اور سب سے زیادہ ضرورت علماء و مشائخ کو اپنی اصلاح کی ہے کیونکہ ان کی اصلاح پر عوام کی اصلاح موقوف ہے۔ پہلے

بزرگوں کی یہ حالت تھی کہ جب ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ نے اس مسجد (پیر محمد والی) میں قیام کا ارادہ کیا اور پہلے یہ سہ دری یہاں بنی ہوئی نہ تھی۔ یہ حضرت میاں جی صاحب قدس سرہٗ کے حکم سے بنی ہے تو حاجی صاحب کے یہاں بیٹھنے سے پہلے اس مسجد میں ایک بزرگ حسن شاہؒ رہتے تھے، وہ صاحب سماع تھے مگر سچے آدمی تھے، دکاندار نہ تھے جب انہوں نے حضرت حاجی صاحبؒ کو یہاں قیام کرتے دیکھا تو وہ اپنا بستر لپیٹ کر شاہ ولایت میں جا پڑے اور فرمایا کہ اب شیخ بستی میں کامل آ گیا ہے۔ اس کے سامنے مجھے بستی میں رہنے کی ضرورت نہیں وہ جنگل میں جا بسے اور وہیں زندگی کے دن پورے کردیئے۔ واللہ! میں تو اس ادا کا عاشق ہوں، افسوس اب ہمارے اندر یہ باتیں نہیں رہیں۔

اسی طرح جب حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی اپنے شیخ علی احمد صابرؒ کے حکم سے پانی پت تشریف لائے اور یہاں قیام کا ارادہ کیا تو پانی پت میں شاہ بوعلیؒ قلندر پہلے سے موجود تھے انہوں نے اپنے ایک مرید کے ہاتھ کٹورے میں پانی بھر کر شیخ شمس الدینؒ کے پاس بھیجا، شیخ شمس الدینؒ نے اس پر ایک پھول رکھ کر واپس کردیا۔ لوگ اس رمز کو نہ سمجھے تو انہوں نے قلندر صاحبؒ سے دریافت کیا کہ یہ کیا بات تھی فرمایا کہ میں نے شیخ شمس الدین سے یہ کہا تھا کہ پانی پت میرے اثر سے ایسا بھرا ہوا ہے جیسے یہ کٹورا پانی سے بھرا ہے۔ اس میں کسی دوسرے کی گنجائش نہیں آپ یہاں فضول تشریف لائے تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ میں یہاں اس طرح رہوں گا جیسے پانی پر پھول رہتا ہے کہ پانی کی جگہ کو نہیں گھیرتا یعنی میں آپ کے اثر میں تصرف نہ کروں گا۔

اس کے بعد شاہ بوعلی قلندرؒ خود ہی بستی چھوڑ کر جنگل کی طرف تشریف لے گئے گویا حضرت شیخ شمس الدینؒ کو اجازت دیدی کہ تم جس طرح چاہو تصرف کرو۔ اب ہماری ضرورت نہیں رہی کیونکہ دوسرا صاحب کمال آ گیا ہے۔

صاحبو! ہمارے اندر یہی باتیں تو نہیں رہیں بلکہ اس کے بجائے ہمارے اندر تحزب اور گروہ بندی کا مرض آ گیا ہے اگر ہم کو نفع خلق مقصود ہوتا تو دوسرے نفع پہنچانے والوں سے انقباض نہ ہوتا۔ بلکہ خوشی ہوتی کہ اچھا ہوا اس نے میرے اوپر سے بوجھ ہلکا کردیا۔ اب میں دین کا کوئی دوسرا کام کروں جس کو کوئی نہ کر رہا ہو۔ نیز اگر نفع خلق مقصود ہوتا تو جس شخص کے ہاتھ سے بھی دین کا نفع پہنچتا۔ ہم اُس سے خوش ہوتے اگرچہ وہ ہمارے بزرگوں سے بعض مسائل فرعیہ میں اختلاف ہی رکھتا ہوتا کیونکہ مسائل فرعیہ میں اختلاف تو اہل حق میں ابتداء سے چلا آ رہا ہے کوئی نئی بات نہیں مگر ہماری یہ حالت ہے کہ اگر ہمارے بزرگوں سے کسی عالم کو کسی مسئلہ میں بھی اختلاف ہو تو چاہے اُس سے دین کا فیض ہمارے بزرگوں سے بھی زیادہ ہو رہا ہو اُس سے خوش نہ ہوں گے اور نہ اس کے مرنے پر حسرت و رنج ہوتا ہے

بلکہ کسی درجہ میں خوشی ہی ہوتی ہے میں کہاں تک معیارات بیان کروں۔ اگر ہمارے اندر دین ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ ان کسوٹیوں پر نہیں کسا جاتا۔ بس جہاں تک اپنی حالت میں غور کرتے ہیں، حسرت ہی ہوتی ہے اور زیادہ حسرت اس کی ہے کہ حسرت بھی پوری طرح نہیں ہوتی۔

صاحبو! یہ سب آثار اسی کے ہیں کہ ہم لوگ رضائے خلق کو رضائے حق پر ترجیح دیتے ہیں اور یہ بڑا مرض ہے جو شرک کا شائبہ ہے کیونکہ اسی سے ریاء پیدا ہوتی ہے اس لئے کہ ریاء کی حقیقت مقصودیت خلق ہے اور جو شخص رضائے خلق کا طالب ہوگا اُس سے زیادہ مقصودیت خلق کس میں ہوگی پس ریاء بھی اس مرض کی فرع ہے اور ریاء کو حدیث میں شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔

درجات توحید مطلوب

کیونکہ توحید مطلوب کے مختلف درجات ہیں ایک توحید اعتقادی ہے کہ حق تعالیٰ کو ذات و صفات میں واحد و یکتا سمجھنا اس درجہ کا عنوان **لا معبود الا اللّٰہ** ہے اور بحمد اللہ یہ درجہ توحید کا سب مسلمانوں کو حاصل ہے اس کا مقابل شرک اعتقادی ہے اس شرک سے تو سب مسلمان محفوظ ہیں اور ایک توحید قصدی ہے کہ حق تعالیٰ کو قصد میں بھی یکتا واحد سمجھے کہ بجز حق تعالیٰ کے کسی چیز کو مقصود و مطلوب نہ بنائے اس درجہ کا عنوان **لا مقصود الا اللّٰہ** ہے۔

اس درجہ میں بہت لوگ کوتاہی کررہے ہیں جیسا کہ اوپر معلوم ہوا اور اس درجہ توحید کا مقابل شرک قصدی ہے یعنی غیر حق کو مطلوب و مقصود بنانا اور اسی شرک کا ایک فرد ریاء بھی ہے اور یہ دونوں درجے توحید کے مطلوب ہیں اور ایک تیسرا درجہ اور ہے مگر وہ توحید مطلوب کا کوئی درجہ نہیں ہے گو عام طور پر لوگ اس کو توحید ہی کا درجہ سمجھتے ہیں مگر یہ غلط ہے بلکہ وہ ان درجات توحید کا ذریعہ اور سبب ہے کہ اُس سے ان درجات مطلوبہ کے حصول وکمال میں سہولت ہو جاتی ہے۔ وہ خود مقصود نہیں۔ اُس کا نام توحید وجودی ہے یعنی حق تعالیٰ کو وجود میں واحد و یکتا سمجھنا جس کا اثر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کے وجود کا اثر اس کی طبیعت پر نہ ہو جس سے خوفاً یا رجاءً متاثر ہو جائے بلکہ بجز وجود حق کے سب کے وجود سے قطع نظر ہو جائے اور یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ کے سوا کوئی موجود اس قابل نہیں جس سے خوف و رجاء کو متعلق کیا جائے جیسے کوئی شخص کلکٹر صاحب کا مقرب ہو جائے تو اب وہ باورچی اور سپاہی اور خانساماں سے متاثر نہ ہوگا۔ اب اس پر خانساماں اور سپاہی کا وہ اثر نہیں ہوتا جو پہلے تھا کہ ان سب سے ڈرتا تھا اور ان کی خوشامد کرتا تھا اب وہ بجز کلکٹر کے کسی ماتحت سے نہ ڈرے گا۔ نہ کسی کی خوشامد کرے گا۔ اسی کو شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

موحد چہ برپائے ریزی زرش　　چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نہ باشد نہ کس　　ہمیں است بنیاد و توحید بس

(موحد کے قدموں کے نیچے خواہ زر بکھیر دیں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں امید و خوف اس کے سوائے خدا کے اور کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے)

حقیقت وحدت الوجود

اس توحید کا عنوان لا موجود الی اللہ ہے اسی کو وحدت الوجود کہتے ہیں مگر یہ شرعاً نہ مامور بہ ہے اور نہ اس کو توحید کہا گیا ہے نہ اس کے عدم کو شرک کہا گیا ہے جیسے ریاء کو شرک کہا گیا ہے۔ اسی لئے اس کو توحید کا درجہ سمجھنا غلط ہے۔ باقی اصطلاح میں کوئی نزاع نہیں مطلب یہ ہے کہ شرعاً جو توحید مطلوب و مامور بہ ہے وہ دو ہی درجے ہیں ایک درجہ ایمان میں دوسرا درجہ عمل میں توحید وجودی توحید مامور بہ نہیں ہے ہاں توحید مطلوب کی معین ضرور ہے کہ اس سے توحید اعتقادی و توحید قصدی کا حصول و کمال سہل ہو جاتا ہے مگر یہ نہیں کہ اس کے بغیر توحید کامل ہی نہ ہو سکے نہیں نہیں توحید اس کے بغیر کامل بھی ہو سکتی ہے ورنہ لازم آئے گا کہ نصوص پر عمل کرنے سے کوئی صوفی ہی نہ ہو حالانکہ تصوف کچھ اسی پر موقوف نہیں۔ میں تو یہ ضرور کہوں گا کہ غیر صوفی مومن کامل نہیں ہوتا مگر اسی کے ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ صوفی ہونا وحدۃ الوجود پر موقوف نہیں بلکہ اس کے بغیر بھی تصوف حاصل ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک بہت سے علماء محققین خصوصاً آئمہ مجتہدین سب صوفی تھے کیونکہ تصوف سے جو مقصود ہے وہ ان کو علی وجہ الکمال حاصل تھا حالانکہ وحدۃ الوجود کا غلبہ اُن پر نہ تھا۔ غلبہ وحدۃ الوجود سے اصل مقصود صرف یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو مقصود نہ سمجھے اور ہر کام میں رضائے حق ہی کو مطلوب بنائے سو یہ بات بدوں اس غلبہ کے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اگر غیر حق کے وجود سے بھی قطع نظر ہو جائے گی تو یہ مقصود سہولت سے حاصل ہو جائے گا۔

یہ بات کہ توحید وجودی توحید مطلوب کا کوئی درجہ نہیں آج پینسٹھ سال کے بعد معلوم ہوئی ورنہ اب تک میں بھی اس کو توحید کی ایک قسم سمجھتا تھا۔ الحمدللہ آج غلطی منکشف ہوئی جس پر میں بے حد مسرور ہوں۔

اور اس کے متعلق ایک بات اور سمجھو کہ غیر حق کے وجود سے قطع نظر ہو جانے اور غیر کے وجود سے متاثر نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس کی برکت سے کسی سوچ اور فکر میں نہ پڑے گا۔ یہ نہیں کہ طبعی اثر بھی نہ ہوگا۔ عام طور پر لوگ وحدۃ الوجود کی حقیقت یہی سمجھتے ہیں کہ غیر حق کے وجود سے طبعی اثر بھی نہ پیدا ہو مگر یہ بات نہیں ہے بلکہ وحدۃ الوجود کا اثر صرف یہ ہے کہ عقلاً متاثر نہ ہو اور اس کی وجہ سے عقلاً فکر اور سوچ میں نہ پڑے ورنہ طبعی تاثر ضرور ہوتا ہے۔ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

زیادہ موحد کامل اور جامع حقائق وآثار اقسام توحید کون ہوگا۔ مگر طبعی تاثر آپ کو بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ حضور اپنے صاحبزادے کے انتقال سے متاثر ہوئے جس کو خود ان الفاظ سے آپ نے ظاہر فرمایا۔

انا بفراقک یا ابراھیم لمحزنون (اے ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں تمہاری جدائی سے غمگین ہوں) اب شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب مبتدی بھی متاثر ہوتا ہے اور کامل بھی تو پھر دونوں میں فرق کیا ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے مبتدی کا تاثر تو ایسا ہے جیسے بچہ کے ذرا سا زخم ہو جائے اور اس میں سے خون نکل پڑے تو وہ گھبرا کر روتا ہے کہ ہائے کھون نکل آیا اور سمجھتا ہے کہ اب بس جان نکل جائے گی اور متوسط کی ایسی حالت ہے جیسے کسی کو کلوروفام سنگھا کر آپریشن کیا جائے وہ نشتر لگنے سے ظاہر میں ذرا متاثر نہیں ہوتا اور ناواقف سمجھتا ہے کہ یہ بڑا بہادر ہے اور منتہی کامل کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو بدوں کلوروفام سنگھائے آپریشن کیا جائے اس کے منہ سے آہ نکلتی ہے اور نشتر لگنے سے متاثر ہوتا ہے۔ تکلیف کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن فکر اور سوچ نہیں ہوتی۔ اور وہ اس سے گھبراتا بھی نہیں بلکہ دل سے راضی ہے اور خوشی خوشی نشتر لگوا رہا ہے ناواقف اس کی آہ سن کر سمجھتا ہے کہ یہ بزدل اور کمزور ہے مگر حقیقت شناس جانتا ہے کہ جس نے آہ نہیں کی یہ اس کا کمال نہ تھا بلکہ کلوروفام کا کمال تھا اور جس نے آہ کی ہے یہ اُس سے زیادہ کامل ہے کہ تکلیف کا احساس ہو رہا ہے اور پھر خوشی سے نشتر لگوا رہا ہے۔

پس غلبۂ وحدۃ الوجود یا بعبادت دیگر توحید وجودی کے کے اثر کا مطلب نہیں کہ طبعی تاثر بھی نہ ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ وجود غیر حق کا اتنا اثر نہ ہو کہ اُس سے سوچ اور فکر میں پڑ جائے۔ یہی ہے **لا موجود الّا اللہ** اور اسی کو توحید حالی کہتے ہیں۔ مگر یہ توحید شرعی کا کوئی درجہ نہیں ہے صرف معین ہے بلکہ درجات توحید کا انتہا **لا مقصود اِلَّا اللہ** پر ہے۔ اور **لا موجود الّا اللہ** نہ مامور بہ ہے۔ نہ اس پر ثواب کا وعدہ ہے۔ اگر یہ بھی توحید کا کوئی درجہ ہوتا تو ضرور اس کا امر بھی ہوتا اور اس پر ثواب بھی ہوتا مگر نصوص اس سے ساکت ہیں۔ ہاں کوئی مجازاً اور اصطلاحاً اس معین توحید کو توحید کہے تو مضائقہ نہیں۔ **لا مشاحۃ فِی الْاِصْطَلَاحِ** (اصطلاح میں کچھ مضائقہ نہیں ہے) لیکن اس کو مدار کمال سمجھو تو صلاح ہے۔

علاج رضاءِ خلق

میں یہ کہہ رہا تھا کہ رضائے خلق پر نظر رکھنا شرک کی ایک فرد ہے خواہ اصغر ہی ہو کیونکہ ریاء اسی کی فرع ہے اور اس کو احادیث میں شرک سے تعبیر کیا گیا ہے پس یہ نہایت سخت مرض ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ توحید قصدی حاصل کرو اور مراقبہ وذکر سے **لا مقصود الّا اللہ** کو اپنے

اوپر غالب کرواس کے بعد انشاء اللہ تم رضائے خلق کو رضائے حق پر ہرگز ترجیح نہ دو گے۔

اب ایک شبہ رہا وہ یہ کہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کو ہزار مراقبوں سے بھی **لا مقصود الا اللہ** کا غلبہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ غیر حق کی مقصودیت کا خیال برابر قائم رہتا ہے تو سنیے ان کے لئے بھی تدبیر موجود ہے وہ ناامید نہ ہوں۔ یہ لوگ یوں کریں کہ اپنے اختیار سے ہر کام میں رضائے حق کا قصد کریں اور اپنے اختیار سے رضائے خلق کا قصد نہ کریں اور بلا قصد کے اگر رضاءِ خلق کا وسوسہ یا خیال آئے تو اس کی مطلق پرواہ نہ کرے بلکہ ہمیشہ یوں ہی کرتا رہے کہ اپنے اختیار وارادہ سے رضائے حق کا قصد کیا کرے تجربہ ہے کہ رذائل کے خلاف عمل کرنے سے چند روز میں اس عمل کی عادت ومشق ہوجاتی ہے پھر رذیلہ کے خلاف عمل کرنے میں کچھ دشواری نہیں ہوتی بلکہ رذیلہ کمزور ہوجاتا ہے جس کی مقاومت سہل ہوجاتی ہے۔

ہمارے حاجی صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ رذائل کا ازالہ نہ کرو صرف امالہ کافی ہے۔ غرض ازالہ کی فکر ضرور نہیں اضمحلال بھی کافی ہے مگر اضمحلال کے لئے اس کی مشق ضروری ہے اور مشق ہوتی ہے کثرت تکرار سے یہ نہ ہو۔

الحائک اذا صلی یوماانتظر الوحی. (جولاہا اگر ایک دن نماز پڑھ لے تو وحی کا منتظر ہوتا ہے) کہ دو دن مخالفت کر کے اپنے کو کامل سمجھنے لگے کثرت تکرار کی خاصیت ہے اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک دن انشاء اللہ یہ رذیلہ کمزور ہوجائے گا۔

بعض حکماء اس نکتہ کو نہیں سمجھے وہ کہتے ہیں کہ عادات نہیں بدلا کرتیں اس لئے مجاہدہ فضول ہے مگر وہ یہ نہیں سمجھے کہ عادت کے خلاف کی عادت ہوجانے سے پہلی عادات ایسی کمزور ہوجاتی ہیں کہ گویا تھی ہی نہیں اور اس کا انکار نہیں ہوسکتا۔ مشائخ طریق کے یہاں رات دن ایسی نظائر مشاہدہ میں آتی ہیں کہ مجاہدات وکثرت مخالفت سے اخلاق رذیلہ گو معدوم نہیں مگر کالعدم ضرور ہوجاتی ہے۔

اور یہ طریقہ ایسا آسان ہے جو ہر شخص کے اختیار میں ہے کہ اپنے قصد واختیار سے رذائل کی مخالفت کرے۔ اسی طرح اپنے اختیار سے رضائے خلق کا قصد نہ کرے بلکہ رضائے حق کا قصد کرے اور اس کے خلاف جو وساوس وخیالات آئیں ان کی پرواہ نہ کرے۔ انشاء اللہ تم ایک دن **لا مقصود الا اللہ** پر عامل ہوجاؤ گے اور جب کثرت تکرار سے قصد رضائے حق کی عادت اور مشق ہوجائے گی تو رضائے خلق کے وساوس وخیالات بھی منقطع ہوجائیں گے اور نہ بھی منقطع ہوں تو تم گھبراؤ نہیں کیونکہ وسوسہ ریاء ریا نہیں ریاء اور رضائے خلاق وہ ہے جس کے ساتھ قصد متعلق ہو صحیح طریقہ تو یہ ہے۔

حقیقت توجہ

اور ایک دوسرا طریقہ ناکافی اور ہے کہ بعض لوگ چھومنتر کے پیچھے پڑے رہتے ہیں کہ ہم کوتو کچھ کرنا نہ پڑے۔ بس کسی کی توجہ سے غلبہ ہو جائے اور ایسا ہو بھی جاتا ہے مگر وہ اثر چند روزہ ہوتا ہے اس کی عمر نہیں ہوتی جیسے شعبدہ باز اور بھان متی، آم کا درخت بنا دیتے ہیں اور اس پر پھل بھی اسی وقت آ جاتا ہے لیکن اس کی عمر نہیں ہوتی ذرا سی دیر میں سب فنا ہو جاتے ہیں۔

مجھے اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ میرٹھ میں ایک دفعہ ایک شعبدہ باز آیا۔ اور اس نے بڑے بڑے شعبدے دکھلائے حاضرین میں ایک سوداگر حاجی خدا بخش تھے وہ ہر شعبدہ پر یہ کہتے تھے کہ یہ محض چالاکی اور ہاتھ کی صفائی ہے اور اُن ترکیبوں کو بھی بتلاتے جاتے تھے جب انہوں نے بار بار یہی کہنا شروع کیا تو شعبدہ باز نے کہا کہ اچھا ذرا کرسی سے کھڑے ہو کر اپنا پیٹ ملو حاجی جی نے کرسی سے کھڑے ہو کر اپنا پیٹ ملا تو تھوڑی دیر میں اُن کے پاجامہ کے اندر سے ایک پنجرہ کبوتروں کا نکل پڑا اور کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کرنے لگے، شعبدہ باز نے کہا کہ حاجی صاحب یہ بچے کب سے پیٹ میں لئے بیٹھے تھے اور حاجی صاحب کی یہ حالت ہوئی کہ اُن پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور شرم کی وجہ سے سر نہ اٹھا سکے۔ پھر دم نہیں مارا خاموش بیٹھے دیکھتے رہے۔ مگر یہ کبوتر جیسے چھومنتر سے آئے تھے ویسے ہی چھومنتر سے غائب بھی ہو گئے ایسے ہی جن لوگوں کو کسی کی توجہ سے کوئی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے اس کے لئے بقا نہیں ہوتا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک حرارت تو وہ ہے کہ تنور کے پاس بیٹھنے سے بدن گرم ہو گیا، یہ دیر پا نہیں۔ وہاں سے اٹھ کر جہاں ٹھنڈی ہوا لگی اور سرد ہو گئے اور ایک حرارت وہ ہے جو سنکھیا کھانے سے پیدا ہو اُس کو ہزار پنکھے جھلو مگر وہ سرد ہی نہیں ہوتا۔ اسی طرح جن کے پاس توجہ اور چھومنتر سے کوئی کیفیت ہوتی ہے وہ جہاں چند روز شیخ سے الگ رہے اور سرد ہوئے اور جس کے پاس اپنی کمائی ہوئی دولت ہو وہ تمام شیاطین و ابالسہ سے بھی سرد نہیں ہوتا اگر دنیا بھر کے شیاطین اس کی دولت کو چھیننا چاہیں گے کبھی ممکن نہیں کیونکہ وہ تو اس کی رگ رگ میں پیوستہ ہے جان نکلنے کے ساتھ بھی نہیں نکل سکتی۔

سلبِ نسبت

اور یہ جو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں کی نسبت سلب کر لی تو وہ محض کیفیت سلب ہوتی ہے ورنہ نسبت مع اللہ بھی کہیں کسی کے سلب کرنے سے سلب ہو سکتی ہے ہرگز نہیں۔

صاحبو! میں اس وقت تصوف کو پانی کر رہا ہوں نہ تو میں آپ کو لا موجود الا اللّٰہ کا مکلّف

کرتا ہوں کیونکہ یہ تو شیخ ابن عربی ہی کا کام تھا۔ ہمارا آپ کا کام نہیں۔ اور نہ ایسا آزاد چھوڑتا ہوں کہ تم خود کچھ نہ کرو۔ بلکہ میں آپ کو بین بین حالت کی وصیت کرتا ہوں کہ نہ تو بالکل بے فکر رہو کہ چھو منتر ہی کا انتظار کرتے رہو اور نہ لا موجود الا اللّٰہ کے درپے رہو بلکہ بحمد اللہ لا معبود الا اللّٰہ کا درجہ تو آپ کو حاصل ہے ہی اعتقاداً بھی اور عملاً بھی بس اتنی کسر ہے کہ لا مقصود الا اللّٰہ کا درجہ حاصل ہو جائے۔ اعتقاداً تو یہ درجہ بھی آپ کو حاصل ہے صرف عمل میں کسر ہے سو ضرورت اس کی ہے کہ عملاً لا مقصود الا اللّٰہ پر عامل ہو جاؤ کہ ہر کام میں رضائے حق کا قصد کرو۔

ارضائے خلق بنیتِ ارضائے حق

اور یہ حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ یہاں وَرَسُوْلِہٖ بڑھا کر اس بات کی تنبیہ فرما دی کہ ارضائے خلق بھی اگر بہ نیت ارضائے حق ہو تو وہ ارضائے حق ہی میں داخل ہے پس اب شیخ کی اطاعت وانقیاد پر اشکال نہ رہا بلکہ وہ بھی ارضائے حق ہی ہے کیونکہ ارضائے شیخ سے مقصود ارضائے حق ہی ہے۔

بعض لوگوں کی نیت تو اس میں یہ ہوتی ہے کہ شیخ خوش ہوگا تو ہمارے حال پر زیادہ توجہ کرے گا اس میں تو اپنی غرض کا شائبہ بھی ہے گو یہ غرض محمود ہے کیونکہ توجہ سے مقصود اپنی اصلاح و تکمیل ہے اور اس سے مقصود رضائے حق ہی ہے۔ اور بعض کی نیت یہ ہوتی ہے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کا مقرب و مقبول ہے اس کے خوش کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوں گے۔ اس نیت میں اپنی غرض بھی نہیں ہے بلکہ خالص ارضائے حق ہی مطلوب ہے۔ بہر حال ارضائے خلق اگر بہ نیت ارضائے حق ہو۔ تو وہ ارضائے حق ہی میں داخل ہے۔

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارضاء کو آیت میں ارضائے حق کے ساتھ ذکر کیا گیا اور حدیث نے تو اس مسئلہ کو بہت اچھی طرح صاف کر دیا۔ حدیث صحیح میں ہے کہ ایک رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا قرآن سنا جبکہ وہ تہجد میں قرأت کر رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کو فرمایا کہ اے ابوموسیٰ رات میں نے تمہارا قرآن سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مزامیر آلِ داؤد میں سے ایک مزمار عطا فرمایا ہے۔ مراد یہ کہ تمہاری آواز گویا لحن داؤدی ہے۔

تو حضرت ابوموسیٰؓ نے عرض کیا کہ یا رَسُوْلَ اللّٰہ! اگر مجھے خبر ہوتی کہ آپ سن رہے ہیں تو میں اور بنا سنوار کر پڑھتا۔ حدیث میں لحبرت تحبیرا وارد ہے اس کا یہی ترجمہ ہے۔

اس سے بعض زاہدان خشک کو یہ شبہ ہوا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن کو بنا سنوار کر پڑھتے تو یہ ریاء ہوتی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غیر حق ہیں اور غیر حق

کے لئے عمل کرنا ریاء ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ہرگز ریاء نہ ہوتی کیونکہ اس وقت ابوموسیٰ کو تطییب قلب رسول بہ نیت ارضائے حق مطلوب ہوتی اور یہ ریاء نہیں۔ گو کسی کو شبہ ہو جائے کہ صورۃً تو ریاء ہے مگر اس کی تسلیم کے بعد یہ کہا جائے گا کہ صورت ریاء ریاء نہیں ہے جب تک حقیقت ریاء نہ ہو۔

صورت ریاء ریاء نہیں

اور یہاں سے ایک مسئلہ اور سمجھ لیجئے جو اجمالاً اس وقت میری زبان سے نکل گیا ہے کہ صورت ریاء ریا نہیں ہے اس کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ وسوسہ ریاء ریاء نہیں ہے۔ بس ریاء وہ ہے کہ عمل دینی سے مقصود ہی غیر حق ہو اور غیر حق کو ارضائے حق کا واسطہ بھی نہ بنایا گیا ہو۔ اور اگر مقصود عمل سے غیر حق نہ ہو تو غیر کا وسوسہ آنا مضر نہیں۔

رہا یہ کہ اس کا معیار کیا ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ وسوسۂ ریاء تھا نہ کہ حقیقت ریاء۔ تو ائمہ طریق نے اس کو بھی بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ریاء یہ ہے کہ اس کے دیکھنے والے چلے جائیں تو یہ ذکر وغیرہ کو قطع کر دے اور اگر اُن کے جانے کے بعد ذکر کو قطع نہ کرے تو دیکھنے والوں کے ہوتے ہوئے جو اُن کی طرف خیال گیا تھا یہ وسوسۂ ریاء تھا ریاء نہ تھا۔ خوب سمجھ لو بعض لوگ اس حقیقت کے نہ جاننے سے ذکر جہر میں پس و پیش کرتے ہیں کہ اس میں تو ریاء ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک شخص کو ذکرِ جہر تعلیم فرمایا تو اس نے یہی کہا کہ اس میں تو ریاء ہوگی خفی کر لیا کروں۔ مولانا نے فرمایا کہ جی ہاں! اس میں تو ریاء ہوگی خفی میں نہ ہوگی۔ ارے بیٹھو! ذکرِ خفی میں تو اس سے زیادہ ریاء ہوگی۔ کیونکہ ذکر جہر میں تو لوگ یہی جانیں گے بس لا الہ الا اللہ کر رہے ہیں۔ اور جب گردن جھکا کر بیٹھو گے تو لوگ سمجھیں گے کہ نہ معلوم کہاں کہاں کی سیر کر رہا ہے۔ عرش کی یا کرسی کی چاہے میاں سوتے ہی رہیں۔

چنانچہ مولانا نے فرمایا کہ جس زمانہ میں ہم تھانہ بھون حاجی صاحبؒ کی خدمت میں تھے اس وقت ایک نقشبندی بزرگ بھی آئے ہوئے تھے۔ رات کو ہم ذکرِ جہر کرتے تھے اور وہ ذکرِ خفی مگر صبح کو وہ روز شکایت کرتے تھے کہ آدھا ذکر ہوا تھوڑی دیر کے بعد نیند آ گئی تھی اور میں سر جھکائے سو رہا اور ہم سب اپنا معمول پورا کر لیتے تھے تو حضرت ذکر خفی میں بعض دفعہ آپ سوتے ہی رہیں گے اور لوگ سمجھیں گے کہ شیخ صاحب مراقبہ میں ہیں تو یہ اچھا انسداد ریاء ہوا کہ ذکر ہی سے رہ گئے پس یہ وسوسہ لغو ہے ریاء کوئی خود نہیں لپٹتی پھرتی۔ جب قصد کرو گے تب ہی ریاء ہوگی ورنہ محض وسوسہ ہوگا جو مضر نہیں۔

اور بعض لوگ جو خود اپنے لئے ذکر خفی تجویز کرتے ہیں اس میں کبھی نفس کا ایک کید بھی ہوتا

ہے اگر شیخ تجویز کرے تو اور بات ہے خود تجویز کرنے میں اکثر نفس کا یہ کید ہوتا ہے کہ لوگوں کو میرے ناغہ کی اطلاع نہ ہو کیونکہ ذکرِ جہر میں اگر کسی دن سو گئے اور جہر نہ ہوا تو بھانڈا پھوٹ جائے گا کہ بس سارا جوش ختم ہو گیا۔ اور آج میاں نے کچھ بھی نہیں کیا اور ذکر خفی میں چاہے روز سویا کرو عمر بھر بھی ناغہ کا پتہ کسی کو نہ چلے گا۔ پس یہ خیالات لغو ہیں ان کو دل سے نکالو اور شوق سے ذکر جہر کرو اور ریاء سے بے فکر رہو مگر اتنا جہر نہ کرنا کہ محلّہ والے تم کو کوسیں ورنہ ایسے جہر سے نفع نہ ہوگا۔

ہمارے ایک دوست ڈپٹی کلکٹر ذاکر شاغل تھے انتقال کر گئے پہلے وہ دوسرے شیخ سے متعلق تھے ایک زمانہ میں وہ اتنا جہر کرتے تھے کہ محلّہ بھر کو رات بھر جگاتے تھے اور سب ان کو کوستے تھے پھر وہ اپنے شیخ سے بے تعلق ہو گئے کیونکہ وہ واقع میں شیخ نہ تھے ان کی تعلیم سے ان کو تسلی نہ ہوتی تھی پھر انہوں نے مجھ سے رجوع کیا چونکہ طالب تھے اس لئے میں نے ان کی تعلیم وتربیت قبول کر لی مگر یہ کہہ دیا کہ اپنے پہلے شیخ سے بدگمانی اور بے ادبی کبھی نہ کرنا کیونکہ اس کا یہی تم پر بڑا احسان ہے کہ اس نے تم کو راستہ پر ڈال دیا اور اس کے بعد میں نے ان کو جہر مفرط سے منع کر دیا تو ان کے محلّہ والے مجھے دعا دیتے تھے، خلاصہ یہ کہ وسوسۂ ریاء سے بے فکر رہو اور ذکر جہر شوق سے کرو۔

اسی طرح اگر کسی میں ذوق وشوق وغیرہ کی استعداد نہ ہو تو وہ بھی بے فکر رہے اس کو بھی توحید **لا مقصود الا اللہ** کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے جس کا طریقہ میں نے اوپر بتلا دیا ہے۔ پس ان کیفیات کی استعداد نہ ہونے سے کوئی مایوس نہ ہو، آج کل غیر محقق مشائخ بہت ہیں وہ ایسے لوگوں کو حصول مقصود سے مایوس کر دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔ میں صاف کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں کہ طریق کی استعداد اور مقصود تصوف کی قابلیت ہر مسلمان میں ہے کوئی مسلمان نااہل نہیں کیونکہ تصوف کا مقصود اصلی ادائے مامور بہٖ ہے اور مامور بہٖ کا اختیاری ہونا ضروری ہے اور امر اختیاری کا ہر شخص اہل ہے ورنہ وہ اختیاری نہ ہوگا۔ خوب سمجھ لو! آج کے بیان میں دیر بہت ہو گئی ہے مگر میرے نزدیک یہ سب مضامین ضروری تھے اور چونکہ اس وقت ضروری مضامین قریب قریب سب بیان ہو گئے ہیں جن کا مقصود بالبیان سے تعلق تھا اس لئے میں ختم کرنا چاہتا ہوں۔

مراتب اخلاص

ہاں! ایک مضمون میں کچھ کمی رہ گئی ہے اس کو اب پورا کئے دیتا ہوں، اس کے بعد ختم کر دوں گا۔ وہ مضمون یہ ہے کہ میں نے کہا تھا کہ ارضائے خلق للحق ریاء نہیں اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کی حدیث دلیل میں بیان کی تھی اس سے ایک اشکال کا جواب ہو گیا جو زمانۂ دراز تک مجھے

بھی رہا وہ یہ کہ بعض لوگ قراء سے درخواست کرتے ہیں کہ کچھ قرآن سناؤ اب اگر وہ بنا سنوار کر پڑھتے ہیں تو ریاء کا شبہ ہوتا ہے کیونکہ وہ تنہائی میں اس طرح بنا سنوار کر نہیں پڑھتے اور اگر معمولی طور سے پڑھ دیں تو درخواست کرنے والوں کا جی خوش نہیں ہوتا یہ اشکال پھر بہت دنوں کے بعد الحمدللہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے رفع ہوا۔ اور معلوم ہوا کہ تطییب قلب مومن کے لئے خوش آوازی سے قرآن پڑھنا ریاء نہیں گو اس میں ارضاء خلق مقصود ہے مگر یہ ارضاء خلق للحق ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے تطییب قلب مومن کا امر فرمایا ہے پس جو قاری خوش آوازی سے لوگوں کو قرآن سناتا ہے اگر اُس کو دینا مطلوب نہیں اور وہ قرآن سُنا کر روپیہ نہیں لیتا تو یہ بھی اخلاص ہی ہے کیونکہ یہ سب اخلاص ہی کے مراتب ہیں ایک یہ کہ محض خدا تعالیٰ کے لئے کام کرے مخلوق کا اس میں تعلق ہی نہ ہو اور ایک یہ کہ مخلوق کے راضی کرنے کو کام کرے مگر کوئی غرض دنیوی مطلوب نہ ہو صرف اس کا خوش کرنا مقصود ہو جو دینی غرض ہے اور ایک درجہ یہ کہ کچھ نیت نہ ہو نہ دنیا مطلوب ہو نہ دین، یونہی خالی الذہن ہو کر کوئی عمل کر لیا یہ بھی اخلاص عدم الریاء ہے۔ بس ریاء یہ ہے کہ دنیوی غرض کی نیت ہو۔

اب میں طلبہ کو بشارت دیتا ہوں کہ ان میں سے بعض کو طلب علم سے کچھ بھی مطلوب نہیں ہوتا نہ دنیا نہ دین۔ محض والدین کے کہنے سے پڑھ رہے ہیں۔ سو یہ بھی ایک درجہ کے مخلص ہیں۔ خلو عن الغرض الدنیوی بھی اخلاص ہی ہے کیونکہ ریاء اور اخلاص کے درمیان کوئی واسطہ نہیں اور ریاء کی حقیقت ہے۔

اراءۃ الخلق للغرض الدنیوی: (دنیوی غرض سے مخلوق کو دکھانا) اس مجموعہ میں سے ایک قید کے اُٹھ جانے سے بھی اخلاص کا تحقق ہو جائے گا۔ خواہ ارادتا الخلق ہی نہ ہو یا ارائۃ الخلق ہو۔ مگر غرض دنیوی نہ ہو بلکہ دینی ہو یا غرض[1] ہی کچھ نہ ہو۔

اسی رمضان میں گڈھی کے خان صاحب کی فرمائش پر مولوی طیب نے جمعہ کے بعد کچھ قرآن پڑھا تھا اگر کوئی اُن سے پوچھتا کہ آپ کی اس وقت کیا غرض تھی تو وہ کچھ بھی نہ کہہ سکتے۔ بس خان صاحب نے فرمائش کی اور انہوں نے فرمائش کو پورا کر دیا تو یہ بھی اخلاص ہے گو اعلیٰ درجہ تو یہی ہے کہ نیت ارضائے حق کی ہو مگر اعلیٰ درجہ کا اخلاص بڑے درجہ والوں کے لئے ہے ہمارے لئے تو یہی بہت ہے کہ ریاء سے بچ جائیں اور جہنم میں نہ جائیں۔ چاہے جنتیوں کی جوتیوں میں ہی جگہ مل جائے ہمارے لئے یہی کافی ہے۔ مقصود ریاء سے بچنا ہے اور یہ اخلاص کے ہر درجہ میں حاصل ہے۔ بس اسی کا نام تصوف ہے۔ تصوف لوٹنے پوٹنے کا نام نہیں ہے بلکہ

---

[1] (فان قلت) یرد علیه خلو العمل الاختیاری عین غایته وهو محال ۱۲ ظ (قلت) الغایة عام یشمل بلوغ درجة الکمال فی ذاک العمل ولا یلزم قصد الغایة فی هذه الغایة.

مقامات کا نام تصوف ہے اور مقامات یہی ملکات ہیں۔ اخلاص ورضاء وتواضع وغیرہ ان کو حاصل کرو اور ان کی اضداد ریاء و کبر واعتراض وغیرہ سے نکل جاؤ بس صوفی ہو گئے۔

اسی طرح بیمار پرسی میں ایک نیت تو یہ ہے کہ مسلمان کی عیادت سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں یہ تو اعلیٰ درجہ کا اخلاص ہے اور ایک نیت یہ ہے کہ عیادت سے یہ بیمار خوش ہوگا یہ بھی اخلاص ہے کیونکہ تطییب قلب مومن بھی عبادت ہے ایک نیت یہ ہے کہ بیمار کا حق ہے کہ اس کی عیادت کی جائے یہ بھی اخلاص ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ کچھ نیت نہ ہو بس کسی کی بیماری کا حال سن کر دل کڑھا۔ اور دل میں دیکھنے کا جوش ہوا اور چلے گئے کوئی غرض دینی یا دنیوی ذہن میں حاضر نہیں یہ بھی اخلاص ہے بس ریاء یہ ہے کہ اس نیت سے جائے کہ اگر میں نہ جاؤں گا تو کل کو یہ مجھے پوچھنے نہ آئے گا یہ دنیوی غرض ہے بس جب تک دنیوی غرض نہ ہو ریاء نہیں بلکہ اخلاص ہی ہے۔

اب یہاں سے ایک بزرگ کے اشکال کا جواب ہو گیا کہ حکایات اولیاء میں منقول ہے کہ ایک بزرگ کے سامنے جنازہ لایا گیا تو وہ نماز میں شریک نہ ہوئے لوگوں نے نماز پڑھ لی اور نماز کے بعد اُن سے پوچھا گیا کہ آپ کیوں شریک نہ ہوئے فرمایاں کہ میں نیت درست کرنے میں رہ گیا۔ میں اس کا یہ مطلب سمجھا ہوں کہ انہوں نے نفس سے پوچھا کہ تو کس نیت سے اس کی نماز پڑھتا ہے وہ کوئی نیت معین نہ کر سکا اب تک نیت درست نہ ہوئی تھی۔ اس لئے شریک نہ ہو سکا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اُن پر خالص حالت کا غلبہ تھا ورنہ جب کوئی نیت معلوم نہ ہوئی تھی تو یہ بھی اخلاص تھا۔ ان کو چاہئے تھا کہ خلو ذہن ہی کی حالت میں شریک ہو جاتے ورنہ اگر اس قاعدہ سے کام نہ لیا گیا تو بہت سے اعمال سے رہ جاؤ گے۔

احمق کا اخلاص

اور وہ حالت ہوگی جو ہمارے ایک کرم فرما کی دہلی کے اسٹیشن پر ہوئی وہ اپنے گھر والوں کو ساتھ لئے ہوئے وطن سے تھانہ بھون آ رہے تھے جب دہلی کے اسٹیشن پر پہنچے تو ایک پیسہ کے چنے خریدنے کو ریل پر سے اُترے اور دیر تک کھڑے کھڑے سوچتے رہے کہ یہ چنے تو کس لئے خریدتا ہے کیا ضرورت ہے ایسا نہ ہو کہ یہ اسراف ہو جائے۔ اسی سوچ میں بہت دیر ہو گئی آخر ریل نے جب سیٹی دی اس وقت گھبرا کر خوانچہ والے کو پیسہ دیدیا کہ اس کے چنے دیدے۔ اتنے وہ چنے دیتا رہا ریل چھوٹ گئی پھر جو یہ چنے لے کر اپنے درجہ میں بیٹھنے کے لئے دوڑے تو گاڑی تیز ہو گئی اور ریل کے قلی یا بابو نے ان کو روک دیا کہ چلتی گاڑی میں آپ نہیں بیٹھ سکتے۔ اب سخت

پریشان ہوئے کیونکہ بیوی زنانہ درجہ میں تھی اور سامان مردانہ میں تھا۔ بیوی کی پریشانی کا الگ خیال کہ سامان کے ضائع ہو جانے کا جدا اندیشہ۔ وہ تو خیر ہوئی کہ مردانہ درجہ میں شاہدرہ کے اترنے والے ایک ملاقاتی موجود تھے انہوں نے شاہدرہ میں سامان اتار لیا۔ اور زنانہ درجہ میں غازی آباد کی بعض عورتیں بیوی کی جان پہچان والی تھیں وہ اُن کے ساتھ غازی آباد کے اسٹیشن پر اُتر کر اُن کے ساتھ ان کے مکان پر چلی گئی مردانہ درجہ میں جو ملنے والے شخص تھے جب وہ شاہدرہ میں اپنا اور اُن کا دونوں کا سامان لے کر اُترے تو ریل کے سپاہی نے ان کو ٹوکا کہ سامان زیادہ ہے اس کی بلٹی لاؤ ورنہ وزن کراؤ۔ سامان پندرہ سیر سے زیادہ نہ تھا مگر احمق کا دوست احمق ہی ہوتا ہے اُن کی زبان سے نکل گیا کہ یہ سامان کل میرا نہیں ہے بلکہ اس میں زیادہ حصہ ایک مسافر کا ہے جو ریل چھوٹ جانے کی وجہ سے دہلی رہ گیا ہے اور ابھی آنے والا ہے سپاہی نے یہ سُن کر کہا کہ پھر تو آپ پر چوری کا شبہ ہے اس لئے جب تک وہ دوسرا مسافر نہ آ جائے آپ نہیں جا سکتے اور یہیں حراست میں رہنا پڑے گا۔ اب دوسری ٹرین سے یہ حضرت شاہدرہ پہنچے تو وہ دوست ان کو آ کر لپٹ گئے کہ تمہارے سامان کی وجہ سے میں قید میں ہوں مجھ کو چھڑاؤ۔ انہوں نے اس کی خوشامد کی کہ یہاں دو تین منٹ ہی ریل ٹھہرتی ہے اس لئے میں نہیں اتر سکتا۔ میری بیوی آگے غازی آباد چلی گئی ہے اُس کو واپس لا کر آپ کو چھڑاؤں گا۔ اب غازی آباد پہنچے تو اسٹیشن کے مسافر خانہ میں بیوی موجود نہیں۔ بڑے پریشان ہوئے کہ پھر کہاں گئی۔ شہر میں بیوی کے باپ ملازم تھے ان کے گھر گئے تو معلوم ہوا کہ یہاں نہیں پھر اسٹیشن پر واپس آئے اور ادھر ادھر لوگوں سے سراغ لگایا تو بڑی دیر میں کسی سے پتہ لگا کہ ایک لاوارث عورت فلاں محلّہ کی عورتوں کے ساتھ چلی گئی ہے یہ اُس محلّہ میں گئے اور یکہ یا ٹمٹم کرایہ کر کے اُس کو لائے اور کئی گھنٹوں میں شاہدرہ واپس آئے اُس وقت تک وہ دوست بے چارہ بدستور مقید تھا اُس کو الگ پریشان کیا خود الگ پریشان ہوئے۔ پھر سپاہی نے ان کی واپسی پر بھی اُس دوست کو مفت نہیں چھوڑا بلکہ ایک ''روپیہ'' رشوت کا دینا پڑا تو ایک پیسہ کے چنے خریدنے میں آپ نے اتنے سوچ سے کام لیا کہ بجائے ایک پیسہ کے کئی روپیوں کا نقصان ہوا اور اپنی اور بیوی کی اور دوست کی پریشانی الگ رہی ان حضرت کو میں نے یہ کہہ رکھا تھا کہ جو کام کرو سوچ کر کرو جو بات کرو سوچ کر کرو اس تعلیم کا آپ نے یہ مطلب سمجھا کہ اتنی دیر تک سوچا کرو کہ ریل بھی نکل جائے۔

واقعی! اب تو میں اس حکایت کو سن کر ڈر گیا کہ ایسے احمقوں کو تو یہ بھی نہ بتلانا چاہئے کہ سوچ کر کام کرو کیونکہ وہ اسی طرح سوچا کریں گے جس طرح ان حضرت نے سوچا تھا پھر جب

اس سے نقصان پہنچے گا تو دل میں کہیں گے کہ پیر صاحب کی تعلیم پر اچھا عمل کیا تھا کہ ایک پیسہ کی جگہ کئی روپیہ کا نقصان ہوا وہ اپنی عقل کو الزام نہ دیں گے بلکہ شیخ کی تعلیم پر الزام رکھیں گے اس لئے میں صاف کہتا ہوں کہ خلو ذہن بھی اخلاص ہی ہے۔ اگر کوئی نیت حاضر نہ ہو تو اس کے سوچنے میں دیر کرنے کی ضرورت نہیں بے فکر ہو کر کام کر لو تم ریاء کار نہ ہو گے بلکہ مخلص ہو گے اور اسراف کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ جب کوئی چیز خریدنا چاہو تو سوچ لو کہ ضرورت ہے یا نہیں اگر فوراً ضرورت ذہن میں آ جائے تو خرید لو اگر فوراً ضرورت ذہن میں نہ آئے تو نہ خریدو کیونکہ جس ضرورت کو آدھے گھنٹے تک سوچ سوچ کر پیدا کیا جائے وہ ضرورت نہیں۔

اور اگر دل میں بہت ہی تقاضا ہو اور ضرورت معتد بہا سمجھ میں نہ آئے تو ایسی صورت میں چیز خرید لو اور اطمینان سے بیٹھ کر سوچتے رہو اگر اسراف نہ ہونا محقق ہو گیا کھالو ورنہ خیرات کر دو اور بیوی کو کھلا دینا بھی خیرات ہی ہے۔ اور اگر بیوی کا جی خوش کرنے کے لئے بلا ضرورت بھی کوئی چیز خرید لو تو وہ بھی اسراف نہیں کیونکہ تطییب قلب زوجہ بھی مطلوب ہے بشرطیکہ اُس میں طاقت سے زیادہ قرض نہ کرے۔

واللہ ! مجھے ایسے احمقوں کی تعلیم میں آئندہ کے لئے خطرہ ہو گیا کہ ان کو کس طرح تعلیم کی جائے جب گھر کی عقل نہیں تو نہ معلوم یہ لوگ اُس تعلیم کا کیا مطلب سمجھیں گے۔ جیسے ان حضرت نے سوچ کر کام کرنے کا یہ مطلب سمجھا۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا باللہ !

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اُن بزرگ کا جنازہ کی نماز میں اس لئے شریک نہ ہونا کہ کوئی نیت قائم نہ ہوئی تھی محتاج تاویل ہے ورنہ اصل یہی تھا کہ اُن کو شریک ہو جانا چاہیئے تھا اور اس صورت میں ریاء نہ ہوتی۔

حقیقت ریاء

خلاصہ یہ کہ وَاللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ میں وَرَسُوْلُهٗ (اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسکے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو راضی کیا جائے) بڑھانے سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ ارضاءِ خلق للحق ریاء نہیں ہے ریاء وہ ہے جس میں دنیا کی غرض ہوحتیٰ کہ ارضاء رسول بھی اگر دنیا کے لئے ہو تو ریاء ہے چنانچہ منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا ہی کے لئے راضی کرنا چاہتے تھے جس پر اُن کو ملامت کی گئی مگر یہاں ایک تفصیل اور ہے وہ یہ کہ اگر دنیائے فاسد یعنی معصیت کی نیت ہو وہ تو یقیناً ریاء ہے اور اگر دنیائے مباح کی نیت ہو تو اگر عمل دنیوی میں ہے تو وہ بھی ریاء نہیں ہے اور اگر عمل دینی میں ہے تو وہ بھی ریاء ہے پس اب یوں کہنا چاہیئے کہ ریاء کی حقیقت

ارضاء الخلق للغرض الدنیوی الفاسد او للغرض المباح فی الطّاعة

(دنیاوی غرض سے مخلوق کو دکھانا یا غرض مباح سے دکھانا)

ہے مثلاً اگر کسی شخص کو عمل مباح سے اس لئے راضی کیا جائے تا کہ اُس کے شر سے محفوظ
رہیں تو یہ ریاء نہیں۔ ریاء یہ ہے کہ مخلوق کو اس لئے راضی کیا جائے کہ وہ ہمارے معتقد رہیں۔
ہمارے مُرید زیادہ ہوں وغیرہ وغیرہ کیونکہ یہ نیت معصیت ہے۔

اور ایک بات اور سمجھ لو وہ یہ کہ بعض دفعہ کوئی عمل ظاہر میں صالح معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں محقق کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ تمہارے واسطے یہ عمل صالح نہیں۔ کیونکہ نیت محمود نہیں تو اُس عمل کو چھوڑ دو اور محقق کا اتباع کرو۔ جیسا کہ بعض لوگ اپنا مجمع بڑھانے کو تاویل فاسد سے عمل صالح سمجھتے ہیں یہاں اپنے رائے پر عمل نہ کرو۔ بلکہ محقق سے استفتاء کرو کسی نے خوب کہا ہے ؎

بہر چہ از دوست وا مانی چہ کفر آں حرف وچہ ایماں
بہر چہ ازیر دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

اور اس کو محقق ہی بتلا سکتا ہے کہ کس عمل کو قرب حق میں دخل ہے اور کس کو دخل نہیں ہاں اگر خدا تعالیٰ تم کو بصیرت و تحقیق عطا فرما دیں تو پھر اپنے رائے پر بھی عمل کرنا جائز ہے اور اس میں اگر غلطی ہوگی تو تم ماخوذ نہ ہوگے کیونکہ وہ غلطی اجتہادی ہوگی جس میں اجر کا وعدہ ہے۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں۔ اور یہ مضامین اس آیت سے بزرگوں کے اقوال اور احادیث نبویہ کی امداد اور اہل اللہ کی جوتیاں سیدھی کرنے کی برکت سے میں نے مستنبط کئے ہیں ورنہ میری کیا مجال تھی جو ان علوم کو بیان کرسکتا۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق دیں اور فہم سلیم عطا فرمائیں (آمین)

وَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی اَفْضَلِ الْخَلْقِ وَ اکملہٖ
سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اجمعین صَلٰوۃً وَ سَلٰمًا
دَائِمِیْنَ مُتَلَازِمِیْنَ اَبَدًا لاٰبِدِیْنَ۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ
رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرَّاحِمِیْنَ ۔

طریق القرب

طریق القرب نامی وعظ 10 فروری قعدہ 1329ھ کو جمعہ کے روز جامع مسجد قصبہ قنوج میں بیٹھ کر سوا دو گھنٹے تک ہوا۔ سامعین کی تعداد تقریباً پانچ سو تھی، مولوی سعید احمد صاحب نے اسے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ للّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَ مَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ۔

اَمَّا بَعْدُ! اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَمَا اَمْوَالُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِىْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِى الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ۔ (السباء آیت نمبر ۳۷)

تمہارے مال اور اولاد مجھ سے قریب نہیں کر سکتے بلکہ قریب وہ ہے جو ایمان لایا اور اچھے کام کئے ان کے لیے کرنے کا دگنا بدلہ ہے۔ وہ بہترین کمروں میں پناہ گزین ہوں گے۔

قُربِ الٰہی

یہ قرآن مجید کی ایک آیت ہے۔ اس میں خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ایک بڑی دولت کا پتہ اور اس کے حصول کا طریقہ بتلایا ہے اور جو غلطیاں ان سے واقع ہوگئی ہیں ان پر تنبیہ فرمائی ہے۔ حاصل یہ ہے اس آیت کے ترجمہ سے اس دولت کا پتہ چل جاوے گا مگر اوّل مجملاً اس کا پتہ بتلاتا ہوں۔ کیونکہ بہت کم لوگ اس کو دولت سمجھتے ہیں اور اہل دنیا تو کیا سمجھتے اکثر اہلِ دین بھی اُس پر نظر کم کرتے ہیں۔ اور وہ دولت قربِ خداوندی ہے اور وہی اس آیت میں مذکور ہے۔ اور اس قرب کی حقیقت عنقریب معلوم ہوگی۔ اس لئے کہ وہاں قرب جسمانی تو ہے نہیں کہ فاصلہ کم ہو جائے کیونکہ یہ خواص جسم سے باقی جو چیزیں مادی نہیں ہیں، اگرچہ حادث اور ممکن ہوں ان میں بھی یہ قرب متصور نہیں ہے تو جو ذات پاک امکان اور حدوث سے بھی منزہ ہے اس میں یہ قرب کیونکر متصور ہوسکتا ہے۔ اور یہاں سے اُن عوام الناس کی غلطی معلوم ہوگئی ہوگی جو خواص

کی صورت میں ہیں اور خواص سے علماء مراد نہیں کیونکہ وہ ایسی غلطیوں سے محفوظ ہیں بلکہ مشائخ اور صوفیہ مراد ہیں تو جولوگ ان حضرات کی صورت بناتے ہیں اور حقیقت میں وہ عامی ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قرب خداوندی بھی قرب جسمانی ہے اور اس کا پتہ اُن کی مثالوں سے چلتا ہے اور اگر محققین سے اس قسم کی کوئی مثال منقول ہوتو ہم اس میں تاویل کریں گے لیکن یہ عوام اس قسم کے اقوال میں تاویل بھی نہیں کرتے بلکہ اُن کے ظاہری متبادر معنی مراد لیتے ہیں اور اس قسم کے اقوال بولنے والے بعض تو وہ ہیں کہ خدا کو دریا اور اپنے کو موج کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اور بعض لوگ قطرہ اور دریا کی تشبیہ دیتے ہیں تو اگر تشبیہات کسی معتبر کلام میں پائے جائیں گے تو ہم اس کی تاویل کریں گے۔ کیونکہ محض تشبیہ پر انکار کرنا تو غلو ہے قرآن شریف میں خود تشبیہ موجود ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ ۔(اللہ تعالیٰ نور (ہدایت) دینے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اس کے نور کی حالت عجیبہ ایسا ہے جیسے (فرض کرو) ایک اور اس میں ایک چراغ (رکھا ہے اور) وہ چراغ ایک قندیل میں ہے (اور وہ قندیل ایک طاق میں رکھا ہے اور) وہ قندیل (ایسا صاف وشفاف) ہے جیسا ایک چمکدار ستارہ ہو)

اس میں تصریح ہے کہ نور خداوندی کی صفت ایسی ہے جیسے کہ ایک طاقچہ ہو کہ اس میں ایک چراغ ہو اور وہ چراغ ایک شیشہ میں ہو اور اس شیشہ کی یہ حالت ہو جیسے کہ ایک درخشاں ستارہ۔ الی آخر القول پس جب قرآن میں خود تصریح تشبیہ کی ہے تو اگر مطلق تشبیہ مذموم ہوتی تو قرآن میں یہ تشبیہ کیوں مذکور ہوتی۔ اور یہ اس واسطے میں نے ذکر کر دیا کہ آج کل بعض متشددین بہت غلو کرنے لگے ہیں کہ محض ظاہری الفاظ دیکھ کر معنی میں غور نہ کر کے کفر و بدعت کا فتویٰ لگا دیتے ہیں حالانکہ ارشاد خداوندی ہے۔

لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ ۔ کہ حق سے آگے نہ بڑھو کہ یہ غلو فی الدین ہے۔ مثلاً جس چیز کا نظیر قرآن میں موجود ہو اس کو علی الاطلاق حرام کہہ دیا جائے۔

ہاں! وجہ شبہ متعین کرنی چاہئے تو سمجھ لو کہ تشبیہ میں مشارکت ہوتی ہے۔ دو چیزوں کی کسی خاص امر میں مثلاً کسی کے چہرہ کو چاند سا کہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ حُسن میں یہ اور چاند شریک ہیں یہ مطلب نہیں ہوتا کہ چہرہ بھی اسی قدر بڑا جسم ہے جس قدر چاند یا چاند میں بھی آنکھ ناک کان خدوخال موجود ہیں یا جیسے چاند کے ہاتھ پیر نہیں اس شخص کے بھی نہیں۔

علیٰ ہذا خدا تعالیٰ نے جو تشبیہ دی ہے تو مطلق نورانیت میں تشبیہ دی ہے کہ کمال نورانیت میں اس

کے مشابہ ہے اگرچہ یہ بھی ظاہر ہے کہ دونوں کمال ایک درجہ کے نہیں ہیں جس طرح کلی مشکک کے افراد مختلف ہوتے ہیں برابر نہیں ہوتے۔ مگر کوئی امر مشترک اس میں ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً شدت ضیاء اور مشبہ بہ کا اکمل ہونا بھی ضروری نہیں۔ البتہ اوضح یا اشہر ہونا ضروری ہے تو اسی طرح سے اگر کسی محقق کے کلام میں خدا کو دریا اور اپنے کو قطرہ کے ساتھ تشبیہ دی ہو تو وہ کسی خاص امر میں ہوگی۔ جیسا کہ مغربیؒ نے کہا ہے ؎

زدریا موج گونا گوں برآمد زبے رنگی بہ رنگ چوں برآمد

(دریا سے بڑی بری موجیں اٹھتی ہیں جس طرح بے رنگ سے رنگ نکلتا ہے)

خوبی شریعت

افسوس ہے کہ آج یہ حالت ہے کہ جنہوں نے ایک پارہ قرآن کا بھی نہیں پڑھا۔ وہ ان اشعار کو پڑھتے اور سنتے ہیں اور ان پر وجد کرتے ہیں حالانکہ خاک بھی نہیں سمجھتے اور اگر کچھ سمجھتے ہیں تو یہی کہ خدا پھیلا ہوا ہے اور ہم اس سے نکلے ہیں اور یہ سمجھ کر اپنا دین برباد کرتے ہیں۔ ایسے اشعار کا ان لوگوں کے سامنے پڑھنا بھی جائز نہیں ہے۔ اور اسی عدم جواز کے حکم سے کوئی تعجب نہ کرے۔ دیکھئے حکماء امت نے یہاں تک احتیاط کی ہے کہ بعض لوگوں کے لئے حج کو ناجائز کہہ دیا ہے۔

مثلاً ایک ایسا شخص کہ جس کے پاس زادراہ بھی نہ ہو۔ بیوی بچوں کے دینے کو بھی کچھ نہ ہو اس کے لئے سفر حج کو بالکل ناجائز کہا جاوے گا۔ اور یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں دیکھو عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنا نصاً ناجائز ہے حالانکہ نماز کتنی بڑی عبادت ہے۔ علی ہذا عید کے روز روزہ رکھنا حرام ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر عبادت میں کچھ قیود وجوب کے ہوتے ہیں اور کچھ شرائط جواز کے ہوتے ہیں تو حج میں استطاعت وجوب حج کی شرط ہے اور اہل وعیال کا حق ضائع نہ ہونا جواز حج کی شرط ہے، اس کو حضرت مسعود بکؒ اور واقعی حضرت کا کلام بدوں علم ظاہری کے سمجھنا نہایت دشوار ہے۔ ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ اس فرمانے کا ہر شخص مخاطب ہے مگر واقع میں مخاطب ایسے ہی لوگ ہیں سو فرماتے ہیں ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید معشوق دریں جاست بیائید بیائید

(حج کو گئی ہوئی قوم کہاں ہو کیا ہو؟ ارے یہاں آؤ یہاں معشوق (محبوب حقیقی) اسی جگہ ہے)

یعنی تمہارے لئے محبوب اسی جگہ ہے کیوں کہ مقصود رضائے حق ہے تو اگر بحالت مذکورہ بالا مکہ جاوئے گا تو خلاف رضائے حق ہوگا اس لئے خدا نہ ملے گا۔ اس واسطے کہ محض سفر مکہ سے خدا نہیں ملتا مثلاً اگر کوئی نفل حج کر کے بیوی کا حق ضائع کردے تو خدا تعالیٰ کب راضی ہو سکتے ہیں تو معلوم ہوا کہ بعض صورتوں میں حج کرنا بھی ناجائز ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ایسے شخص کے سامنے کعبہ کے حالات بیان کرنا جس سے وہ

مغلوب الشوق ہوکر سفر میں چلا جاوے جائز نہیں۔ دیکھو ظاہر نظر میں یہ بات سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ لیکن واقع میں بالکل صحیح فرمایا ہے۔ اس واسطے کہ حالات سن کر سفر کا شوق پیدا ہوگا اور بوجہ عدم استطاعت کے یہ سفر معصیت ہوگا تو اس کا جو سبب ہوگا وہ بھی معصیت ہوگا۔ واقعی اول اول جس نے امام غزالیؒ کا یہ قول سُنا ہوگا اُس نے امام کو کافر کہا ہوگا۔ حالانکہ امام بالکل ٹھیک لکھ رہے ہیں کہ جب سفر معصیت ہے اور تذکرہ اس کا سبب ہے تو تذکرہ بھی معصیت ہوگا۔ غرض کیسی ہی عبادت ہو وہ کسی نہ کسی وقت ناجائز ہوجاتی ہے ایک اور مثال یاد آئی نیک کام میں چندہ دینا عبادت ہے لیکن بعض اوقات یہ بھی جائز نہیں۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا چندہ لینے سے اس لئے انکار فرمادیا کہ وہ اس واقعہ سے پہلے خود سوال کر چکا تھا۔ تو اس چندہ دینے کا مال یہ ہوتا کہ جب اپنے پاس کچھ نہ رہتا تو پھر سوال کرتا خوب سمجھ لو کہ شریعت جو کچھ حکم کرے وہ کرو جہاں شریعت پڑھنے کی اجازت دے پڑھو۔ جہاں روک دے رُک جاؤ۔

شانِ عبدیت

بالکل مسلمان کی وہ حالت ہونی چاہئے کہ جیسے ایک شخص نے ایک غلام خریدا اور اس سے پوچھا کہ تم کیا کھایا کرتے ہو کہنے لگا جو کچھ آپ کھلا دیں گے وہی میری غذا ہے اور بزبان حال یہ کہا ؂

زندہ کنی عطائے تو　　　　ور بہ کشی فدائے تو
جان شدہ مبتلائے تو　　　　ہرچہ کنی رضائے تو

(اگر مجھے زندہ رکھے تو آپ کی عطا ہے اور اگر مار ڈالے تو میں آپ پر قربان ہوں بہر حال رو کو آپ سے تعلق ہے آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں)

جب غلام کی شان آقا کے سامنے یہ ہے تو کیا خدا تعالیٰ کے سامنے بندہ کی یہ شان بھی نہ ہو۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کے سامنے ایسا ہو جائے جیسے مردہ بدست زندہ اور آپؐ کے احکام جیسے کبھی منصوص ہوتے ہیں۔ اسی طرح کبھی غیر منصوص اور مستنبط بھی ہوتے ہیں اور یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے احکام ہیں اور فقہ اور حدیث میں یہ ہی فرق ہے کہ حقیقت ایک ہے لباس جدا جدا ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　　　من انداز قدرت رامی شناسم

(آپ جس رنگ اور لباس میں رہے مجھے تو آپ کے قد کا اندازہ ہے آپ کو خوب جانتا ہوں)

عاشق کی یہ شان ہوتی ہے کہ محبوب جس جوڑہ میں بھی آوے وہ پہچان لیتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ عاشق نہیں۔ تو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق ہیں اُن کو حدیث فقہ سب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ارشادات نظر آتے ہیں۔

بہر حال شریعت کے احکام یہ ہیں اور یہ واجب العمل متبوع ہیں تو جب حج کو جانا بعض کو ناجائز ہے تو یہاں سے قیاس کر کے دیکھ لو کہ جب بعض وقت عبادت ناجائز ہو جاتی ہے تو ایسے اشعار گو وہ صحیح ہوں ذکر کرنا ان لوگوں کے سامنے جبکہ ان میں کوئی مفسدہ ہو، اگر ناجائز ہو جائے تو عجب کیا ہے۔ اسی لئے حدیث میں ہے۔

كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ (لم اجد الحديث فى موسوعة اطراف الحديث النبوى الشريف) (لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق کلام کرو)

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب کسی کے سامنے اس کی عقل سے بڑھ کر کلام کیا گیا تو وہ اس کے لئے فتنہ ہوگا۔ تو اب جو ایسے اشعار عوام کے سامنے پڑھے جاتے ہیں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اگر چہ وہ حافظ اور مغربی ہی کے ہوں تو یہ عوام کے لئے فتنہ ہوں گے یا نہیں۔ ان حضرات کے کلام کے صحیح ہونے میں کلام نہیں جو کچھ انہوں نے کہا صحیح ہے، لیکن اس کے سمجھنے کے لئے فہم صحیح اور طبیعت سلیم درکار ہے تو مولانا ایسے ہی نازک مضامین کی نسبت فرماتے ہیں ۔

نکتہا چوں تیغ پولا دست تیز　　　گر نداری تو سپر واپس گریز

کہ بہت سے نکتے تلوار کی طرح تیز ہیں اور سپر سے مراد فہم یعنی اگر فہم نہ ہو تو دور رہو۔

آگے فرماتے ہیں ۔

پیش ایں الماس بے سپر میا　　　کز بریدن تیغ رانبو دحیا

کہ اسکے سامنے بدوں سپر نہ آؤ کیونکہ ایمان اگر اس کے سامنے پڑے گا یہ اس کو قطع کر دیگا۔

علم اور احوال

اور اسی واسطے ابن العربیؒ نے کہا ہے یحرم النظر فی کتبنا۔ (ہماری کتابوں میں نظر حرام ہے) رہا یہ شبہ کہ جب کتاب کے دیکھنے کی اجازت نہیں تو پھر لکھا تھا کیوں۔ یہ شبہ اکثر بڑے لوگوں کو بھی ہو جاتا ہے تو وجہ یہ ہے کہ وہ حالات جو ان پر طاری ہوئے۔ دوسرے لوگوں پر بھی طاری ہو سکتے ہیں۔ تو انہوں نے اپنے سے پچھلے لوگوں کے لئے جن پر وہ حالات طاری ہوں اپنے قول و احوال کو مدون کیا ہے تا کہ پچھلوں کے پاس معیار رہے ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ ہماری طاعت مقبول ہے یا مردود اور جب پہلوں کے حالات مدون ہیں تو نہایت آسان ہے کہ اس پر منطبق کر کے دیکھ لو اگر مطابق ہو تو صحیح ورنہ باطل۔ تو خلاصہ یہ ہوا کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے جیسوں کے لئے لکھا ہے۔ نہ عوام الناس کے لئے اسلئے اس کو دیکھنے سے منع کر دیا بلکہ وہ اخفاء کا اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ انکے سامنے ان مضامین کا اگر کوئی انکار بھی کرتا ہے تب بھی اُن کو جوش نہیں آتا اور وہ بیان نہیں کرتے۔ بلکہ یوں کہتے ہیں ۔

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی　　　بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے عشق و مستی کے راز کی باتیں نہ کیجئے بلکہ اسے اپنے حال پر چھوڑ دیجئے تا کہ وہ خود پڑھے اور رضا میں مر جائے)

رسول کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے علوم کا اعلان کرے اور ولی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے علوم کا اخفاء کرے اس لئے ان کو کبھی ہیجان بھی نہیں ہوتا۔ البتہ اپنے خواص سے بیان کرتے ہیں تو کوئی کلام غیر اہل کے سامنے بیان نہ کرو۔ تصوف کے اجزاء بہت سے ہیں منجملہ ان کے احوال بھی ہیں ان کو کسی سے بیان نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ اپنے خاص معاملات ہیں، خدا تعالیٰ کے ساتھ اُن کے ظاہر کرنے سے اپنا باطنی نقصان ہوتا ہے۔

نیز ایک جز اس میں علم مکاشفہ اور اسرار بھی ہیں ان کو بھی کسی کے سامنے ظاہر نہ کرنا چاہئے کیوں کہ وہ اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے اور بہت سی غلط فہمیاں سننے والے کو ہو جاتی ہیں جن سے اُس کا بہت نقصان ہو جاتا ہے اور عوام کے نہ سمجھنے کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔

دیکھو اگر کسی شخص نے کبھی آئینہ نہ دیکھا ہو اور اس کے سامنے آئینہ کی کیفیت بیان کی جاوے تو کیسی ہی جامع مانع حقیقت بیان کرو لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے

پرسید یکے کہ عاشقی چیست　　　گفتم کہ چوما شوے بدانے

(ایک عاشق سے کسی نے پوچھا عاشقی کیا ہے؟ اس نے کہا کہ جب مجھ جیسے ہوجاؤ گے تب معلوم ہوجائیگا)

اور وجہ اُس کی یہ ہے کہ امور وجدانیہ وجدان ہی سے سمجھ میں آتی ہیں اور وجدان محض سننے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اسی واسطے محققین اجانب پر کبھی ظاہر نہیں کرتے۔

کیفیت اور حقیقت

اب بے احتیاطی ہوگئی ہے کہ عام مجالس میں اس قسم کی غزلیں پڑھی جاتی ہیں اور کوئی نہیں سمجھتا میں ایسے بہت سے لوگوں کو ملا ہوں کہ ان الفاظ کے معنی غلط سمجھتے ہیں، ایک ایسا ہی شخص مجھ سے ملا اور پوچھا کہ تصور شیخ جائز ہے یا نہیں۔ میں جائز کہنے کو تھا بشرائط مگر میرے ذہن میں آیا کہ شاید یہ تصور شیخ کے معنی غلط سمجھ رہا ہو اس لئے میں نے اس سے پوچھا کہ تصور شیخ کے کیا معنی ہیں کہنے لگا خدا کو بشکل شیخ سمجھنا۔ انا للّٰہ حالانکہ قرآن شریف میں تصریح ہے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (اور اس جیسی کوئی چیز نہیں) اور یہ جو بعض آیات میں يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے، اس جیسی کوئی چیز نہیں) وغیرہ آیا ہے۔ وہاں ید وغیرہ سے مراد یہ نہیں کہ ہم جیسے ہاتھ پیر ہیں۔ بلکہ جو اس کے مناسب ہوں ہم اس کی حقیقت دریافت نہیں کرسکتے۔

ہماری مثال عدم احاطہ حقیقت میں ایسی ہے جیسے کہ ایک پانی کا کیڑا۔ انسان کی مصنوعات ریل اور تار وغیرہ کو دیکھے اور ان کی نا تمام حقیقت دریافت کر کے اندازہ کرے کہ جس نے یہ بنایا ہوگا وہ اس قسم کا ہوگا۔ کیا کوئی عاقل کہہ سکتا ہے کہ وہ کیڑا ہمارے ہاتھ پاؤں کی حقیقت کو دریافت کرسکتا ہے۔ خدا تعالیٰ اس مثال سے بھی بالاتر ہیں لیکن تقریب فہم کے لئے اس مثال کے ضمن میں اُس کو ظاہر کیا گیا کسی نے خوب کہا ہے۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان وہم — وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر — ماہمچناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

غرض خدا تعالیٰ کو کیا کوئی پہچان سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ **اعلمنا باللّٰہِ** جیسا کہ خود ارشاد فرمایا ہے **اِنی اعلمکم با اللّٰہ** (میں تم سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی معرفت کا علم رکھنے والا ہوں) آپ بھی اس سے اپنا عجز ظاہر فرماتے ہیں۔ **لا احصی ثناً علیک انت کما اثنیت علی نفسک** (سنن الترمذی 1997، میزان الاعتدال:3624، کنز العمال:24742) (میں آپکی تعریف کا حق ادا نہیں کرسکتا جیسا کہ خود آپ نے تعریف فرمائی ہے) یہاں تو منتہائے ثناء یہ ہے کہ ؎

خاموشی از ثنائے تو حدثنائے تست (خاموشی ہی تیری حد درجہ کی حمد ہے)

اور یہی خاموشی حاصل ہے حدیث مذکور کا حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ اس عجز کو عجیب عنوان سے فرماتے ہیں ؎

خدا در انتظار حمد مانیست — محمد چشم براہ ثنا نیست
خدا مدح آفریں مصطفٰے بس — محمد حامد حمد خدا بس

(خدا کو ہماری حمد کا انتظار نہیں ہے اور نہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہماری ثناء کے چشم براہ ہیں بلکہ خداوند تعالیف خود ہضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرنے والے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد کرنے والے کافی ہیں)

خدا کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خدا کی تعریف کافی ہے آگے فرماتے ہیں ؎

مناجاتے اگر خواہی بیان کرد — بہ بیتے ہم قناعت می توان کرد
محمد از تو مے خواہم خدا را — الٰہی از تو حُب مصطفٰے را

(اگر چاہو تو تمنائیں بیان کی جاسکتی ہیں اور صرف ایک شعر پر قناعت ہوسکتی ہے کہ اپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خدا کو چاہتا ہوں اور خداوندا آپ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا طلب گار ہوں)

حقیقت میں بے مثل مضمون ہے۔ باقی کوئی یہ نہ کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں **لا احصٰی ثناء علیک** اور مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ حضورؐ کا ثناء کرنا کافی ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ کفایت ہمارے اعتبار سے ہے ورنہ خدا تعالیٰ کو کماحقہٗ کوئی نہیں پہچان سکتا ؎

دُور بینان بارگاہ است — جزا زیں بے بزدہ اند کہ ہست

(بارگاہ است کے دور میں حضرات نے سوائے اس کے کہ وجود ہے اور کوئی سراغ نہیں لگایا)

یعنی اتنا معلوم ہوا کہ موجود ہے باقی یہ کہ کیا ہے اور کیسا ہے اس کے لئے بس یہ سمجھیئے کہ

اندریں رہ آنچہ مے آید بدست　　　حیرت اندر حیرت اندر حیرت است

(ہمیں اس راستہ میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ حیرت ہی حیرت ہے)

شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ؎

چہ شبہا نشستم دریں سیر گم　　　کہ حیرت گرفت آستینم کہ قم

محیط ست علم ملک بر بسیط　　　قیاس تو بروے نگردد محیط

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار　　　کہ پیدا نشد تختۂ برکنار

(کتنی راتیں میں اس منزل میں اسیر رہا ہوں کہ بالآخرت حیرت نے میری دستگیری کی ہے تمام دنیا پر ایک بادساہی کا علم محیط ہے تمہارا قیاس اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس طوفان میں ہزاروں کشتیاں اس طرح ڈوبیں کہ کنارے پر ایک تختہ تک باقی نہیں)

کون احاطہ کر سکتا ہے خدا تعالیٰ کے کمالات کا ، ہاں ہم ایمان لاتے ہیں کہ ہم اس سے آگے رائے سے کلام نہیں کر سکتے۔ دیکھو افعال تک کا تو پتہ لگ ہی نہیں سکتا تو صفات کا کیا پتہ لگ سکتا ہے۔ یہاں تو اقرار عجز کی بالکل وہ حالت ہونا چاہئے کہ جیسے ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا تھا کہ شب معراج میں کیا کیا گفتگو خدا تعالیٰ سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تھی انہوں نے جواب میں فرمایا۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں　　　بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

(اب کس میں یہ مجال ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا تھا گل نے کیا سنا تھا اور صبا نے کیا کہا)

حقیقت میں کس کی مجال ہے اور جو کچھ کہہ دیتے ہیں وہ اوچھے ہیں کہ او چھلتے ہیں۔ ورنہ اہل کمال کا یہی مشرب ہے جو میں نے بیان کیا۔ اسی طرح اسرارِ خداوندی کا بھی جو متعلق اکوان کے ہیں احاطہ نہیں ہوسکتا۔ ان کی نسبت عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

حدیث مطرب و می گو و راز دہر کمتر جو　　　کہ کس نہ کشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

(شراب وساقی کی بات کرو اور گردش زمانہ کی گفتگو کو چھوڑو کہ اس معمہ کو نہ کوئی حل کر سکا ہے نہ حل کر سکے گا)

جب راز دہر کے پیچھے پڑنے سے منع کرتے ہیں تو راز حق کی تو کیا انتہاء ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر شفیق تھے کہ جس چیز کو بے سود دیکھا اور فلاح دین و دنیا میں اس کی حاجت نہ دیکھی اس میں گفتگو کرنے سے منع کر دیا اور ایسید قائق وغوامض پر چونکہ نجات موقوف نہیں اس لئے اس کی حاجت نہیں۔ پس ان میں کلام کرنا پسند نہیں کیا گیا۔ اضاعت عمر ہے اور احتمال ضرر۔

مسئلہ تقدیر

صحابہ کرام[1] ایک مرتبہ مسئلہ قدر میں کچھ گفتگو فرما رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف

---

[1] کنز العمال3648، اتحاف السادة المتقين 9:604

لے آئے اور سُنا فرمایا کہ تم لوگ کیا گفتگو کر رہے تھے۔ معلوم ہوا تو عتاب فرمایا کہ تم اس میں گفتگو کرتے ہو کیا میں اس لئے مبعوث ہوا ہوں اور فرمایا کہ جو اس میں گفتگو کرے گا اس سے باز پرس ہوگی۔ یعنی پوچھ گچھ ہوگی۔ کیوں اس میں گفتگو کی اور ایک لطیف معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ سوال ہوگا کہ ذرا ہم بھی سنیں تم نے اس بارہ میں کیا تحقیق کیا ہے۔ اس سے وہ شخص دم بخود رہ جاوے گا، اور عجز کی وجہ سے کچھ جواب نہ دے سکے گا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اس قسم کے علوم میں گفتگو کرنے سے ممانعت کی طرف اشارہ کر دیا کیوں کہ یہ علم وہبی ہے دلائل سے کبھی حل نہیں ہو سکتا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ان امور کے اظہار کی حاجت تو ہے نہیں جیسا اوپر بیان ہوا اور الفاظ وضع ہوئے ہیں۔ حاجت کی چیزوں پر دلالت کرنے کے لئے سو ان مفہومات کے لئے الفاظ موضوع نہیں ہیں تو اگر ان مصلین مفہومات کو الفاظ سے تعبیر کیا جاوے گا تو وہ تشبیہات ہوں گی اور وہ بالکل ناکافی ہیں۔

اسرار وجدانیہ

تشبیہات کے ناکافی ہونے کی مثال کے لئے ایک قصہ عرض کرتا ہوں، مشہور ہے کہ ایک اندھے مادرزاد کی دعوت اس کے کسی شاگرد نے کی۔ حافظ جی نے پوچھا کہ کیا پکاؤ گے شاگرد نے کہا کہ کھیر پکاؤں گا کہنے لگا کھیر کیسی ہوتی ہے۔ شاگرد نے کہا کہ سفید، کہنے لگے سفید کس کو کہتے ہیں؟، اس نے کہا جیسے بگلا، حافظ جی نے کہا کہ بگلا کیسا ہوتا ہے شاگرد نے ہاتھ سے اس کی ہیئت بنائی حافظ جی نے اس کو ٹٹول کر دیکھا اور کہنے لگے کہ بھائی یہ کھیر تو بہت ٹیڑھی ہے حلق میں کیسے اترے گی۔

اب غور کیجئے کہ کھیر جو اتنی ٹیڑھی ہوگئی اس کا کیا سبب ہوا یہی کہ اس کو تشبیہات میں بیان کیا گیا تو اس اندھے مادرزاد کو اگر ساری دنیا بھی سمجھا دینے کی کوشش کرتی تو اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ ہاں سمجھانے کی یہ صورت ہے کہ ایک انگلی لے کر اس کے منہ میں دیدی جاوے کہ وہ ہونٹ چاٹتا رہے اور لیجئے اگر کسی نابالغ بچے کو لذت مجامعت سمجھانا چاہیں تو عمر ختم ہو جائے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی، البتہ جب وہ بالغ ہو جاوے گا تو خود بخود بغیر سمجھائے سمجھ میں آ جاوے گی۔

اسی طرح کملاء کے سامنے نااہل لوگ مثل اطفال نابالغ کے ہیں بڑے بڑے حکماء ارسطو افلاطون ان کے سامنے ایسے ہیں جیسے بچے تو ایسوں کے سامنے یہ مضامین بیان کرنا بچے کے سامنے لذت مجامعت کو بیان کرنا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

خلق اطفالند جز مرد خدا   ست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(سوائے اہل اللہ کے باقی ساری مخلوق بچے ہیں وہی بالغ ہے جس نے خواہشات نفسانی چھوڑ دیں)

جو شخص نفسانی خواہشات سے چھوٹ گیا وہی بالغ ہے، باقی اس کے مقابلہ میں سب نابالغ ہیں تو ان کے سامنے جو کچھ بیان کیا جاوے گا وہ تشبیہات میں بیان کیا جاوے گا اور

تشبیہات میں غلطیاں واقع ہوں گی، لہذا اسرار وجدانیہ کسی کے سامنے بیان نہ کرنے چاہئیں۔
آج کل افسوس ہے کہ لوگوں نے اسی جمع عبارات کا نام تصوف رکھ لیا ہے اور اکثر اسی قسم کے اسرار کہنے والے خود بھی رسمی لوگ ہوتے ہیں اسی کو کہتے ہیں ؎

حرف درویشاں ندر ذو مرودوں تابہ میش جاہلاں خواند فسوں

(ایک پست انسان فقیروں کی چند باتیں اس لئے لے اڑا ہے تاکہ جاہلوں کے سامنے سحر کاری کر سکے)
کہ چند الفاظ سنے سنائے یاد کر لئے اور انہیں کو مختلف مجالس میں گاتے پھرتے اور اگر کوئی آگے پوچھ بیٹھے تو خاک بھی نہیں۔
صاحبو! محض ملفوظات کے یاد کر لینے کا نام تصوف نہیں ہے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ملفوظات یاد کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اس کی سعی کرو کہ تم بھی ایسے ہو جاؤ کہ تمہاری زبان سے وہی باتیں نکلنے لگیں جو اُن کے منہ سے نکلیں اور وہ حالت بنالو کہ ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب بے معید وا وستا

(علوم انبیاء علیہم السلام میں خود کو بغیر کسی کتاب بغیر کسی استاذ اور بغیر کسی معاون کے محسوس کرو گے)
اور اگر یہ نہ ہو تو محض دعوے و تصنع سے کیا ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ؎

کہ گہے آوہے دروغے میزنی از برائے مسکہ دوغے میزنی
خلق را گیرم کہ بفریبے تمام در غلط اندازے تا ہر خاص و عام
کارہا باخلق آرے جملہ راست با خدا تزویر و حیلہ کے رواست
کار با اوراست باید داشتن رایت اخلاص و صدق افراشتن

(کبھی کبھی محض فریب سے اہیں کھینچتے ہو مکھن کے لئے چھاچھ بلوتے ہو مجھے مخلوق پر رحم آتا ہے کہ تم نے فریب تمام سے ہر خاص و عام کو بتلائے غلطی کر دیا ہے مخلوق کے ساتھ ہر قسم کے کام روا ہیں لیکن خدا کے ساتھ فریب کاری کہاں روا ہے ان کے ساتھ معاملہ درست رہنا چاہئے صدق و اخلاص کے پرچم کو بلند رکھنا چاہے)

شہرت اور خلوص

امام صاحب کا واقعہ ہے کہ آپ چلے جا رہے تھے کہ ایک شخص نے کہا کہ یہ امام ابوحنیفہ ہیں۔ یہ پانچ سو رکعتیں روزانہ پڑھتے ہیں آپ اس کو سن کر رونے لگے اور اُسی روز سے اتنا ہی عمل شروع کر دیا۔ کیوں کہ جانتے تھے کہ مخلوق تو دھوکہ میں آسکتی ہے لیکن خالق کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں چل سکتا۔
آج یہ حالت ہے کہ لوگ اپنی نسبت تقویٰ و طہارت کے مشہور ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے تدابیر کی جاتی ہیں۔ ایک شخص کلکتہ میں گیا اور اس نے یہ تدبیر کی کہ اپنے چند

گرگئے اس غرض کے لئے چھوڑ دیئے کہ اس کومشہور کریں۔ بہرحال علم میں خواہ حال وقال میں مکر کرنا سخت غلطی ہے۔ غرض جو حال یا سر ہے بدوں حصول سمجھ میں نہیں آتا اور جو سمجھ میں نہ آوے اس کے پیچھے نہ پڑنا چاہئے نہ دوسرے کو بتلانا چاہئے۔ تعلیم اسی چیز کی دینی چاہئے کہ جس کی ضرورت ہے ورنہ محض مجلس گرم کرنے کے لئے بے ضرورت باتیں یا محتمل الضرر مسائل کو ہرگز بیان نہ کرنا چاہئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدر کے بارہ میں گفتگو کرنے کی ممانعت سے سبق لینا چاہئے۔ دیکھو بچے کے سامنے کتنے ہی نفیس کھانے ہوں لیکن جب کافی مقدار پیٹ میں پہنچ جاتی ہے تو شفیق ماں کھانے سے روک دیتی ہے بچہ ضد کرتا ہے لیکن اس کی پرواہ نہیں کرتی۔ اس کی نظر مصلحت اور فائدہ پر ہوتی ہے اسی طرح ہم کو چاہئے کہ جن امور کو ہمارے لئے غیر ضروری یا مضر قرار دیا ہے۔ ان کے درپے ہم نہ ہوں اور اپنا یہ مذہب رکھیں ؎

بدرد صاف ترا حکم نیست دم درکش که آنچه ساقی ماریخته عین الطاف است

(تلچھٹ ہو کر سراب تمہیں مجال نہیں کہ بچالو ساقی نے جو کچھ دیا وہ عین الطاف ہے)

قبولیت دعا

اسی کی نظیر ہے کہ اگر دُعا قبول نہ ہو تو تنگدل نہ ہو کہ کبھی کبھی دیر لگانے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کو اپنے بندہ کا گریہ وزاری پسند ہوتا ہے۔ بزرگوں نے اس کی مثال لکھی ہے کہ جیسے کوئی حسین عورت کسی سے سوال کرے تو وہ ٹالتا ہے تاکہ اس کو مکرر سوال کی نوبت آئے اور اس کے ذریعہ سے اس سے خطاب کا موقع مل جاوے اور دیکھئے آپ اپنے بچہ کیلئے کوئی چیز لاتے ہیں مگر اس کو دق کر کے دیتے ہیں حتیٰ کہ بچہ رونے لگتا ہے اور آپ کو اس کا رونا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اب جن لوگوں کی دعا قبول ہو جاتی ہے وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور جن لوگوں کی دعا قبول نہیں ہوتی وہ سخت نالاں رہتے ہیں۔ حالانکہ نہ قبولیت دعا مقبول ہونے کی علامت ہے نہ عدم قبولیت مردود ہونے کی علامت ہے۔ خدا تعالیٰ انسان کی اسی حالت کی شکایت فرماتے ہیں۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ط
وَ اَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ط ۔

(پس آدمی کو اس کا پروردگار جب آزماتا ہے یعنی اس کو ظاہراً انعام واکرام دیتا ہے تو وہ بطور فخر کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر بڑھادی اور جب اس کو دوسری طرح آزماتا ہے یعنی اسکی روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ (شکایۃً) کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر گھٹادی)

آگے فرماتے ہیں کلا، یعنی جب خدا تعالیٰ انسان کو فراغت دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے میرا بڑا اکرام کیا۔ اور جب رزق تنگ کر دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے

ذلیل کیا۔ اور خدا تعالیٰ مجھے چاہتے نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہرگز یعنی یہ بات نہیں کہ رزق کی فراغت دلیل اکرام ہو اور عسرت دلیل اہانت ہو۔ تو اسی طرح اگر دعا بھی قبول نہ ہو تو وہ دلیل عدمِ قبولیت اور مردودیت کی نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے کہ جو مناسب سمجھتے ہیں وہ دیتے ہیں۔ تشریعاً بھی اور تکویناً بھی۔ غرض جو علم نہ دیا اس کا نہ دینا ہے نعمت ہے جیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قدر میں گفتگو کرنے سے ممانعت فرمادی اور اسی حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جو امور غامضہ ہیں ان کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی اُن میں گفتگو نہ کرنی چاہئے۔

درجاتِ قرب

یہ سلسلہ اس پر چلہ تھا کہ قرب کے معنی یہ نہیں جو دریا و قطرہ میں سمجھا جاتا ہے اور ایسے الفاظ کو لغوی معنی پر محمول کرنا غلطی ہے۔ بلکہ مراد اس قرب سے جو اس آیت میں مذکور ہے رضا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کا راضی ہونا مراد ہے کیونکہ قرب کے مختلف درجے ہیں ایک تو قرب علمی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہر چیز کو حاصل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ

اور ہم (اس وقت اس مرنے والے) کے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم سمجھتے نہیں،

اور ارشاد ہے: وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ

(اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔)

اور ایک قرب رضا کا ہے اور وہ بعض کو حاصل ہے اور اس آیت میں قرب رضا مراد ہے۔ قرب علم مراد نہیں کیونکہ وہ مومن اور صالح کے ساتھ خاص نہیں اور یہ قرب رضا بڑی دولت ہے مگر اس کو اہل دنیا کا تو کیا مقصود سمجھتے بہت سے اہل دین بھی پورے طور سے مقصود نہیں سمجھتے۔ پس اس آیت میں حق تعالیٰ نے اس کا طریق بیان فرمایا ہے۔ وَمَا اَمْوَالُكُمْ الآیہ۔ یعنی مال اور اولاد جس کی تحصیل کے پیچھے لوگ پڑے ہیں یہ ذریعہ قرب نہیں ہوسکتے بلکہ ایمان اور عمل صالح اس کے ذرائع ہیں اور ظاہر ہے کہ ایمان و عمل صالح میں وہی درجہ مطلوب ہوگا جو کامل ہو کیونکہ ناقص پورا پسندیدہ نہ ہوگا اور وہ ذریعہ رضا کا کیسے بن سکتا ہے۔

صاحب حال

اور اس کا کامل ہونا موقوف ہے تین چیزوں پر علم و عمل دائم حال اور دین کے یہ ہی شعبے ہیں سو اگر علم نہیں تو احکام کی اطلاع ہی نہ ہوگی اور اگر عمل نہیں تو اس اطلاع کا نفع کیا ہوا۔ اور اگر علم نہیں تو اگرچہ بظاہر عمل کا ہونا کافی معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے کے بعد یہ حالت بھی کچھ مفید نہیں کیونکہ اس میں خلوص اور بقاء کی امید نہیں۔ اور حال سے مراد ملکہ ہے اس کی ایسی مثال سمجھو کہ اگر کسی سے محبت ہوجاوے اور اس کو کھلاؤ پلاؤ تو ایک تو یہ حالت دوسرے یہ کہ اس کی محبت

میں بے چینی ہونے لگے۔ پہلی حالت عمل ہے دوسری حالت حال ہے اور پہلی حالت یعنی نرا عمل بلا حال پائیدار نہیں اور حال ہو جانے کے بعد پائدار ہو جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نماز روزہ کرتا ہے لیکن صاحب حال نہ ہونے کی وجہ سے نفس پر جبر کر کے کھینچ تان کر کرتا ہے اگر ایک وقت چھوٹ بھی جاوے تو کچھ زیادہ قلق نہیں ہوتا۔ اور ایک دوسرے کی یہ حالت ہے کہ اگر ایک وقت نماز بھی چھوٹ جائے تو زندگی وبال معلوم ہونے لگتی ہے تو یہ دوسرا صاحب حال ہے اسی کو کہتے ہیں۔

بردل سالک ہزاراں غم بود　　　گر باغ دل خلالے کم بود

اور اس کا پیدا کرنا گو واجب نہیں کیونکہ اگر تکلف سے بھی کرتا رہا لیکن اخلاص ہو کہ عبادت سے کوئی دوسری غرض نہ ہو تو خدا تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے کچھ کمی اس میں نہیں لیکن ہے خطرناک حالت کیونکہ جب قلب میں تقاضا نہیں تو خدا جانے کہاں گاڑی اٹک جاوے اور کہاں پہنچ کر عمل کا خاتمہ ہو جائے اس لئے ضروری ہے کہ حال کو بھی پیدا کرے اس کو کہا ہے ۔

صنمارہ قلندر سزوار بمن نمائی　　　کہ دراز ودُور دیدم رہ ورسم پارسائی

(قلندر کی راہ میں بڑے صنم ہیں لیکن میں پارسائی کی اس رسم سے خوب واقف ہوں)

دراز دور کے معنی یہ ہی ہیں کہ عمل ہو اور حال نہ ہو تو راستہ قطع ہو جائے گا لیکن بڑی دشواری اور مشکل سے قطع ہوگا۔ اور اسی معنی میں مولانا نے فرمایا ہے قال را بگذار مرد حال شو۔ آگے اس کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ پیش مرد کامل پامال شو۔ یعنی یہ حالت لکھنے پڑھنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ محض محبت سے حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ مَلکہ ہے اور مَلکہ صحبت سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ارژنگ چین لے کر خط کی مشق کرے تو کبھی وہ ملکہ پیدا نہ ہوگا جو کہ مثلاً منشی شمس الدین کی خدمت اور صحبت سے پیدا ہوگا۔ اسی طرح حال باطنی کی بھی کیفیت ہے تو علم اور عمل اور حال ان تینوں چیزوں کی ضرورت ہوئی۔ اگر ان میں سے ایک بھی نہیں تو کچھ بھی نہیں اور یہی دین ہے اسی حال کی تعلیم اسی آیت میں بھی ہے۔

اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

(کیا ایمان والوں کیلئے اب بھی وقت نہیں کہ انکے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف جھک جائیں)

مطلب یہ ہے کہ اس طرف جلد توجہ کرو ایسا نہ ہو کہ ایک زمانہ گزر جانے سے قلب میں قساوت پیدا ہو جاوئے اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ حال کی تاکید بھی کسی درجہ میں قرآن سے ثابت ہے۔ غرض ارادہ اور قصد تو ضروری ہے اور حال مصلحت ہے کہ اس سے تسہیل ہو جاتی ہے اور یہی وہ شان ہے جس کو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کان خلقه القرآن (مسند احمد324:5) جب کہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے تو آپؓ نے یہ جواب دیا کہ قرآن آپ کا امر طبعی بن گیا تھا آپ کا جی اسی چیز کو چاہتا تھا۔

معیتِ حق

جس کو خدا چاہے جس شخص کی یہ حالت ہوگی وہ کبھی انشاء اللہ تعالیٰ راجع نہ ہوگا۔ نہ واقف ہوگا بلکہ برابر ترقی کرتا چلا جاوے گا۔ کیونکہ اوّل تو قلب میں ایک چیز محرک ہے دوسرے اس کی حالت برکت سے یہ محبّ ہونے کے ساتھ محبوب ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس کی وہ حالت ہوتی ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ حضرت علیؓ کے لئے **اَللّٰهُمَّ ادر الحق معه حيث دار**

(سنن أبي داؤد: 3717، مسند أحمد3: 478، كنز العمال: 281)

(اے اللہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس طرف ہوں حق اس طرف ہو جائے، آپ کے اخلاق قرآن ہے)

کہ یہ جس طرف ہوں تو حق بھی اسی طرف ہو جائے۔ ظاہر تو یہ ہے کہ آپ یہ دعا دیتے کہ: **ادره مع الحق:** لیکن آپ نے بجائے اس کے یہ فرمایا کہ **ادر الحق معه** ۔ اور یہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑی بات فرمائی اور بہت بڑی دعا دی اور یہ بتلا دیا کہ ان کی محبوبیت ایسی ہو جاتی ہے کہ اگر اُن سے معاملات یومیہ میں اجتہادی غلطی بھی ہو۔ تو اسباب ایسے جمع ہو جاتے ہیں کہ وہ حق واقعی ہو جاتا ہے۔

مثلاً اگر دو شخصوں میں لڑائی ہو جائے اور ایک ایسا ہی محبوب حق اپنے حق اجتہاد سے ان میں سے کسی ایک کی طرف ہو جاویں جو کہ واقعہ میں حق پر نہ ہو تو خدا تعالیٰ حق کو اسی کے ساتھ اس طرح کر دیتے ہیں کہ وہ شخص تائب ہو کر حق پر ہو جائے۔ اور ان کو اس کی طرف رائے سے پھرنا نہ پڑے یا اگر خود انہیں سے کسی کے مقابلہ میں غلطی ہو جائے تو خدا تعالیٰ حق کو اُن کے ساتھ اس طرح کر دیتے ہیں کہ اُن کا مقابل جو ابھی تک مظلوم تھا انتقام لینے میں حد جائز سے آگے نکل جاوے۔ پس انتقام کی وجہ سے اُن کا ظلم عفو ہو جائے گا۔ اور مقابل کے اعتداء کی وجہ سے اب یہ مظلوم ہو جاویں گے اور حق ان کے ساتھ ہو جاوے گا۔

الحمد للہ یہ بالکل نئی بات ہے اور اس تفصیل سے آج ہی ذہن میں آئی ہے اور اس کی ایک نظیر حدیث میں صاف آئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

رب اشعث اغبر لا يوبه لهٗ مدفوع بالابواب لو اقسم على الله لابره

(لم أجد الحديث فى موسوعة أطراف الحديث النبوى الشريف)

یعنی بہت سے ایسے پراگندہ مو غبار آلود خستہ حال لوگ ہیں کہ کوئی ان کی پرواہ بھی نہیں کرتا مگر حالت ان کی یہ ہے کہ اگر کسی امر کے متعلق قسم کھا بیٹھیں کہ یوں ہوگا تو خدا تعالیٰ اسی طرح کر دیتے ہیں تو یہ مضمون بھی اسی کے قریب ہے کہ واقعہ ان کی قسم کے موافق بدل جاتا ہے۔

میں نے ایک سیاح سے سُنا کہ کسی مقام پر انہوں نے ایسی چیز دیکھی کہ اس کا ایک حصہ پتھر ہے، ایک لکڑی، ایک کنکر، ایک غیر معلوم الجنس اور لوگوں نے اس کا قصہ یہ بیان کیا کہ اندھیرے میں کسی بزرگ کی ٹھوکر لگی تھی۔ انہوں نے فرمایا یہ کیا ہے پتھر ہے یا لکڑی یا کنکر یا کچھ

اور۔ اس میں ان سب چیزوں کا تھوڑا تھوڑا جزو پیدا ہو گیا۔

مرتبہ محبوبیت

مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ میاں ان کے کہنے میں ہیں ہرگز نہیں بلکہ یہ حضرات خود حق تعالیٰ کے کہنے میں ہیں اور یہ اسی کی برکت ہے چنانچہ خداوند تعالیٰ کبھی کبھی ان کے کہنے کے خلاف بھی کر دیتے ہیں۔ اور کسی کا تو کیا منہ ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دعائیں فرمائیں۔ ان میں سے دو قبول ہوئیں اور ایک نامنظور ہوئی۔ سو اس سے سمجھ لیجئے کہ جب حضورؐ کی دو دعائیں منظور اور ایک نامنظور ہوئی تو اور کون ہوگا کہ جس کا سب کہنا ہو جاوے۔ اور میں اس مضمون کو کہتا بھی نہیں مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تو مجھے چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ غرض آپؐ فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ ادر الحق معه حیث دار اور یہ کبھی کبھی ہوتا ہے۔ اور غالب تو یہ ہوتا ہے کہ وہ حق کے ساتھ ہوتے ہیں اور خداوند تعالیٰ ان کے ذہن میں ادراک پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ خلاف حق چلتے ہی نہیں۔ غرض اُن کو مرتبہ محبوبیت کا عطا ہوتا ہے جس سے وہ خلاف نہیں کرتے۔ یہ وجہ ہوتی ہے صاحب حال کی، ترقی واستقامت کی، پس علم و عمل و حال کا جمع کرنا یہ طریقہ ہے قرب و رضا کا جو کہ بہت بڑی دولت ہے۔ کیوں کہ دولت راحت قلب ہے تو اس سے بڑھ کر اور کیا راحت ہوگی کہ اس کا محبوب حقیقی اس سے راضی اور قریب ہو۔ یہ راحت کسی کو بھی نصیب نہیں۔ بلکہ اس دولت میں تو اگر کچھ محنت بھی ہوتی وہ اس پر بھی راضی ہوتے۔
چنانچہ کبھی ایسی حالت ابتلاء گو پیش آتی ہے تو قانع ہوتا ہے اس وقت اُن کی یہ حالت ہوتی ہے

دمادم شراب الم در کشند　　　　وگر تلخ بیند در کشند

لحہ بہ لمحہ شراب الم کھینچتے ہیں اگرچہ دوسرے لوگ اسے دیکھ کر ہاتھ سمیٹ لیتے ہیں۔
لوگ جس کو کلفت سمجھتے ہیں وہ اس کو بھی راحت سمجھتا ہے۔

مجنوں کو اس کے اقارب خانہ کعبہ میں لے گئے اور کہا کہ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ مِنْ لَیلٰی و حبِّہٖ (اے اللہ مجھ پر رحم فرما لیلیٰ اور اس کی محبت سے بچا، اے اللہ میری حب لیلیٰ میں اضافہ فرما) تو وہ کہتا ہے اَللّٰھُمَّ زدنیُ حب لیلیٰ (اے اللہ میری حب لیلیٰ میں اضافہ فرما) اور یہ شعر پڑھا۔

الٰھی تبت من کل المعاصی　　　　الیک فقد تکثرتُ الذنوب
فا ما من ھوی لیلیٰ و ترکی　　　　زیَارتھا فانی لَا اتوب

(الٰہی میں بہت گنہگار ہوں آپ سے میں ہر گناہ سے توبہ کرتا ہوں لیکن لیلیٰ کی محبت اور اس کی زیارت سے توبہ نہیں کرتا)

غور کرو کہ ایک عورت کی محبت میں یہ حالت تھی۔ اب مولانا کا قول سنو فرماتے ہیں۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود　　　　گوئی گشتن بہراو اولےٰ بود

(خدا کا عشق لیلیٰ سے کیسے کم ہوسکتا ہے)

یعنی کیا خدا تعالیٰ کی محبت لیلیٰ کی محبت سے بھی کم ہوگئی۔ ہرگز نہیں تو اب غور کیجئے کہ وہ کیسی لذت کی چیز ہوگی۔ پس معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کا قرب بڑی دولت ہے۔

حب دنیا

اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ جو لوگ خدائے تعالیٰ کو چھوڑ بیٹھتے ہیں وہ بڑی مصیبت میں ہیں گو ان کے پاس اموال واولاد بھی ہو اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ

حقیقت اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو معلوم ہوگا کہ جنہوں نے دنیا کو قبلہ وکعبہ بنا رکھا ہے وہ کس قدر مصیبت میں ہیں۔ عیش کے ذرائع سوچتے اور جمع کرتے ساری عمر گزر گئی اور کھانے پینے کو وہی چار چپاتیاں اور تین کپڑے ہی ملے جو کہ سب کو ملتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ اس قدر انہماک کے بعد بھی عیش کے ذرائع نصیب نہ ہوئے اور غضب یہ کہ آج تک بھی اس کا حس نہیں ہوا اب تک بھی وہی ترقی کی تعلیم دی جاتی ہے اور اگر پورا عیش حاصل ہو بھی گیا تو یہ عیش کیا ہے کہ خوب کھا لیا اگر یہی عیش ہے تو بیل کو سب سے زیادہ عیش میسر ہے کہ اس کو نہ گزشتہ کل کی یاد نہ آئندہ کل کی سوچ اس کے برابر سلطان بھی عیش میں نہیں۔

غرض محض بےفکری سے کھالینا کوئی عیش نہیں۔ عیش یہ ہے کہ نہ کہ ماضی کی فکر ہو نہ مستقبل کا اندیشہ ہو۔ بس وہ ابن الحال ہے کہ جو اس پر گزرتا ہے سب کو خوشی سے برداشت کرتا ہے اور اس کو نعمت سمجھتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں صوفی ابن الحال باشد اے رفیق یعنی جو حالت اس پر طاری ہو وہ اسی میں راضی ہے۔ اور یہ کہتا ہے۔ ہرچہ ز دوست میرسد نیکوست۔ اگر طیش بھی ہو تو عیش ہی ہے اور اس پر کچھ تعجب نہ کیجئے دیکھئے اگر ایک مدت کے بعد محبوب سے ملاقات ہو کہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جائے نہ بات کی ہمت ہو نہ سلام کی جرأت ہو اور اسی حالت میں محبوب اس پر رحم کرے کہ اس کو سینہ سے لگا لے اور خوب دبا دے کہ اس کا دم نکلنے لگے اور اسی حالت میں اس کا کوئی رقیب آ جاوے اُس کو دیکھ کر محبوب کی حالت دریافت کرے کہ اگر تم کو تکلیف ہو رہی ہو تو میں تم کو چھوڑ کر اس کو دبانے لگوں تو اس وقت کیا کہے گا کیا یہ تکلیف اس کو محسوس ہوگی اور کیا اس کی وجہ سے وہ محبوب کے علیحدہ ہونے پر راضی ہوگا کبھی نہیں بلکہ وہ یہ کہے گا

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور یہ کہے گا کہ

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے یہ ہی دل کی حسرت یہ ہی آرزو ہے

تو جب آدمی کی محبت میں یہ حالت ہے تو خدا تعالیٰ کی محبت میں کیا عالم ہوگا۔ بقول سعدی رحمۃ اللہ

عجب داری از سالکان طریق   کہ باشند در بحرِ معنے غریق

(سالکین کی عجب راہ ہے کہ وہ ہمیشہ معانی کے سمندر میں غرق رہتے ہیں)

اوران کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

نا خوش تو خوش بود بر جان من   دل فدائے یار دل رنجانِ من

(آپ کی خوشی ناخوشی میری جان پر ہے میں اپنے یار پر جو میری جان پر رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

اور وہ یوں کہتے ہیں ؎

بس زبونِ وسوسہ باشی دلا   گرطرب باز دانی از بلا

یعنی اگر طرب اور بلا میں فرق کیا تو تم طالب خدا نہیں بلکہ طالب مخلوق ہو ایک مخلوق کو چھوڑ کر دوسری مخلوق کو لیا ہے۔ جس نے اس کی حقیقت سمجھ لی اس کی برابر کوئی دولت مند نہیں۔

مغفرت ورحمت

تو معلوم ہوا کہ یہ بہت بڑی دولت ہے جو اس سے محروم ہو وہ محروم بھی ہے۔ مرحوم بھی ہے مرجوم بھی ہے۔ محروم ہونا تو ظاہر ہی ہے اور مرحوم اس لئے کہ اہل اللہ کو ایسے شخص پر رحم آتا ہے۔ ہاں اگر باغی ہو تو اس پر ان کو رحم نہیں آتا اس لئے کہ خدا کو اس پر رحم نہیں آتا لیکن اگر باغی نہ ہو بلکہ گنہگار ہو تو ان حضرات کو اس پر بہت رحم آتا ہے اور اس کو ذلیل نہیں سمجھتے کیونکہ جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی یہ شان ہے ؎

گنہ آمرز رندانِ قدح خوار   بطاعت گیر پیران ریا کار

(رند شراب خور کے گناہوں کو بخشتا ہے اور ریا کاروں کی اطاعت کو پکڑتا ہے)

کسی نے خوب کہا ہے ؎

غافل مرد کہ مرکب مرداں مرد راہ   در سنگ لاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش   ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(گافل مت رہو کہ مرد خدا پتھر بھی زمینوں اور جنگلوں کو طے کرتا ہے ہم سے ناامید نہ ہو کہ رند شراب نوش اچانک نظر میں منزل تک پہنچ جاتے ہیں)

دوسرے کہتے ہیں ؎

گنہ آئینہ عفو و رحمت است اے شیخ   مبین بچشم حقارت گناہگاران را

(گناہ عفو ورحمت کا آئینہ ہے گناہگاروں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھو)

یعنی حقیر نہ سمجھو البتہ قابل رحم سمجھو اور وہ برتاؤ کرو جیسے کہ تمہارا بیٹا بیمار ہو جائے اور اس کے ساتھ تم برتاؤ کرتے ہو۔ دیکھو اگر وہ تم پر ہگ بھی دے تو تم کو غصہ نہیں آتا بلکہ رحم آتا ہے تو مسلمان وہ ہے کہ مسلمان کی حالت پر آنسو بہا دے نہ یہ کہ اُن کو ذلیل حقیر سمجھے اور بُرا بھلا کہے ؎

تایار کرا خواہد ومیلش بہ کہ با شد

(جب تک یار کسی کو چاہتا ہے اس کا میلان اسی کی طرف ہوتا ہے)

اور اگر اصلاح کی امید نہ رہے تو خدا کے سپرد کرو اور دعا کرو یہ ہے اسلامی شان۔

آج کل ذرا سی بات پر بدعت اور وہابیت کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ صاحبو! کس کی بدعت کس کی وہابیت۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں بعض مختلف فیہ بھی ہیں کوئی کسی طرف گیا کوئی کسی طرف تو اس کے لئے لڑتے کیوں ہو اور اگر کوئی مسئلہ متعین الصواب ہے اور اس میں کسی کو لغزش ہے تو اس کے غیر کے دعا کرو۔ خوب کہا ہے ؎

گر ایں مدعی دوست بشناختے بہ پیکار دشمن نہ پردا ختے

(اگر یہ مدعی دوست کو پہچان لیتے تو دشمن کی تلوار سے مشغول نہ ہو جاتے)

دیکھو اگر ایک مجلس میں محبوب بھی ہو اور اُس نے اجازت دیدی ہو کہ میری طرف دیکھو اور یہ دیکھنے میں مشغول ہو کہ اتنے میں ایک شخص آ کر اس کی انگلی کو چھو دے اب بتاؤ کہ وہ کیا کرے گا کیا محبوب کی طرف سے نظر ہٹا کر اس شخص کو دیکھنے لگے گا یا اس سے الجھنا شروع کر دے گا۔ ہرگز نہیں وہ کبھی دوسری طرف التفات بھی نہ کرے گا۔ اور اگر التفات کرے گا تو محبوب سے حرمان ہوگا اور یہ توجہ واستغراق اسی وقت ہوگا کہ دوست کو پہچانے۔ اسی کو کہتے ہیں

اگر ایں مدعی دوست بشناختی بہ پیکار دشمن نہ پرداختی

(اگر یہ مدعی دوست کو پہچان لیتے تو دشمن کی تلوار سے مشغول نہ ہو جاتے)

اگر ادھر متوجہ ہوتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔ حضرت حاجی صاحب **نور اللّٰہ مرقدہٗ** فرمایا کرتے تھے۔ کہ اگر تم سے کوئی مناظرہ کرے تو تم کبھی مناظرہ نہ کرو اس سے دل سیاہ ہوتا ہے۔

میں عوام میں سے جس کو بیعت کرتا ہوں اس سے یہ بھی کہتا ہوں کہ بدعت کو چھوڑ و لیکن بدعتی لوگوں سے مت لڑو۔ خدا تعالیٰ تم سے یہ نہ پوچھے گا کہ اُن لوگوں نے ایسا کیوں کیا اور قرآن مجید سے بھی اس مشرب کی تائید ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ ا الخ

(اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو نیکیوں کی طرف بلایا کرے)

لفظ منکم سے معلوم ہوتا ہے کہ سب اس کام کے لائق نہیں ہیں اور یہ تجربہ ہے کہ جو لوگ اس کے اہل نہیں سمجھے جاتے۔ اُن کا کہنا لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے اور جو لوگ اہل ہیں اُن کا کہنا چنداں گراں نہیں گزرتا۔ نیز علما جو کچھ کہتے ہیں تہذیب سے اور شائستگی سے کہتے ہیں۔ غرض یہ طعن و تشنیع کا شیوہ مناسب نہیں ہے۔ اپنے کام میں لگے رہو۔ اگر کوئی بُرا ہو تم اس پر ترحم کرو اور اس کے لئے دعا کرو۔

چنانچہ اہل اللہ دنیاداروں پر رحم ہی کرتے ہیں جیسے بیمار کو دیکھ کر اس پر رحم آیا کرتا ہے بلکہ

وہ مالداروں کو دیکھ کر بھی رحم کرتے کہ بے چارے حمالیں لدے ہوئے ہیں ہانپے جارہے ہیں۔
حضرت شبلیؒ کی یہ حالت تھی کہ جب کسی امیر کو دیکھتے تو کہتے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاکَ بِهٖ وَ فَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا۔

(سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے اس بلا سے عافیت دی جس میں تجھے مبتلا کیا اور تجھے اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت عطا فرمائی)

یہ دعا حدیث[1] میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمایا ہے کہ جب کسی بیمار کو دیکھو تو یہ دعا پڑھو تو دنیا کی محبت سے زیادہ کون سی بیماری ہوگی کہ قلب کی بیماری ہے اور قلب کی بیماری سب سے بدتر ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے کہ

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا: (ان کے دلوں میں (نفاق) کی بیماری ہے اللہ تعالیٰ اس بیماری کو اور بڑھادیں) حضرت شبلیؒ اس کو سمجھے اور انہوں نے مرض کی حقیقت معلوم کی۔ غرض دنیادار بیمار ہیں اور اس بیماری سے بچا رہنا خدا کی نعمت ہے جو قابل شکر ہے۔

مصیبت اور رحمت

اکبر پور کا واقعہ ہے کہ ایک خان صاحب نے ایک جولاہے سے براہ تمسخر پوچھا کہ میاں جی کیا کررہے ہو، کہنے لگا کہ خدا کا شکر کررہا ہوں کہ مجھ کو خان صاحب نہ بنایا۔ کسی غریب پر ظلم کرتا اور دوزخ میں جاتا۔ خان صاحب چپ ہی تو رہ گئے۔ حقیقت میں خدا کی یہ بھی بڑی رحمت ہے کہ گناہ کا سامان ہی نہ دے۔

آنکس کہ تونگرت نمی گرداند ۔۔۔ او مصلحت تواز تو بہتر داند

(ہر وہ شخص جو تیری مالداری کو نہیں سمجھتا ہے وہ تیری مصلحت کو تجھ سے بہتر جانتا ہے)

اب آپ کو معلوم ہوگیا کہ یہ لوگ رحم کے قابل ہیں کہ ایک بڑی مصیبت میں پھنسے ہیں مگر اُن کو خبر بھی نہیں ان کی وہ حالت ہے۔ جیسے ایک سرحدی وحشی ہندوستان میں آیا تھا کہ کسی حلوائی کی دکان پر حلوا رکھا دیکھا قیمت پاس تھی نہیں۔ آپ اس میں سے بہت سا اٹھا کر کھا گئے۔ حلوائی نے حاکم شہر کو اطلاع دی۔ حاکم نے یہ سزا مقرر کی کہ ان کا منہ کالا کر کے جوتیوں کا ہار گلے میں ڈالا جائے اور گدھے پر سوار کر کے تمام شہر میں تشہیر کیا جاوے۔ اور بہت سے لڑکے ساتھ کردیئے جائیں کہ وہ ڈھول بجاتے پیچھے پیچھے چلیں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا۔ جب یہ حلوا خور صاحب اپنے گھر واپس گئے تو تو وہاں کے لوگوں نے پوچھا کہ "آغا ہندوستان چگونہ ملک است" کہنے لگے۔

ہندوستان خوب ملک است ۔۔۔ حلوا خوردن مفت است فوج طفلاں مفت است
سواری خر مفت است، ڈم ڈم مفت است ۔۔۔ ہندوستان ملک خوب است

---

[1] مسند أحمد 58:6، اتحاف السادة المتقين 71:2

(ہندوستان (برصغیر پاک و ہند) اچھا ملک ہے حلوہ کھانا مفت ہے بچوں کی فوج مفت ہے، گدھے کی سواری مفت ہے، ڈم ڈم مفت ہے، ہندوستان اچھا ملک ہے)

بس دنیاداروں کا خوب ملک است کہنا ایسا ہی ہے۔ جیسے اُس آغا نے ہندوستان کو خوب ملک است کہا اور دنیا کے حشم وخدم پر ناز کرنا ایسا ہی ہے جیسا اُس نے سواری خر اور فوج طفلاں پر ناز کیا تھا۔

ہوس اقتدار

صاحبو! یہ بے حسی ہے۔ واللہ! اگر حس صحیح ہو تو یہ سب عذاب نظر آنے لگے۔ حکومت دنیوی کی نسبت حدیث میں ہے کہ جس کی دس آدمیوں پر بھی حکومت ہوگی، قیامت میں اس کو مشکیں کس کر لایا جاوے گا۔ اگرچہ اس کے بعد چھوٹ ہی جاوے آج اس کی درخواست کی جاتی ہے اس کے لئے روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اور اگر کوئی کچھ کہتا ہے تو یہ جواب ملتا ہے کہ ہم میں اگر صاحب حکومت نہ ہوں گے تو قوم تباہ ہو جائے گی۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ حاکم ہوں۔ لیکن کون شخص ہو اس کا فیصلہ خود حدیث میں موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

اَلْقَضَاةُ ثَلٰثَةٌ اِثْنَانِ فِي النَّارِ وَ وَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ ط (سنن ابن ماجة: 4196، الدر المنثور: 26513)

(قاضیوں کی تین قسمیں ہیں ان میں دو قسمیں دوزخی ہیں صرف ایک قسم جنتی ہیں)

اور اس واحد کو عالم باعمل بتلایا ہے تو حکومت ضروری ہے مگر حکومت کے لئے متبحر عالم ہونا چاہئے ورنہ بدوں علم کے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور امتحان علم کا یہ ہے کہ ان کے سامنے جتنے واقعات ومقدمات پیش ہوں اُن میں اپنی رائے لکھیں اور اس کے بعد اہل علم سے ان کا حکم دریافت کریں پھر دونوں میں موازنہ کریں واللہ! زمین آسمان کا فرق نکلے گا۔

دوسری اس میں ایک اور شرط ہے کہ حکومت کی خود درخواست نہ کرے کیونکہ جو درخواست کرے گا وہ خودغرض ہوگا۔ اور نفسانیت سے کام کرے گا۔ اس کو لوگوں کی مصلحت پر ہرگز نظر نہ ہوگی بلکہ اپنی مصلحت پر ہرگز نظر ہوگی اور اس سے جتنی خرابیاں پیدا ہوں کم ہیں۔

حضرت عثمانؓ نے ابن عمرؓ سے قضا کا عدہ قبول کرنے کے لئے کہا۔ انہوں نے انکار کردیا۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ اگر تم منظور نہیں کرتے تو اپنے انکار کی کسی کو خبر نہ کرنا کیونکہ ایسا نہ ہو کہ سب ہی انکار کردیں۔

اس واقعہ سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ سلف صالحین حکومت کو کیسا سمجھتے تھے اور حقیقت میں ایسا ہی شخص کام بھی کرسکے گا۔ اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ دنیا کے لوگ حقیقت میں بڑی تکلیف اور عذاب میں مبتلا ہیں اور دولت حقیقی دوسری چیز ہے تو خدا تعالیٰ اس آیت میں اس دولت کو بتلاتے ہیں اور اس کا طریقہ ارشاد فرماتے ہیں اور مروّج طریقہ کو رد کرتے ہیں فرماتے

ہیں تمہارے مال اور اولاد اس قابل نہیں کہ تم کو ہم سے قریب کریں البتہ ایمان اور عمل صالح اس کا ذریعہ ہے جیسا بیان ہوا اور اس میں آج کل کے اہل مذاق جدید کا بھی جواب ہوگیا۔

ترقی دنیا

یعنی بعضے لوگ کہتے ہیں کہ ترقی دنیا سے ہمارا مقصود ترقی دین ہے تو خدا تعالیٰ نے بتلا دیا ہے کہ ترقی دین کی یہ صورت نہیں کہ بہت سا مال سمیٹ لو۔ ہم اس آیت کا ترجمہ کئے دیتے ہیں اگر تین پانچ کرنا ہو تو خدا تعالیٰ سے کرو اور پوچھو کہ یہ کیوں فرمایا۔

آج کل یہ بھی ایک عجیب عادت ہوگئی ہے کہ لوگ ہر بات کا ذمہ دار مولویوں کو سمجھتے ہیں۔ صاحبو! مولوی تو صرف منادی کرنے والے ہیں۔ دیکھو اگر کلکٹر کسی سے منادی کرا دے تو اس منادی کی حکمت منادی کرنے والے سے نہیں پوچھی جاتی کیونکہ جانتے ہیں کہ یہ اس کا ذمہ دار نہیں پھر کیا وجہ کہ مولویوں کو ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ اگر یہ کچھ بتلا دیں تو ان کا احسان ہے باقی ان کے ذمہ کچھ نہیں۔ غرض مال اور اولاد ذریعہ قرب نہیں بلکہ ایمان اور اعمال صالحہ ذریعہ قرب ہیں اور یہ دونوں طویل الذیل ہیں مگر میں ان کے متعلق کچھ مختصر سا بیان کرتا ہوں ۔ سو بعض لوگ تو ہم سے ایسے ہیں کہ وہ ایمان ہی کو بگاڑ بیٹھے ہیں۔ اگرچہ ان کے عمل کسی درجہ میں اچھے ہیں لیکن عقیدہ بالکل ہی تباہ ہیں۔

ایمان اور عمل صالح

بہت سے لوگ پیروں سے اس قدر علاقہ رکھتے ہیں کہ خدا سے بھی اتنا علاقہ نہیں رکھتے۔ وہ ان کو ایسا سمجھتے ہیں کہ جیسا ایک سر منہ چڑھا سررشتہ دار ہو کہ جو کچھ کہہ دے گا اسی پر دستخط ہو جاویں گے اور ان کے نام پر کہیں ہنسلی چڑھاتے ہیں کہیں منتیں مانتے ہیں۔ بعض نے تعزیوں کو اس قدر ضروری سمجھ رکھا ہے کہ ان کا سارا دین ایمان وہی ہیں۔ ایک شخص کہنے لگا کہ جب سے میں نے گیارہویں شریف چھوڑی ہیں اس وقت سے مجھ پر آفتیں آنی ہونا شروع ہوگئیں۔ استغفر اللہ! میرا یہ مطلب اس سے نہیں ہے کہ بزرگوں کو ایصال ثواب نہ کرو۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا عقیدہ خراب نہ کرو بلکہ اس نیت سے ایصال ثواب کرو کہ انہوں نے ہمارے ساتھ دینی احسان کیا تھا ہم اُن کو ثواب پہنچائیں باقی یہ بات کہ ان سے ہمیں مال یا اولاد ملے گی یہ کچھ نہ ہونا چاہئے اور غور کر کے دیکھو کہ اس نیت سے ایصال ثواب کرنا کیسی بے ادبی ہے۔ دیکھو اگر تمہارے پاس کوئی شخص مٹھائی لے کر آوے اور پیش کرنے کے بعد کہے کہ جناب آپ سے میرا فلاں کام ہے تو تمہارے دل پر کیا اثر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ خوشی اس کے مٹھائی لانے سے تم کو ہوئی ہوگی۔ وہ سب خاک میں مل جاوے گی اور سمجھو گے کہ یہ سب خوشامد اسی غرض کے لئے تھی۔ دوسرے جب وہ حضرات اپنی زندگی میں اس قسم کی چیزوں سے دلچسپی نہ رکھتے تھے تو اب مرنے کے بعد کیوں ان کو دلچسپی ہوگی تو ایمان کی

درستگی جب ہوگی کہ اس قسم کی ساری باتوں سے توبہ کرو، دوسری چیز ہے عمل صالح۔ اس کے متعلق یہ حالت ہے کہ بہت سے لوگ اس کو ضروری ہی نہیں سمجھتے بلکہ عقائد کی درستی کو کافی سمجھتے ہیں حالانکہ جب عمل نہیں تو نری عقائد کی درستی کیا کرے گی اور جو لوگ عمل کو ضروری بھی سمجھتے ہیں تو صرف دیانات روزہ نماز وغیرہ کو باقی معاملات تو بالکل خراب ہیں۔ میں نے بہت سے متقی ایسے دیکھے ہیں کہ ان کے معاملات نہایت گندر گند ہیں۔ خدا جانے کیسا تقویٰ ہے کہ وہ کبھی ٹوٹتا ہی نہیں گویا بی بی تمیزہ کا وضو ہے کہ بس ایک دفعہ کر کے عمر بھر کو چھٹی ہوگئی۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ ان کے معاملات بھی اچھے ہیں لیکن اخلاق نہایت خراب ہیں۔ نہ خدا کی محبت، نہ خوف، نہ توکل، نہ صبر و شکر، نہ توحید بلکہ ان کے بجائے تکبر ریا عجب حسد کینہ وغیرہ سے پُر ہیں یہ حال ہے کہ ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل — واندروں قہر خدائے عزّ و جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید — وازدرونت ننگ میدارد یزید

(اوپر سے تو کافر کی قبر کی طرح مزین اور اندر اللہ کا عذاب ہے اوپر سے تم حضرت بایزید رحمہ اللہ پر طعنہ کرتے ہو اور اندر یزید کی طرح ہے)

تصوف کی حقیقت

تو عمل صالحہ میں یہ اخلاق باطنی بھی آگئے اور یہی ہے وہ چیز جس کو تصوف کہتے ہیں۔ اسی کی نسبت فرماتے ہیں۔

اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ۔

(خبردار ہو کہ اولیاء اللہ کو خوف اور ملال نہیں ہوتا اور وہ لوگ جو ایماندار اور متقی ہیں)

اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہ تصوف نہیں بلکہ غیر معمولی چیز ہے تو سمجھو کہ اہل فن کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی تصوف ہے، حواشی قشریہ میں ہے۔

التصوف تعمیر الظّاهر وَالْبَاطن: (تصوف ظاہر و باطن کی صفائی کا نام ہے) اور باطن کے متعلق دو چیزیں ہیں ایک عقیدہ اور دوسرے اخلاق، ان سب کی اصلاح بھی قرآن میں ہے۔ مگر صوفیہ نے اس کو تصوف سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن نے ایمان اور عمل صالح سے تعبیر کیا ہے تو تصوف کی حقیقت یہ ہے ثمرہ اس کا یہ ہے۔

تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰى: (تم میں سے ہمارے قریب وہ ہے جو ایمان لایا اور نیک کام کئے) الحمد للہ اس وقت دو غلطیاں رفع ہوئیں ایک تو یہ کہ لوگ تصوف کی حقیقت کو غلط سمجھے ہوئے تھے یعنی تصوف میں تین چیزیں ہیں ایک تو ایمان اور عمل صالح کہ یہ عین تصوف ہیں۔ ایک وہ کہ اُن کو تصوف سے کچھ بھی علاقہ نہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں ایک مباحات دوسرے ممنوعات۔ جیسے یہ عقیدہ کہ

طریقت میں سب کچھ مباح ہوجاتا ہے یا کہ میرے پیر کو سب کچھ خبر ہے۔ جیسے چند روز ہوئے ایک پیر صاحب نے کہا کہ میرے سپرد پولیس کا کام ہے اور ہر جمعرات کو سب اولیاء پیران کلیر میں جمع ہوتے ہیں اور اشرف علی بھی وہاں آتا ہے۔ وہ سمجھے تھے کہ یہ سن کر میں بہت خوش ہوں گا، اور ان کی تعریف کروں گا مگر مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں ان کو یقینی کاذب سمجھنے لگا تو گویا خدائی کو اپنا سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مُردوں کے اختیار میں کچھ سمجھنا بھی ایسا ہی ہے یہ تو وہ چیزیں ہیں کہ معاصی لعینہ ہیں۔ دوسری وہ چیزیں کہ وہ معصیت لغیرہ ہیں۔ جیسے سماع کا سننا کہ اگر کسی سے مجبوری کی وجہ سے سُن لینا منقول ہے تو وہ رحمت نہیں اور بلا عذر ناجائز ہے اور اب تو اس کی حالت نہایت گندر گند ہوگئی ہے اور واقع میں یہ سب اعمال فقیہ ہیں، ان کو تصوف سے کچھ علاقہ نہیں، بعض اعمال کہ ان کو تصوف سے علاقہ ہے مگر وہ عین تصوف نہیں جیسے احوال کہ کثرت ذکر سے کبھی مرتب ہوجاتے ہیں تو مقصود کے متعلق چار چیزیں ہوئیں، ایمان اور اعمال اور اخلاق اور حالات کہ ان کو تصوف سے تعلق ہے بعض کو عینیت کا اور بعض کو ترتب و مناسبت کا جیسے احوال کہ اگر ہوں تو اچھا ہے نہ ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں اور یہیں سے شیخ کامل کی پہچان بھی معلوم ہوگئی ہوگی کہ اس کے اندر ایک تو ایمان خالص ہونے کی ضرورت ہے۔ دوسرے اعمال صالحہ کی، تیسرے اخلاق کی کہ اس میں صبر و شکر ہو، دنیا سے اس کو نفرت ہو کہ اس کی صحبت سے بھی دنیا سے جی ہٹ جاوے۔ اور ایک بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کی طرف عوام کم متوجہ ہوں اور اہلِ علم و فہم زیادہ متوجہ ہوں۔ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جس درویش پر اہل دنیا زیادہ ہجوم کرے معلوم کر لینا چاہئے کہ یہ خود بھی دنیا ہے کیونکہ **الجنس یمیل الی الجنس** اور جس کی طرف صلحاء زیادہ متوجہ ہوں وہ ہادی ہونے کے لائق ہے۔ جب ایسا شخص مل جائے تو اس کی صحبت اختیار کرو اور جس کو یہ سب حاصل ہوجائیں ان کے لئے خدا تعالیٰ آگے فرماتے ہیں۔

اُولٰئِکَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَ هُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ۔

(ان کیلئے حسنات کرنے کا دگنا بدلہ ہے اور وہ بہترین کمروں میں پناہ گزین ہوں گے)

یعنی ان کو اس سے امن ہوگا کہ اُن کو بُعد ہو۔

چونکہ آج کل جاہل صوفی گمراہ کرتے پھرتے ہیں اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ تصوف کی حقیقت اور کاملین کی علامت کو بیان کردوں تاکہ لوگ ان کے پھندے سے بچ سکیں۔

اب خدا تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ وہ توفیق نیک عطا فرماویں۔ (آمین)

ناظرین وعظ کی خدمت میں جامع وعظ کی عاجزانہ التماس ہے کہ بارگاہ رحمت میں میرے لئے بھی حسن خاتمہ اور عفو و عافیت کی دعا فرمادیں۔

(تمت بالخیر)

وحدۃ الحب

وحدۃ الحب سے موسوم وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں بروز جمعہ 8 شوال المکرم 1330ھ کو بیٹھ کر دو گھنٹے تک ارشاد فرمایا۔
سامعین کی تعداد تقریباً تین سو تھی۔ حضرت مولانا سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اِسے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَ مَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ۔ اَمَّا بَعْدُ: فَقَدْ وَرَدَ فِيْ اَحَادِيْثِ[1] الْاَدْعِيَةِ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَشْيَاءِ اِلَيَّ۔ وَاجْعَلْ خَشْيَتَكَ اَخْوَفَ الْاَشْيَاءِ عِنْدِيْ وَ اَقْطَعْ عَنِّيْ حَاجَاتِ الدُّنْيَا بِا الشَّوْقِ اِلٰى لِقَائِكَ واذا اقررت اعين اهل الدنيا من دنيا هم فا قرر عيني من عبادتك۔

ترجمہ: اے اللہ! میرے لئے اپنی محبت کوتمام چیزوں کی محبت سے مرغوب تر کر دے اور اپنے ڈر کو میرے نزدیک تمام چیزوں سے زیادہ خوفناک کر دیجئے اور اپنی ملاقات کا شوق دے کر دنیا کی تمام حاجتیں مجھ سے قطع کر دیجئے اور جب کہ آپ نے اہل دنیا کی آنکھیں ان کی دنیا سے ٹھنڈی کی ہیں تو میری آنکھ کو اپنی عبادت سے ٹھنڈ کر دیجئے ۔۱۲ (محمد صابر غفرلہٗ)

تمہید

یہ ایک حدیث ہے ادعیہ کی احادیث میں سے یعنی کچھ دعائیں احادیث میں آئی ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی ہے جس کو میں نے پڑھا۔ یہ حدیث حزب الاعظم کی ہے اس کی سند مجھ کو یاد نہیں مگر ملاعلی قاریؒ نے احادیث ادعیہ جمع کی ہیں، وہ محدث ہیں۔ اُس میں اکثر احادیث تو مرفوعہ ہیں، عجب نہیں کہ یہ بھی مرفوع ہو۔ اور بعض موقوف ہیں مجھ کو تحقیق کا وقت نہیں ملا نہ ضرورت سمجھی کیونکہ صحابہؓ کے مضامین بھی حضورؐ ہی کے مضامین ہیں۔ گو الفاظ صحابہؓ کے ہیں جیسے حضورؐ کے علوم مستفاد (حاصل ۱۲ص) ہیں۔ خدا تعالیٰ سے خاص کردہ مضمون جو مدرک بالقیاس نہ ہو کیونکہ وہاں یہ

---

[1] مسند أحمد 1:172، المصنف لابن أبی شیبة 10:264، کنز العمال: 3610

احتمال ہی نہیں ہوسکتا کہ یہ صحابی کی رائے ہے۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد سمجھا جاتا ہے۔اس لئے ایسی موقوف احادیث مرفوع حکمی کہلاتی ہیں۔ کیونکہ وہ احادیث مرفوعہ کے مماثل ہوتی ہیں۔خواہ وہ باب احکام سے ہوں۔ یا دوسرے علوم سے کیونکہ حضورؐ سے مختلف علوم منقول ہیں۔

غرض جو کچھ بھی ہو حدیث موقوف جو مدرک بالقیاس نہ ہو حکمِ مرفوع میں ہوتی ہے یہ دُعا جو تلاوت کی گئی ہے اگر مرفوع ہے تب تو فبہا۔ اور اگر مرفوع نہیں تو مضمون کے عُمق پر نظر کر کے مرفوع حکمی قرار دی جاوے گی۔ بہر حال یہ ہر طرح مرفوع ہے۔

اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کا مضمون مدرک بالرائے (رائے سے معلوم ۱۲ص) ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ ہر فن کی رائے اس کے مناسب ہوا کرتی ہے۔ اور یہ مسئلہ جس فن کا ہے اُس کا فتویٰ تو یہ ہے کہ خدا کی محبت کے مقابلہ میں کسی چیز کی محبت ذرا بھی نہ ہو۔ پس دوسری چیزوں کی محبت کی بقدر ضرورت اجازت دینا۔ جیسا کہ اس حدیث میں حق تعالیٰ کی محبت کو اَحَبُّ الْاَشْیَاءِ (تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ۱۲ص) کہنے سے جو دال ہے دوسری اشیائے کے بھی کسی درجہ میں محبوب ہونے سے معلوم ہوتا ہے۔ محض علم وحی ہے نہ کہ علم رائے۔ بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر یہ رائے بھی ہو تو چونکہ مدرک بالرائے میں بھی ہمارے مجتہدین رائے صحابی کو اپنی رائے سے افضل سمجھتے ہیں۔ تب بھی وہ ہمارے واسطے محبت ہی ہے۔

غرض یہ حدیث تینوں حالتوں میں ہمارے واسطے حجت ہوئی گو تینوں حالتوں میں فرق ہوگا مگر مجھ کو اس وقت حجیت کافی ہے کیونکہ یہ کوئی ایسا مضمون اختلافی نہیں۔ میں نے یہ تصریح اس لئے کر دی کہ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ اگر یہ حضورؐ کا قول نہ ہو تو شاید حجت نہ ہو۔ پس اس کا مضمون نہایت درجہ قابل التفات ہے۔ اس لئے میں نے یہ تمہید عرض کر دی ہے۔

تدابیر فلاح

اب دیکھئے کہ وہ مسئلہ کیا ہے اور یہ خدا کا فضل ہے کہ اس حدیث کے معلوم ہونے سے پہلے یہ مضمون ذہن میں بھی آیا تھا۔ لیکن واردات اس وقت مقبول ہیں جب موافق حدیث وسنت ہوں کیونکہ علوم دو قسم کے ہیں ایک تو استدلالی کہ بعد فکر کے قلب میں آویں، ان کا تو موافق دلیل ہونا ظاہر ہی ہے۔ ایک یہ کہ دفعتًا قلب میں آویں۔ وہ واردات کہلاتی ہے۔ پس ان کی تطبیق قرآن وسنت سے ضروری ہے۔ پس جب یہ مضمون بطور وارد کے ذہن میں آیا۔ میں نے قرآن میں دیکھا

تو قرآن سے سمجھ میں نہ آیا[1] مگر ایک حدیث کی کتاب میں دیکھا تو یہ حدیث نکلی۔

اب میں بتلاتا ہوں کہ وہ مسئلہ کیا ہے۔ اور کتنا ضروری ہے۔ اور وہ ایسا ہے کہ ہمارے دین و دنیا کی فلاح اُس پر موقوف ہے۔ گو ظاہر میں ایک کلمہ ہی ہو۔ مگر حدیث میں ہے۔

كَلِمَتَانِ خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ

(سنن أبی داوٗد، 4031، مسند أحمد 2:50، مشكوة المصابيح: 4347)

دو کلمہ ہیں آسان ہیں زبان پر ثقیل ہیں میزان میں (۱۲ص)

کہ بعض باتیں زبان پر آسان ہوتی ہیں مگر اس کا ثمرہ وثواب بہت ہوتا ہے۔ اور یہ خوبی ہے علوم شرعیہ کی وہ نہایت سہل باتیں ہیں اور ثمرہ اُن کا نہایت عجیب ہے اور یہ دلیل ہے اُن کے من الحق (حق کی جانب سے ۱۲ص) ہونے کی۔ کیونکہ جو شخص جتنا شفیق ہوتا ہے وہ اپنے متعلق کے لئے تدابیر فلاح ایسی تجویز کرتا ہے کہ نہایت سہل ہوں اور فائدہ بہت ہو۔ مثلاً اگر تجارت میں لگائے گا تو سودا ایسا تجویز کرے گا کہ روپیہ کم خرچ ہو اور فائدہ بہت ہو۔ ایسا ہی استاد شفیق، ایسی تدابیر بتلادے گا جن پر عمل کرنا سہل ہو اور نفع بہت ہو کہ اگر مثلاً اپنی رائے سے پڑھنا شروع کرتا تو 7 برس میں فارغ ہوتا مگر ان تدابیر پر عمل کرنے سے 4 یا 5 سال میں فارغ ہو جائے گا۔

غرض نظائر کہاں تک کہوں سب جانتے ہیں کہ جس پر شفقت زیادہ ہوتی ہے اس کے لئے ایسی تدابیر بتلائی جاتی ہیں جن پر عمل کرنا سہل ہو اور نفع بہت ہو۔ پس چونکہ حق تعالیٰ کو اپنے بندوں پر سب سے زیادہ شفقت ہے اس لئے تعلیم الٰہی وہی ہو سکتی ہے کہ اس پر عمل سہل ہو اور فوائد بہت ہوں۔

چونکہ علوم شریعت کا جیسا کہ مشاہدہ ہے۔ یہی حال ہے کہ باتیں بہت سہل مگر منفعت کثیر ہوتی ہے۔ اس لئے ان کا حق ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ بات اسی کی تعلیم میں ہو سکتی ہے جس کو مخاطبین کے ساتھ سب سے زیادہ شفقت ہو۔ اب اگر وہ علوم قرآنیہ ہیں تب تو ظاہر ہے کہ وہ علوم الٰہیہ ہیں۔ اور خدا تعالیٰ سے زیادہ عباد پر کسی کو شفقت نہیں ہو سکتی۔ اور اگر وہ مضامین بظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوں (اور بظاہر اس لئے کہا کہ واقع میں تو وہ بھی خدا تعالیٰ ہی کے علوم ہیں) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بھی دنیا میں کوئی شفیق نہیں ہوا۔ سب سے زیادہ انسان اپنا شفیق ہوتا ہے حتیٰ کہ دوسرے کے نفع میں بھی اس کو اپنا ہی نفع مدنظر ہوتا ہے۔ غرض نفس کا کوئی کام چاہے اپنی ذات کے ساتھ ہو یا دوسرے کے ساتھ۔ غرض سے خالی نہیں ہوتا۔ تو ایسا نفس جو

---

[1] واللہ اعلم اس وقت اس آیۃ کی طرف ذہن کیوں نہیں منتقل ہوا۔ وَالَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۱۲ (جو لوگ مومن ہیں ان کو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ قوی محبت ہے ۱۲۔ص)

کہ سب سے زیادہ اپنے لئے شفیق ہے اس کی نسبت ارشاد ہے۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ : کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مومنین کے ساتھ ان کے نفوس سے بھی زیادہ تعلق ہے۔ اور یہ کوئی شاعرانہ بات نہیں بالکل بجا ارشاد ہے۔ دیکھو نفس تو اتنا اپنا خیر خواہ مگر ہر وقت بدخواہی کرتا ہے۔ شہوت و غضب و کینہ میں ہر وقت منہمک ہے۔ اور اس کو موجب ہلاکت بھی سمجھتا ہے۔ بری نیت سے کسی کسی کی طرف میلان کرتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ دوزخ میں لے جانے والی ہے۔ پس آپ نے دیکھ لیا کہ کتنا خیر خواہ ہے یہ صرف نام کا خیر خواہ ہے ورنہ اس سے زیادہ بدخواہ کوئی بھی نہیں۔

نفس کا فریب

شاید کوئی یوں کہنے لگے کہ صاحب یہ کیسی بات ہے کہ نفس جان کر ہلاکت کے کام بھی کرے۔ اور پھر خیر خواہ بھی رہے تو تمہارا پہلا کلیہ بھی غلط ہے کہ نفس اپنا بڑا خیر خواہ ہے تو سنئے بات یہ ہے کہ نفس کی خیر خواہی میں کوئی شک نہیں۔ خیر خواہی تو اس کی طبعی چیز ہے۔ مگر جب وہ بدخواہی کے کام کرنا چاہتا ہے۔ تو اُن کو خیر خواہی کی صورت میں لے آتا ہے مثلاً نفس نے ارادہ کیا کہ مکان کی ضرورت ہے ایک مکان بنانا چاہئے اور اس میں بہت سی مصلحتیں سمجھتا ہے مگر روپیہ ہاتھ میں موجود نہیں تو اب وہ رشوت ستانی پر کمر باندھتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اندیشہ جہنم کا ہوتا ہے تو وہ پہلے پہل متردد ہوتا ہے کہ کیا کروں مکان کی مصلحتیں رشوت لینے پر مجبور کرتی ہیں اور اندیشہ عذاب اس سے روکتا ہے ایسے وقت میں شیطان آ کر اُس کو ایک نیا سبق پڑھاتا ہے کہ اللہ بڑا غفور الرحیم ہے یعنی نفس سے کہتا ہے کہ رشوت لینے میں دنیا کا تو نفع ہے اور دین کا نقصان ہے مگر دینی نقصان کی تلافی تو رشوت لینے کے بعد بھی ہوسکتی ہے۔ وہ یہ کہ خدا تعالیٰ غفور الرحیم ہے توبہ استغفار کر لیں گے۔ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ مگر دنیا کا نفع یعنی مکان کا بننا بغیر رشوت کے نہیں ہوسکتا۔ اگر رشوت نہ لی تو منافع حاصل نہ ہوں گے۔ اور اس نقصان کی بظاہر کوئی تلافی نہیں معلوم ہوتی۔ پس جس نقصان کی تلافی ہوسکتی ہے۔ اس کو گوارا کر کے رشوت لینا چاہئے۔ پھر خدا تعالیٰ سے معاف کرا لیں گے۔

تو صاحبو! آپ نے دیکھ لیا کہ نفس بدخواہی کو کس رنگ آمیزی کے ساتھ خیر خواہی کی صورت میں لاتا ہے مگر شیطان کے اس سبق کی وہی مثال ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک شخص نے اپنی طوطی کو ''دریں چہ شک'' (اس میں کیا شک ہے ۱۲ص) سکھلا دیا تھا وہ ہر بات کے جواب میں یہی لفظ کہہ دیا کرتی تھی۔ مگر یہ لفظ ایسا ہے کہ اکثر باتوں کا جواب بھی بن جاتا

ہے۔چنانچہ اس شخص نے طوطی کو یہ لفظ یاد کرادیا اور برسر بازار لاکر دعویٰ کیا کہ میری طوطی فارسی بولتی ہے۔ایک شخص نے اس کا امتحان لیا کئی باتیں اس سے کیں سب کے جواب میں اس نے دریں چہ شک (اس میں کیا شک ہے،۱۲ص) ہی کہا مگر اُن باتوں پر یہ جواب چسپاں تھا۔اس نے خوش ہوکر اس کو خرید لیا اور گھر پر لایا اب جو اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اُس نے سب کے جواب میں دریں چہ شک ہی کہا چاہے کہیں جوڑ لگے یا نہ لگے آخر اُس نے کہا کہ افسوس! میں نے تیرے خریدنے میں بڑی بے وقوفی کی۔

اُس نے اس کے جواب میں بھی یہی کہا ''دریں چہ شک'' کہ اس میں کیا شک ہے ایسے ہی ہمارے نفس کو بھی ایک سبق یاد ہے ہر جگہ اسی کا استعمال کرتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے خواہ وہ کیسا ہی گناہ ہو۔حق اللہ ہو یا حق العبد، دوسرے یہ احمق نہیں جانتا کہ غفور رحیم ہونے کے لئے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ گناہ کا ضرر نہ ہوگا۔اگر غفور رحیم ہونے کے لئے یہ ضروری ہے تو جیسے خدا تعالیٰ آخرت میں غفور رحیم ہیں دنیا میں بھی تو ہیں کیونکہ صفات باری سب قدیم ہیں پھر سنکھیا کھانے سے ضرر کیوں ہوتا ہے۔اگر غفور رحیم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ چاہو کرو کچھ ضرر نہ ہوگا۔تو سنکھیا کھانے سے بھی کوئی نقصان نہ ہونا چاہئے۔مگر ضرر یقینی ہوتا ہے اور باوجود ضرر ہونے کے خدا تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے میں فرق نہیں آتا۔تو ایسے ہی آخرت میں بھی خدا غفور رحیم ہوں گے اور گناہ کا ضرر بھی ہوگا۔کیونکہ غفور رحیم ہونے کے لئے ضرر نہ ہونا لازم نہیں۔خداوند تعالیٰ رحیم اس طرح ہیں کہ تم کو بتلا دیا کہ۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکٰارٰی

نماز کے پاس تم ایسی حالت میں مت جاؤ کہ تم نشہ میں ہو (۱۲ص)

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً

یعنی زنا کے پاس مت پھٹکو بلاشبہ وہ بڑی بے حیائی کی بات ہے۔(۱۲ص)

یہ کتنے بڑے رحم کی بات ہے کہ خود بخود ایک قانون مفید تجویز فرما کر سب کو بتلا دیا کہ طریق فلاح و رضا الٰہی یہ ہے ورنہ یہ کام تو خود ہمارے ذمہ پر تھا۔کہ رضاء مولیٰ کا طریقہ معلوم کرتے۔

دوسرے حق تعالیٰ نے جہاں اپنی رضا حاصل کرنے کے طریقہ بیان فرمائے ہیں وہاں ایسے امور کی بھی تعلیم دی ہے جن سے امن عام قائم رہے اس کے سوا اور بھی رحیم ہونے کے معنی ہیں جو میں آئندہ بتلاؤں گا۔اور غفور ہونے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بعد سزا کے بخش دیں اگر کہئے کہ کیسی مغفرت ہے۔کہ سزا بھی ہو اور بخشش بھی ان دونوں میں تو منافاۃ ہے۔

غفور کے معنی

توصاحبو! آپ نے نہ خدا تعالیٰ کی عظمت سمجھی نہ گناہ کی حقیقت معلوم کی تو سمجھو کہ گناہ کہتے ہیں۔حاکم کی سرکشی کواور جس قدر حاکم بڑا ہوتا ہے اُسی قدر اس کی سرکشی بھی جرم عظیم ہوتی ہے۔مثلاً ایک سرکشی تو یہ ہے کہ حاکم ضلع کا کہنا نہ ماننا۔مگر اُس سے بڑھ کر وائسرائے کا کہنا نہ ماننا اور بادشاہ کا کہنا نہ ماننا تو سب سے بڑا سنگین جرم ہے۔ایسے ہی بڑے بھائی کا کہنا نہ ماننا ایک جرم ہے مگر باپ کا کہنا نہ ماننا اس سے بہت بڑا جرم ہے غرض سرکشی کی شدت کا مدار اس شخص کی عظمت پر ہوتا ہے جس کی سرکشی کی گئی ہے۔ایک مقدمہ تو یہ سمجھ لیجئے۔اور دوسرا مقدمہ سب کو پہلے سے مسلم ہے کہ خدا تعالیٰ سے بڑا کوئی حاکم نہیں کیونکہ اور سب کی عظمت محدود ہے اور عظمت الٰہی غیر محدود خارج از وہم وقیاس ہے۔تیسرا مقدمہ یہ بھی سب کے نزدیک بدیہی اور مسلم ہے کہ سزا بقدر گناہ ہوا کرتی ہے۔

پس اب سمجھئے کہ جب خدا تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔تو اس کی مخالفت سے بڑھ کر کوئی مخالفت نہیں۔اور اس کی مخالفت کی سزا سے بڑھ کر کسی کی مخالفت کی سزا نہیں بڑھ سکتی۔تو جیسا کہ عظمت غیر اللہ محدود ہے اسی لئے اس کی مخالفت کی سزا بھی محدود ہوتی ہے اور چونکہ عظمت الٰہی نامحدود ہے اس کی مخالفت کی سزا بھی غیر محدود ہونی چاہئے۔

پس اس عقلی قاعدہ کا مقتضا تو یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی صغیرہ گناہ بھی ہو جائے تو چونکہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔اس کی سزا بھی ابدالآباد جہنم ہونی چاہئے اور اس کے لئے کبھی مغفرت نہ ہونی چاہئے۔مگر خدا تعالیٰ نے ابدالآباد جہنم سوائے مشرکین وکافرین کے کسی کے واسطے مقرر نہیں فرمائی۔،پس اب اگر حق تعالیٰ کسی گناہ میں دس ہزار ودس لاکھ برس کے بعد بھی چھوڑ دیں تو یہ اُن کی مغفرت اور بخشش ہے یا نہیں یقینی ہے اور ضرور ہے اور دنیا کے قصوں میں ہم اس کو رات دن جانتے ہیں۔اگر کوئی شخص دس سال کی جیل کا مستحق ہو اور حاکم اس کو دو برس کے بعد چھوڑ دے۔یہ اس کا انعام سمجھا جاتا ہے یا نہیں۔پس نامحدود عذاب کی بجائے اگر حق تعالیٰ محدود عذاب دے کر دس ہزار یا دس لاکھ ہزار برس کے بعد بھی نجات عطا فرمادیں تو یہ بھی یقیناً مغفرت ہوگی۔اب آپ کی سمجھ میں آ گیا کہ غفور ہونے کیلئے سزا نہ دینا ضروری نہیں بلکہ غفور ہونے کے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ایک محدود زمانہ تک سزا دے کر رہا کر دیا جاوے۔اور غفور ہونے کی ایک یہ بھی صورت ہو سکتی ہے کہ گناہ کرتے ہی فوراً سزا نہ دی جائے جس کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے۔

رحیم کے معنے

اوراس کو رحمت بھی کہہ سکتے ہیں اب رحیم کے دوسرے معنی بھی سنئے وہ یہ کہ عرفاً یہ بات سب کو معلوم ہے کہ جس کی خطا معاف کرتے ہیں اس کے لئے بڑی بات یہی ہوتی ہے کہ جیل سے رہا کر دیا جائے اس کے لئے انعام کا کوئی قاعدہ نہیں نہ کوئی مستحق انعام واکرام سمجھے تو حق تعالیٰ کو بھی یہ حق حاصل تھا کہ جہنم سے نکال کر چھوڑ دیتے جس حال میں چاہے رہے خواہ مرے یا جیئے خواہ راحت میں رہے یا تکلیف میں۔ مگر وہ رحیم بھی ہیں اُن کی رحمت کا مقتضاء یہ ہے کہ وہ جہنم سے نکال کر وہ جگہ دیتے ہیں جو جنت کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں وہ چیزیں ہیں کہ جن کو نہ آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سُنا نہ کسی کے دل پر اُن کا خطرہ گزرا۔

فیها مَالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علٰی قلب بشر

اس جنت میں ایسی چیزیں ہیں کہ ان کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کانوں نے سُنا نہ کسی کے دل پر ان کا خطرہ گزرا۱۲اص)

پھر یہ کہ خطا معاف کر کے اس کو اپنا مقرب بناتے ہیں کسی سے ہفتہ وار ملاقات ہوا کرے گی کسی سے ماہوار کسی سے سالانہ اور سب سے مقرب وہ شخص ہوگا جس سے دن میں دومرتبہ صبح وشام ملاقات ہوا کرے گی۔ پھر یہ نہیں کہ آنے والوں کو حکم ہو کہ خود سلام کریں بلکہ حدیث[۱] میں ہے کہ سب لوگوں کو ایک باغ میں جمع کیا جائے گا اور حق تعالیٰ اُن پر متجلی ہوں گے اور پہلے خود فرمائیں گے، السَّلام علیکم۔ پس ان کی نظیر کوئی پیش کرسکتا ہے کہ خطاوار اور گنہگار کے ساتھ اس قدر انعام کیا جاتا ہو۔ یہاں سے یہ بھی سمجھ لیجئے کہ السلام علیکم کی کیا عظمت ہے کہ حق تعالیٰ بھی بندوں کو اسی کے ساتھ خطاب فرمائیں گے۔

اب ہمارے بھائیوں نے کورنشات اور آداب نکالے ہیں اور سلام کو ترک کر دیا ہے اور پورب میں تو بندگی کہتے ہیں۔ دراصل یہ متکبر بادشاہوں نے ہندوؤں کے لئے مقرر کیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ بتوں کو یہ پوجتے ہیں درختوں کو یہ پوجتے ہیں تو ہم کو کیوں نہ پوجیں ایک مورخ کہتے تھے کہ اُن کو یہ حکم کیا تھا کہ جب ہمارے دربار میں آؤ تو زمین پر سر رکھ کر لفظ بندگی کہو۔ مگر یہ شائع ہوگیا اب مسلمان بھی بندگی کہتے ہیں بلکہ عورتیں بھی کہتی ہیں۔ اور بعض ہندوؤں کو بندگی کرتے ہیں۔ کتنا سخت کلمہ ہے معاذ اللہ!

---

[۱] لم اجدالحدیث بهذه الالفاظ فی موسوعة اطراف الحدیث النبوی الشریف

مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ بندگی کے جواب میں فرمایا کرتے تھے کہ صاحب کو یعنی جو بندگی کا اہل ہے اس کو بندگی کرو۔ مولانا کے لطیفے ایسے ہوتے تھے کہ کوئی بڑا ذی فہم ہی سمجھتا تھا بعض بات کم صاف ہوتی تھی اور مولانا شہید علیہ الرحمۃ شمشیر برہنہ تھے۔ اُن کی بدنامی تو بہت ہوئی مگر وہ بادل ہٹ گیا اور آفتاب دین نکل آیا۔ خیر ہر بزرگ کی اپنی اپنی رائے ہے مگر اس وقت مولانا شہیدؒ ہی کی رائے پر عمل کرنا مناسب ہے کیونکہ حضرت شاہ صاحب کا زمانہ وہ تھا کہ عوام کے خلاف کوئی بات صاف صاف کہنے میں جان کا خطرہ تھا۔ اور بحمد اللہ یہ بات نہیں ہے کہ الفاظ خشن (سخت ۱۲اص) اور سخت نہ ہوں۔ کیونکہ نصیحت کے تین طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ لفظ نرم ہوں اور بات گول ہو۔ دوسرے یہ کہ الفاظ سخت ہوں اور بات صاف ہو۔ تیسرے یہ کہ لفظ نرم ہوں اور بات صاف ہو۔ یہی قرآن کا طرز ہے اور اسی کا حکم ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ : کہ جو تم کو حکم ہے اس کو صاف صاف کہو گول نہ رکھو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى

کہ اے ہارون و موسیٰ علیہم السلام فرعون سے بات نرم کہو شاید کہ وہ نصیحت حاصل کرے اور ڈر جائے۔ اور فرماتے ہیں

وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ يَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ : کہ میرے بندوں سے فرما دیجئے کہ بات عمدہ کہا کریں۔

غرض مولانا کا جواب پہلے طرز پر تھا۔ اور ان کا خیال یہ تھا کہ عوام گھبراویں نہیں اب جو بہت ہی ضعیف ہو وہ بندگی کے جواب میں صاحب کو یا جناب وغیرہ کہہ دیا کریں۔ مگر ہمت کی بات یہ ہے کہ اُس کو فوراً منع کر دے کہ بندگی کیا ہوتی ہے۔ سیدھا السلام علیکم کیوں نہیں کہا جاتا۔

غرض یہ مضمون لفظ سلام کی مناسبت سے بیان ہو گیا تو آپ نے دیکھا کہ حق تعالیٰ کیسے کیسے انعامات فرمائیں گے کہ خود اپنے بندوں کو سلام فرمائیں گے پھر یہ نہیں کہ اُن کو بلاویں گے بلکہ خود ان کے پاس تشریف لا کر متجلی ہوں گے اس وقت وہ حال ہوگا کہ سب زبان حال سے کہتے ہوں گے ؎

امروز شاہِ شاہاں مہمان شد است مارا

آج بادشاہوں کا بادشاہ ہمارا مہمان ہوا ہے۔ ۱۲اص

تو دیکھئے خدا تعالیٰ کی رحمت کے معنیٰ سمجھ میں آ گئے ہیں اب اس تفسیر کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ رحمت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ سزا ہی نہ ہو۔ تو یہ نفس کا بڑا دھوکہ ہے کہ حق تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے سے یہ سمجھتا ہے کہ گناہ کی سزا ہی نہ ہوگی۔ اسی کو کہتے ہیں۔

کلمة حق اريدبها الباطل یعنی یہ کلمہ حق ہے اس سے مراد باطل لی گئی ۱۲اص

اسی لئے میں کہتا تھا کہ نفس خیر خواہی کے پردہ میں بدخواہی کرتا ہے۔ چنانچہ آپ نے دیکھ لیا کہ خدا تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے کے کیا معنی سمجھ گیا۔ اور اس کے بعد گناہ پر دلیر ہوگیا جو سراسر بد خواہی ہے تو نفس کا علاقہ تو معلوم ہوگیا جو سب سے زیادہ خیر خواہ مانا جاتا ہے۔ اب جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا اندازہ کیجئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری مضرت کبھی گوارہ نہیں ہوئی۔ اور گوارا تو کیا فرماتے بلکہ ہماری کلفت حضورؐ پر خود بہت گراں تھی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ یعنی شَاقٌ عَلَيْهِ عَنَتُكُمْ

کہ تمہاری کلفت ان پر بہت شاق ہے خواہ کسی قسم کی کلفت ہو دینی ہو یا دنیوی۔ چنانچہ آپ کے واقعات زندگی کے معلوم کرنے سے یہ بات واضح ہوسکتی ہے۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! میری امت کو قحط عام سے ہلاک نہ فرمایئے گا یہ دعا قبول ہوئی۔ دوسری دعا فرمائی کہ کوئی ایسا دشمن ان پر نہ مسلط ہو جو ان کا استیصال کردے۔ یہ دعا بھی قبول ہوئی۔ تیسری دعا فرمائی کہ ان میں نااتفاقی نہ ہو اس کا اثر دین پر بہت برا۔

جنگ ہفتاد و دوملت ہمہ را عذر بنہ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

(تمام بہتر فرقوں کو جنگ و اختلاف میں معذور جانو جب ان کو حقیقت کا پتہ نہ چلا تو انہوں نے اپنے اپنے مذہب کا مدار قصوں اور افسانوں پر رکھا ۱۲اص)

کہ اکثر اختلاف حقیقت نہ جاننے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ آج کل مشاہد ہے۔ مگر یہ دعا بارگاہ خداوندی میں قبول نہ ہوئی۔ پس آپ کو معلوم ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری ہر قسم کی کلفت سے پریشانی ہوتی تھی۔ آپ یوں چاہتے تھے۔ کہ میری امت ہر طرح آرام میں رہے۔ آخرت میں بھی دنیا میں بھی۔

نزاع مذہبی

اس اختلاف پر مجھے ایک بات جملہ معترضہ کے طور پر یاد آتی ہے وہ یہ کہ اس وقت اکثر تعلیم یافتہ لوگ یہ رائے دیتے ہیں کہ مولوی سب باہم متفق ہو جائیں تو یہ سارا باہمی نزاع دور ہو جائے۔ سب اختلافات کی جڑ وہ نزاع مذہبی ہے جو آج کل مولویوں میں ہو رہا ہے۔ واقعی یہ ایک قیمتی رائے ہے مگر اس میں ایک دھوکہ ان صاحبوں کو ہو رہا ہے جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اول اس کی ایک نظیر پیش کرتا ہوں کیونکہ آج کل بدوں اس کے لوگ کچھ نہیں سمجھتے۔

---

[1] سنن أبي داوٗد :5112، مسند أحمد 235:1، مشكل الآثار للطحاوي 252:2

اس وقت یہ بات سب کو مسلم ہے کہ اہل یورپ آج کل سب سے زیادہ متمدن ہیں۔ بالخصوص انگریز نیز دنیاوی امور میں ان کی عقل وفہم سب سے زیادہ حجت سمجھی جاتی ہے۔ ان کا ایک قانون ہے کہ جب کوئی عدالت میں جا کر نالش کرے تو حاکم کو اس کی تنقیح کرنی چاہئے۔ شہادت اور ثبوت طلب کرے اور وکلاء طرفین میں گفتگو ہو اور اخیر تک حاکم سب کی گفتگو سنتا ہے۔ پھر اپنی رائے کے موافق کسی ایک کو ترجیح دے کر ڈگری دیتا ہے اور اس درمیان میں ظاہر ہے کہ ہر ایک وکیل اپنے موکل کو غالب کرنے کی کوشش کرتا ہے اور طرفین میں اچھی طرح مباحثہ قائم ہو جاتا ہے۔ اب مَیں پوچھتا ہوں کہ کوئی تعلیم یافتہ اس طرح تنقیح میں اس حاکم کو ظالم کہے گا ہرگز نہیں بلکہ ہر ایک شخص اس کو عدل کے موافق سمجھتا ہے پس اگر نااتفاقی بری چیز ہے تو ان وکلاء طرفین کو کیوں نہیں ملامت کی جاتی۔ اور سب سے زیادہ اس حاکم کو ملامت کرنی چاہئے جس نے اپنی کچہری میں یہ نزاع اور بحث قائم ہونے دی۔ اور اُسی پر اپنے فیصلے کی بنیاد ڈالی۔ مگر جب اس منازعت کو قابل ملامت نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ اس کو عین عدل کہا جاتا ہے۔ تو اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ منازعت اور نااتفاقی مطلقاً بری نہیں۔ بلکہ طریقہ یہ ہے کہ اول معاملہ کی تنقیح کی جاتی ہے اور قبل تنقیح کے دونوں میں سے کسی کو ملامت نہیں کی جاسکتی اور تنقیح کے بعد جو حق پر معلوم ہو اُس کا ساتھ دو اور جو ناحق پر ہو اس کو ملامت کرو یہ کیا کہ دونوں کو ملامت کی جاتی ہے اور دونوں کو اس اختلاف کو چھڑانے اور اتفاق کر لینے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ ہر معاملہ میں اتفاق ممکن نہیں ہوا کرتا۔ اگر حاکم بھی ایسا کرے کہ دونوں فریق کو ملامت کرنے لگے تو کیسے ہو۔ مگر دنیاوی معاملات میں یہ نوتعلیم یافتہ بھی اس قاعدہ پر عمل نہیں کرتے۔ اور ہمیشہ ایک فریق کا جو حق پر معلوم ہو ساتھ دیا کرتے ہیں۔ پھر دین کے بارے میں یہ قاعدہ کیوں نہیں برتا جاتا۔

اس سے ایک راز معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے دلوں میں دین کی وقعت وعظمت کوئی چیز نہیں اس لئے اس کی کچھ فکر بھی نہیں۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر حاکم کے برابر بھی ان کے نزدیک مذہب کی ضرورت ہوتی تو یہ ہمیشہ صاحب حق کی مدد کرتے۔ یہ کیا کہ زید کو بھی ملامت، عمرو کو بھی اس کو اتفاق کی ترغیب اس کو بھی آخر کس بات میں دونوں متفق ہوں۔ کس بات کو قبول کریں۔ اگر کوئی ایسی بات ہو جس میں اتفاق ہو سکے تو خیر جب اعتقاد کا اختلاف ہے کہ ایک فریق حضرت علیؓ کو نبی سمجھتا ہے۔ دوسرا فریق ایسا نہیں سمجھتا۔ ایک فریقہ ابوحنیفہؒ کو فقیہہ مجتہد سمجھتا ہے۔ دوسرا اُن کو مخالف خدا و رسول جانتا ہے تو اب بتلاؤ کہ اتفاق کی کیا صورت ہے۔ دونوں

کے عقائد میں تضاد ہے۔ اب سوائے اس کے کہ ایک فریق اپنا عقیدہ بدلے اس کے سوا کوئی صورت اتفاق نہیں۔ اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہ کر اتفاق ہرگز متصور نہیں۔ البتہ اگر مذہب وعقیدہ کوئی ضروری چیز نہ ہو تو پھر واقعی ہوسکتا ہے مگر اس کو بجز ان نوتعلیم یافتہ حضرات کے کوئی عاقل بھی قبول نہیں کرسکتا اور زبان سے تو یہ بھی تعلیم نہیں کر سکتے اگر چہ دلوں میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ دوسرے اس طریقہ پر دنیاوی امور میں بھی عمل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً ایک شخص نے مجلس میں ایک بات نکالی تو اس میں دو چار اختلاف کرنے والے ہو جاویں گے۔ اب اگر ان دونوں فریق کو ملامت کی جائے اور اتفاق کی ترغیب دی جائے تو سوقیامتیں آ جائیں گی۔ مگر اتفاق ناممکن ہوگا۔ پس آپ کا طریقہ تو ایسا ناتمام ہے کہ نہ دین میں کارآمد نہ دنیا میں کارآمد۔

اب میں بتلاتا ہوں کہ اتفاق کیونکر ہو پہلے آپ خود تحقیق کیجئے کہ صورت معاملہ کیا ہے۔ پھر جو حق بجانب ہو اس کا ساتھ دیجئے اور دوسرے کو ملامت کیجئے اور پہلے کا تابع بنایئے۔ یہ جو دونوں کو ملامت کی جاتی ہے سخت غلطی ہے۔ اس زمانہ کے نوجوانوں کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ وہ اتفاق کو محمود اور اختلاف کو مذموم سمجھ کر علماء کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ آپس میں اتفاق کرلو۔ پس ان کی اتنی بات تو قابل تسلیم ہے کہ واقعی نزاع واختلاف بری چیز ہے اس کے زائل کرنے کا جو طریقہ بتلایا جاتا ہے کہ دونوں کو ملامت کر کے اتفاق کی دونوں کو ترغیب دی جاتی ہے یہ بالکل سراسر عقل کے اور فطرت کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس کے تو یہ معنے ہوئے کہ صاحب باطل کچھ صاحب حق کا اتباع کرے اور صاحب حق کچھ صاحب باطل کا اتباع کرے کہ پہلے ایک فریق خالص حق پر تھا تو اب وہ بھی باطل کا پیرو ہو جائے اس کو فطرت انسانیہ کبھی تسلیم نہیں کرسکتی۔ عجب بات یہ ہے کہ یہ لوگ خلاف فطرت کی تعلیم کو ہمیشہ ناقابل اشاعت سمجھتے ہیں اور سب سے زیادہ مدعی فطرت ہیں۔ مگر دین میں نہ معلوم وہ فطرت کیا ہو جاتی ہے جو خود خلاف فطرت کی تعلیم دیتے ہیں۔

نبوی تعلیم

غرض دین پر نااتفاقی کا بہت زیادہ برا اثر پڑتا ہے۔ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے لئے دعا فرمائی۔ دنیاوی منافع کے لئے بھی دعا فرمائی۔ ہمارے دین کے خیرخواہ تو حضور ہی ہیں دنیا کے بھی خیرخواہ ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا بڑا علاقہ ہے تو آپ سے زیادہ شفیق کون ہوسکتا ہے اور شفقت کا مقتضاء جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا یہ ہوتا ہے کہ جو تعلیم دی جائے سہل ہو

اوراس میں منافع بہت زیادہ ہو۔ پس چاہے کلامِ خدا ہو یا کلامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کی تعلیم میں سہولت اور کثرت منفعت ضرور ہوگی۔ کیونکہ دونوں کو مخلوق سے بہت زیادہ شفقت ہے کہ مخلوق کو بھی اپنے ساتھ اتنی نہیں گو آپس میں خدا اور رسول کی شفقت میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔

یا رب تو کریمی و رسول تو کریم   صد شکر کہ ہستیم میاں دو کریم

اے اللہ! آپ بھی کریم اور آپ کے رسول بھی کریم ہیں ہزاروں شکر کہ ہم دو کریموں کے درمیان ہیں ۱۲اص)

اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا کہ نواب صاحب ڈھاکہ نے یہ مہر کھدوائی۔ محمد سلیم اللہ اور اس پر یہ مصرعہ لکھوایا۔

صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم (سینکڑوں شکر کہ ہم دو کریموں کے درمیان ہیں ۱۲اص)

تو خداوند جل و علےٰ کی عنایتیں دیکھیئے کہ خدا تو سب کے حق میں کریم ہے اور رسولؐ ہم کو ایسا کریم عطا ہوا ۔ بہر حال جب اللہ و رسولؐ کی یہ شفقت ہے تو شریعت میں ہم کو وہ باتیں بتلائی گئی ہیں جو نہایت سہل ہیں اور منافع بہت ہیں۔

یہ بات بھی ایسی ہی ہے جو میں اس وقت بیان کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ بعض چیزوں پر جو میری نظر پڑی تو یہ سمجھ میں آیا کہ یہ چیز کسی کی ضرور کہلاتی ہوگی۔ پھر یہ ایک دن فنا ہو جائے گی۔ اُس کے مالک کو کیسی کلفت ہوگی۔

نسبت مع غیر اللہ کا اثر

پھر یہ علم عظیم عطا ہوا کہ دنیا میں جو کلفت ہوتی ہے وہ نسبت مع غیر اللہ (غیر اللہ کے ساتھ تعلق رکھنے ۱۲اص) کی وجہ سے ہوتی ہے خواہ کیسی ہی کلفت ہو تشریعی ہو یا تکوینی یعنی دینی ہو یا دنیوی یعنی کسی کے مرنے کا غم ہوا یا کسی گناہ کی سزا میں آخرت کی کلفت ہوئی۔ غرض خواہ کلفت دنیا ہو یا کلفت آخرت اس کی وجہ صرف یہی ہوگی اس کو علاقہ ہے کسی غیر اللہ کے ساتھ اور اس میں جتنا غور کریں گے۔ یہ فصل اتنی بڑھے گی کہ آپ شاید اس کا احاطہ بھی نہ کر سکیں۔ مثلاً ایک شخص کو پریشانی ہوئی اس لئے کہ وہ کسی سے محبت رکھتا ہے۔ اب دو قسم کی پریشانی ہوتی ہے ملنے سے بھی اور نہ ملنے سے بھی۔ نہ ملنے کی پریشانی تو ظاہر ہے اور ملنے سے اس لئے پریشانی ہوتی ہے کہ یہ خیال ہوتا ہے کہ نہ معلوم کب جدا ہو جائے گا۔

نہ آیا وصل میں بھی چین ہم کو   گھٹا کی رات اور حسرت بڑھا کی

اسی طرح پھر محبوب کے ساتھ اندیشہ مفارقت ضرور ہوتا ہے خواہ اس کے جدا ہونے کا یا اپنے جدا ہونے کا مثلاً ہم زندہ ہیں اور مال جاتا رہا۔ یا اولاد جاتی رہی۔ ایسے بہت دیکھے ہیں کہ لاکھوں کے آدمی تھے اور پیسوں پر اُتر آئے اور ایسے بھی بہت ہیں کہ چھ پیسے کے مزدور تھے اور لاکھوں کے ہو گئے۔

ایک سقے کو کانپور میں دیکھا کہ وہ آٹھ آنے ۸ ؏ ماہوار کماتا تھا اور پہلے بوجہ غایت امارت اس کو لوگ نواب کہتے تھے مگر بیوی کی طرف سے یعنی اُس نے کسی بیگم سے نکاح کر لیا تھا۔ اور نکاح اس لئے ہو گیا کہ وہ امیر بہت بڑا تھا۔ اُس کی وجہ سے نواب مشہور ہو گیا اور دنیا میں ایسی لاکھوں نظیریں ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہرا بھرا باغ چھوڑ کر ہم خود چل دیں تو جن کو تعلق نہیں ہوتا وہ تو جاتے ہوئے نہیں مچلتے مگر جن کو تعلق ہوتا ہے وہ بہت مچلتے ہیں اور اُن کی بڑی مصیبت سے جان نکلتی ہے۔ یہیں کا ایک قصہ حکیم کرامت علی صاحب بیان کرتے تھے کہ ایک شخص پر نزع کی حالت طاری تھی۔ مگر وہ ایک کوٹھڑی کی طرف بار بار دیکھتا تھا۔ الٰہی توبہ۔

وَلَا تُعْجِبْکَ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِی الدُّنْیَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ ۔

اس آیت میں حق تعالٰی کفار کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ کو ان کے مال و اولاد بھلے نہ معلوم ہونے چاہئیں ہم چاہتے ہیں کہ ان کو ان کے اموال و اولاد سے دنیا ہی میں عذاب دیں اور پھر ان کی جانیں کافر ہو کے نکلیں وہ دنیا کا عذاب یہی تو ہے جو مرتے وقت ان کو ہوتا ہے۔ اور یہ حکایت بھی کافر کی ہے ورنہ مسلمان تو اکثر ہنسی خوشی دنیا سے جاتے ہیں۔

یہیں قصبہ میں ایک مسلمان بڑی بی تھی اُن کا ایک بیٹا مدت دراز سے غائب تھا جس کو وہ بہت یاد کرتی تھیں اور روتی تھیں جب وہ مرنے لگیں تو بے وقوف عورتوں نے کہا کہ وہ بیٹا بھی یاد آتا ہے اُنہوں نے کہا میرے سامنے کسی کا نام مت لو مجھ کو کوئی یاد نہیں آتا۔ اُن کے مرنے کے بعد منجھلے بیٹے نے اُن کو خواب میں دیکھا کیفیت موت کی پوچھی کہنے لگی کہ مجھ کو تو کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نے تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ چل بس میں ہمراہ چلی گئی۔

رہی یہ بات کہ حضور تو وفات پا چکے آپ اس وقت کیسے تشریف لائے تو بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بعد وفات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ معجزہ خرق عادت ہے اس لئے

کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ بعض علماء نے قبر کے اندر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کو ایک حدیث سے ثابت کیا ہے کہ نکیرین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں میت سے سوال فرمائیں گے۔

ما تقول فی هذا الرجل (الصحیح لمسلم باب :60، رقم :209، سنن أبی داوٗد، الآدب باب :119) کہ یہ کون صاحب ہیں تو لفظ ہذا سے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ میت کو قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار حاصل ہوگا۔

انا عندظن عبد ی بی: (میں اپنے بندہ کے گمان کے نزدیک ہوں ۱۲ ص)

انشاء اللہ کیا عجب ہے کہ جن حضرات کا ایسا خیال ہے۔ ان کو زیارت نبوی قبر میں ہو جائے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کے سامنے بھی یہی تذکرہ ہوا تھا۔ تو آپ نے اس کے راز میں فرمایا۔

کششے کہ عشق دارد نہ گزاروت بدیں ساں　　　بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

(وہ کشش جو عشق رکھتا ہے تم کو اس روش میں نہ چھوڑے گا۔ اگر جنازہ میں نہ آئے تو مزار پر تم ضرور آؤ گے۔ ۱۲ محمد صابر غفرلہٗ)

اور فرمایا کہ حق تو یہ تھا کہ ہم سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے جنازے کی نماز پڑھاتے۔ مگر یہ نصیب نہ ہوا تو مزار پر تو تشریف لاویں ہی گے اور اگر اُس بڑھیا کا قصہ ملا لیا جائے تو بجنازہ ہم بیائی (جنازہ میں تم بھی آؤ گے ۱۲ ص) بھی ہے مگر خدا کے لئے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر اور ہر جگہ موجود نہ سمجھ لیا جائے کیونکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ معجزہ خرق عادت ہے۔ اس لئے اس کے لئے ہمیشہ ہونا ضروری نہیں۔ غرض مسلمان کی نسبت مع غیر اللہ (غیر اللہ کے ساتھ تعلق ۱۲ ص) تو موت کے وقت اکثر منقطع ہو جاتی ہے۔

اتصال قوی

اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ جب مسلمان کی نسبت مع غیر اللہ خود منقطع ہو جاتی ہے تو سارے وعظ و نصیحت بیکار ہیں۔ صاحب بیکار نہیں ہیں کیونکہ جس نے پہلے سے تعلقات قطع نہیں کئے۔ جب اس کا یہ حال ہے تو جو پہلے سے تمام تعلقات قطع کر چکا وہ کیسا کچھ ہوگا۔ یعنی جس کے تعلقات مع غیر اللہ پہلے ہی منقطع نہ ہوں اس کا انقطاع ضعیف ہوگا اور خدا تعالیٰ سے اتصال بھی ضعیف ہوگا اور جس کے پہلے تمام عدائق منقطع ہو چکے ہیں اس کا انقطاع کامل ہے تو خدا تعالیٰ سے اتصال بھی کامل ہوگا تو یہ کتنا بڑا نفع اُس شخص کو حاصل ہوا جو دوسروں کو میسر نہیں۔ بتلاؤ محبوب سے اتصال قوی مطلوب ہوتا ہے یا اتصال ضعیف۔ کتنا بڑا فرق ہے ان دو شخصوں میں

جن میں ایک کومحبوب سے صرف مصافحہ کرنا نصیب ہوا اور دوسرا بغلگیر ہو کر ملا۔ جب انقطاع ضعیف سے بھی اتصال ہو جاتا ہے تو انقطاع قوی سے کیا کچھ نہ ہوگا ۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند | صاف گر باشد ندانم چوں کند

(گرد آلود گھونٹ جب مجنوں کر دیتا ہے اگر صاف ہو تو نہ معلوم کیا کرے۔۱۲ص)

جب انقطاع ناتمام بھی مفید ہو گیا تو انقطاع نام تو بہت زیادہ نفع بخش ہوگا۔غرض وعظ و پند بیکار نہیں حاصل یہ کہ نسبت مع غیر اللہ کا یہ اثر ہے کہ جتنا تعلق ہوگا اُسی قدر زیادہ کلفت و پریشانی ہوگی۔ بلکہ بعض مرتبہ تو اس کی بدولت بے ایمان ہو کر مرتا ہے۔کیونکہ محبوب سے جو چھڑاتا ہے وہ مبغوض (دشمن ۱۲ص) ہوتا ہے اور دنیا سے حق تعالیٰ چھڑاتے ہیں تو نعوذ باللہ ایسے عاشق ماسواء کو خدا تعالیٰ سے بغض ہوگا ایسے بہت سے واقعات ہوئے ہیں۔

الدواء والکافی میں حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص کسی پر عاشق ہو گیا تھا حتی کہ مرنے لگا کسی نے جا کر محبوب سے کہا اس کو رحم آ گیا۔اس کے پاس آنے کے ارادہ سے تھوڑی دیر چلا آدھے سے زیادہ راستہ سے لوٹ آیا۔جب آنے لگا تو عاشق اس کی خبر سُن کر اٹھ بیٹھا۔ پھر جب لوٹ جانے کی خبر سُنی تو گر پڑا اور یہ شعر پڑھا۔

رضاک اشھی الیٰ فوادی | من رحمة الخالق الجلیل

(میرے دل کی طرف تیری رضا مندی اللہ تعالیٰ کی رضا مندی سے زیادہ مرغوب و پسندیدہ ہے۔۱۲ص)

لوگوں نے کہا خدا تعالیٰ سے ڈر کیا بکتا ہے۔ کہنے لگا کہ اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔آخر بے ایمان ہو کر مرا لوگوں کو کچھ خبر نہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔جس قدر غیر اللہ سے تعلق بڑھاتے ہیں اپنے حق میں کانٹے بوتے ہیں۔

انواع محبت

صاحبو! اپنے دل میں کسی کو جگہ نہ دو، نہ کسی مال کو، نہ کسی اولاد کو، حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآءُ كُمْ وَ اَبْنَآ ءُ كُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور

تمہارا کنبہ اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو۔ اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم سزائے ترک ہجرت کا بھیج دیں۔۱۲

یعنی اگر یہ دنیا کی چیزیں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تم کو محبوب ہیں تو ہمارے حکم ثانی کے منتظر رہو کہ ہم کیا حکم کرتے ہیں تو حضرت غیر اللہ کے ساتھ دل لگانا بڑی سخت بات ہے اور اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ بیوی بچوں سے محبت نہ کرو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے زیادہ کسی سے محبت نہ کرو پس اگر تھوڑی سی محبت ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ جب لقاء اللہ کا (دیدار۱۲ اص) کا وقت آئے گا یہ تھوڑی محبت زائل ہو جائے گی اور تھوڑی محبت اتنی ہونی چاہئے کہ حقوق بسہولت ادا ہو سکیں کیونکہ بدوں قدرے محبت کے حقوق ادا نہیں ہو سکتے اور ایسے ہی اگر بیوی سے محبت نہ ہو تو ہمبستری کا جو کہ ایک گندے محل سے متعلق ہے کبھی قصد نہ کرے گا۔ اور اگر کرے گا بھی تو اس فعل پر قادر نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ فعل تو اس پر موقوف ہے کہ وہ کیفیت خاصہ پیدا ہو اور وہ کیفیت بدوں میلان و محبت کے پیدا نہیں ہو سکتی تو چونکہ محبت مخلوق میں بعض حکمتیں تھیں اس لئے قدرے اس کی اجازت دی بشرطیکہ خدا تعالیٰ کی محبت دل میں سب سے زیادہ ہو۔

اگر کوئی کہے کہ جتنی محبت بیوی سے ہوتی ہے اکثر آدمیوں کو اس قدر تو خدا سے نہیں ہوتی۔ کیونکہ جس وقت بیوی کی طرف رغبت ہوتی ہے اس وقت خدا تعالیٰ دل سے غافل ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کی محبت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ تو یہ سب کے سب ناقص الایمان ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس وقت کلمہ کفر کہہ دے تو یہی شخص جو اس وقت اس پر فریفتہ اور مست تھا اس کے قتل پر آمادہ ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ بیوی کی طرف میلان کے وقت بھی خدا تعالیٰ کی محبت مسلمانوں کے دلوں میں باقی رہتی ہے۔ لوگوں کو دھوکہ اس سے ہوا کہ بیوی کی محبت میں تو مستی ہوتی ہے اور خدا کی محبت میں یہ مستی نہیں ہوتی۔ اس سے یہ سمجھا کہ بیوی کی محبت خدا تعالیٰ سے زیادہ ہے، حالانکہ محبت کی انواع مختلف ہیں۔ کسی میں مستی ہوتی ہے اور کسی میں نہیں۔ مثلاً سب جانتے ہیں کہ ہر شخص کو سب سے زیادہ اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے۔ مگر کبھی کسی کو بیٹے پر مستی کرتے نہیں دیکھا گیا اور ایک کسبی پر اکثر لوگ مست ہو جاتے ہیں تو کیا یہ کہیں گے کہ اولاد کی محبت سے یہ محبت زیادہ ہے کبھی نہیں مگر یہ نوع ہی جدا ہے۔

نعمت عقل

دوسرے عام لوگ مستی کو بڑی چیز سمجھتے ہیں لیکن اگر حقیقت پر نظر کی جائے تو یہ کوئی چیز

بھی نہیں کیونکہ مستی نام ہے عقل کے مغلوب ہو جانے کا۔ اور یہ کوئی محمود شے نہیں۔ ایک فقیر سے میرے سامنے کسی نے سوال کیا کہ مجذوب افضل ہے یا سالک۔ تو اس نے جواب دیا کہ عقل کے مغلوب ہو جانے کی خرابی کی وجہ سے حق تعالیٰ نے شراب کو حرام کیا تو معلوم ہوا کہ عقل کا مغلوب ہونا اتنی بری چیز ہے کہ اس کی وجہ سے شراب اتنی پلید اور ناپاک ہوگئی تو اب تم فیصلہ خود کرلو کہ افضل مجذوب ہے یا سالک۔ ظاہر ہے کہ جس کی عقل غالب ہو وہ ہی افضل ہے۔

ایک مرتبہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ[1] اے عمرؓ! جب دو فرشتہ منکر نکیر قبر میں کڑکتے وگرجتے آویں گے تو کیا حال ہوگا۔ آپ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ہم کو بھی عقل بھی ہوگی یا نہیں۔ فرمایا: تم اس وقت دنیا سے بھی زیادہ عاقل ہوگے۔ تو اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ پھر کچھ خوف نہیں۔ کسی نے خوب کہا ؎

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست	گویم آنکس کہ ربود ایں دل دیوانۂ ما

(اگر نکیر آئیں اور دریافت کریں کہ تیرا رب کون ہے؟ تو جواب دوں گا وہ ہے جس نے ہمارے اس دل دیوانہ کو چھین لیا ہے۔ ۱۲ص)

حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کی حکایت ہے کہ کسی کو مکشوف ہوا کہ جب آپ کی وفات ہوگئی اور قبر میں مدفون ہوئیں تو فرشتوں نے پوچھا کہ مَنْ رَّبُّکَ (تیرا رب کون ہے ۱۲ص) آپ نے فرمایا کہ ابھی تو میں دو گز ہی زمین کے نیچے آئی ہوں۔ کیا اتنی دیر میں اپنے خدا کو بھول جاؤں گی۔ غرض عقل بڑی بھاری نعمت ہے تو مستی اور سکر وغیرہ کوئی کمال نہیں۔ اسی لئے انبیاء علیہم السلام کو ایسا وجد جس میں کود پھاند ہو اور عقل مغلوب ہو جائے نہ ہوتا تھا۔

سکر و وجد

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جن کو سکر و وجد ہوتا ہے وہ کچھ بھی نہیں مکار ہیں۔ ہرگز نہیں اللہ تعالیٰ کے بندے سب یکساں نہیں سب کو مکار نہ سمجھنا چاہئے ؎

مکن عیب درویش حیران و مست	کہ غرق است ازاں میزند پا و دست

حیران و مست درویش کی عیب جوئی مت کرو اس لئے کہ وہ محبوب کی محبت میں غرق ہے۔ اس وجہ سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے ۱۲ص) آگے اس کی حد بتلاتے ہیں۔

بہ تسلیم سردر گریباں برند	جو طاقت نماند گریباں درند

---

[1] لم اجد الحدیث فی موسوعة اطراف الحدیث النبوی الشریف

کہ اول تو ضبط کر کے سر جھکا لیتے ہیں مگر جب طاقت نہ رہے اس وقت بے اختیار ہو کر کپڑے پھاڑ ڈالتے ہیں یہ نہیں کہ جان جان کر ایسا کریں۔

کانپور میں ایک صاحب نے آ کر ذکر رسول کیا اور عین بیان کے اندر پرانا کُرتہ پھاڑ ڈالا گھر والے کو شرم سے نیا بنانا پڑا۔ یہ لوگ صاحب بطن ہیں (پیٹ ۱۲ص) صاحب باطن نہیں۔ غرض وجد کے اقسام میں ایک قسم یہ بھی ہے کہ مست ہو کر اختیار سے باہر ہو جائے۔ مگر اس میں منحصر نہیں حقیقت اس کی یہ ہے

حالته محمودة غريبة غالبة ۔ (ایک محمود غریب غالب حالت ہے ۱۲ص)

چنانچہ رونا بھی وجد ہے کہ وعید کی بات سُن کر رونا آ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بکاء (رونا ۱۲ص) طاری ہوتا تھا۔ اور اس میں آپ کی یہ حالت ہوئی تھی۔

وله ازيز كازيز المرجل

کہ جیسے ہانڈی پکنے کی آواز ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز اسی کے مشابہ ہو جاتی تھی۔ مگر کاملین پر ان حالات کا زیادہ غلبہ نہیں ہوتا۔

حقیقت استغراق

بعض لوگ استغراق کو کمال سمجھتے ہیں کہ نماز میں ایسا محو ہو جائے کہ کچھ بھی خبر نہ رہے، حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نماز پڑھتے ہوئے بعض دفعہ ارادہ کرتا ہوں کہ لمبی سورت پڑھوں گا۔ مگر کسی بچہ کے رونے کی آواز سُن کر چھوٹی سورتیں پڑھتا ہوں کہ اس کی ماں زیادہ دیر سے بے چین ہو جائے گی۔ تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں بچوں کے رونے کی خبر ہوتی تھی، تو استغراق حالت کمال نہیں بلکہ حالت توسط ہے اور کمال کے بعد استغراق وانقطاع کلی نہیں ہوتا، بلکہ اہل دنیا سے بھی تعلق ہو جاتا ہے، مگر یہ تعلق اور طرح کا ہوتا ہے، اُس تعلق میں جو قبل از کمال (کمال سے پہلے ۱۲ص) ہوتا ہے اور اُس میں جو بعد کمال ہوتا بڑا فرق ہوتا ہے۔ پہلے سب سے تعلق اپنی نسبت کی وجہ سے تھا کہ یہ میرا باپ ہے، یہ بھائی ہے یہ بیوی ہے یہ بچہ ہے، اب خدا تعالیٰ کی نسبت کی وجہ سے تعلق ہوتا ہے کہ یہ سب خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں اور اس کی ذات کے مظہر ہیں اور اُس کے حقوق کے محل ہیں، پس یہ بھی اصل میں اللہ تعالیٰ ہی کی محبت ہے۔ مگر وسط میں یہ نہیں رہتی۔ یہ حالت

کمال ہی کی ہے کہ غیر میں بھی ذات خدا تعالیٰ کا مشاہدہ ہو۔ حاصل یہ کہ خدا تعالیٰ کی محبت اور طرح کی ہوتی ہے اور ماں کی اور طرح کی بیوی کی دوسری قسم کی۔

امتیاز محبت

یہیں سے یہ شبہ بھی حل ہو جائے گا کہ حدیثوں میں کہیں تو یہ آیا ہے کہ حضور[1] صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے سب سے زیادہ محبت فاطمہؓ سے ہے کہیں فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ محبت عائشہؓ سے ہے۔ کہیں فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ مجھے ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ محبوب ہیں۔ کسی میں ہے کہ سب سے زیادہ محبوب مجھے علیؓ ہیں تو بظاہر اس میں شبہ ہوتا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اتنے آدمیوں سے محبت ہو اور سب سے زیادہ بھی ہو۔ سب سے زیادہ محبت تو ایک ہی سے ہوسکتی ہے۔ تو بات وہی ہے کہ محبت کے انواع مختلف ہیں، نوع محبت اولاد میں سب سے زیادہ حضرت فاطمہؓ سے محبت تھی۔ حب ازواج میں سب سے زیادہ حضرت عائشہؓ صدیقہ سے اور نوع حب اقارب میں سب سے زیادہ حضرت علیؓ سے اور نوع اصحابؓ میں سب سے زیادہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے محبت تھی۔ پس احادیث میں کوئی اشکال باقی نہ رہا۔ غرض لوگوں نے جو آثار بیوی کی محبت کے تھے۔ چونکہ خدا تعالیٰ کی محبت میں نہ پائے سمجھے کہ خدا تعالیٰ سے محبت کم ہے، یہ دھوکہ ہوگیا ہے انواع محبت میں امتیاز نہ کرنے سے۔

اس لئے بعض صوفی نکاح نہیں کرتے کہ خدا سے محبت کم ہو جائے گی یہ کچ پیندیے ہیں یعنی کم ہمت ہیں۔ اُن کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت اتنی کچی ہے جو نکاح سے زائل ہو جائے گی، بعض لوگ کہتے ہیں کہ بیٹے کو یاد کر کے بے چینی ہوتی ہے اور خدا کو یاد کر کے بے چینی نہیں ہوتی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت بیٹے کی محبت سے زیادہ نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ بیٹا تو دور ہے کیا خدا تعالیٰ دور ہیں جو پریشانی اور بے چینی ہو۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ہم بندہ کی شہ رگ سے زیادہ اس کے قریب ہیں ۱۲ص)

ہاں کبھی قرب کی بے چینی ہوا کرتی ہے۔ حضرت ابو المعالی نے ہفت گریہ میں لکھا ہے کہ ہم اپنے شیخ کی مجلس میں تھے اور رو رہے تھے ایک منکر آیا اور کہا کہ یہ سب کے سب دولتِ قرب سے محروم ہیں، میں نے جوش میں آ کر ہفت گریہ کتاب لکھی اور اُس میں یہ دو شعر حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ کے لکھے، حافظ صاحب بڑے عارف اور اُن کا کلام نہایت لطیف اور با اثر ہے۔

---

[1] لم أجد الحديث في موسوعة اطراف الحديث النبوي الشريف

ایک صاحب حافظ شیرازیؒ کی بابت مجھ سے بہت لڑے کہ ان کو اچھا کیوں کہتے ہو۔ میں نے کہا اُن کے کلام میں بڑے بڑے علم موجود ہیں، کہنے لگے کہ یہ سب حسنِ ظن ہے، جس سے اُن کے کلام کو علوم محمودہ پر منطبق کرلیا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ ایسے علوم دوسرے شعراء کے کلام میں نکال دیجئے اور منطبق کردیجئے، غرض وہ شعر یہ تھے ۔

بلبلے برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت　　　واندراں برگ ونوا خوش نغمہائے زار داشت

(جب اس سے پوچھا کہ عین وصل میں یہ رونا جھینکنا کیوں ہے؟ تو اس نے جواب دیا جلوۂ معشوق ہی تو مجھ کو اس کام میں رکھتا ہے۔ یعنی یہی وصل نالہ وزاری کا سبب ہورہا ہے۔ اس میں اس کا بیان کہ عاشق کا گریہ ہمیشہ اس کے فراق وحرماں کی دلیل نہیں ہے۔۱۲ص)

حقیقت میں عشاق کا حال ہی جدا ہوتا ہے۔ مجھے یاد آئی۔ حضرت ابیؓ ابن کعب کی حکایت کہ بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا کہ اے اُبی مجھے خدا تعالیٰ کا حکم ہے کہ تم کو قرآن سناؤں، حضرت ابیؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا حق تعالیٰ نے میرا نام لے کر فرمایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اُبی بن کعبؓ رونے لگے۔

مولانا محمد یعقوب کے سامنے ایک طالب علم نے کہا کہ کیوں روئے خوش ہونا چاہئے تھا فرمایا گؤدنؒ تو کیا جانے واقعی جس پر گزرتی ہے وہی خوب سمجھتا ہے تو رونا کبھی کمالِ قرب میں بھی ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجد اسی قسم کا ہوا کرتا تھا۔ پس جس طرح انواع وجد مختلف ہیں اسی طرح انواع محبت کے بھی۔ مگر یہ امر سب محبان حق میں مشترک ہے کہ غیر حق کی محبت ان کے دل میں حق سے زیادہ نہیں ہوتی۔

تعلق مضر

اور تعلق مضر وہی ہے جو خدا تعالیٰ کی محبت سے بڑھ جائے اور ہمیشہ کلفت تعلق مع غیر اللہ سے پہنچتی ہے کبھی تو عین وصل میں پریشانی ہوتی ہے اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ غیر اللہ سے محبت ہے کبھی اس لئے پریشانی ہوتی ہے کہ کسی سے خوف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ بھی نسبت مع غیر اللہ ہے　کیونکہ اگر اس پر نظر نہ ہوتی تو کچھ بھی اندیشہ نہ تھا۔ اسی طرح اگر کسی سے رنج ہوتا ہے تو اس لئے کہ اس سے کسی قسم کی توقع ہوتی ہے تو چونکہ غیر اللہ کے ساتھ تعلق رجاء (امید ۱۲ص) منفعت تھا۔ اور وہ منفعت فوت ہوئی اس لئے رنج پہنچایا کبھی اس لئے تکلیف ہوتی ہے کہ اُس سے بجائے منفعت کے مضرت پہنچی ہو۔ کبھی اس لئے رنج ہوتا ہے کہ کسی نے ہماری عزت نہ کی، اس کی وجہ بھی یہی ہے۔

غرض جہاں کہیں بھی کلفت ہوتی ہے اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ غیر اللہ پر نظر ہے خواہ اس کی طرف سے اصابت مکروہ (مکروہ بات کا پہنچنا ۱۲ص) کی ہو یا فوت نفع کی۔ پس جب اس سے قطع نظر کرلے گا تو کچھ بھی کلفت نہ ہوگی۔ کبھی مرض میں تکلیف کے ساتھ پریشانی ہوتی ہے۔ مثلاً یہ سنا کہ جلدی اچھے ہوجائیں گے۔ اور دیر لگ گئی تو سخت بے چینی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اپنی زندگی کے ساتھ محبت ہے غرض کہاں تک مثالیں دوں۔ جب کبھی آپ کو کوئی کلفت پہنچے تو دیکھ لیا کیجئے کہ یہ تکلیف کیوں ہوئی۔ ضرور اس کا یہی سبب نکلے گا کہ غیر اللہ پر نظر تھی۔ اسی طرح جب غصہ آئے گا تو غیر اللہ پر نظر ہونے کی وجہ سے اور اپنے نفس پر جو غصہ آتا ہے تو اس کا یہ سبب ہوتا ہے کہ توقع ہوتی ہے کہ یوں کرے اور جب اس طرح نہیں کرتا تو غصہ آتا ہے۔ اس میں بھی غیر اللہ پر نظر ہے۔ یعنی اپنے نفس پر اور غیر اللہ سے تکلیف پہنچنے میں تو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ نسبت مع الغیر (غیر کے ساتھ ۱۲ص) ایسی ہے کہ اس سے اگر خوشی بھی پہنچے۔ بعض اوقات اُس خوشی میں بھی تکلیف ہوتی ہے کہ نہ زبان قابو میں رہتی ہے نہ افعال، حتی کہ بعض لوگ مرجاتے ہیں۔ واقعی دنیا کی خوشی میں بھی رنج ہے۔ مگر یہ تو سب کو پیش آتا ہے کہ جب بہت ہنستے ہیں تو اس کے بعد دل میں کسی قدر کبیدگی ہوتی ہے اور عوام کی زبان پر بھی یہ مسئلہ مشہور ہے کہ آج بہت ہنسے ہیں خدا خیر کرے۔ ہر کام میں اعتدال ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ بے اعتدالی سے ہمیشہ تکلیف ہوتی ہے۔

دوسرے ہنسنے میں اس لئے بھی رنج ہوتا ہے۔ کہ ہنسنا کسی سبب کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ اور وہ سبب دائم ہے نہیں سو جب وہ سبب جاتا رہتا ہے تو رنج بھی پہنچتا ہے۔

تیسرے زیادہ ہنسنا غفلت اور بے فکری سے ہوتا ہے اور غفلت کا موجب کدورت ہونا ظاہر ہے اور یہیں سے راز معلوم ہوگیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت تبسم کا کہ جب آپ ہنستے تھے تو نواجذ (کچلیاں ۱۲) کبھی نظر نہیں آئے یعنی آپ کبھی منہ کھول کر نہ ہنستے تھے۔ آپ کا انتہائی ضحک (ہنسنا ۱۲ص) تبسم (مسکرانا ۱۲ص) تھا تو یہ بات غور کرنے کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیوں ضحک کم فرماتے تھے یوں اللہ اعلم جو کچھ بھی وجہ ہو مگر تجربہ یہ ہے کہ جس کو کوئی فکر ہوا کرتی ہے اس کو قہقہہ نہیں ہوتا۔ البتہ تبسم ہوسکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں ہے۔

كان دائم الاحزان متواصل الافكار (لم أجد الحديث بهذه الالفاظ في موسوعة اطراف الحديث النبوي الشريف)

کہ آپ ہمیشہ غمگین رہتے ہیں۔ مگر بوجہ لطافت طبع کے کبھی تبسم یا ضحک قلیل فرمادیا کرتے تھے کیونکہ کوئی کیفیت آپ پر ایسی غالب نہ ہوتی تھی کہ دوسرے مؤثرات کا اثر ظاہر نہ ہوسکے۔

یہ نہایت سلامت مزاج کی دلیل ہے۔ کہ بھوک کے وقت بھوک لگے اور پیاس کے وقت پیاس۔

افعال میں اعتدال

آج کل بعض لوگ پیروں کی تعریف کیا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ اناج نہیں کھاتے یہ کچھ کمال نہیں۔ تعریف یہ ہے کہ سب کچھ کھاوے مگر حلال روزی کھاوے اور اعتدال سے کھاوے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کھانے میں سب کے ساتھ بیٹھتے اور سب کے ساتھ اٹھتے مگر کم کھاتے تھے اور کوئی ہدیہ لاتا تو حاضرین سے فرمایا کرتے کہ کھاؤ یہ خدا کے واسطہ سے آئی ہے اس میں واسطہ کی وجہ سے نور ہے۔

میں کیا بتلاؤں مجھے ایک مرتبہ ایک بزرگ نے ایک چوغہ بھیجا۔ میں نے جب اس کو پہنا تو دو تین دفعہ کے پہننے سے یہ تجربہ ہوا کہ جب اس کو پہنتا ہوں گناہ کا وسوسہ نہیں ہوتا۔ اب حضرت کے قول کی پوری طرح تصدیق ہوگئی کہ خدا تعالیٰ کے علاقہ سے جو چیز آتی ہے اس میں نور ہوتا ہے۔ خیر حضرت تو صاحب کشف تھے مگر کشفی ہم کو بھی ہوگئی اور اس میں کشف کی بھی کیا بات ہے۔ یہ تو نورِ ایمانی ہے جو ہر مسلمان میں ہونا چاہئے۔ تو ہمارے حضرت خود بھی طیبات کھاتے تھے اور دوسروں کو بھی امر فرمایا کرتے تھے کہ نفس کو بہت مت ستاؤ کہ کھانے پینے میں کمی کردو بلکہ اس کو خوش رکھو۔

کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

مزدور کا دل خوش ہو تو زیادہ کام کرتا ہے

خوب کھاؤ اور خوب کام کرو۔ حضرت کا تو یہ معمول تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی حالت تھی مگر آپ باوجودیکہ ہر وقت فکر آخرت میں مصروف رہتے تھے۔ مگر یہ کیفیت اتنی غالب نہ تھی جو کھانے اور پینے اور ہنسنے بولنے سے بھی روک دے۔ اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے حق میں بھلائی کی ورنہ ہم تو مر جاتے اور وہی حال ہوتا جو حضرت یحییٰ علیہ السلام کا تھا کہ مارے خوف کے روتے روتے آپ کے رخسار مبارک کا گوشت تک گل گیا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہ السلام میں مناظرہ ہوا وہ رونے کو افضل فرماتے تھے اور عیسیٰ علیہ السلام ہنسنے کو افضل فرماتے تھے۔ حق تعالیٰ نے ایک فرشتہ کے ہاتھ پر یہ فیصلہ کہلا کر بھیجا کہ اے عیسیٰ تم جلوت میں تو ایسے رہو جیسے اب ہو اور خلوت میں یحییٰ کی طرح رہو۔ اے یحییٰ تم خلوت میں تو ایسے رہو جیسے اب ہو اور جلوت میں عیسیٰ کی طرح رہو۔ ورنہ میرے بندے دل شکستہ اور مایوس ہو جائیں گے۔ تو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر کبھی نہ ہنستے تو ہماری

حالت مایوسانہ ہو جاتی۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بڑا کمال تھا کہ باوجود سب سے زیادہ خدا کا خوف دل میں ہونے کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوف پر ایسے غالب تھے کہ تبسم بھی فرماتے نیز باوجود سب سے زیادہ مورد رحمتِ الٰہی ہونے کے اُس سے آپ ایسے مغلوب نہ تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بُکاء (رونا ۱۲ص) طاری نہ ہو۔ غرض کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فعل میں غور کیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر کام معتدل اور بقدر ضرورت تھا۔

اور یہاں سے ایک غلطی ہماری معلوم ہوگئی اور وہ یہ کہ ہمارے اندر بعض افعال طبعی ہیں۔ ہم نے اُن کے جواز پر احادیث سے استدلال کر رکھا ہے۔ مثلاً ہمارے اندر غصہ موجود ہے۔ اس کے جواز پر یہ سند پیش کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی غصہ کیا ہے یہ استدلال غلط ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں غصہ فرمایا وہاں ضرورت پر اکتفا کیا ہے اور ہم لوگ حد سے بھی متجاوز ہوتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ فرمانا ہمارے اس غصہ کے لئے کب سند جواز بن سکتا ہے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کو سند میں پیش کرنا اُسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب ہمارے افعال بھی حد اعتدال سے باہر نہ ہوں۔ ورنہ ایک شخص کا فعل معتدل دوسرے کے فعل غیر معتدل کے لئے کس طرح سند جواز بن سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فعل بقدر ضرورت تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھلا دیا کہ تمام قوتوں کا حق اس طرح سے پورا ہو سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بہت بڑا کمال تھا کہ آپؐ نے سب بشری قوتوں سے کام لیا اور پھر عبادت الٰہی کا حق بوجہ اکمل ادا کیا۔ اور کسی قوت انسانی کو بیکار کر کے اگر عبادت کی گئی تو یہ کوئی بڑا کمال نہیں۔ اگر دوسرے کی وہ حالت ہوئی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی تو وہ حال ہوتا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما رہے ہیں کہ قسم اس ذات کی کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تم کو وہ بات معلوم ہو جو مجھے معلوم ہے تو تم ہنستے کم اور روتے زیادہ۔ اور بیبیوں کے ساتھ بستر پر لذت حاصل نہ کر سکتے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا حوصلہ ہے کہ قلب پر آرہ چل رہا ہے۔ مگر ہمارے لئے ہنس رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہنسنا ایسا ہی تھا جیسے کسی کی بیوی مر جائے مگر وہ بچوں کے سامنے غمگین ہونے کے خوف سے ہنستا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب چیزیں استعمال فرمائیں۔ میوے بھی کھائے، مٹھائی بھی کھائی۔ غلہ اور اناج بھی نوش فرمایا۔ اور لباس بھی پہنا، عمدہ بھی اور ادنیٰ بھی۔ مگر ہر چیز میں اختصار ملحوظ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت بھی کی اور عداوت بھی، مگر ہر ایک میں اعتدال مدنظر تھا اور یہی دوسروں کو بھی تعلیم فرمایا کہ

---

۱ الصحیح للبخاری 144:6، الصحیح لابن خزیمہ: 2244، کنز العمال: 5249

۲ کنز العمال: 2353، اتحاف السادۃ المتقین 116:5

اَحْبِبْ حَبِيْبَکَ هَوْنًا (اپنے دوست سے تھوڑی ہی محبت کرو)

(فتح الباری 11:95، جمع الجوامع:5208، الدر المنثور 5:356)

اس کو دین کے اعتبار سے دیکھئے یا تمدن کے اعتبار سے ہر پہلو سے ایک عجیب بات کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی۔ دین کے لحاظ سے تو ظاہر ہے کہ اگر غیر کی محبت زیادہ ہوگی تو خدا تعالیٰ کی بہت کم ہوگی اور مرتے وقت بہت حسرت وارمان لے کر جائے گا۔ مگر دنیا کے اعتبار سے بھی اس میں خوبی یہ ہے کہ کسی سے بہت حد سے زیادہ میل جول نہ کیا جاوے۔ کیونکہ زمانہ پلٹتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ممکن ہے کہ یہ دوست کسی وقت دشمن ہو جائے تو چونکہ یہ گھر کا بھیدی ہے اس لئے بہت دق کرے گا۔ اسی طرح عداوت بھی کسی سے اگر کرو تو ہلکی کرو حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ کیونکہ ممکن ہے کہ یہ شخص کسی وقت تمہارا دوست ہو جائے تو اس سے حجاب نہ ہوگا۔ اور بہت سے فوائد ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ایسی عجیب تھی کہ افلاطون اور ارسطو کے ملفوظات میں بھی کہیں اُس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ ایسے ہی عمارت میں بھی آپؐ نے اختصار کا حکم فرمایا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ عنداللہ تمہاری عمر تھوڑی باقی ہو اور تم اس کو تمام نہ کر سکو تو حسرت وارمان دل میں باقی رہے گا۔

ایک مرتبہ آپ[1] صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا رہے تھے راستہ میں ایک مکان نظر پڑا جو قبہ دار یعنی ڈاٹ کی چوڑائی کا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ مکان کس کا ہے لوگوں نے بتلایا کہ فلاں صحابیؓ کا ہے۔ غور کیجئے کہ یہ وقت تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غصہ ہونے کا۔ کیونکہ دریافت ہی اسی لئے فرمایا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ مکان ناگوار معلوم ہوا تھا مگر اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں فرمایا: بلکہ صحابیؓ کہتے ہیں۔

حملها فی قلبه (لم أجد الحدیث فی موسوعة اطراف الحدیث النبوی الشریف)

کہ اس قصہ کو دل میں اٹھا رکھا زبان سے کچھ نہ فرمایا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لا کر مجلس میں رونق افروز ہوئے تو وہ صحابیؓ آئے اور سلام کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہ دیا۔ ان کی جان نکل گئی۔ لوگوں سے پوچھا لوگوں نے کہا پختہ طور سے تو معلوم نہیں۔ مگر تمہارا مکان دیکھ کر پوچھا تو تھا کس کا ہے۔ شاید اس سے ناخوش ہوئے ہوں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ ان کو معلوم ہوا تو آ کر مکان کو جڑ سے اکھاڑ دیا اور پھر آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع بھی نہیں کی۔ اتفاق سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پھر اس طرف سے گزر ہوا جب وہ مکان نظر نہ آیا تو دریافت فرمایا کہ وہ مکان کیا ہوا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ مالک مکان نے یہ سُن کر حضور

---

[1] سنن الترمذی :3373، اتحاف السادة المتقین 5:30، مشکوٰۃ:2238

صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگواری ہوئی سارا مکان گرا دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غصہ کی یہ حالت تھی یہ نہیں کہ مار دھاڑ کریں۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے۔ کیونکہ آپ سلطان وقت بھی تھی اور صحابہ آپ کے ایسے جاں نثار تھے کہ سلاطین کو ایسے خدام قیامت تک بھی میسر نہیں آسکتے تو اس کی یہی وجہ تھی کہ غیر اللہ کے ساتھ حضور کے قلب کو زیادہ تعلق نہ تھا جس سے زیادہ تعلق ہوتا ہے اس کے ہر کام کا اثر دل پر زیادہ ہوتا ہے، جیسے آج کل لوگوں کی حالت ہے کہ جس سے دوستی ہے تو بے انتہا ہے اور بغض ہے تو حد سے زیادہ۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ ہمارے قلوب کو غیر اللہ سے بہت تعلق ہے اس کے ہر فعل کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے افعال کے ذریعہ سے بتلا دیا کہ تعلق غیر اللہ کے ساتھ بہت زیادہ نہیں ہونا چاہئے، نہ کسی خوفناک چیز سے زیادہ ڈرو، نہ کسی مرغوب چیز پر بہت فریفتہ ہو۔ بلکہ اتنا علاقہ رکھو جتنا کہ فطرت سلیمہ کا مقتضاء ہے۔

انسان کی احتیاج

وہ یہ ہے کہ انسان فطرۃ سے مدنی الطبع ہے۔ یعنی اجتماع کا محتاج ہے، تنہا سارا کام نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے اس کو اپنی ضروریات کے پورا کرنے میں غیر کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ نوع انسان میں ہر ایک محتاج ومحتاج الیہ ہے پھر ساری نوع انسان کو حیوانات ونباتات کی احتیاج ہے اور ان سب کو جمادات کی احتیاج ہے اس بیان سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ سب سے زیادہ احتیاج انسان کو ہے کیونکہ دیگر حیوانات صرف نباتات و جمادات کے محتاج ہیں۔ اور نباتات صرف جمادات کے محتاج ہیں اور انسان تینوں کا محتاج ہے اور انسان کا سب سے اخیر میں پیدا ہونا یہ خود دلیل ہے اس بات کی کہ یہ سارا سامان اسی کی غرض سے ہے اور یہ سب اسی کی ضروریات ہیں کیونکہ جب کوئی معزز مہمان آنے والا ہوتا ہے تو اُس کی ساری ضروریات کا سامان پہلے سے ہوا کرتا ہے تاکہ اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ تو عالم میں جتنی چیزیں ہیں سب انسان کی کارآمد ہیں۔ کتا حفاظت کے لئے۔ گھوڑے گدھے سواری اور بوجھ لادنے کے لئے۔ ان سب چیزوں کا انسان سے پہلے پیدا ہونا اس کی دلیل ہے کہ اس کو ان کی ضرورت ہے۔ سانپ بچھو اگر نہ ہوتے تو بہت سی دوائیں تیار نہ ہوسکتیں۔ نیز ان حشرات الارض میں اور بہت سے منافع ہیں۔ جن میں سے ایک ہماری فرعونیت کا علاج بھی ہے کہ وہ انسان جو ہاتھی اور شیر تک پر قبضہ کر لیتا ہے۔ ذرا سے حقیر جانور سے عاجز ہے۔ غرض اور جتنی چیزیں ظاہر میں ہم کو بیکار معلوم ہوتی ہیں۔ حقیقت میں اُن سے کوئی منفعت ضرور ہے۔ اگرچہ کسی خاص فرد کو نہ ہو۔

مثلاً چوروں کے وجود سے قفل والوں کولوہاروں کوکتنا بڑا نفع ہے۔اُن سے جا کر پوچھو۔تو یہ عالم ایک باغ ہے جس میں زینت وآزمائش کے لئے جہاں جہاں عمدہ عمدہ پھول لگائے گئے ہیں وہاں حفاظت کے لئے جھاڑ کانٹے بھی لگائے گئے ہیں تو انسان چونکہ دنیا کی ہر چیز کا محتاج ہے۔ اس احتیاج کی وجہ سے اس کے دل میں دوسری چیزوں کا تعلق پیدا کیا گیا اوراس کی اجازت دی گئی کیونکہ بدوں قدرے تعلق کے نفع وانتفاع متصور نہیں ہوسکتا۔کیونکہ نوع انسان جو آپس میں ایک دوسرے کے محتاج ومحتاج الیہ ہیں وہ احتیاج صرف دوعلاقوں میں منحصر ہے ایک انتفاع یعنی دوسرے سے فائدہ مند ہونا۔دوسرا نفع یعنی دوسرے کو فائدہ پہنچانا۔دُنیا کا کوئی علاقہ ان دونوں سے خالی نہ ہوگا۔اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جولوگ خود مطلب ہیں کہ دوسروں سے نفع حاصل کرنا ہی جانتے ہیں۔دوسروں کو نفع پہنچاتے نہیں وہ نہایت بھدے ہیں بڑے ظلم کی بات ہے کہ اوروں پر تو آپ کا حق ہو اور دوسروں کا آپ کے اوپر کوئی حق نہ ہو تو تعلق مع غیر اللہ کا مبنیٰ یہ ہے کہ انسان میں احتیاج ہے اور احتیاج الی العبد (بندہ کی طرف احتیاج ۱۲ص) اصل مقتضی کے خلاف ہے تو یہ تعلق عارض کی وجہ سے ہوا اور یہ قاعدہ مسلم ہے کہ

الضروری یتقدّر بقدر الضرورۃ: (ضروری بقدرِ ضرورت ضروری ہوتا ہے ۱۲ص) تو ہر چیز سے اتنا علاقہ ہونا چاہئے کہ نفع انتفاع کے لئے کافی ہو یعنی دوسروں کو نفع پہنچا سکو اوردوسروں سے نفع حاصل کرسکو۔اس کے علاوہ جتنی زیادتی ہوگی وہ جائز نہیں ہوسکتی۔اس سے زیادہ تعلق خدا تعالیٰ کے ساتھ ہونا چاہئے۔

افراطِ شفقت

البتہ اگر کسی تعلق غیر کو تعلق مع اللہ میں دخل ہو۔جیسے شیخ کے ساتھ محبت وادب اور شیخ کا مرید پر شفقت کرنا اس میں مبالغہ کرنے میں مضائقہ نہیں مگر افراط اس میں بھی نہ چاہئے بعض شیوخ ایسی شفقت کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ! یوں چاہتے ہیں کہ سارا عالم خدا تعالیٰ کی یاد میں لگ جائے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ اس کے درپے ہونے سے روکتے ہیں۔

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِھِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا

کہ معلوم ہوتا ہے آپ ان لوگوں کے پیچھے اگر یہ ایمان نہ لائیں۔غم کے مارے جان دے دیں گے۔ان کم بختوں کو چھوڑیئے بھی آپ کا کام تو ابلاغ (پہنچانا ۱۲ص) ہے آپ سب کے وکیل نہیں ہیں۔

اِنَّمَا اَنْتَ نَذِيْرٌ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو صرف ڈرانے والے ہیں۔

وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ خدا تعالیٰ ہر چیز کا نگہبان ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں

فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ آپ نصیحت کیجئے۔ آپ صرف سمجھانے والے ہیں۔ اُن پر مسلط نہیں ہیں کہ بالکل پاک صاف کر دینا آپ کے ذمہ کیا گیا ہو۔ جیسا کہ دھوبی کو کپڑے دھونے کے لئے دیئے جاتے ہیں تو یہ شرط ہوتی ہے کہ بالکل سفید کر کے لا دے۔ ذرا بھی دھبہ رہے گا تو باز پرس ہوگی یہ بات نہیں۔ کہ آپ کام کام صرف سمجھا دینا ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ

کہ کوئی نفس بغیر ہمارے اذن و اجازت کے کبھی ایمان نہیں لا سکتا پھر آپ اتنی فکر کس لئے کرتے ہیں غرض باوجود یہ کہ یہ تمام تر شفقت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے ساتھ تھی صرف اس لئے تھی کہ یہ مخلوق خدا ہیں اس کی مصنوعات ہیں اور یہ محبت عین محبت خداوندی ہے مگر اس میں بھی افراط سے منع فرمایا ہے۔ ایک مرتبہ معجزات کی بابت آپ کا جی چاہا کہ جو یہ چاہتے ہیں وہی ہو جائے تو اچھا ہو کہ ان پر حجت بالکل تام ہو جائے اس پر حق تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے۔

وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ الاية۔

کہ اگر آپ پر ان کا اعراض گراں ہو گیا ہے اور آپ کا یہی جی چاہتا ہے کہ یہ جو مانگیں وہی بات ہو جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر طاقت ہو تو زمین میں سرنگ لگا کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر کوئی معجزہ لے آیئے یعنی ہم تو بھیجتے نہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدرت میں ہے نہیں تو پھر آپ کیوں فکر میں پڑے ہیں۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ.

یعنی اگر خدا تعالیٰ کی مشیت ہوتی تو ان سب کو ہدایت پر جمع فرما دیتا۔ سو آپ نادانوں کی سی باتیں نہ کیجئے۔

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ

کہ حق بات وہی لوگ قبول کرتے ہیں جن کے کان ہیں اور جن کے دل مردہ ہیں ان کو تو خدا تعالیٰ قیامت میں اٹھاویں گے پھر خدا تعالیٰ کے پاس ان کا فیصلہ ہوگا وہ خود سب کو سمجھ لیں

گے۔ اس مضمون کو سنتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ واقعی یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے ورنہ اور کون ایسا ہو سکتا ہے اگر معاذ اللہ! یہ کلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوتا تو فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ (سو آپ نادانوں کی سی باتیں نہ کیجئے ۱۲ص) وغیرہ ایسے کلمات ہرگز اپنے واسطے تصنیف نہ کرتے تو بعض شیوخ کو شفقت میں بعض اوقات افراط ہو جاتا ہے۔ حق تعالیٰ نے اس افراط سے روک دیا ہے۔

اور ایسا اب بھی ہوتا ہے کہ شیخ یوں چاہا کرتا ہے کہ سب ایسے ہی ہو جائیں جیسا کہ میرا جی چاہتا ہے۔ اس سے جو حق تعالیٰ نے منع فرما دیا ہے تو میرے خیال میں اس میں بھی یہی راز ہے کہ اتنی غایت شفقت میں بھی غیر اللہ سے گونہ تعلق ہو جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ شیخ مرید سے شفقت ہی نہ کرے کیونکہ اگر شفقت نہ ہوگی تو مرید کو ہرگز نفع نہ ہوگا۔ مگر نفع میں نفس شفقت کو تو دخل ہے۔ شفقت مفرط کو دخل نہیں اگر بے پروائی برتی جائے تو ہرگز نفع نہ ہوگا

بے عنایات حق و خاصانِ حق　　گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

کہ خدا تعالیٰ اور اللہ والوں کی عنایت اگر نہ ہو تو اگر انسان فرشتہ کے برابر بھی ہو تب بھی اُس کا دفتر سیاہ رہے گا۔ غرض افراط موقوف علیہ نفع کا نہیں اس لئے اس کی کچھ ضرورت نہیں بلکہ میں اور ترقی کر کے کہتا ہوں کہ وہ مفضی الی الضرر (ضرر کی طرف پہنچانے والی ۱۲ص) یعنی افراط شفقت بعض دفعہ ضرر کا سبب ہو جاتا ہے۔ نفع تو رہا در کنار۔

ایذاء مشائخ بلا قصد

تجربہ سے یہ بات معلوم ہے کہ جیسے شفقت سے نفع ہوتا ہے۔ غصہ سے ضرر ہوتا ہے اور غایت شفقت میں غصہ زیادہ آیا کرتا ہے یہ آزمائی ہوئی بات ہے کہ جس سے شفقت کم ہوتی ہے اس کی حرکات سے غصہ کم آتا ہے اور جس پر زیادہ شفقت ہوتی ہے اس کی مخالف حرکات پر غصہ بھی بہت ہوتا ہے اور اس سے بجائے نفع کے الٹا ضرر ہوتا ہے مگر یہ اس صورت میں ہے جب کہ ایسی حرکات قصداً ہوں مگر بلا قصد میں بھی کچھ نہ کچھ چرکہ لگ ہی جاتا ہے۔ کیونکہ بلا قصد جو ایسی حرکات ہوں گی وہ لاپرواہی سے ہوں گی اور لاپرواہی اختیاری فعل ہے۔

حضرت مرزا مظہر جانجاں رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بادشاہ وقت زیارت کے لئے آیا۔ آپ بہت نازک مزاج تھے کہ بادشاہ بھی ایسے نازک مزاج نہیں ہو سکتے۔ اتفاق سے بادشاہ کو پیاس لگی تو وہاں کوئی خادم تو تھا نہیں۔ خود ہی اٹھ کر پانی پیا۔ پانی پی کر پیالہ گھڑے پر ذرا ٹیڑھا رکھا گیا۔ مرزا صاحب کی نظر جو ٹیڑھے رکھے ہوئے پیالے پر پڑی فوراً سر میں درد ہو گیا۔ مگر تحمل

سے ضبط فرما گئے۔ بادشاہ کی جو کم بختی آئی آپ یہ حال دیکھ کر کہ یہاں پانی پلانے والا بھی کوئی نہیں۔ مرزا صاحب سے کہنے لگے کہ حضرت آپ کے لئے کوئی آدمی بھیج دوں جو آپ کی خدمت انجام دے۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ پہلے آپ خود تو آدمی بن جایئے کہ پانی پینے کی بھی تمیز نہ آئی۔ جب سے آپ نے پیالہ ٹیڑھا رکھا ہے۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ جب آپ کا یہ حال ہے جو بادشاہت کرتے ہیں تو آپ کے خادم تو نہ معلوم کیا نور برساویں گے۔ غرض اس قصہ سے یہ تھی کہ مرزا صاحب چونکہ نازک مزاج بہت تھے اس لئے لوگوں سے کم ملتے تھے۔ کیونکہ لوگوں میں سلیقہ کم ہوتا ہے اور بدنظمی سے مرزا صاحب کو تکلیف ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ لوگوں سے کیوں نہیں ملتے لوگ فیض سے محروم رہتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ لوگ بے تمیز ہیں۔ اُن کی بے تمیزی سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ پھر ان پر اُس کا وبال پڑتا ہے۔ میں نے حق تعالیٰ سے بہت کچھ درخواست کی کہ لوگوں پر اس وجہ سے وبال نہ پڑے۔ مگر منظور نہیں ہوئی۔ اس لئے میں نے بوجہ شفقت کے امت کے حال پر خود ہی ملنا کم کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بلا قصد ایذاء مشائخ سے بھی وبال پڑتا ہے۔

ایک بزرگ کی حکایت میں نے خود اپنے اُستاد سے سُنی کہ وہ چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک شخص نے آپ کی شان میں گستاخی کا کلمہ کہا تو آپ نے خادم سے فرمایا کہ اس کے تھپڑ مار۔ خادم ذرا رکا۔ وہ شخص فوراً گرا اور مر گیا۔ کیونکہ خود بدلہ لے لیتے تو حق تعالیٰ کی طرف سے بدلہ نہ لیا جاتا۔ یہ مضمون حدیث میں بھی ہے کہ حضرت[1] عائشہؓ کی کوئی چیز چوری ہوگئی وہ بد دعا دینے لگیں۔ آپؐ نے فرمایا اے عائشہؓ چور کی سزا کیوں کم کرتی ہو۔ نیز دوسری حدیث میں اس کی دلیل مذکور ہے کہ مرض وفات میں لوگوں نے آپؐ کے دہن مبارک میں دوا ڈالنی چاہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار فرمایا۔ لوگوں نے کہا۔ یہ ویسا ہی انکار ہے جیسے مریض دوا سے کیا کرتا ہے۔ دوا ڈالنی چاہئے چنانچہ زبردستی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دہان مبارک میں دوا ڈال دی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غشی سے افاقہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر شخص کے منہ میں پچھاڑ کر دوا ڈالو اس میں بھی حکمت تھی کہ من اللہ (اللہ کی جانب سے ۱۲ص) ان پر عتاب نہ ہو۔ ایک بزرگ نے اپنے مُرید کو یہ نصیحت کی کہ جب کسی سے تم کو کلفت پہنچے تو نہ تو بدلہ لیا کرو اور نہ صبر کیا کرو۔ بلکہ کچھ کھا لیا کرو۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوگیا کہ ایذاء شیوخ بلا قصد بھی وبال سے خالی نہیں

---

[1] اتحاف السادة المتقین 251:10

ہوتی۔ اس لئے افراط فی الشفقت (شفقت میں زیادتی کرنا ۱۲ص) مضر ہے کیونکہ جتنی شفقت ہوگی اتنی ہی اُس کی بے تمیزیوں سے ایذاء زیادہ ہوگی اور بات بات میں رنج ہوگی۔

غلو بیعت

اب میں[1] اس پر ایک دوسرے مسئلہ کی تفریع کرتا ہوں جو چندروز سے میں نے تجویز کیا ہے جس میں مجبور ہوں۔ مگر لوگ میری معذوری کو اب تک نہیں سمجھے۔ اس بیان سے لوگوں کو یہ تو معلوم ہوگیا ہوگا کہ افراط فی الشفقت (شفقت میں زیادتی کرنا ۱۲ص) مضر ہے اور یہ مقدمہ پہلے سے معلوم ہے۔ مقدمہ المکرّوہ مکروہٌ ومقدمۃ الواجب واجبٌ کہ جو چیز کسی بُری شے کا سبب ہے وہ بھی بُری ہے اور جو ضروری شئے کا ذریعہ ہو وہ ضروری ہے تو چونکہ معلوم ہو چکا ہے کہ افراط فی الشفقت مضر ہے اور مکروہ ہے اس لئے جو چیز افراط فی الشفقت کا سبب بنے وہ بھی واجب الترک ہوگی تو مجھے بیعت کرنے سے افراط فی الشفقت ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں نے بیعت کرنا چھوڑ دیا ہے گو اس میں ایک فتوئی کی بات بھی ہے کہ بیعت کی جو اصل تھی آج کل اُس سے تجاوز ہوگیا ہے۔ بیعت کا خلاصہ ہے معاہدہ مرید براتباع (مرید کا معاہدہ اتباع پر ہوتا ہے۔ ۱۲ص) ومعاہدہ شیخ برشفقت و اصلاح (شیخ کا معاہدہ اصلاح وشفقت پر ہوتا ہے۔ ۱۲ص) اب لوگوں نے اپنی حد سے ایسا بڑھایا ہے کہ جس سے عقیدہ اور عمد میں تغیر پیدا ہوگیا ہے۔

عقیدہ میں تو یہ کہ جب تک ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت نہ کیا جائے صرف زبانی معاہدہ کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ ہم تم کو تعلیم دیں گے اور ہر طرح تمہاری اصلاح کی تدبیر کریں گے مگر وہ کبھی راضی نہیں ہوتا۔ گویا بزرگی کوئی برق ہے کہ جب تک پیر کے ہاتھ سے ہاتھ نہ ملایا جائے وہ برق نہیں دوڑتی۔

اگر یہی بات ہے تو لازم آتا ہے کہ ہمارا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے کیونکہ ایک زمانہ میں بزرگوں نے اس طریقہ سے بیعت کرنے کو ترک کر دیا تھا اس لئے کہ اس زمانہ میں بادشاہ رعایا سے اطاعت کی بیعت لیا کرتے تھے۔ تو اگر کسی دوسرے کو بیعت کرتے ہوئے دیکھا جاتا اس پر بغاوت کا گمان کیا جاتا تھا کہ یہ بھی طالب سلطنت ہے تو بزرگوں نے اس خوف سے کہ کوئی بادشاہ سے چغلی نہ کھا دیوے اس

---

[1] (تنبیہ اول) شیخ سے محبت جتنی چاہے ہو مضر نہیں بلکہ مفید ہے البتہ تعظیم میں اب افراط ہے پس تعظیم و اطاعت تو قواعد شرعیہ کے موافق ہو اور محبت خواہ کسی قدر ہو۔ (تنبیہ دوم) اس طرز میں ایک نفع یہ بھی ہے کہ طرز متعارف میں چونکہ تھوڑی سی مخالفت سے ناگواری زیادہ ہوتی ہے۔ اور اس میں تھوڑی سی موافقت غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا اس طرز میں زیادہ نفع ہوگا فقط ۱۲ منہ)

طریقہ بیعت کو ترک کر دیا تھا صرف زبانی معاہدہ پر اکتفا کرتے تھے۔ اور تعلیم فرمایا کرتے تھے تو بتلایئے اگر بدوں اس خاص طریقہ کے بیعت نہیں ہو سکتی تو آپ کا سارا سلسلہ نسبت ہی منقطع ہوا جاتا ہے اور اگر ہو سکتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ اُس سے انکار کیا جاتا ہے اور زبانی معاہدہ اور تعلیم کو نا کافی خیال کیا جاتا ہے جو چیز موقوف علیہ نہ ہو اس کو موقوف علیہ سمجھنا یہ غلو فی العقیدہ (عقیدہ میں غلو ۱۲ اص) ہے یا نہیں ضرور ہے اور اس کی اصلاح ہونی چاہئے اس کے دو طریقے ہیں ایک یہ ہے کہ اُس طریقہ کو اسی ہیئت سے جاری رکھا جائے اور زبان سے سمجھا دیا جائے کہ یہ ہاتھ میں ہاتھ دینا صرف ظاہری بیعت ہے۔ اصل بیعت کام کرنا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس ہیئت کو بالکل چھوڑ دیا جائے۔ دوسرے حضرات پہلے طریق پر عمل کریں اور مجھے چونکہ اس ہیئت خاصہ سے افراط فی الشفقت ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں دوسرا طریق اختیار کرتا ہوں۔ اس طرح غلو فی العقیدہ کی بھی اصلاح ہوگئی اور ضرر کی بھی۔

دوسرا غلو بیعت سے آج کل عمل میں ہو گیا ہے وہ یہ کہ جتنا بڑا پیر کو سمجھنا چاہئے مُرید اس سے زیادہ بڑا سمجھتا ہے۔ ایسے ہی پیر مُرید کو اپنے سے بہت چھوٹا سمجھتا ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہ سمجھنا چاہئے۔ تواضع کے بالکل خلاف ہے اور خاصہ تکبر ہے پیر یوں سمجھتا ہے کہ میں اس کا حاکم ہوں اس کو میرے خلاف مرضی کوئی کام نہ کرنا چاہئے۔ اگر کبھی مُرید پیر کو کسی بات پر ٹوکے تو وہ سخت رنجیدہ ہوتا ہے کہ اس کو یہ منصب حاصل نہیں پھر ہمیں کیوں نصیحت کرتا ہے۔ معاذ اللہ پیر کے ساتھ بالکل خدا کا سا معاملہ طے کرتے ہیں۔ پیر کے سامنے الٹے پاؤں لوٹیں گے یا جب تک وہ بیٹھنے کا حکم خود نہ کرے کھڑے رہیں گے۔ ایک صاحب میرے پاس آئے اور کھڑے ہو گئے۔ بڑی دیر ہو گئی میں بڑا پریشان ہوا آخر میں نے بھی اُسے بیٹھنے کو نہ کہا جب دیر ہو گئی تو میں نے کہا بیٹھتے کیوں نہیں کہنے لگے۔ بلا اجازت کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔ میں نے کہا تو پھر آٹھ دن تک بیٹھنے کی اجازت نہیں یہ سنتے ہی فوراً بیٹھ گئے۔ یہ تو ظاہر میں معاملہ ہے اور دل سے یوں سمجھتے ہیں کہ خدا کا نائب مطلق ہے اگر پیر کسی کام کرنے کا حکم کرے تو مرید سمجھتا ہے کہ اگر یہ کام نہ کروں گا تو نہ معلوم کیا ہو جائے گا۔ اگر وہ کسی کو نوکر رکھنے کا حکم کرے تو چاہے اپنے آپ کو کلفت ہی ہو اور دل نہ چاہتا ہو مگر کیا مجال جو اُس کو نوکر نہ رکھے۔

صاحبو! صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم سے زیادہ اپنے شیخ سے محبت کرنے والا کون ہو گا مگر بایں ہمہ اُن کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو برتاؤ تھا وہ اس واقعہ سے معلوم ہو جائے گا کہ جب حضرت[1] عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی باندی بریرہ رضی اللہ عنہا کو آزاد کیا ہے تو حضور صلی

---

[1] الصحیح للبخاری 1:20، الصحیح لمسلم المساقات:103

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُن کو سابق شوہر کے پاس رہنے میں اختیار عطا فرمایا اور یہ اختیار ہر ایک باندی کو حاصل ہوتا ہے کہ جب وہ آزاد ہو تو پہلے شوہر سے جس سے حالت غلامی میں با اجازت مولی نکاح ہوا تھا اگر مرضی ہو نکاح باقی رکھے نہیں تو نکاح فسخ کر دے۔ چنانچہ حضرت بریرہؓ کو جب اختیار دیا گیا تو انہوں نے اپنے پہلے شوہر سے علیحدگی اختیار کی اور نکاح فسخ کر دیا۔ ان کے شوہر کا نام مغیث تھا۔ ان کو اس سے بہت رنج ہوا اور بیچارے ان کے پیچھے روتے پھرتے تھے۔

اس وقت مغیث کا رونا دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ترس آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہؓ سے فرمایا کہ بریرہؓ تم رجوع کر لو اور مغیث کی درخواست قبول کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سُن کر حضرت بریرہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ حکم فرماتے ہیں یا بطور سفارش کے فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نہیں حکم نہیں ہے صرف سفارش ہے تو حضرت بریرہؓ نے صاف عرض کر دیا کہ میں اس سفارش کے قبول کرنے سے معذور ہوں۔ چنانچہ انہوں نے یہ دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بطور امر کے نہیں بلکہ مشورہ ہے صاف اپنی معذوری ظاہر کر دی اور مغیث سے قطع تعلق کر دیا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا ذرا بھی ملال نہیں ہوا۔ اب تو کوئی مرید ایسا کر کے دیکھے پھر معلوم ہو جائے گا کہ پیر صاحب کیسے ناراض ہو کر منہ چڑھاتے ہیں۔ سو اس کی نظیر تو شریعت میں کہیں نہیں اتنا حق تو رسولؐ نے بھی صحابہؓ پر نہیں سمجھا بلکہ ان کو مشورہ کے ماننے نہ ماننے میں اختیار دیا۔

درجہ عظمتِ شیخ

اور ایک غضب اور یہ ہے کہ آج کل جس قدر ادب پیروں کا کرتے ہیں باپ کا نہیں کرتے۔ حالانکہ اطاعت عظمت کرنا والدین کی امر منصوص فی القرآن (قرآن شریف میں منصوص ہے ۱۲ اص) ہے شرعاً اگر باپ کہے کہ میرے پیر دباؤ اور پیر کہے کہ نفلیں پڑھو باپ کا کہنا واجب ہے اگر باپ سے سرکشی کر کے نفلیں پڑھے گا شرعاً گنہگار ہوگا۔ پس پیر کا اتنا ادب کرنا کہ رسول و والدین کا بھی اتنا حق نہ سمجھے یقیناً غلو فی العمل (عمل میں غلو ۱۲ اص) ہے جس کی اصلاح واجب ہے۔ بہت سے بہت پیر کا حق والدین کے برابر رکھو اگرچہ واقع اس سے بھی کم ہے اور واقع میں تو اتنا ہے کہ جتنا حق استاد کا سمجھتے ہو اتنا سمجھو۔ اب تو پیر کا ادب خدا تعالیٰ کے برابر کرتے ہیں کہ اگر سجدہ کا بھی حکم کرے تو شاید کر لیں اور استدلال میں حضرت حافظ کا شعر پڑھتے ہیں ؎

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید　　　　کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسم منزلہا

اور یہ معنے سمجھتے ہیں کہ اگر پیر شراب خوری کا بھی حکم کرے تو بجا لاؤ کیونکہ وہ منزل سے

واقف ہے تمہارے حق میں بھی مفید ہوگا۔ استغفر اللہ حضرت حافظؒ کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ بلکہ مئے سے مراد طریق عشق ہے اور سجادہ سے مراد قلب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سلوک میں ایک طریق اعمال کا ہے اور ایک طریق محبت و جذب کا ہے پس اگر شیخ نے تمہارے لئے طریق محبت و جذب تجویز کیا ہو اور تمہاری رائے میں طریقہ عمل مناسب ہو تو اس کو دل میں جگہ دو اور اپنی تجویز کو چھوڑ دو۔ کیونکہ عارف سالک اس منزل کی راہ و رسم سے ناواقف نہیں ہوتا اور جو معنی مشہور ہیں وہ بالکل غلط ہیں کیونکہ ہم نے تو پیر اس واسطے بنایا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رضا مندی کا راستہ بتا دے۔ اگر وہ راستہ نہ بتاوے۔ بلکہ راہ سے ہٹاوے تو اس کی پیروی ہرگز جائز نہیں ہے۔ یہیں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ پیر کا علاقہ والدین سے بھی کم ہے کیونکہ پیر تو چھوٹ سکتا ہے اگر خدانخواستہ ناجائز تعلیم دے اور باپ کبھی نہیں چھوٹ سکتا۔ بلکہ وہ ہمیشہ واجب التعظیم ہے گو خلاف شرع میں اطاعت نہیں۔ مگر باپ تو ہے۔ پس کیا وجہ ہے کہ پیروں کو والدین سے بڑھا رکھا ہے۔

اِلتزامِ بیعت

میں اہلِ حق سے پوچھتا ہوں کہ پیروں کا جتنا حق ہے انصاف سے بتلاویں کہ لوگ اُس سے زیادہ سمجھتے ہیں یا نہیں۔ اور اگر سمجھتے ہیں تو پھر ایسی بیعت عام کو ناپسندیدہ سمجھو گے یا نہیں۔ میں اپنے حق میں تو ضرور سمجھتا ہوں۔ ہاں جس جگہ بیعت ہونے والوں کی طبائع سلیمہ ہوں اور وہاں یہ مفاسد نہ ہوں اُن کو یہ ہیئت متعارفہ بیعت کے لئے مبارک ہو جو ان مفاسد کو مشاہدہ کرتا ہو وہ ضرور اس کو خیر باد کہہ دے۔ چنانچہ الحمدللہ! میں نے اس مفسدہ پر مطلع ہو کر اس کو عموم کے طور پر خیر باد کہہ دیا۔ میں اس کا دعویٰ اور وعدہ کرتا ہوں کہ جو نفع اس ہیئت متعارفہ میں ہوتا تھا وہ اب بھی حاصل ہوگا۔ منفعت میں کوئی نقصان نہیں آیا۔ مگر چھوڑا اس لئے ہے کہ اُس میں ایک قسم کا یہ ضرر ہے جس کو میں نے ابھی بیان کیا جو لوگ مجھے اس فن کا جاننے والا سمجھیں وہ اس کو ضرور سچا سمجھیں اور مجھ سے راہ پوچھیں اور اس طریقہ سے بیعت کی درخواست نہ کریں اور اگر کوئی اس کو غلط سمجھے تو خیر وہ جانے اور اس کا کام البتہ یہ طریقہ مسنونہ ہے۔ اس کے ترک میں ثواب میں کمی ضرور ہوگی۔ مگر حضرت کے سامنے ثواب کا درجہ مؤخر ہوتا ہے۔ گناہ سے بچنا مقدم ہے۔ ثواب کی کمی کو کسی دوسرے طریق سے پورا کر لیا جائے گا۔ سارا ثواب اسی میں منحصر نہیں ہے۔ ہمارے دوسرے ہی کام کون سے لائق ثواب ہیں۔ جو اس ایک ہی ثواب کے چھوٹنے کا رنج کیا جائے۔ اگر حق تعالیٰ کے یہاں صفِ نعال میں جگہ مل جائے تو بساغنیمت وہ لوگ بڑے درجہ کے ہیں جو ذرا ذرا سے ثواب کے چھوٹنے پر رنج کرتے ہیں۔ ہم درجوں کے طالب نہیں۔ ہاں اتنا

چاہتے ہیں کہ غضب الٰہی سے چھوٹ جائیں اور اس کی رحمت سے بہت کچھ امید ہے۔

اور یہ تو اس وقت ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ اس ضرر کے ساتھ بھی یہ طریقہ بیعت موجب ثواب ہے ورنہ اگر مجھے غلط گو نہ سمجھو تو میں بتلاؤں گا کہ ثواب کس میں ہے۔ صاحبو! جب طریقہ بیعت متعارفہ اپنی حد سے گزر گیا اور اس کی وجہ سے عقیدہ اور عمل میں خرابی آ گئی تو کیا اس ہیئت کے التزام کو بدعت نہ کہا جائے گا۔ اور اس کا ترک کر دینا کیا احیاء سنت (سنت کا زندہ کرنا ۱۲ص) نہ ہوگا۔ اگر یہ مان لیا جائے تو پھر بتلایئے کہ ثواب کس میں ہوگا۔ خیر میں سب سے درخواست نہیں کرتا کہ وہ ضرور چھوڑیں مگر اپنے حق میں تو چھوڑنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اور اس وقت پہلے سے زیادہ خوبی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اب بدوں ہاتھ میں ہاتھ لئے جو کسی کو تعلیم کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ شفقت کی جاتی ہے تو اس پر زیادہ اثر ہوتا ہے۔ ایسے ہی اب اگر کوئی میری خدمت کرتا ہے تو اس کا مجھ پر زیادہ احسان ہوتا ہے۔ پہلے کچھ احسان کا اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ نیز پہلے مرید کے پاس بیٹھ کر رعونت ہوتی تھی اب نہیں ہوتی۔ کیونکہ پہلے زور سمجھا جاتا تھا اب وہ زور نہیں رہا، تو آج کل یہ بیعت مشتمل پر مفاسد مذکورہ بھی تعلق مع غیر اللہ (غیر اللہ کے ساتھ تعلق ۱۲ص) کی ایک فرع ہے پس اس تعلق میں بھی کمی کرنی واجب ہے اور یہ ایسا ہی ہے کہ جیسا کہ توجہ متعارف کو ہمارے مشائخ نے ترک کر دیا۔ کیونکہ اس میں بھی غلو ہو گیا تھا۔ چنانچہ اب بھی بعض خاندانوں میں اس طریق توجہ ہی کو مدار اور اصل سمجھ رکھا ہے۔

تکالیف کا علاج

خیر بحمد اللہ اچھی طرح یہ بیان ہو گیا کہ اصل چیز نسبت مع اللہ ہے اور اس کی کس قدر ضرورت ہے اور نسبت مع غیر اللہ بھی بقدر ضرورت جائز ہے۔ بشرطیکہ خدا تعالیٰ کی محبت سے کم رہے۔ میرا قصد اس مضمون کو دوسری طرح بیان کرنے کا تھا۔ مگر بحمد اللہ خوب بیان ہو گیا۔ غرض تعلق غیر اللہ میں دنیوی اور اخروی ہر طرح کا خسارہ ہے۔ جس کسی کو تکلیف و پریشانی میں مبتلا دیکھا جائے سمجھنا چاہئے کہ اُس کو غیر اللہ کے ساتھ تعلق زیادہ ہے۔ اس تعلق کو قطع کر دو تکلیف جاتی رہے گی۔ یہ طریقہ تمام دنیا کی تکالیف کا خاتمہ کر دینے والا ہے۔ یہی وہ مضمون ہے جو پہلے خود بخود ذہن میں آیا تھا۔ اس کے بعد یہ حدیث نظر سے گزری۔

اللھم اجعل حبک احب الاشیاء الیَّ واجعل خشیتک اخوف الاشیاء عندی[1]

کہ اے اللہ تعالیٰ اپنی محبت کو میرے دل میں سب سے زیادہ محبوب بنا دے اور اپنا خوف میرے دل میں سب سے زیادہ پیدا کر دے۔ سبحان اللہ! کیا جامع دعا ہے کیونکہ دو ہی طرح کے

---

[1] اتحاد السادة المتقین 7:158، البدایة والنہایة 6:37

تعلقات ہوتے ہیں۔ رغبت کے یا ہیبت (ڈر نا۱۲ص) کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ہی لفظوں میں سب تعلقات کو کھپا دیا کہ سارے تعلقات اس حد تک ہونے چاہئیں کہ خدا تعالیٰ سے زیادہ کسی کی محبت نہ ہو اور نہ خدا تعالیٰ سے زیادہ کسی کا ڈر ہو۔ سب تعلقات خدا کے تعلق سے مغلوب ہونے چاہئیں تو وہ مسئلہ وارد قلبی اچھی طرح ثابت اور سنت سے مؤید ہو گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے بھی اور فعل سے بھی۔ کیونکہ میں نے پہلے آپ کو جتلا دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال بیان کر کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی چیز سے زیادہ تعلق نہ تھا۔

طریق تعلق

اب میں آپ کو یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ تعلق خداوند تعالیٰ سے کیونکر بڑھ سکتا ہے اس کا کیا طریقہ ہے توسنیئے سب سے پہلے تو آپ اس کام کی پختہ نیت کر لیں کہ جیسے ہو خدا تعالیٰ کی محبت پیدا کرنی چاہئے۔ اس کے بعد گذشتہ گناہوں سے خالص توبہ کیجئے اور آئندہ کے لئے اہتمام کر کے گناہوں کو چھوڑ دو۔ اوّل اوّل ضرور تکلیف ہوگی۔ مگر پھر ان شاء اللہ تعالیٰ مدد ہوگی اور کام آسان ہو جائے گا۔ اس کو قرب میں بڑا دخل ہے پھر انشاء اللہ نیک کاموں کی عادت ہو جائے گی۔ دوسرے کسی اللہ والے سے تعلق رکھو۔ اُس سے امراض قلبی کا علاج کراؤ۔ اگر وہ بیعت کرتا ہو تو بیعت ہو جاؤ اور نہ کرے تو علاج پر اکتفا کرو۔ تیسرے یہ کہ کچھ تھوڑا سا وقت ذکر کے واسطے معین کر لو۔ جتنا بھی ہو سکے چاہے پندرہ ہی منٹ ہو اور ذکر اسی نیت سے کرو کہ دل میں محبت خداوندی پیدا ہو جائے یہی ثواب کی جڑ ہے اکثر لوگ مختلف نیتوں سے ذکر کرتے ہیں اسی لئے نفع نہیں ہوتا۔ بس یہ تین باتیں اگر نباہ کر لو گے تو خدا سے ایسا تعلق ہو جائے گا کہ ہر چیز ہیچ اور اس کے آگے گرد نظر آئے گی پھر چند روز میں وہ حالت ہوگی ؎

موحد چہ برپائے ریزی زرش — چہ فولاد ہندی نہی سرش

امید و ہراسش نباشد ز کس — ہمیں است بنیاد توحید و بس

(موحد کے قدموں پر مال و زر نچھاور کرو خواہ اس کے سر پر فولاد ہندی رکھو۔ اس کو کسی سے امید وار ہراس نہیں ہوتی۔ پس یہی تو توحید کی بنیاد ہے۱۲ص)

اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو تو کہ توفیق تک نیک عطا ہوا۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ.

الوصل والفصل

13 جمادی الاخریٰ 1343ھ کو بعد نماز جمعہ ممبر پر بیٹھ کر 2 گھنٹے 45 منٹ تک اہل خانقاہ اور بعض مہمانوں کی درخواست پر "وصل و فصل" کے موضوع پر بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔
حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے یہ وعظ قلمبند فرمایا۔ تفصیلی تسوید 12 شوال 1343ھ سے شروع ہو کر 17 شوال کو پوری ہوئی۔

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ للّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَ مَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ۔

اَمَّا بَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ . وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۔ (سورۃ المزمل:۸)

ترجمہ: اورتو اپنے پروردگار کا ذکر کر۔ اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جا۔

تمہید

یہ ایک آیت ہے سورۂ مزمل کی اس میں حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دو باتوں کا امر فرمایا ہے ایک ذکر اللہ کا اور ایک انقطاع غیر اللہ کا۔

اس مضمون خاص کے اختیار کی وجہ میں ابھی بتلاؤں گا۔ اور اس وقت مطلق بیان کی وجہ یہ ہوئی کہ بعض احباب نے اس کی درخواست کی تھی گو طبیعت میں اس وقت بیان کا تقاضا نہ تھا۔ مگر چند وجوہ سے میں نے اس شرط پر وعدہ کر لیا تھا کہ وقت پر کوئی مانع نہ ہوا تو بیان کردوں گا۔ وہ وجوہ یہ ہیں کہ اول تو درخواست کرنے والے دور کے رہنے والے ہیں اور دور والوں کو بیان سننے کا اشتیاق زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے مجھے اُن کی خاطر اس لئے بھی عزیز ہے کہ مولانا گنگوہیؒ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہیں۔ اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین سے میری طبیعت کو خاص تعلق ہے۔ میں اُن کو بالکل اپنا سمجھتا ہوں۔ تیسرے وہ مہمان بھی ہیں، اس لئے بھی قابل اکرام ہیں۔ غرض ان وجوہ سے میں ان کی درخواست کو رد نہ کر سکا اور معلق وعدہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اُس وقت ذہن میں مضمون کی تعیین نہ ہوئی

تھی۔ اتفاق سے کل پرسوں ایک مہمان اور آگئے انہوں نے مجھ سے اپنا ایک خواب بیان کیا۔ میں نے اس کو تعبیر دی۔ اوہر اتفاق سے تعبیر میں تقریر طویل اور مفید ہوگئی تو جی چاہا کہ اس مضمون کو تفصیل کے ساتھ بیان کردیا جائے پھر آیت بھی ذہن میں آگئی۔ جسمیں مضمون موجود تھا۔ جس کی میں نے ابھی تلاوت کی ہے۔ پس اس وقت میں اس خواب کی تعبیر کا مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یہ وجہ ہے مضمون خاص کے بیان کرنے کی اور اصل خواب کے بیان کرنے کی تو ضرورت نہیں۔ ہاں اُس کا ایک جزو بیان کرنے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ خواب میں وصل وفصل کا لفظ بھی تھا جس کو وہ نہ سمجھے تھے کیونکہ اصطلاح قوم پران کی کوئی نظر نہیں ہے۔ میری نظر سے اصطلاحات قوم گزری ہیں۔ اس لئے میں تعبیر سمجھ گیا۔ وصل وفصل کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ وصل کہتے ہیں خدا تعالیٰ سے ملنے کو یعنی اُن سے تعلق اور لگاؤ پیدا کرنے۔ اور فصل کہتے ہیں غیر اللہ سے بے تعلق کرنے کو یعنی غیر اللہ سے تعلق کم کرنے کو اس وقت اسی کے متعلق بیان ہوگا مگر مختصراً۔

توجہ الی الحق اب میں آیت کے ساتھ اس مضمون کا تعلق بتلانا چاہتا ہوں۔ اس آیت نے اشارۃً کیا بلکہ صراحۃً دونوں مضمون مذکور ہیں چنانچہ اس میں ایک جملہ تو وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ ہے اس میں ذکر اللہ کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور لگاؤ ہوتا ہے اور وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلاً ۔ میں انقطاع کا حکم ہے۔ کیونکہ لغت میں تبتل کے معنی انقطاع ہی کے ہیں۔ رہا یہ کہ انقطاع کس سے؟ تو ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ سے انقطاع تو مراد نہیں کیونکہ الیہ میں صلہٗ الی خود بتلا رہا ہے کہ انقطاع کے بعد حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا امر ہے۔ پس انقطاع غیر اللہ سے مراد ہوگا۔ بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو صرف تبتل الیہ یہی ایک جملہ وصل وفصل دونوں پر دلالت کررہا ہے۔ اگر واذ کر اسم ربک بھی نہ ہوتا تو یہی ایک جملہ دونوں باتوں سے بیان کے لئے کافی تھا۔ کیونکہ جن لوگوں کی نظر عربیت پر ہے وہ جانتے ہیں کہ تبتل وانقطاع کا اصلی صلہ عن ہے۔ جو اُس چیز پر داخل ہوتا ہے۔ جس سے تعلق قطع کیا جاتا ہے اور اس کا اصلی صلہ الی نہیں ہے۔ بلکہ یہ عارضی صلہ ہے اور جس وقت اس کے بعد الی ہوتا ہے۔ اس وقت یہ معنی وصول کو متضمن ہوتا ہے۔ اس کو اہل بلاغت تضمین کہتے ہیں۔ پھر کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ مُتَضمِّنْ و مُتَضَمَّنْ دونوں کا صلہ مذکور ہوتا ہے۔ اس وقت تبتل کا استعمال عن والی دونوں کے ساتھ ہوگا اور کبھی صرف الی مذکور ہوتا ہے جو کہ معنی وصول کا صلہ ہے۔ جس کو تبتل کے ضمن میں لیا گیا ہے اور اس کا مدخول وہ ہوتا ہے۔ جس سے وصل ہوگا اور اصلی صلہ یعنی عن مع اپنے مدخول کے حذف کردیا جاتا ہے۔ مگر لفظوں ہی سے حذف ہوتا ہے۔

ارادہ سے حذف نہیں ہوتا بلکہ ارادہ میں ملحوظ ہوتا ہے اور اُس کو حذف اس لئے کر دیتے ہیں کہ وہ تو اس لفظ کا اصلی صلہ ہے۔ اگر محذوف بھی ہوگا تو سننے والے خود سمجھ لیں گے۔ چنانچہ یہاں ایسا ہی ہوا ہے کہ تبتل کا عارضی صلہ الی مذکور ہے اور اصل صلہ عن مقدر ہے لفظ الی سے معلوم ہوگیا کہ تبتل معنی وصل کو متضمن ہے پس معنی یہ ہوئے کہ تبتل عن الخلق الیہ یعنی مخلوق سے منقطع ہوکر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائیے تو چونکہ یہاں معنیٰ انقطاع لفظ تبتل سے اور معنی وصل صلہٗ اِلیٰ سے مفہوم ہو رہے ہیں اس لئے یہی ایک جملہ وصل وفصل دونوں پر دلالت کر رہا ہے۔

طریق توجہ

اب سوال ہوگا کہ پھر وَاذْ کُرِاسْمَ رَبِّکَ (اور تو اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کر) کی کیا ضرورت تھی کہ کیا یہ زائد ہوا تو خوب سمجھ لو کہ یہ بھی زائد نہیں کیونکہ گو تبتل الیہ میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا امر ہوگیا مگر اس میں طریق توجہ کا ذکر نہ تھا وَاذْ کُرِاسْمَ رَبِّکَ میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا طریقہ بتلایا گیا ہے اور اس کے بتلانے کی ضرورت بھی تھی کیونکہ توجہ کے جتنے طریقے ہیں یہاں سب متعذر ہیں۔ توجہ کا ایک طریقہ تو مشاہدہ یعنی رؤیت ہے اور یہاں حق تعالیٰ کا یہ مشاہدہ نہیں ہوسکتا۔ ہاں آخرت میں ہوگا۔ چنانچہ حدیث مسلم میں ہے۔

لن ترو ا ربکم حتی تموتوا (سنن بن ماجة : 207، مسند احمد 4 : 361، کنز العمال: 43126) ہرگز نہ دیکھو گے اپنے رب کو مرنے سے پہلے

اس سے جیسے دنیا میں مشاہدہ کی نفی ہوئی ہے ایسے ہی مرنے کے بعد رؤیت کا اثبات بھی ہو رہا ہے کیونکہ حتی غایت کے لئے ہے تو معلوم ہوا کہ نفی رؤیت موت پر منتہی ہو جائے گی تو موت کے بعد رؤیت ہوگی اور دوسرا طریقہ توجہ کا تصور ہے اور حق تعالیٰ کا تصور بھی بالکنہ یا بکنہ نہیں ہو سکتا یعنی ذات کا ادراک نہیں ہوسکتا۔ بلکہ جو کچھ تصور میں آتا ہے وہ محض وجہ اور مثال ہے اور حق تعالیٰ اس سے بھی وراء الوراثم وراء الوراء ہیں۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ۔۔۔ وز ہر چہ گفتہ اند وشنیدیم وخواندہ ایم

اے خیال اور قیاس اور گمان اور وہم سے زیادہ بڑھے ہوئے۔ جو کچھ کہ کہا ہے اور سنا ہے اور پڑھا ہے۔

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ۔۔۔ ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

دفتر ختم ہوگیا اور عمر آخر ہوگئی ہم اُسی طرح تیرے وصف میں عاجز آگئے

اور ایک عارف فرماتے ہیں ؎

دور بیناں بارگاہِ الست جز ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

بارگاہ الست کے دور بینوں نے سوائے اس کے انہوں نے حاصل نہیں کیا ہے کہ۔

بڑے بڑے عارفین کو بھی ذاتِ حق تعالیٰ کا ادراک تام اور کامل تصور نصیب نہیں ہوا اور جس کا نام ان کی اصطلاح میں توجہ تام ہے اس کا حال یہ ہے کہ وجہ قریب اور مثال قریب ان کے قلب میں قائم ہو جاتی ہے جس کی طرف ہر وقت توجہ سہل ہو جاتی ہے باقی وہ بھی مرآۃ حق ہی ہے عین حق نہیں ہے اس لئے کہتے ہیں۔

كُلُّ مَا خَطَرَ بِبَالِکَ فَهُوَ هَالِکٌ وَاللّٰهُ اَجَلُ مِنْ ذٰلِکَ: تو مبتدی بے چارہ کا تو کیا منہ ہے جو ذات کا ادراک تام کر سکے بس سارے مقامات طے کر کے بھی اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ موجود ہیں باقی کیونکر ہیں اور ان کی کنہ کیا ہے یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا ایک دفعہ اسی حالت کے غلبہ میں بے ساختہ ایک شعر موزوں ہو گیا تھا۔ اس کو بھی پڑھے دیتا ہوں ۔

اندریں رہ انچہ می آید بدست حیرت اندر حیرت حیرت ست

اس راستہ میں جو کچھ حاصل ہوتا ہے حیرت کے اندر حیرت ہے

بس واقعی اس طریق میں جوں جوں بڑھتے جاؤ گے حیرت ہی بڑھتی جائے گی ادراک تام نصیب نہ ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں ۔

گہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں جز کہ حیرانی نہ باشد کارِ دیں

کبھی ایسا دکھلاتا ہے اور کبھی اس کیخلاف دین کا کام سوائے حیرانی کے نہیں ہے

اگر حق تعالیٰ کا تصور کبھی ہوگا بھی تو ناتمام ہوگا کیونکہ یہاں اُن کی نظیر نہیں مل سکتی۔ جب کاملین کا بھی یہ حال ہے تو مبتدی کو تو کسی طرح بھی ادراک تام نہیں ہوسکتا۔

حق تعالیٰ کے ساتھ محبت طبعی

یہاں سے میں ایک بات پر متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ حق تعالیٰ کے مدرک بالحواس اور مدرک بالکنہ نہ ہونے اور ان کی نظیر اور مثل نہ ہونے پر اس حکم کا متفرع کرنا تو صحیح ہے کہ ان کا ادراک تام نہیں ہوسکتا۔ مگر بعض نے غلطی کی ہے کہ اس پر یہ حکم بھی متفرع کیا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ محبت طبعی بھی نہیں ہوسکتی اور دلیل میں یہ کہا ہے کہ محبت طبعی یا تو دیکھنے سے ہوتی ہے یا آواز سننے سے۔ چنانچہ اندھوں کو آواز سُن کر عشق ہو جاتا ہے وہ صورت کہاں دیکھتے ہیں اس لئے محض مشاہدہ صورت تو مدار عشق نہیں ہے بلکہ آواز بھی اس کا منشاء ہوسکتی ہے۔ رئیس العاشقین مولانا جامیؒ فرماتے ہیں ۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں دولت از گفتار خیزد

عشق تنہا دیدار سے ہی نہیں پیدا ہوتا بہت دفعہ یہ دولت گفتگو سے بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

اور حق تعالیٰ کا نہ مشاہدہ ہوسکتا ہے اور نہ عادۃً حق تعالیٰ سے کلام ہوسکتا ہے اور اگر خرقِ عادات کے طور پر کسی کو ہو بھی۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوا ہے مگر وہ صورت سے منزہ ہے تو پھر وہ بھی جب کہ اس کو بلا واسطہ کلامِ الٰہی مانا جائے بواسطۂ مثال کے نہ مانا جائے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو کلام ہوا وہ بواسطۂ مثال کے تھا۔ کیونکہ وہ کلام مسموع تھا۔ اور کلام مسموع میں ترکیب بھی ہوگی الفاظ بھی ہوں گے۔ آواز بھی ہوگی۔ اور یہ امور مثال میں ہوسکتے ہیں نہ کہ اصل کلام الٰہی میں کیونکہ صوفیہ کا اجماع ہے۔ اور یہی متکلمین کا بھی مذہب ہے۔ کہ

قول اور الحن نے آواز نے   اس کی بات کو آواز اور لحن نہیں

حق تعالیٰ کا کلام لحن اور آواز سے مبرا ہے اور دنیا میں بدوں لحن و آواز کے ہم کلام کو نہ سُن سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں تو اس اعتبار سے کلام بھی مثل رؤیت کے ہے کہ دنیا میں حق تعالیٰ سے کلام بھی بلا واسطہ مثال کے نہیں ہوسکتا۔ اور شاید یہی مراد ہے حجاب سے اس آیت میں۔

مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ

ترجمہ: کسی بشر کی یہ مجال نہیں کہ حق تعالیٰ اُس سے (دنیا میں) کلام کریں مگر وحی سے یا حجاب کے پیچھے سے ۱۲)

ہاں! مثال کے واسطے سے رؤیت بھی ہوسکتی ہے اور کلام بھی ہوسکتا ہے۔

یہ شبہ نہ ہو کہ پہلے تو حق تعالیٰ کی نظیر کی تم نے نفی کی ہے اور یہاں مثال کو جائز کہا ہے۔ جواب یہ ہے کہ وہاں نظیر سے مراد مثل ہے جو متحد فی النوع ہوتی ہے اور اس سے حق تعالیٰ منزہ ہے اور مثال مشارک فی الوصف ہوا کرتی ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ کے لئے مثل یعنی مشارک فی النوع تو کوئی نہیں ہاں مثال مشارک فی الوصف جائز ہے۔ پس بعض متکشفین کہتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ کی نہ رؤیت ہوسکتی ہے نہ ان کا کلام بالا واسطہ مثال کے مسموع ہوسکتا ہے تو حق تعالیٰ کے ساتھ محبت طبعی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ محبت طبعی کا سبب رؤیت صورت یا سماع صورت ہی ہوا کرتا ہے یہ دلیل اپنی جزامت و پختگی میں بظاہر قوی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں محض لاشئے ہے۔

امام غزالیؒ نے اس کا خوب رد کیا ہے اور فرمایا ہے کہ محبت طبعیہ کا سبب ان اسباب میں منحصر نہیں ہے اور اس کی خوب مثال دی ہے کہ ہر مومن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت طبعیہ ایسی ہے کہ بیوی بچوں

اور ماں باپ وغیرہ سب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا کرنے کو تیار ہے حالانکہ نہ اس وقت کے مسلمانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت دیکھی ہے۔ نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی ہے اسی طرح بزرگوں کے سلسلہ سے ہم کو محبت ہے۔ جن کو ہم نے دیکھا بھی نہیں۔ (مثلاً حضرت فاطمہ زہرا اور امام حسین رضی اللہ عنہما اور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت مسلمانوں کو طبعی محبت ہے)۔

نیز مقلدوں کو ائمہ مجتہدین سے طبعی محبت ہے۔ چنانچہ مقلدوں اور غیر مقلدوں سے جو جھگڑا ہوتا ہے وہ اس کی دلیل ظاہر ہے کہ ذرا سی گستاخی پر مقلدوں کو جوش آ جاتا ہے۔ اور آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور یہ اثر محبت طبعی کا ہے محبت عقلی کا نہیں کیونکہ محبت عقلی استدلال سے ہوتی ہے اور استدلال سے جوش نہیں ہوا کرتا بہر حال محبت طبعی بدوں ان دو کے بھی ہو سکتی ہے تو معلوم ہوا کہ اس کا ایک اور سبب بھی ہے جس کا نام ہے مناسبت اور مناسبت ہی مدار محبت طبعیہ ہے۔ سو حق تعالیٰ سے زیادہ بندہ کو کسی سے بھی مناسبت نہیں۔ پس محبت طبعی بھی خدا تعالیٰ سے زیادہ کسی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔

محبت غیر حق

بلکہ محققین نے تو دعویٰ کیا ہے کہ غیر خدا سے محبت ہو ہی نہیں سکتی اور جس کو غیر سے بظاہر محبت ہے وہ بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ ہی سے محبت ہے۔ باقی اس پر جو مواخذہ ہے وہ بوجہ نیت کے ہے کیونکہ اس کو تو یہ خبر نہیں کہ میں اللہ تعالیٰ سے محبت کر رہا ہوں۔ یہ تو نیت غیر ہی کی کر رہا ہے اور اس پر اجماع ہے کہ مواخذہ جب ہوتا ہے نیت ہی پر ہوتا ہے اور جہاں بظاہر عمل پر مواخذہ ہے وہ بھی حقیقت میں نیت ہی پر ہے۔ مثلاً کسی نے زنا کیا اور اس پر حد قائم کی گئی تو ظاہر میں مواخذہ فعل پر ہے مگر حقیقت میں مواخذہ قصد زناء پر ہے۔ چنانچہ اس پر اتفاق ہے کہ شب زفاف میں اگر شبہ سے غیر عورت کے ساتھ اپنی بیوی سمجھ کر وطی کر لے تو گناہ نہ ہوگا نہ اس پر حد قائم ہوگی نہ یہ زنا شمار ہوگا بلکہ حمل رہ جائے تو لڑکا حلالی ہوگا۔ اور اپنی بیوی سے غیر سمجھ کر وطی کر لے تو گناہ ہوگا۔ بلکہ اپنی بیوی سے وطی کرتے ہوئے تصور غیر سے بھی گناہ ہوگا۔ یعنی اگر کسی نے کوئی حسین عورت دیکھی ہو پھر اپنی بیوی سے وطی کرتے ہوئے اس کی صورت ذہن میں حاضر کر کے یہ تصور کرے کہ گویا میں اس اجنبی حسین عورت سے وطی کر رہا ہوں تو گناہ ہوگا۔ حالانکہ بظاہر یہاں وطی حلال کا تحقق ہو رہا ہے۔ مگر چونکہ قصد حرام کا ہے۔ اس لئے گناہ ہوا گو حد نہ ہو۔ اسی طرح کسی غیر عورت کا عکس پانی میں دیکھ کر اُس سے تلذذ کرنا بھی گناہ کا سبب ہے۔ گو یہاں تمتع بالاجنبیہ نہیں پایا گیا، کیونکہ پانی میں جو عکس آ رہا ہے وہ کوئی چیز نہیں ہے۔ مگر قصد کی وجہ سے گناہ ہوا اسی طرح غلطی سے پانی یا شربت سمجھ کر شراب پی

لے تو گناہ نہیں ہوا۔ اور شراب کی نیت سے جو شربت پی گیا ہو تو گناہ ہوا۔ غرض اس کی اور بہت نظیریں ہیں جن سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ مواخذہ دراصل نیت پر ہے۔ اسی لئے ان لوگوں سے مؤاخذہ ہوتا ہے کو غیر خدا سے ناجائز محبت کرتے ہیں کیونکہ ان کی نیت تو غیر حق سے ہی محبت کی ہے۔ خدا تعالیٰ کا تو انہیں دھیان بھی نہیں آتا۔ باقی حقیقت میں یہ محبت حق تعالیٰ ہی سے ہے۔

تقریر اس کی یہ ہے کہ محبت کے جتنے اسباب ہیں یعنی حسن و جمال اور عطاء ونوال یا فضل وکمال یہ صفات حقیقت میں حق تعالیٰ کے ہیں دوسروں میں صفات الٰہیہ کا عکس ہے تو اس عکس کا عاشق ہونا ایسا ہے جیسے دیوار پر دھوپ پڑ رہی ہو اور کوئی دیوار کی روشنی پر عاشق ہو جائے تو گو ظاہر میں یہ نورِ جدار کا عشق ہے مگر حقیقت میں آفتاب کا عشق ہے یہ شخص دیوار پر اسی وقت تک عاشق ہے جب تک اس کو یہ خبر نہیں کہ یہ نور آفتاب کا ہے اور جب اس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ تو آفتاب کی صفت ہے اس وقت کہے گا۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم　　　چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(نہ میں رات ہوں نہ شب پرست کہ خواب کی بات کروں چونکہ آفتاب کا غلام ہوں اس لئے آفتاب کی باتیں کرتا ہوں)

اور اس وقت اپنی حماقت پر افسوس کرے گا کہ میں اب تک آفتاب سے کیوں غافل رہا اور دوسروں میں انس کا عکس دیکھ کر کیوں الجھا رہا اسی طرح جن کی نظر حق تعالیٰ کے کمالات پر پہنچ گئی ہے اور وہ سمجھ گئے ہیں کہ اسباب محبت حقیقت میں حق تعالیٰ ہی میں ہیں اور دوسروں میں محض عکس ہے وہ سب کو چھوڑ کر خدا کے ہو گئے اور جو لوگ عکس کے اوپر فریفتہ ہیں اُن کی نسبت یوں فرماتے ہیں۔

عشق با مردہ نبا شد پائیدار　　　عشق را باحی و با قیوم دار

عشق ساتھ مردہ کے پائیدار نہیں ہوا کرتا عشق کو زندہ رہنے والے اور قائم رہنے کے ساتھ رکھ۔

عشق ہائے کز پئے رنگے بود　　　عشق نبود عاقبت ننگ بود

جو عشق رنگ کے لئے ہوتا ہے اصل میں وہ عشق نہیں ہے۔ آخر کار ننگ و عار ہوتا ہے۔

واقعی غیر حق کے ساتھ عشق پائیدار نہیں ہے کیونکہ جو لوگ غیر کے عاشق ہیں وہ اسی وقت تک عاشق ہیں جب تک صفات حق کا جلوہ ان میں ہو رہا ہے۔ اسی کو رنگ فرمایا گیا ہے اور اگر وہ اپنے عکس کو سلب کر لیں تو پھر ان کا عشق بھی جاتا رہے گا چنانچہ جو لوگ کسی عورت یا لڑکے پر عاشق ہیں وہ اگر مرنے کے بعد اُس کی لاش کو اس حالت میں دیکھ لیں کہ بدن پھٹ گیا ہو اور

اُس میں عفونیت پیدا ہوگئی ہو کیڑے گوشت پوست کے اندر پیدا ہوگئے ہوں تو سب سے پہلے یہ عاشق صاحب ہی اس سے نفرت کرنے لگیں گے اور اس کی بھی ضرورت نہیں بلکہ زندگی ہی میں کسی حسین عورت کا سر منڈا دیا جائے تو کوئی بھی اُسے نہ پوچھے گا۔ اسی لئے کہتے ہیں ؎

عاشقی با مردگاں پایندہ نیست　　　زانکہ مردہ سوئے ما آیندہ نیست

عاشقی مُردوں کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ مردہ ہماری طرف آنے والا نہیں ہے۔

اور یہ تو اُس عشق کا حال ہے جو واقع میں عشق ہو ورنہ آج کل تو عشق کا وجود ہی بہت کم ہے لوگوں نے فسق کا نام عشق رکھ لیا ہے سو اس کے زائل ہونے کے لئے تو اتنا ہی کافی ہے کہ ذرا ان کا محبوب زیب و زینت نہ کرے، قیمتی کپڑا اور زیور نہ پہنے تو بس پھر یہ عاشق صاحب کسی اور کو تلاش کرنے لگیں گے۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

عشق ہائے کز پئے رنگے بود　　　عشق نبود عاقبت ننگ بود

جو عشق رنگ کے لئے ہوتا ہے اصل میں وہ عشق نہیں ہے۔ آخر کار ننگ و عار ہوتا ہے۔

بہر حال اہلِ تحقیق کا یہ قول ہے کہ محبت خدا کے سوا کسی سے نہیں ہوسکتی اور حق تعالیٰ سے محبت عقلی تو ہوتی ہے طبعی بھی ہوسکتی ہے پس فلاسفہ اور بعض خشک متکلمین کا حق تعالیٰ کے مشاہد اور مدرک بالکنہ نہ ہونے پر تفریع کرنا تو غلط ہے کہ حق تعالیٰ سے محبت طبعی نہیں ہوسکتی ہاں جو تفریع میں نے کی ہے وہ صحیح ہے کہ ذات حق تعالیٰ کا ادراک تام نہیں ہوسکتا۔

توجہ ذکری

اسی لئے مبتدی کو ابتداء میں وساوس و خطرات زیادہ آتے ہیں کیونکہ ایسی ذات کی طرف توجہ کا مربوط ہو جانا اول اول بہت دشوار ہوتا ہے جو نہ مشاہدہ میں آسکے نہ تصور میں پوری طرح آسکے اس لئے توجہ الی اللہ کا طریقہ بتلانے کی بہت ضرورت تھی۔ چنانچہ واذکر اسمَ رَبِّکَ (اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کر) میں بھی یہی طریقہ بتلایا گیا ہے اس لئے یہ جملہ زیادہ نہیں۔ حاصل طریقہ کا یہ ہے کہ گو ذات حق کی طرف توجہ تام نہیں ہوسکتی۔ مگر تم اس کو یاد ہی کرتے رہو۔ بس یہی توجہ ذکری کافی ہے اور اسی سے مطلوب حاصل ہو جائے گا۔ گو ذکر کرتے وقت تمہارے ذہن میں ذات کا تصور حقیقی نہ ہوگا بالوجہ ہی ادراک ہوگا مگر یہی کافی ہے کہ بلکہ اگر مسمی کا تصور بالکل نہ ہو محض اسم اللہ ہی کا تصور ہو تو یہ بھی کافی ہے اس تقریر سے معلوم ہوگیا کہ اس جملہ میں لفظ اسم بھی زائد نہیں گو بعض نے اس کو زائد کہا ہے مگر اسلم وارجح یہ ہے کہ زائد نہ ہو کیونکہ توجہ الی اللہ کا طریقہ ابتداء میں یہی

ہے کہ توجہ الی الاسم کی جاوے۔ یہ عقدہ حضرت حاجی صاحبؒ کی برکت سے حاصل ہوا حضرت فرماتے تھے کہ ذکر میں اول تو توجہ الی المذکور چاہیے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو توجہ الی الذکر ہی کر لے اس سے بھی شدہ شدہ مذکور کی طرف توجہ ہو جاتی ہے۔ گو اس کی توجہ ذکر ہی کی طرف ہے۔ بلکہ اگر توجہ الی المذکور کے ساتھ بھی توجہ الی الذکر ہو تب بھی اس کو توجہ الی لمذکور میں مخل سمجھ کر اس کی نفی نہ کرے۔ کیونکہ بالذات اس کی توجہ مذکور ہی کی طرف ہوگی اور ذکر کی طرف تبعاً توجہ ہے۔

توجہ قلب کی بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے رؤیت بصر کی حالت ہے کہ آپ جب آنکھ سے کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو یہ نہیں ہوتا کہ مرئی کے سوا اور کوئی چیز آپ کو نظر نہ آئے اگر آپ ایک نقطہ کی طرف نگاہ کریں گے تو ساتھ میں اور اشیاء بھی تبعاً نظر آئیں گی مگر یہ نہیں کہا جاتا کہ اس شخص نے نقطہ کے سوا اور چیزوں کو بھی قصداً دیکھا ہے بلکہ یہی کہا جاتا ہے کہ قصداً تو اس نے صرف نقطہ ہی کو دیکھا ہے کیونکہ بالذات اُسی کی طرف نگاہ اُٹھائی گئی ہے اور دوسری چیزوں کو قصداً نہیں دیکھا۔ لیکن وہ بدوں قصد کے سامنے آ گئیں۔ اسی طرح جب ہم توجہ بالذات مذکور کی طرف کریں گے تو یہی کہا جائے گا کہ توجہ تو مذکور کی طرف ہے مگر تبعاً ذکر کی طرف بھی التفات ہو گیا۔

اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ذکر کے وقت اگر وساوس خود بخود آئیں تو مضر نہیں کیونکہ وہ حاسۂ باطنہ کے سامنے خود بخود آ گئے ہیں قصداً نہیں لائے تو جس طرح حاسہ بصر کے سامنے مرئی کے سوا اور چیزیں بھی اضطراراً آ جاتی ہیں اسی طرح حاسۂ بصیرت کے سامنے بھی اضطراراً کچھ چیزیں آ جاتی ہیں اس سے سالک پریشان نہ ہو کیونکہ ذکر میں ایسی توجہ ہونا کہ دوسری اشیاء کی طرف بلا قصد بھی خیال نہ جائے قریب بمحال ہے۔

ہاں استغراق میں ایسا ہو سکتا ہے مگر استغراق خود ہی کمال نہیں جس کی ایک دلیل تو ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو استغراق نہیں ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں بھی استغراق نہ ہوتا تھا۔ بخاری کی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں بعض دفعہ نماز میں قراءت طویل کرنا چاہتا ہوں۔

فاسمع بکاء صبی فاتجوز فی الصلوٰۃ خشیۃ ان تفتتن امہ

(الصحیح لمسلم کتاب البر و الصلۃ باب:40، رقم:130، کنز العمال:5924)

پھر میں کسی بچہ کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو نماز میں اختصار کر دیتا ہوں کہ مُبادا اس کی ماں پریشانی میں پڑ جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بچوں کے رونے کی آواز بھی سنتے تھے اور اُس سے متاثر بھی ہوتے تھے۔ بھلا صاحب استغراق کو یہ بات کہاں پیش آتی ہے اُسے دوسروں کی آوازیں کہاں سنائی دیتی ہیں۔

مدارِ قرب

دوسرے یہ کہ قرب مجاہدہ سے ہوتا ہے اور استغراق میں مجاہدہ کچھ نہیں کیونکہ صاحب استغراق کو توجہ الی اللہ سے مانع کوئی نہیں ہے اور مجاہدہ موانع کا مقابلہ کر کے متوجہ الی اللہ ہونے میں ہے یہ بات صاحب صحو کو حاصل ہوتی ہے اس کو وساوس وخطرات کے ساتھ متوجہ الی اللہ ہونا پڑتا ہے۔ جس میں سخت کشاکشی اور مشقت ہے یہی تو وہ بات ہے جس کی وجہ سے انسان کو ملائکہ پر فضیلت ہے بعض روایات میں آتا ہے کہ ملائکہ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا یعنی اے اللہ! بنی آدم تو کھاتے پیتے ہیں اور ہم یہ کام نہیں کرتے تو ان کے لئے دنیا کر دیجئے اور ہمارے لئے آخرت۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ جس مخلوق کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے یعنی اپنی خاص عنایت وفضل سے اس کو اور اس مخلوق کو کیسے برابر کردوں۔ جس کو میں نے کلمہ کن سے پیدا کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان ملائکہ سے نوعاً افضل ہے باقی جو جواب اس حدیث میں مذکور ہے وہ تو حاکمانہ جواب ہے اور حکیمانہ جواب یہ ہے کہ فرشتوں کو ذکر اللہ میں کچھ مشقت نہیں کیونکہ اُن کو نہ کھانے کی فکر ہے نہ پینے کی نہ بیوی بچوں کی اور انسان کو بڑی مشقت کا سامنا ہے وہ چار طرف سے چھوٹ کر خدا تک پہنچتا ہے تو جس چیز کو ملائکہ نے انسان کے نقص کا سبب سمجھا تھا۔ (یعنی کھانا پینا وغیرہ) وہی اس کے کمال کا سبب ہے کہ باوجود ان جھگڑوں کے ساتھ لگے ہونے کے پھر بھی وہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کھاتے بھی تھے پیتے بھی تھے اُن کی بیویاں بھی تھیں اور پھر بھی اُن میں معصیت کا وجود مطلق نہ تھا۔ اسی طرح اولیاء کرام بھی سب قصوں کے باوجود گناہوں سے بچتے اور خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتے ہیں گو معصوم نہ ہوں۔

غرض استغراق کچھ کمال نہیں ورنہ ملائکہ انسان سے افضل ہوتے بلکہ جس کو استغراق نہیں ہے اس کو قرب زیادہ ہے گو وساوس کتنے ہی ہوں سالک وساوس سے گھبرا جاتا ہے۔ مگر محقق ایک نکتہ سے تسلی کر دیتا ہے۔

چنانچہ سید المحققین صلی اللہ علیہ وسلم سے جب صحابہؓ نے وساوس کی شکایت کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو سید المحققین کہنا بھی بے ادبی ہے مگر کیا کریں اور کیا کہیں کسی طرح نام بھی لیں۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ ہمارے دلوں میں ایسے وسوسے آتے ہیں کہ ہم جل کر کوئلہ ہو جانا پسند کرتے ہیں اُن کو زبان پر لانے سے۔ تو دیکھئے صحابہ کیسے پریشان آئے تھے۔ مگر قربان جایئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ کہ کیسی تسلی فرمائی ہے۔ فرمایا:

اَوَجَدْ تُمُوْهُ ذَاکَ صَرِیْحُ الْاِیْمَانِ (سنن الترمذی:1955، مسند احمد2:258، مشکوۃ المصابیح:3025) کیاتم کو وسوسے آنے لگے یہ تو ایمان خالص کی علامت ہے۔ کیونکہ کفار کو شیطان وسوسہ نہیں ڈالتا۔ اس لئے کہ وہ تو سرتاپا اس کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ اُن کے دل میں وساوس ڈالنے کی کیا ضرورت ہے معاصی یا کفر کے وساوسے اُن کو پریشانی کیا ہوتی۔ وہ تو پہلے ہی سے کافر ہیں ہاں مسلمان یا متقی کے دل میں معاصی یا کفر کے وساوس ڈال کر ان کو پریشان کرتا ہے۔ کیونکہ یہ گناہ اور کفر سے بچنا چاہتا ہے تو شیطان اُن کو پریشان کرتا ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو صریح ایمان ہے۔ اب بتلایئے ایک پریشان شخص کے دل پر اس جملہ سے کیسی ٹھنڈک پہنچی ہوگی۔ غرض ثواب وقرب کا مدار مشقت ومجاہدہ پر ہے اور یہ صاحب وساوس کو زیادہ ہے غیر صاحب وساوس کو نہیں۔ اس لئے وساوس سے گھبرانا نہ چاہئے۔ مگر از خود لانا بھی نہ چاہئے کیونکہ مشقت سے قرب جبھی ہوتا ہے جبکہ وہ مشقت غیر اختیار یہ ہو اختیاری نہ ہو۔ اور اگر کوئی امور غیر مقصودہ ہیں از خود مشقت کو اپنے اوپر لپیٹ لے تو اس سے قرب نہ بڑھے گا۔

میرے ایک دوست اس میں کلام کرتے تھے وہ مشقت کو مطلقاً موجب قرب سمجھے تھے خواہ بالاختیار ہو یا بلا اختیار اور خواہ مقاصد میں ہو یا وسائل میں۔ تو میں نے کہا اچھا پھر نماز کے لئے وضو کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ یہاں ہی حوض سے یا اسی مسجد کے کنوئیں سے پانی لے کر وضو کیا جائے دوسرے یہ کہ ایک دو میل جا کر جلال آباد سے پانی لا کر وضو کیا جائے۔ اگر مشقت مطلقاً موجب ثواب ہے تو آپ یہاں کے پانی سے وضو نہ کیا کریں۔ بلکہ جلال آباد سے پانی لا کر وضو کیا کریں۔ بس اس مثال سے فوراً سمجھ گئے کہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہؓ نے ایسا کبھی نہیں کیا کہ قریب پانی موجود ہوتے ہوئے دور سے لائے ہوں۔ معلوم ہوا کہ مشقت اختیار یہ مطلقاً موجب قرب نہیں ہے ہاں جہاں نص معلوم ہو جائے کہ یہ مشقت اختیار یہ مطلوب ہے تو وہ مستثنیٰ ہوگی۔ جیسے تہجد کے لئے سونے کے بعد اٹھنا واقعی دشوار ہے مگر یہ مشقت مطلوب ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا

کہ رات کو اٹھنے میں نفس بہت زیادہ پامال ہوتا ہے اور اس کے باوجود پھر حکم ہے قُمِ الَّيْلِ یہ تو نص کی وجہ سے مستثنیٰ ہے باقی غیر مقصودہ میں یہی قاعدہ ہے کہ اختیاری مشقت موجب قرب نہیں، یہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ باوجود گھر میں غلہ بھرا ہونے کے فاقہ کرو اور بھوکے رہو۔

فاقہ کے جو فضائل ہیں وہ اُسی وقت ہیں جب کہ گھر میں کھانے کو نہ ہو۔ اس وقت صبر سے قرب و ثواب ہوگا۔ باقی غذا موجود ہوتے ہوئے تو کھانا پینا ہی افضل ہے۔ مگر اس کے ساتھ بھی شرط ہے کہ جتنا نفس کو کھلاؤ پلاؤ اتنا ہی اُس سے کام بھی لو۔ مفت نہ پالو۔ کیونکہ یہ تو حرام خوری ہے کہ پیٹ بھر کے کھانا کھاویں۔ اور کام کچھ نہ کریں یا بہت کم کریں۔ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ ذاکر کو دودھ گھی کھانا چاہئے۔ اس کو فاقہ کرنا یا تقلیل غذا کرنا جائز نہیں۔ بشرطیکہ نفس سے کام اتنا ہی لے جتنا کھاتا ہے۔ بہرحال وساوس کو خود تو نہ لاؤ لیکن جو بے اختیار آویں اُن سے گھبراؤ بھی نہیں۔ کیونکہ ان میں مشقت کی وجہ سے قرب ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بعد تو اب کوئی اشکال نہیں رہا۔ راستہ بالکل صاف ہوگیا اب بھی کوئی رنج وغم میں مرے تو وہ خود اپنے اوپر بلا لیتا ہے اگر صرف شیخ کہتا کہ وساوس مضر نہیں تو اس پر تو یہ احتمال ہوسکتا تھا کہ شاید یوں ہی تسلی کردی ہو اور واقع میں مضر ہوں گو یہ احتمال بھی باطل ہے۔

جیسے حضرت مولانا گنگوہیؒ کے ایک مرید نے مجھ سے اس قسم کی شکایت کی تھی تو میں نے کہا بے فکر رہو۔ اس سے کچھ ضرر نہیں ہوتا تو وہ کہنے لگے کہ حضرت نے بھی یہی فرمایا تھا۔ مگر میں نے سمجھا کہ شاید ویسے ہی تسلی کردی ہو۔ میں نے کہا توبہ کرو شیخ کی نسبت ایسا گمان کرنا بے ادبی ہے۔ شیخ کی جوتی کو غرض پڑی ہے جو مریض کی جھوٹ موٹ تسلی کرے اُس کو مضر حالت کے علاج سے بے فکر کردے اور جو ایسا کرے وہ شیخ نہیں رہزن ہے اس کی تو ایسی مثال ہوئی کہ ایک شخص کو بخار ہو رہا ہے، طبیب سے علاج کرانے جائے اور کہہ دے نہیں تم کو بخار نہیں خوب کھاؤ پیو اور بے فکر رہو بھلا اس کو کوئی طبیب کہہ سکتا ہے ہرگز نہیں۔ میرے اس کہنے سے اُن کی آنکھیں کھلیں اور اس خیال کو دل سے نکالا۔ سو اول تو شیخ پر بھی ایسا گمان نہیں ہوسکتا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تو کسی طرح یہ گمان ہو ہی نہیں سکتا۔ جہاں یہ حکم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ

ترجمہ: اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔ (یعنی پیغمبری کا فرض ادا نہ کیا)

کہ صاف صاف احکام پہنچا دو اور یہ حکم ایسے وقت میں ہوا جب کہ چار طرف سے مخالفت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ اس کے متعلق حق تعالیٰ نے یوں تسلی فرمائی وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۔ خدا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو

لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار سے بھی نہ ڈرنے کا حکم ہے کہ کسی کی پرواہ نہ کیجئے۔ کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود کفار کی سخت مخالفت اور شورش کے صاف صاف تبلیغ فرمائی جب آپ نے دشمنوں کی بھی پرواہ نہ کی تو مسلمانوں کو جھوٹی تسلی کرنے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ضرورت تھی۔ یہاں صاف صاف کہنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا چیز مانع تھی پھر چونکہ **وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ** فرمانے سے آپ کو غایت حرص علی ایمان الکفار سے یہ طمع ہوسکتی تھی۔ کہ بس اب تو سب کافر مسلمان ہوجائیں گے کیونکہ جب کوئی میرا کچھ نہیں کرسکتا تو میں ہر کافر کو قرآن سناؤں گا اور وہ بھی آپ کی زبان سے بھلا کون کافر رہے گا۔ مگر ایسا ہونا مقدر نہیں تھا۔ اس لئے آگے تسلی کے لئے فرماتے ہیں **اِنَّ اللّٰهَ لَايَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ** (بیشک اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہ کریں گے) کہ سب کے اسلام کی طمع نہ کیجئے۔ بعضوں کو حق تعالیٰ ہدایت نہ کریں گے۔ اس اخیر جملہ کا یہ ربط ہے ماقبل سے جو شاید بہت لوگوں کے ذہن میں نہ آیا ہو۔ پس سالک وساوس سے نہ گھبرائے کیونکہ یہ شیطان تو اس وقت تک تمہارے ساتھ رہے گا جب تک تم دربار کے اندر نہ پہنچو۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک بادشاہ کے دربار میں جانا چاہتا ہو اور راستہ میں کوئی باغی دشمن بادشاہ اس کے ساتھ ہولے اور تمام راستہ بادشاہ کو برا بھلا کہتا چلے تاکہ یہ شخص اس میں مشغول ہوکر دربار سے رہ جاوے تو گو اس کو اس کی باتوں پر غصہ آئے گا مگر یہ تو مجرم نہ ہوگا۔ بلکہ مجرم وہی نالائق ہے پھر دربار تک تو وہ ساتھ ہی رہے گا اور دروازہ پر قدم رکھتے ہی یہ شخص تو اندر لے لیا جائے گا اور وہ باغی مار کر باہر نکال دیا جائے گا۔ اسی طرح جب تک تم دربار میں داخل نہیں ہوئے اس وقت تک شیطان تمہاری ساتھ ہے اور وہ کمبخت تمہارے قلب میں دین کے خلاف وساوس ڈالتا رہتا ہے۔ جس پر تم کو غصہ آتا ہے مگر تم مجرم نہیں ہو کیونکہ یہ باتیں تم نہیں کہہ رہے ہو بلکہ باغی کہہ رہا ہے تم تو محض سامع ہو مستمع بھی نہیں ہو (اگر اس پر التفات نہ کرو ۱۲) پھر دربار تک تو یہ نالائق ساتھ رہے گا۔ اس کے بعد تم اندر لے لئے جاؤ گے۔ اور وہ مردود مار کر نکال دیا جائے گا۔ اب تم کو اس درجہ کے وساوس بھی نہ آئیں گے لیکن جو شخص ابھی تک واصل نہیں ہوا اور وساوس میں گھرا ہوا ہے اور اس لئے وہ مسمی کی طرف توجہ تام نہیں کرسکتا۔ تو اس کے لئے توجہ الی اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اسم ہی کی طرف توجہ رکھے اور چونکہ اسم شئی محسوس ہے اس کی طرف توجہ سہولت سے قائم ہوجائے گی۔ یہ حاجی صاحبؒ کی تعلیم ہے اور اس صورت میں توجہ الی الاسم سے وہی ثواب ملے گا

جو توجہ الی المسمّٰے سے ملتا ہے اگر نص میں لفظ اسم نہ ہوتا تو ہمارے پاس اس کی کوئی دلیل نہ ہوتی۔ مگر اب تو دلیل موجود ہے۔ کیونکہ جب نص سے معلوم ہو گیا کہ ذکر اسم بھی مامور بہ اور مطلوب ہے تو ہم نقصان ثواب کے گمان میں کیوں رہیں۔ یہ تو نکتہ تھا لفظ اسم لانے میں۔

اجزائے طریق

اب میں پھر اس طرف عود کر آتا ہوں کہ تبتل الیہ میں وصل و فصل دونوں مذکور ہیں اور یہی خلاصہ ہے طریق کا مگر اس جگہ طریق کا مبداء و منتہی بتلایا گیا ہے کہ فصل مبداء طریق ہے اور وصل منتہی ہے اور ان دونوں کے بیچ میں کچھ وسائط بھی ہیں کیونکہ فصل کے درجات ہیں۔ ناقص اور متوسط اور اعلیٰ پھر جیسا جیسا فصل ہوتا جائے گا۔ ویسا ویسا وصل حاصل ہو جائے گا جب تک فصل ناقص ہے وصل بھی ناقص ہے اور جب فصل متوسط ہوگا۔ وصل بھی متوسط ہوتا جائے گا اور جس دن فصل کامل ہو جائے گا فوراً وصل بھی کامل ہو جائے گا تو اصل مقصود وصل کامل ہے۔

جس کے طریق کے یہاں دو جز بتلائے گئے ہیں۔ ایک ذکر اسم رب ایک فصل عن الغیر مگر آج کل لوگوں نے محض پہلے جز و یعنی ذکر پر اکتفا کر لیا ہے۔ دوسرے جز و یعنی قطع عن الغیر کو ترک ہی کر دیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اکثر سالکین بلکہ اکثر مشائخ بھی قطع تعلقات غیر کا اہتمام نہیں کرتے۔ صرف چند اوراد کے پابند رہتے ہیں۔ اور غضب یہ کہ ورقت ورد میں بھی قطع تعلق عن الغیر کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس وقت بھی اگر کوئی بڑا آدمی ملنے آ جائے تو یہ حضرت تسبیح ہاتھ میں لے کر اس کے پاس باتیں بنانے کو بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی ایسا بھی نہ کرے تب بھی ذکر کے وقت اس کا اہتمام نہیں ہوتا تاکہ قصداً خیالات نہ لائے جائیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ لوگ رات دن تعلقات بڑھائے چلے جاتے ہیں کوئی مدرسہ کے ساتھ تعلقات بڑھا رہا ہے اور سمجھتے ہیں کہ اس میں ثواب ہوگا۔ حالانکہ اس کا مدار خلوص پر ہے۔

معیارِ خلوص

اور خلوص کا ایک معیار ہے جو شیخ علی خواص کے مقولات میں مذکور ہے وہ فرماتے ہیں کہ خلوص کی علامت یہ ہے کہ جس بستی میں دین کا ایک کام تم کر رہے ہو اگر کوئی دوسرا اُسی کام کرنے والا وہاں آ جائے تو تم کو ناگوار نہ ہو۔ بلکہ خوشی ہو کہ الحمد للہ میرا ایک معین و مددگار آ گیا بلکہ اگر وہ کافی ہو تو تم اور کسی ضروری کام میں لگ جاؤ۔ اب دلوں کو ٹٹول کر دیکھ لو کہ کیا تمہاری

یہی حالت ہے۔ ہرگز نہیں ۔اب تو اگر تمہارے مدرسہ کے ہوتے ہوئے بستی میں دوسرا مدرسہ ہو جائے تو دل پر نشتر سا لگتا ہے اور محض دل ہی تک یہ اثر نہیں رہتا۔ بلکہ زبان سے بھی ظاہر ہونے لگتا ہے۔ دوسرے مدرسہ کو مدرسہ ضرار اور دوسری مسجد کو مسجد ضرار کہنے لگتے ہیں۔ یہ لفظ آج کل مولویوں کی زبان پر بہت جلدی آ جاتا ہے۔ بس جہاں ایک قدیم مسجد کے ہوتے ہوئے دوسری مسجد بنائی گئی اور انہوں اس کو مسجد ضرار کا لقب دیا۔ حالانکہ مسجد ضرار کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مسجد ہی نہ تھی۔ اس میں بناء مسجد کی نیت ہی نہ تھی۔ کیونکہ اس کے بانی منافق تھے۔ جن کی نیت ہی مسجد بنانے کی نہ تھی بلکہ محض ایک درالمشورہ بنانا چاہتے تھے۔ جس کو بشکل مسجد اس لئے بنایا تاکہ مسلمانوں کو کسی قسم کا اشتباہ نہ ہو۔ اور یہاں جو مسلمان بھی مسجد بناتا ہے اس کی نیت یقیناً بناء مسجد کی ہوتی ہے وہ کسی اور عمارت کی نیت نہیں کرتا۔ یہ اور بات ہے کہ بناء مسجد میں اس کی نیت تفاخر وریاء کی بھی ہو۔ مگر اس سے اس کی مسجدیت باطل نہ ہوگی۔ بلکہ اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے کوئی مسلمان نماز پڑھنے میں ریاء کا قصد کرے۔ تو اس قصد سے نماز باطل نہ ہوگی۔ گو ثواب نہ ملے مگر اس پر احکام صلوٰۃ ہی کے جاری ہوں گے، پس مسجد ضرار وہ ہے جس میں بناء مسجد کی بالکل نیت نہ ہو بلکہ محض ضرار مسلمین کی نیت ہو یا اور کسی غرض کی۔ اور یہ نیت ایسی متیقن ہو کہ خدا تعالیٰ اُس کی نسبت فرماویں کہ یہ بہ نیت ضرار بنائی گئی ہے اور اب تو تم بھی قسم کھا کر نہیں کہہ سکتے اور اگر کوئی ہیکڑی کر کے قسم کھا بھی لے تو یہ قسم خلاف شرع ہوگی جو غیر معتبر ہے (کیونکہ نیت کا علم سوائے خدا کے کسی کو قطعی طور پر نہیں ہوسکتا) اور تم جو کسی مسجد کو مسجد ضرار کہتے ہو تو بتلاؤ کیا قدرت کے وقت اس پر تم مسجد ضرار کے احکام جاری کر سکتے ہو۔ ہرگز نہیں مسجد ضرار کے احکام یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منہدم کرا کے وہاں آگ لگوا دی تھی اور پاخانہ ڈلوایا تھا تو کیا تم بھی ان مساجد کے ساتھ یہ معاملہ کر سکتے ہو؟

اس پر شائد کوئی یہ کہے کہ یہ احکام تو مسجد ضرار کے ہیں اور یہ مساجد اس کے حکم میں نہیں۔ لہٰذا دونوں کے ساتھ برابر درجہ کا معاملہ نہیں ہوسکتا۔ میں کہتا ہوں کہ پھر آپ لوگوں کو ان مساجد یا مدارس میں جانے سے کیوں روکتے ہیں۔ یہ حکم بھی تو مسجد ضرار ہی کا ہے بلکہ آپ کو چاہئے کہ ان مساجد پر وہ احکام جاری کریں جو مسجد ضرار کے احکام کے مشابہ ہیں جس کی صورت یہ ہے کہ لوگوں کو جانے سے نہ روکو بلکہ یوں کہو کہ نیت فاسدہ کے سبب وہ موجب ثواب نہیں نیز یہ بتلاؤ کہ اگر دوسرے مدرسہ والے یا مسجد والے تمہارے مدرسہ یا مسجد کو مدرسۂ ضرار یا مسجد ضرار کہنے لگیں تو

تمہارے پاس کیا جواب ہے۔ شاید تم یہ کہو کہ ہمارا مدرسہ یا مسجد قدیم ہے۔ اس لئے وہ ضرار میں داخل نہیں ہوسکتا۔ سو خوب یاد رکھو کہ قدیم ہونا ضرار کے منافی نہیں کیونکہ مدار تو نیت پر ہے اگر تمہاری نیت دوسرے مدرسہ یا مسجد کو ضرر پہنچانے کی ہو تو تم بھی ضرار کے مرتکب ہو گے۔ بہر حال آج کل مدارس کے تعلقات کو علی الاطلاق ثواب سمجھ کر بڑھایا جاتا ہے۔ حالانکہ مدار ثواب کا خلوص نیت پر ہے۔ جس کی علامت میں نے ابھی بتلائی، مگر اب یہ نیت اور یہ حالت کہاں ہے۔ علی خواص کا ارشاد سن چکے ہو کہ مخلص کی علامت یہ ہے کہ جب کوئی دوسرا ایک کام کرنے والا آجائے تو یہ شخص اس کام کو چھوڑ دے اور کوئی دوسرا کام کرے۔ بشرطیکہ وہ تم سے اچھا یا تمہارے برابر اس کام کو کرتا ہو البتہ اگر تم اس کام کو اس سے اچھا کرتے ہو تو اس صورت میں چھوڑنے کی ضرورت نہیں بلکہ تم بھی کرتے رہو وہ بھی کرتا رہے۔ جب تک یہ مزاحمت اور نزاع کی صورت نہ ہو اور اگر نزاع و مزاحمت کی صورت ہو تو پھر صوفیہ کا قول یہ ہے کہ تم کسی سے منازعت نہ کرو۔ بلکہ اپنا کام چھوڑ کر منازع کے سپرد کر دو۔ اگر چہ وہ مدعی ہی کیوں نہ ہو۔ بشرطیکہ دین کو کوئی مضرت نہ پہنچے۔

حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ ایسے ہی موقع کے متعلق فرماتے تھے کہ جو شخص کسی بات میں تم سے منازعت کرے تو سب رطب و یابس اس کے آگے رکھ کر خود الگ ہو جاؤ اور کہہ دو کہ ہم کو فیصلہ یا ترجیح کی فرصت نہیں تم خود جس کو چاہو ترجیح دے لو۔ جیسے ایک حجام سے کسی نے کہا تھا کہ میں نے ایک جوان عورت سے شادی کی ہے اس کو سفید بال بُرے لگتے ہیں تو میری ڈاڑھی میں سے سفید بال نوچ دے تو اُس نے اُسترہ لے کر ساری ڈاڑھی مونڈ کر سارے بال اس کے سامنے رکھ دیئے کہ آپ خود سیاہ و سفید کو الگ کر لیجئے۔ مجھے اس کی فرصت نہیں۔ دوسرے کام بھی ہیں۔ مولانا رومیؒ نے اس کی اور مثال دی ہے وہ تو بڑے آزاد ہیں ان کو تمثیل میں کسی مثال سے بھی باک نہیں چنانچہ انہوں نے اول ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص بانسری بجا رہا تھا کہ اس درمیان میں اس کی ریح صادر ہوئی۔ تو اس نے بانسری کا منہ وہاں لگا دیا۔ لے بی! پھر تو ہی بجا لے، اس پر مولانا نے اس مضمون کو متفرع کیا ہے کہ اہل کے سامنے اگر کوئی نااہل دعویٰ کرنے لگے تو اس کو چاہئے کہ اس سے منازعت نہ کرے بلکہ اپنا کام چھوڑ کر اس کے سپرد کر دے کہ اچھا بھائی پھر تم ہی یہ کام کرو۔ میں کوئی دوسرا کام کر لوں گا، اور اس کا ہرگز خیال نہ کرو۔

کہ ایسا کرنے سے دین کا کام بند ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں کیونکہ یہ دین تو وہ ہے جس کی یہ شان ہے ؎

چراغے را کہ ایزد برفروزد ہر آن کو تف زند ریشش بسوزد

جس چراغ کو خداوند تعالیٰ نے جلایا ہو جو اس کو پھونکے اس کی ڈاڑھی جل جاوے گی اور یہ شان ہے۔

اگر گیتی سراسر باد گیرد چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

اگر دنیا سر بسر ہوا بن جائے مقبولان الٰہی کا چراغ ہرگز نہیں بجھتا۔

حق تعالیٰ نے اس دین کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ.

(بے شک ہم نے ہی قرآن حکیم کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)

تو یہ مت سمجھ کہ نااہل پر کام چھوڑ دینے سے دین کا کام رک جائے گا۔ ارے اگر زمیندار کی زمین تم سے کوئی دوسرا کاشتکار چھیننے لگے تو تم زمیندار کو اطلاع کر کے زمین اس کے حوالہ کر دو اگر زمیندار اس سے راضی ہوا تو اسی سے کام لے لے گا (اس صورت میں تو دین کا کام رکنے کا نہیں) اور اگر وہ نالائق ہوا تو پھر زمیندار جوتے مار کر اُسے خود ہی نکال دے گا، اور تمہارے گھر پر بھجوا دے گا۔ اس لئے تم بے فکر بیٹھے رہو۔

غیر مخلص مولوی

مگر اب تو یہ حالت ہے کہ ہمارے اندر اخلاص کا نام ہی نہیں۔ کانپور میں کوئی ایک درجن مدرسے ہوں گے۔ مگر رات دن نزاع اور مزاحمت کے قصے ہوتے رہتے ہیں۔ عوام کی تو میں تعریف کروں گا کہ باوجود اس کے وہ سب مدرسوں کی خدمت کرتے ہیں اور سب کا کام چل رہا ہے مگر قصور ہمارے غیر مخلص مولویوں کا ہے کہ جہاں ایک مولوی کسی مدرسہ کی ملازمت سے ناخوش ہوا وہ اپنا الگ مدرسہ لے کر بیٹھ گیا۔ اور عوام اس کی امداد کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ پھر وہاں عجیب وغریب قصے ہوتے ہیں کہ ایک سال دو مدرسوں کا سالانہ جلسہ تھا۔ جس میں طلبہ کی دستار بندی تھی۔ اُن میں ایک طالب علم ایسا بھی تھا جس نے دونوں مدرسوں میں تعلیم پائی تھی اور زیادہ تعلیم ایک مدرسہ میں ہوئی تھی۔ مگر اخیر سال میں دوسرے مدرسہ میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کی دستار بندی بھی اسی دوسرے مدرسہ میں قرار پائی۔ پہلے مدرسہ والوں کو خیال ہوا کہ اس کی ساری تعلیم تو ہمارے یہاں ہوئی۔ اور اب نام دوسرے مدرسہ کا ہوگا کہ وہاں فارغ ہوا۔ تو انہوں نے اس طالب علم کو بلا کر سمجھایا اور غالباً کچھ رشوت دینے کو بھی کہا کہ بھائی تمہارے ذمہ ہمارے مدرسہ کا زیادہ حق ہے تم کو چاہئے کہ یہیں اپنی دستار بندی کراؤ وہ اس پر راضی ہو گیا۔ تو مدرسہ

والوں کو اطلاع ہوئی۔ اُن کو خیال ہوا کہ ہمارے ہاتھ سے شکار نکلا جاتا ہے۔ کسی تدبیر سے دستار بندی کی تاریخ سے ایک روز قبل اس کو یہاں لائے اور اُس متازع فعلین مختلفین کے محل کو ایک کوٹھڑی میں بٹھلا کر کچھ مٹھائی سامنے رکھ کر ایک جماعت کے ساتھ اس کو کھانے میں مشغول کیا۔ اور ایک ایک کر کے سب اٹھ گئے جب اکیلا رہ گیا باہر سے کنڈی لگا دی اور کہہ دیا کہ تم گھبرانا نہیں یہاں تم کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ تمہارے لئے کھانے پینے کا سامان بہت ہے۔ مگر دستار بندی کے وقت تک تم اس کوٹھڑی سے باہر نہیں جا سکتے۔ غرض صبح تک اسے بند رکھا گیا اور عین دستار بندی کے وقت پابدست دگرے دست بدست دگرے کر کے اسے جلسہ میں لائے اور سب سے پہلے اس کی دستار بندی کر کے چھوڑ دیا۔ کہ جہاں چاہو چلے جاؤ۔ بھلا بتائیے کہ کیا یہ لوگ دین کے خادم ہیں، کیا ان سے دین کی خدمت ہو سکتی ہے۔ اور کیا ان سے کوئی کام ڈھنگ کا ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں پھر کیا اس صورت میں مدارس کے تعلقات میں ثواب ہو سکتا ہے۔

پیری مریدی کی گت

اسی طرح پیری مریدی کی آج کل گت بن رہی ہے۔ حالانکہ اس کا مدار تو سراسر خلوص ہی پر ہے اور کاموں میں تو بدوں خلوص بھی کام تو ہو جاتا ہے گو ثواب نہ ہو مگر یہاں تو اس کے بغیر کام بھی نہیں ہوتا۔ لیکن آج کل اس میں خلوص نہیں رہا۔ نہ مریدوں کی نیت درست ہے نہ مشائخ کی۔ بعضے مشائخ ہر شخص کو مرید کر لیتے ہیں، نہ طلب کی تحقیق کرتے ہیں نہ نیت کی۔ بس یہ سمجھتے ہیں کہ اچھا ہے کہ ایک خادم تو بڑھا پھر اس کے افعال پر اس لئے روک ٹوک نہیں کرتے کہ کہیں بددل ہو کر ہم سے الگ نہ ہو جائے پھر آمدنی کم ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک ایسے پیر کے ایک مرید نے اُن سے اپنا خواب بیان کیا کہ میں نے یہ دیکھا کہ حضور کی انگلیاں تو شہد میں بھر رہی ہیں اور میری انگلیاں پاخانہ میں۔ اتنا کہہ کر وہ ذرا خاموش ہو گیا تو شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ کیوں نہ ہو بحمد اللہ ہم دین کے کام میں رہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ اور تم سگِ دنیا ہو۔ رات دن دنیا کے قصوں میں پھنسے ہوئے ہو۔ مرید نے کہا حضور یہ سب سچ ہے مگر ابھی خواب پورا نہیں ہوا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ آپ تو میری انگلیاں چاٹ رہے ہیں اور میں آپ کی انگلیاں چاٹ رہا ہوں۔ بس یہ سن کر شیخ جھلا اٹھے کہ نالائق مردود کیا بکتا ہے اُس نے کہا حضور میں نے تو خواب عرض کیا ہے۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا جو دیکھا تھا وہ بیان کر دیا۔ اگر یہ خواب تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ مرید تو شیخ سے دین کے لئے تعلق رکھتا تھا۔ اور وہ حضرت اس سے دنیا کے لئے تعلق رکھتے تھے۔

غرض ایسے لوگ اسی واسطے مجمع بڑھاتے ہیں تاکہ بہت سے خادم ہو جائیں۔ ارے کیا ان کو لام پر بھیجنے کو بھرتی کہہ رہے ہو۔ آخر یہ فوج کس لئے بڑھائی جاتی ہے۔ اور اس کے لئے تدبیریں کیوں کی جاتی ہیں حق تعالیٰ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہیں۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ.

(تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں جس سے وہ ایمان ہی لے آئیں)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم شفقت کی وجہ سے یہ چاہتے تھے کہ سارے کافر مسلمان ہو جائیں اور بظاہر یہ خواہش ہر طرح محمود ہی تھی۔ کیونکہ اس میں مخلوق کو جہنم سے نجات حاصل ہوتی تھی۔ مگر حق تعالیٰ نے اس میں بھی کاوش کرنے سے جا بجا منع فرمایا ہے۔ کہ کیا آپ لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا چاہتے ہیں تو جب اصل دین میں بھی ایسی کاوش سے روک دیا تو پھر مشائخ کا یہ جماعت بڑھانا کیسا؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت اہل حق بھی اپنا مجمع بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور سلسلہ بڑھانے کی تدبیریں نکالتے رہتے ہیں۔ یاد رکھو یہ سب فضول ہے۔

احمد تو عاشقی بمشیخت تراچہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

احمد تو عاشق ہے، مشیخت سے تجھ کو کیا کام ہے۔ دیوانہ ہو جا سلسلہ ہوا ہوا نہ ہوا نہ ہوا۔

اور فضول تو اسی درجہ میں ہے جب کہ اس سے ضروریات اور معمولات میں خلل نہ ہو اور اگر اس کی بھی نوبت آنے لگے تو پھر سدراہ ہے لوگ کہتے ہیں کہ ہماری نیت تو مخلوق کی ہدایت ہے سو یاد رکھو کہ اصل مقصود اپنا وصول الی اللہ ہے دوسروں کا ایصال بالذات مطلوب نہیں بلکہ یہ ایصال بھی اسی لئے مطلوب ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہم کو وصول تام ہو جائے۔ حق تعالیٰ راضی ہو جائیں ورنہ ایصال خلق خود بالذات مطلوب نہیں خصوص جبکہ مخل وصول ہونے لگے۔ پس اصلی کوشش اپنے وصول کے لئے کرنا ہے۔ البتہ اگر بدوں کاوش اور بدوں گھیر گھار کے کوئی طالب آ جائے اور اس کی طلب محقق ہو جائے تو اس کی خدمت کر دینے کا بھی مضائقہ نہیں۔ بلکہ طاعت ہے باقی یہ کیا واہیات ہے کہ ساری کوشش سلسلہ بڑھانے ہی کے لئے کی جاتی ہے اور اپنے وصول کی فکر نہیں کی جاتی۔ اگر تم اپنے کام میں لگے رہو اور ایک شخص بھی تم سے بیعت نہ ہو تو وصول میں ذرہ برابر کمی نہ ہوگی۔ کیونکہ وصول کوئی اسی میں منحصر نہیں ہے اُس کے اور بہت طرق ہیں۔

طرق وصول

اس زمانہ کے امام العارفین حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے گو اس موقع میں کہ عام مجمع ہے کہنے کے قابل نہیں مگر اللہ پر توکل کر کے کہتا ہوں اے اللہ! سامعین کو غلطی سے محفوظ رکھئے!

حضرت کے پاس ایک دفعہ ایک بیمار آیا اور رو کر عرض کرنے لگا کہ حضرت اس کا افسوس ہے کہ مجھے کئی روز سے حرم کی نماز بھی نصیب نہیں ہوتی حضرت نے تسلی فرمائی اور بعد میں فرمایا کہ یہ شخص عارف نہیں ہے اگر عارف ہوتا تو اس حالت میں بھی خوش رہتا کیونکہ وصول و قرب حق حرم کی نماز ہی میں منحصر نہیں بلکہ طریق وصول بے شمار ہیں ان میں سے بحالت مرض یہ بھی وصول کا ایک طریق ہے کہ حرم کی نماز سے محروم ہونے پر صبر کرے اور اسی حال میں راضی رہے تو اس شخص کو اس حالت میں نماز حرم سے کم قرب نہ ہوگا۔ جیسا احادیث میں تصریح ہے کہ عذر کی حالت میں جو معمولات میں کمی ہو جاتی ہے تب بھی پورا اجر ملتا ہے۔ سو ایسی حالت میں تم کو کیا حق ہے کہ اپنے لئے ایک طریق کو متعین کرو کہ ہمیں تو حرم کی نماز ہی سے وصول کرایا جاوے ارے میاں تھانہ بھون سے چھوٹی لائن اور بڑی لائن دونوں طرف سے دہلی کا راستہ ہے وہ جس طرف سے چاہیں پہنچا دیں۔ تم کو ایک کی تعیین کا کیا حق ہے۔ اگر قرب و وصول چاہتے ہو تو جو مصیبت پڑے اس پر راضی رہو چاہے قبض ہو یا بسط چاہے وساوس ہوں یا بیماری سب پر صبر کرو کیونکہ جس کو جو حالت غیب سے دی گئی ہے اس کے لئے طریقہ قرب یہی ہے ایسی ہی حالت کی نسبت کہتے ہیں ؎

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش ۔۔۔ بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

باغباں اگر کچھ دن پھولوں کی خوشبو سے منتفع ہونا چاہتا ہے تو جدائی کے کانٹوں کی اذیت پر مثل بلبل کے صبر بھی تو کرنا چاہیے۔

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال ۔۔۔ مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

اے دل اس کی زلف محبت میں پھنس کر پریشانی سے مت گھبرا ہوشیار پرندہ جب جال میں پھنسے تو اس کو صبر و تحمل کرنا چاہیے۔

اس میں قبض وغیرہ پر راضی رہنے کی ہدایت ہے اور فرماتے ہیں ؎

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافری ست ۔۔۔ راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

راہ سلوک میں تقویٰ و عقل پر بھروسہ کرنا ہی کفر ہے۔ راہ رو چاہے سو طریقہ جانتا ہو مگر اس کو توکل ہی کرنا چاہیے۔

اس میں خود رائی اور تجویز کے قطع کرنے کی تعلیم ہے اگر کسی عذر میں حق تعالیٰ مسجد کی نماز سے محروم کر دیں تو تم نماز مسجد کو تجویز نہ کرو چاہے عمر بھر گھر ہی میں نماز پڑھنا پڑے۔

اظہار عجز

صاحب میں تو اپنے مذاق کی بات کہتا ہوں کہ بیماری میں ایسی تکلیف برداشت کرنا کہ چار آدمی اس کو لے جا کر مسجد میں بٹھلائیں۔ میں تو پسند نہیں کرتا ہوں۔ ہاں اگر دوسروں کو بالکل مشقت نہ ہو (یا تنخواہ دیتا ہو ۱۲) اور اس کو بھی زیادہ مشقت نہ ہو نہ عجب و شہرت کا اندیشہ ہو تو

مضائقہ نہیں اور یہی محمل ہے حضرات صحابہ کے فعل کا جو احادیث میں آتا ہے۔

لَقَدْ رَأَيْتُ الرَّجُلَ يُهَادِي بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ حَتّٰى يُقَامَ فِي الصَّفِّ

(سنن الترمذی:2035، مشکوۃ المصابیح:3024، کنز العمال:16825)

(میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ دو شخصوں کے درمیان یہاں تک کہ صف میں کھڑا ہو لیا)

(اخرجہ مسلم والنسائی وابوداؤد وغیرہم عن ابن مسعود جامع ۱۲)

خشک ملا کیا جانے، بس وہ تو اس حدیث کو دیکھ کر ہر حال میں اسی کو افضل کہے گا چاہے دوسروں کو تکلیف ہی ہو چاہے شہرت و عجب ہی پیدا ہو۔

کاندھلہ میں دو بھائی تھے ایک درویش اور دوسرے عالم۔ ایک دفعہ عالم صاحب بیمار ہوئے تو وہ تکلیف میں اللہ اللہ کررہے تھے۔ درویش بھائی اُن کی عیادت کو گئے تو کہا بھائی صاحب! آہ آہ کرو تب اچھے ہوگے تا کہ عجز وضعف ظاہر ہو۔ حالانکہ ظاہر میں اللہ اللہ کرنا افضل تھا مگر اس میں قوت کا اظہار تھا کہ ہم بیمار ہو کر بھی ذکر کے پابند ہیں۔ اس لئے شیخ نے کہا کہ آہ آہ کرو کیونکہ حق تعالی نے بیماری اسی لئے دی ہے تا کہ تمہارا عجز وضعف ظاہر ہو اُس کے ظاہر ہونے کے بعد وہ جلدی اس کو دور کردیں گے۔ اور یہ بھی کلیہ نہیں ہر حالت کا جدا مقتضاء ہے جس کے لئے ضرورت ہے تحقیق کی یا کسی محقق کی تقلید کی۔ غرض ہمیں تو یہ مذاق پسند ہے کہ جس وقت جس حالت کا جو مقتضٰی ہو اس کو بے تکلف ظاہر کیا جاوے۔

چنانچہ ایک بزرگ کو لوگوں نے دیکھا کہ بیٹھے رو رہے ہیں پوچھا کیوں رو رہے ہو فرمایا بھوک لگ رہی ہے۔ کہا گیا پھر کیا بچے ہو کہ بھوک میں روتے ہو۔ فرمایا تم کیا جانو۔ اگر انہوں نے اسی لئے بھوک لگائی ہوتا کہ میرا رونا دیکھیں۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک بار بیمار ہوئے کسی نے پوچھا کہ کیسی طبیعت ہے۔ فرمایا تکلیف ہے کہا کیا آپ شکایت کرتے ہیں۔ فرمایا تو کیا خدا تعالی کے سامنے قوت ظاہر کروں کہ وہ تو مجھ کو ضعف دیں اور میں پہلوان بنوں اور باوجود تکلیف کے یوں کہوں کہ بہت اچھا ہوں مگر یہ وہی کرسکتا ہے جس نے جاہ کو مٹا دیا ہو کیونکہ ان باتوں سے شہرت نہیں ہوسکتی۔ شہرت تو اسی میں ہے کہ تکلیف کو تکلیف نہ کہے اور مصیبت کو راحت کہے اور جو شخص بھوک میں رونے لگے بیماری میں آہ آہ کرنے لگے اس کو تو سب ہی ناقص کہیں گے۔

یہ مضامین منبر پر بیٹھ کر کہنے کے نہ تھے۔ بلکہ سات حجروں میں مقفل ہو کر کہنے کے تھے کیونکہ ان کے لئے فہم و معرفت کی ضرورت ہے مگر چونکہ اس وقت مبادی کے ساتھ ان کا بیان ہوا

ہے۔ اس لئے امید ہے کہ ان شاء اللہ غلطی نہ ہوگی اور جو کسی نے غلطی کی بھی تو بہت سے بہت میرے اوپر فتویٰ لگا دے گا۔ سو ہم پر تو فتوے پہلے ہی بہت لگ رہے ہیں ایک اور سہی مگر ان شاء اللہ مجھ کو تو یہی امید ہے کہ غلطی نہ کریں گے۔ غرض تم کسی بات کی فکر میں کیوں پڑتے ہو کہ ہائے بیماری کی وجہ سے جماعت میں محروم ہوگیا ہائے مسجد فوت ہوگئی۔

تو بندگی چوگدایاں بشرط مزد مکن　　　　که خواجه خود روش بنده پروری داند

تو بندگی کو مزدوروں کی طرح مزدوری پر مت کر کہ مولیٰ حقیقی بندہ پروری کے طریقہ کو اچھی طرح جانتا ہے۔

اسی طرح تم سلسلہ بڑھانے کی فکر میں نہ پڑو، لوگوں کو گھیر گھار کر اپنی جماعت میں لانے کی ضرورت نہیں۔ بس جو آئے خدمت کر دو اور کوئی نہ آئے تو اس کی فکر نہ کرو۔

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو　　　　دار و گیر حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

جو آنا چاہے کہہ دو کہ آوے اور جو جانا چاہے کہہ دو کہ جاوے پیچھا کرنے والا روک ٹوک کرنے والا اس درگاہ میں کوئی نہیں۔

ناکامی کا اجر

رہا یہ کہ زیادہ جماعت ہوگی تو ہم کو خدمت خلق کا زیادہ ثواب ملے گا تو یاد رکھو ثواب خدمت ہی پر موقوف نہیں وہ اور صورتوں سے بھی مل سکتا ہے۔ دیکھو! ایاز کی کوئی تنخواہ معین نہ تھی نہ کسی عہدہ پر مامور تھا۔ مگر تنخواہ داروں سے اچھا پڑ رہا تھا کیونکہ محمود اس کا تھا پس تم بھی خدا کے ہو جاؤ اور اسی کی رضا کی فکر میں رہو تو تم سلسلہ والوں سے ثواب میں زیادہ بڑھ رہو گے یہ مذاق اختیار کرو۔ نص قرآنی سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ جا بجا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی فرماتے ہیں کہ آپ تبلیغ کر کے پھر کسی کی فکر میں نہ پڑیں۔ کہ کون آتا ہے اور کون نہیں آتا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

فَلَعَلَّكَ[1] بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا

اور فرماتے ہیں لَسْتَ[2] عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ

اور اِنَّآ[3] اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ

اور ایک دفعہ کفار نے کوئی خاص معجزہ مانگا تھا کہ ایسا نشان ظاہر ہو تو ہم مانیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل چاہا کہ ان کی درخواست کے مطابق ہی معجزہ ظاہر ہو جائے تو اچھا ہے۔ اس پر

---

[1] اے پیغمبر! اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شائد تم ان کے پیچھے رنج کر کے اپنے تئیں ہلاک کر دو گے۔
[2] تم ان پر داروغہ نہیں اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ [3] ہم نے تم کو سچائی کے ساتھ خوشخبری سنانے والا بنا کر بھیجا ہے

حق تعالیٰ نہایت تشدید کے ساتھ فرماتے ہیں۔

وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ.

یعنی اگر آپ پر اُن کافروں کا اعراض اور انکار ایسا ہی گراں ہے (اور اس لئے آپ چاہتے ہیں کہ کسی طرح مان ہی جائیں) تو اگر آپ سے ہو سکے تو زمین میں سرنگ لگا کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر کوئی معجزہ (ان کی خواہش کے موافق لے آیئے ہم تو ایسا نہ کریں گے) آگے فرماتے ہیں فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ یہاں زبان دانی کی ضرورت ہے۔ اس جگہ ہمارے محاورہ کے اعتبار سے جاہل کے ساتھ ترجمہ کرنا غلط ہے بلکہ یہاں ترجمہ یہ ہے کہ بس آپ نادان نہ بنئے بچوں کی سی ضد نہ کیجئے دیکھئے اس ترجمہ سے کیسی شفقت ٹپکتی ہے جو اس ترجمہ سے ہرگز ظاہر نہ ہوتی کہ بس آپ جاہلوں کیسی باتیں نہ کیجئے بات ایک ہی ہے نادان اور جاہل لغۃً مرادف ہیں مگر ہمارے محاورہ میں جاہل تحقیر کے موقع میں اور نادان شفقت کی جگہ بولا جاتا ہے اور یہ مقام شفقت ہی کا ہے اس لئے یہاں جاہل کا ترجمہ نادان ہی کرنا ضروری ہے۔

آگے آپ کی نیت کا جواب دیتے ہیں کہ آپ خود ان کی خواہش کے موافق معجزہ کو اس لئے چاہتے ہیں کہ یہ لوگ مان جائیں گے تو اس خیال کو دل سے دور کیجئے یہ ماننے والے نہیں ہیں۔

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ بات تو وہی مانتے ہیں جو (کان لگا کر) سنیں بھی اور یہ کمبخت تو مردوں کی طرح سنتے ہی نہیں اگر یہ توجہ سے قرآن کو سن لیں تو پھر اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے معجزے کی بھی ان کو ضرورت نہ رہے پھر خیال ہو سکتا تھا کہ جب یہ ایسے ہیں تو پھر ان کم بختوں کو سزا ہی دی جائے تو فرماتے ہیں

وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ: اور مردوں کو خدا تعالیٰ (ایک دن) اٹھائیں گے پھر سب اُس کے پاس لوٹ کر جائیں گے (اُسی دن اُن مردوں کو بھی دیکھ لیا جائے گا) آپ سزا کی فکر میں کیوں پڑتے ہیں ہمارا ان کا معاملہ ہے ہم خود دیکھ لیں گے۔ چاہے ہم جلدی سزا دیں یا دیر میں آپ کو اس سے کچھ مطلب نہیں۔

اس کے یہ معنے نہیں کہ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کو پسند نہیں کیا۔ بلکہ آپ کے حزن وفکر کو پسند نہیں فرمایا کہ آپ اپنی پھول سی جان کو کیوں پریشانی میں ڈالتے ہیں

بس ان کا معاملہ ہمارے سپرد کر کے بے فکر ہو جایئے۔

صاحبو! بس تم بھی یہی مذاق رکھو جو آئے اس کی خدمت کر دو جو نہ آئے اس کی فکر میں نہ پڑو اور جس کی خدمت کرو اس کی بھی کامیابی کی فکر نہ کرو (ہاں دعا کرتے رہو، باقی اسی کا وظیفہ لے کر نہ بیٹھو) اگر شاگرد کو جلالین اچھی طرح آ جائے تو آدھ سیر خوشی ہے اور جو بالکل نہ آئے تو سیر بھر خوشی ہے کیونکہ تم نے ایک خدمت کی تھی جس میں دنیا میں تم کو ناکامی ہوئی تو انشاء اللہ اس کے حصہ کا بھی سارا اجر آخرت میں ملے گا۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبض آید تو دروے بسط بیں   تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

جب تیری طبیعت کند ہو تو اس میں آثار شگفتگی دیکھ خوش رہ اور پیشانی پر آثار کبیدگی ظاہر مت کر۔

قبض میں بھی گونہ ناکامی ہوتی ہے مولانا اس میں بسط اور انشراح کی تعلیم دیتے ہیں کہ اس پر بھی خوش رہو آگے ناکامی کے متعلق صاف فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو   آں صلاح تست آیس دل مشو

(اے سالک جب تجھ کو کوئی باطنی پریشانی ہو وہ تیری درستی کیلئے ہے دل میں مایوس نہ ہو

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

گر مرادت را مذاق شکر ست   بے مرادے نے مراد دلبرست

اے سالک اگر تیری مراد کا مزہ میٹھا ہے تو کیا بے مرادی دلبر کی مراد نہیں ہے

کیا خوب فرمایا کہ اگر تمہاری مراد کا مزہ شیریں ہے اس لئے تم اس کے طالب ہو تو یہ تو سمجھو کہ بے مرادے دلبر کی مراد ہے پھر عاشق کو اپنی مراد کا طالب ہونا چاہئے یا محبوب کی مراد کا۔ حدیث میں ہے کہ جس غزوہ میں غنیمت کا مال مل جاوے اور صحیح سالم آ جاوے تو دو ثلث اجر یہیں مل گیا اور جس میں جان کا ہی نقصان ہو اور مال بھی کچھ نہ ملے تو اس کا پورا اجر آخرت میں جمع رہا۔ (رواہ مسلم ۱۲) تو بتلاؤ یہ بات خوشی کی ہے یا نہیں۔

اس پر ایک حکایت یاد آئی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو ایک دفعہ کسی حاجت میں رقم کی ضرورت تھی۔ حق تعالیٰ سے دعا کی تو روپے مل گئے پھر خواب میں جنت نظر آئی۔ اور ایک محل بھی دیکھا حاضرین سے پوچھا یہ کس کا محل ہے انہوں نے مولانا کا نام بتلایا مگر دیکھتے ہیں کہ اس کا ایک کنگرہ ٹوٹا ہوا ہے۔ مولانا نے پوچھا کہ یہ کنگرہ ٹوٹا ہوا کیوں ہے، جواب دیا گیا کہ انہوں نے دنیا میں مانگ لیا جب خواب سے بیدار ہوئے تو آپ حق تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں

کہ حضور اگر جنت کے کنگرے ہم کو یہاں ملنے لگیں گے تو ہم تو اپنا سارا محل یہاں ہی کھا جائیں گے آپ کے یہاں کیا کمی ہے یہاں الگ دیجئے وہاں الگ دیجئے۔ مولانا مقامِ ناز میں تھے اس لئے حق تعالیٰ سے وہ ایسی باتیں کرلیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ غالباً حضرت مولانا نانوتویؒ نے مولانا محمد یعقوب صاحب کا ایک ناز کا فقرہ سن لیا تھا تو گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ یہ انہی کا مقام ہے کہ ایسی بات کہہ گئے کوئی دوسرا کہتا تو کان پکڑ کر نکال دیا جاتا۔ غرض حدیث سے اور بزرگوں کے کشف سے معلوم ہوا کہ جس عمل کا ثمرہ کچھ یہاں مل جاتا ہے تو اجر کی آخرت میں کمی ہو جاتی ہے۔ اس لئے اگر یہاں ناکامی ہو تو زیادہ خوش ہونا چاہئے۔ پورا اجر جمع ہے پس اگر کسی کی آپ خدمت کریں اور وہ کامیاب نہ ہو تو رنج نہ کرو۔ بلکہ کامیابی سے زیادہ خوش رہو۔

فراق صوری

عارفین کو تو اگر رضا نصیب رہے تو فراق پر بھی راضی ہیں اور وہ فراقِ حقیقی نہیں ہوتا۔ فراق اصطلاحی ہوتا ہے اور رضا کے ساتھ اگر ان کو جہنم میں بھی بھیج دیا جائے تو اس پر بھی راضی ہیں اور یوں کہتے ہیں ؎

اُرِيْدُ وِصَالَهٗ وَ يُرِيْدُ هِجْرِےْ فَاَتْرُکُ مَا اُرِيْدُ لِمَا يُرِيْدُ

میں اس کا وصال چاہتا ہوں اور وہ مجھ سے جدائی چاہتا ہے پس میں اپنے ارادہ کو چھوڑتا ہو محبوب کی خواہش کی وجہ سے۔

عارف اسی کا ترجمہ فرماتے ہیں ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق ترک کام خود گرفتم تا برآید کامِ دوست

میری خواہش وصل کی اس کی خواہش جدائی کی میں نے اپنا مقصد چھوڑا تا کہ دوست کا مقصد پورا ہو۔

کسے پیش شوریدہ حالے بنشت کہ دوزخ تمنا کنی یا بہشت

کسی نے ایک عاشق کو تحریر کیا کہ کہ تیری تمنا دوزخ کی ہے یا بہشت کی

بگفتا مپرس از من ایں ماجرا پسندیدم انچہ او پسند و مرا

وہ بولا کہ مجھ سے اس کا تذکرہ نہ کر میں نے اس کو پسند کیا جو میرے لئے محبوب نے پسند کیا۔

اور گو عاشق تو غلبۂ سکر میں فراقِ حقیقی پر بھی راضی ہے مگر وہ اس کو فراقِ حقیقی میں مبتلا

کرتے نہیں۔ کیونکہ جب اس کو عاشق مان لیا گیا تو عاشقوں کے ساتھ وہ ایسا برتاؤ کب کر سکتے ہیں وہ تو اپنے وصال سے مشرف کرنے کے لئے بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ فاسقوں کو بھی ذرا سی بات پر مشرف بوصال کردیتے ہیں پھر عاشقوں کو تو کیسے محروم کردیں گے۔

ایک بت پرست کا قصہ ہے کہ وہ برسوں ایک صنم کی پرستش کرتا رہا۔ اور زبان سے بھی صنم صنم کہتا رہا۔ ایک دن غلطی سے بجائے صنم کے زبان سے صمد نکل گیا تو معاً غیب سے آواز آئی۔

لَبَّیْکَ یَا عَبْدِیْ لَبَّیْکَ: اس پر حال طاری ہوگیا۔ اور بت کے ایک لات ماری کہ کمبخت تجھے اتنے عرصہ تک میں نے پکارا ایک دن بھی تو نے جواب نہ دیا میں قربان جاؤں اپنے خدا کے کہ ایک دن غلطی سے اس کا نام زبان سے نکل گیا تو اس کا بھی فوراً جواب دیا۔ سچ ہے ؎

رحمتِ حق بہانہ می جوید　　　　اور رحمت حق بہائی جوید

اللہ کی رحمت بہانہ ڈھونڈتی ہے　　　　بہاؤ نہیں ڈھونڈتی

جب وہ غیر عشاق کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے ہیں تو عشاق کو فراقِ حقیقی میں کب مبتلا کریں گے گو یہ اس پر بھی راضی ہو بلکہ صرف فراق صوری میں کبھی مبتلا کردیتے مگر اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک عاشق کو محبوب کسی کام کے لئے بازار بھیج دے تو اس وقت گو یہ فراق صوری میں مبتلا ہے مگر بوجہ رضا کے قرب سے مشرف ہے اور جو اس سے مچلے وہ عاشق نہیں وہ گو ظاہر میں پاس بیٹھا ہوا ہے۔ مگر باطن میں مبتلائے غضب ہے۔

طلب رضاء

عاشق کی تو شان یہ ہے کہ اگر محبوب سچ مچ بھی نکال دے۔ جب بھی اس کے تعلق میں فرق نہ آئے کسی مشاعرہ میں ایک شاعر نے یہ شعر پڑھا ؎

اُسکے کوچہ سے جب اُٹھ اہل وفا جاتے ہیں　　　　تا نظر کام کرے رو بقفا جاتے ہیں

تو اسی وقت ایک شاعر نے جواب دیا ؎

اُسکے کوچہ سے کب اُٹھ اہل وفا جاتے ہیں　　　　وہ ہوسناک ہیں جو رو بقفا جاتے ہیں

خوب جواب دیا مگر اس جواب کا محمل وہی ہے جو خود اُٹھ کر جاوے لیکن اگر محبوب ہی اُٹھاوے تو وہ غیبت میں بھی حاضر ہے۔ غرض عشاق تو آخرت کے بھی فراق پر راضی ہیں اور وہ فراق یہ ہے کہ اُن کو جہنم میں بھیج دیا جائے مگر وہ بھی حقیقی فراق نہ ہوگا یعنی جہنم میں اُن پر عذاب نہ ہوگا۔ کیونکہ جہنم میں جانا عذاب کو مستلزم نہیں جیسے زبانیہ جہنم دوزخ میں موجود ہیں مگر معذب نہیں ہیں۔

یہاں سے حل ہوگیا۔ ارشادنبویؐ: اَلْوَائِدَةُ وَالْمَوْءُ دَةُ كِلَاهُمَا فِي النَّارِ

(مسند أحمد4:59، سنن النسائی2:228، کنز العمال:19006)

کہ زندہ گاڑنے والی اور زندہ درگو کی ہوئی دونوں جہنم میں ہوں گی۔ یہاں اشکال ہوتا ہے کہ مؤودہ کا کیا قصور ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس کا جہنم میں جانا قصور کی بناء پر نہیں ہے بلکہ وائدہ کے عذاب روحانی کے لئے جاوے گی۔ تا کہ اُس کو دیکھ دیکھ کر ماں کی حسرت بڑھے کہ میں نے اس کے ساتھ کیسی بے رحمی کا برتاؤ کیا تھا۔ جس کی وجہ سے آج یہ عذاب اور رسوائی ہو رہی ہے تو وائدہ کو عذاب جسمانی بھی ہوگا اور عذاب روحانی بھی اور مَوْءُ دَةُ کا جہنم میں ہونا اس کے معذب ہونے کو مستلزم نہیں۔

اور یہی جواب اس اشکال کا ہے جو آیت اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

(اے مشرکو! بے شک تم اور جن کو تم خدا سمجھ کر پوج رہے ہو سب جہنم میں جھونکے جاؤ گے اور تم اس میں داخل ہو گے اور یہ بات سمجھنے کی ہے اور تم واقعی معبود ہوتو جہنم میں کیوں جاتے اور سب (عابدین معبودین) اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے)

اور حدیث ہے اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ يُكَوَّرَانِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْ جَهَنَّمَ (او كما قال)

(الصحيح للبخاری3:51، الصحيح لمسلم كتاب الصيام : 193سنن النسائی4:211)

(بے شک سورج اور چاند دونوں دوزخ میں ڈالے جائیں گے)

پر وارد ہوتا ہے کہ آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنی چیزوں کی اللہ کے سوا عبادت کی گئی ہے جیسے اصنام اور شمس وقمر وغیرہ وہ سب جہنم میں ڈالے جائیں گے اور حدیث میں شمس وقمر کی تصریح ہے اس پر بھی وہی سوال ہوتا ہے کہ ان چیزوں نے کیا قصور کیا۔ جب میں بچہ سا دیوبند میں پڑھتا تھا تو مجھے یاد ہے کہ اس مسئلہ میں دو مولویوں کے درمیان تقریباً دو گھنٹہ تک بحث رہی ایک کہتے تھے کہ ان کو عذاب نہ ہوگا کیونکہ یہ جمادات ہیں دوسرے کہتے تھے کہ نہیں ان کو بھی عذاب ہوگا۔ کیونکہ یہ سبب شرک تھے۔

اس وقت تو میں کچھ نہ بولا کیونکہ بزرگوں کی بات میں دخل دینا خلاف ادب تھا مگر اب بولتا ہوں کیونکہ شاید اس وقت میری داڑھی کچھ اُن سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے (یہ بطور لطیفہ کے فرمایا۱۲) جواب وہی ہے کہ ان اشیاء کا دخول جہنم قصور کی وجہ سے نہ ہوگا اور سببیت بلا قصد کوئی قصور نہیں ورنہ بات بہت دور تک پہنچے گی۔ بلکہ ان کو کفار کی حسرت بڑھانے کے لئے جہنم میں بھیجا جائے گا تا کہ وہ ان کو دیکھ دیکھ کر اپنے حماقت پر افسوس کرتے رہیں کہ ہم نے کن چیزوں کو معبود بنایا تھا۔ اور جہنم میں کسی کا ہونا ان کے معذب ہونے کو مستلزم نہیں جیسا کہ ابھی معلوم ہوا۔

غرض عشاق اگر جہنم میں بھیج بھی دیئے جائیں تو ان کا دوزخ میں جانا اور طرح کا ہوگا۔ معذبین کی طرح نہ ہوگا۔ دیکھو جیل خانہ میں جانا تو ایک مجرم کا ہے اور ایک جیلر کا اور ایک ڈاکٹر کا جانا ہے جو مجرموں کی صحت کا معائنہ کرتا ہے۔ کیا سب کا جانا برابر ہے ہرگز نہیں۔ بلکہ حیثیات کا فرق موجود ہے گو بظاہر سب جیل خانہ ہی میں ہیں مگر ڈاکٹر اور جیلر گورنمنٹ کے مقرب ہیں اور مجرم معتوب ہیں یہی فرق حیثیات دخول جہنم میں بھی کیوں نہیں مانتے آخر معقول کس لئے پڑھی تھی کیا ماکول بنانے کے لئے پڑھی تھی۔ صاحب اس سے کام لو تو پھر کچھ بھی اشکال نہیں۔

اسی فرق حیثیات سے ایک اور اشکال رفع ہوتا ہے وہ یہ کہ عقائد کا مسئلہ ہے کہ رضا بالقضاء واجب ہے اور دوسرا مسئلہ ہے کہ خیر وشر سب قضا وقدر کے تابع ہیں تو کفر بھی قضاء سے ہے اور تیسرا مسئلہ ہے کہ رضا بالکفر کفر ہے تو اب رضاء بالقضاء کیونکر ہوا اگر ہر قضاء کے ساتھ رضاء لازم ہے تو پھر کفر سے رضا لازم ہوگی۔ حالانکہ رضا بالکفر کفر ہے اس کا ایک جواب تو علماء ظاہر نے دیا ہے کہ قضاء کے ساتھ تو رضا لازم ہے مگر مقضی کے ساتھ لازم نہیں اور کفر مقضی ہے قضاء نہیں تو رضا بالکفر اس لئے کفر ہے کہ اُس میں رضا بالمقضی ہے اور رضا بالمقضی مطلقاً واجب بلکہ جائز بھی نہیں بلکہ اگر مقضی خیر ہے تو رضا واجب ہے اور اگر شر ہے تو جائز نہیں۔ مگر اس جواب میں بہت تکلف ہے عارفین نے اس سے بڑھ کر یہ کہا کہ رضاء بالکفر میں حیثیات کا فرق ہے یعنی ایک حیثیت تو کفر میں صدور عن العبد کی ہے اور اس درجہ میں یہ شر محض ہے اور اسی درجہ میں اس پر رضا کفر ہے اور ایک حیثیت مخلوقیہ للحق کی ہے یعنی وہ حق تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس درجہ میں وہ حکمتوں کو متضمن ہے اور اسی درجہ میں اس پر رضا واجب ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ مکسوب للعبد ہونے کی حیثیت سے اس پر رضا جائز نہیں اور مخلوق للحق ہونے کی حیثیت سے اس پر رضا واجب ہے مولانا اسی کو فرماتے ہیں ۔

کفر ہم نسبت بخالق حکمت ست   گر بما نسبت کنی کفر آفت است

کفر اس کی مخلوق ہونے کی بناء پر سراسر حکمت ہے اور کفر بندے سے سرزد ہونے کی بناء پر سراسر آفت ہے اور عارف فرماتے ہیں ۔

درکار خانہ عشق از کفر ناگزیر ست   آتش کرا بسوزد گر بولہب نبا شد

دنیا میں کفر کا ہونا بھی ضروری ہے   اگر کوڑا کرکٹ نہ ہو تو آگ کس طرح روشن ہو۔

یعنی حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے کفر میں بھی حکمتیں ہیں کہ اس سے

صفت قہر وجلال واسم منتقم کا ظہور ہوتا ہے نیز اس سے ایمان اور مؤمنین کی رفعت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اضداد ہی سے اشیاء کا ظہور کامل ہوتا ہے نیز اس سے کارخانۂ دنیا کی رونق اور ترقی ہے کیونکہ دنیا میں پوری ترقی کافر ہی کرسکتا ہے جس کو آخرت کی کچھ بھی فکر نہیں۔ مسلمان چونکہ آخرت کی فکر میں رہتا ہے وہ دنیا میں پوری طرح منہمک نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ ریل اور تار اور قسم قسم کی نئی ایجادیں کیونکر ظاہر ہوتیں تو خدا تعالیٰ نے جو کفر کو پیدا کیا اس میں بہت حکمتیں ہوئیں اور بندہ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے کفر میں کوئی حکمت نہیں کیونکہ جو شخص کفر کر رہا ہے اس کا اپنے کفر سے کیا نفع ہے کچھ بھی نہیں بلکہ اس کا تو ضرر ہی ضرر ہے گو اُس کے ضرر سے مجموعہ عالم کا نفع ہے مگر خاص اُس کا تو سراپا ضرر ہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا باغی ہوگیا۔ پس کفر اس حیثیت سے کہ خدا کا پیدا کیا ہوا ہے اس کے ساتھ رضا لازم ہے چنانچہ اگر کوئی یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے کفر کو کیوں پیدا کیا، یہ پیدا کرنا برا ہوا یہ کفر ہے اور اس حیثیت سے کہ یہ بندہ کا فعل ہے اس کے ساتھ رضا کفر ہے۔ مثلاً کوئی یہ کہے کہ بہت اچھا ہوا کہ فلاں کافر ہوگیا تو یہ کفر ہے خوب سمجھ لو۔

دیکھئے معقول نے کتنا نفع دیا کہ فرق حیثیات سے بہت اشکال مرتفع ہوگئے میں یہ کہہ رہا تھا کہ عارفین تو ناکامی میں بھی خوش ہیں۔ بس اُن کو صرف ایک رضا مطلوب ہے اگر ان کی ناکامی ہی سے راضی ہوں تو وہ اسی میں خوش ہیں گو ایسا ہوگا نہیں اور یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ تم کسی کی خدمت کر کے یہ تجویز نہ کرو کہ وہ کامیاب ہی ہوجاوئے ہاں دعا کرنے کا کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر اس کو اتنا لپٹنا کہ اگر ناکامی ہو تو رنج ہو یہ مناسب نہیں۔ چنانچہ نصوص سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے جابجا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لگنے اور لپٹنے سے منع فرمایا ہے، پھر اس انہماک سے کیا فائدہ جو آج کل لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے کہ اپنی جماعت کو بڑھانا چاہئے سلسلہ کو پھیلانا چاہئے، اور اس کے لئے مختلف تدبیریں کرتے ہیں۔

کمالِ وصول

غرض آج کل میں دیکھتا ہوں لوگوں کو وصل کی تو کچھ فکر ہے گو بے اصول سہی مگر فصل عن الخَلق کا مطلق اہتمام نہیں۔ تعلقات کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں میں دیکھتا ہوں کہ مشائخ کا مریدوں کے اجتماع و ہجوم سے جی نہیں گھبراتا۔ نہ اُن کی تعظیم و تکریم سے الجھن ہوتی ہے۔ حالانکہ ضرورت ہے کہ کوئی وقت تو ایسا ہو کہ جس میں مخلوق سے یکسو ہو کر خالق کی طرف متوجہ رہا جائے۔ بھلا اور تو کس شمار میں ہیں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی امر ہے۔

وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا: (اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جا۔) جس میں مفعول مطلق تاکید کے لئے ہے حاصل یہ ہوا کہ مخلوق سے کامل طور پر منقطع ہو کر حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے اور ظاہر ہے کہ کامل توجہ بدوں تقلیل تعلقات کے ہر گز نہیں ہو سکتی تو مشائخ اور سالکین کو تعلقات قائم کرنے کا اہتمام ہونا چاہئے اور لوگوں کے اجتماع و ہجوم سے پریشانی اور تعظیم وغیرہ سے الجھن ہونی چاہئے۔ یہ مذاق پیدا کرو کیونکہ کمال وصول بدوں اس کے نہیں ہو سکتا۔ سوا گر ان آفات سے بچنا چاہتے ہو تو تجربہ کی بناء پر میری رائے یہ ہے کہ کٹے مُلّاً بن کر رہو کہ نہ ہو حق ہو نہ تعویذ گنڈوں کا سلسلہ ہو درویشوں کا رنگ نہ اختیار کرو اس سے ہجوم خلق ہوتا ہے بلکہ مُلّا نے بن کر رہو تا کہ لوگ صورت دیکھ کر یہ سمجھیں کہ یہ سب خشک مولوی ہیں۔ اور اپنے متعلقین کو بھی ایسا بننے کی تاکید کرو بس اندر اندر جس کو چاہو جو چاہو دیدو اور اس طرح دو کہ کسی کو خبر بھی نہ ہو کہ ان میں بھی کچھ ہے ان ظاہری سامانوں کو دور کرو اور حتی الامکان اپنے کو مستور رکھو۔ رئیس العاشقین مولانا جامیؒ جو کہ نقشبندی ہیں فرماتے ہیں۔

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار اند	که برندازه ره پنہاں بحرم قافلہ را

حضرات نقشبند طالبین کی عجیب رہبری کرتے ہیں حرم خداوندی میں بے معلوم راستہ سے قافلہ کو پہنچا دیتے ہیں۔

اور تخصیص نقشبندیہ کی محض ذکر ہی ہے ورنہ محققین کی سب کی یہی شان ہوتی ہے کہ چپکے چپکے اندر ہی اندر جو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں اور سالک کو اس طرح لے جاتے ہیں کہ بعض اوقات خود بھی خبر نہیں ہوتی کہ میں کہاں تھا اور کہاں پہنچ گیا۔ آگے فرماتے ہیں کہ باوجود اخفاء کے فیض کی یہ حالت ہے کہ ؎

ہمہ شیرانِ جہاں بستہ ایں سلسلہ اند	روبہ از حیلہ چہ ساں بگسلد ایں سلسلہ را

جب ساری دنیا کے شیر اس زنجیر طریقت میں بندھے ہوئے ہیں، بھلا لومڑی اپنے حیلہ و مکر سے اس زنجیر کو کس طرح توڑ دے گی، غرض اپنی طرف سے تو اخفاء کا اہتمام کرو۔ ہاں اگر ڈھول خود ہی گلے میں پڑ جائے اور خود بخود بجنے بھی لگے تو اس کو بند نہ کرو، اگر رونا آوے رولو چیخیں نکلیں تو نکلنے دو اور عشق الٰہی جس طرح ظاہر ہونا چاہے ظاہر ہونے دو، مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیز	عشق عاشق باد وصد طبل و نفیر

محبوبوں کا عشق پوشیدہ تیر کی طرح ہے عاشق کا عشق سینکڑوں طبل نفیر کی مانند ہے۔

ہوس کمال

اور عارف فرماتے ہیں ؎

من حال دل اے زاہد باخلق نخواہم گفت　　　　کیں نغمہ اگر گویم باچنگ ورباب اولیٰ

زاہد میں اپنے دل کے حال کو مخلوق سے نہیں کہنا چاہتا۔ کہ یہ نغمہ اگر میں گاؤں گا تو اس کے لئے چنگ وارباب سے بھی زیادہ موزوں ہوں۔

یہ بھی ایک رنگ ہے اس میں بھی مزا ہے کہ لوگ وجد وحال کو دیکھ کر مکار کہیں۔ اگر وہ تم کو مکاروں میں شمار کرائیں تو اس سے بھی راضی رہو۔ اور مخلصین میں شمار کرائیں تو اسی میں خوش رہو اپنی طرف سے کوئی حالت اپنے لئے تجویز نہ کرو۔ بس یہ شان رکھو کہ ؎

من چو کلکم درمیان اصبعین　　　　نیستم در صف طاعت بین بین

میں قلم کی طرح انگلیوں کے درمیان میں ہوں، بین بین اطاعت کرنیوالوں میں سے نہیں ہوں۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست　　　　می بردہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

میری گردن میں دوست کی رسی پڑی ہوئی ہے جہاں اس کا جی چاہتا ہے لے جاتا ہے۔

اعمال تو وہی کرے جو مامور بہ ہیں، ایسا اخفاء نہ کرے کہ اعمال خلاف شرع اختیار کرنے لگے، باقی احوال میں جو حال مل جاوے اس پر راضی رہے کمال کی ہوس نہ کرے یہ بھی بڑا راہزن ہے کہ سالک کمال کی ہوس کرنے لگے۔ ایک بزرگ کے مُرید کو طریق میں کشود کار نہ ہوتا تھا۔ انہوں نے بہت ہی توجہ کی اور بڑا زور لگایا مگر چلتا ہی نہ تھا، آخر ایک دن پوچھا کہ ظالم یہ تو بتلا کہ ذکر میں تیری نیت کیا ہے۔ کہنے لگا میری نیت یہ ہے کہ کامل ہو جاؤں پھر دوسروں کی اصلاح کروں۔ فرمایا ارے توبہ کر توبہ کر تو تو شرک میں مبتلا ہے۔ چولہے میں ڈال کمال کو اور مخلوق کی اصلاح کو۔ بس یہ نیت کر کہ مجھ سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں۔ کیسا کمال اور کہاں کی مشیخت یہ حال بناؤ ؎

افروختن وسوختن وجامہ دریدن　　　　پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

(شمع نے جلنا پروانہ نے فدا ہونا　　　　پھولوں نے چاک دامن کرنا مجھ ہی تو سیکھا ہے۔)

پھونک دو اپنی ہوس کو اور جلا دو اپنی تجویز کو بس فنا اور تفویض کلی اختیار کرو۔ میاں کو راضی رکھنے کی کوشش کرو۔ کمال کی ہوس کرنے والے تم کون ہو۔ واللہ بندہ کو اپنی حقیقت بھی معلوم ہوتی تو دعوے سب رہ جاتے ہیں اور ساری ہوس کمال دماغ سے نکل جاتی ہے۔ عارف اپنی طرف سے کبھی نفع پہنچانے کا قصد نہیں کرتا نہ اصلاح خلق کا خیال دل میں لاتا ہے کیونکہ اس کو اپنی حقیقت معلوم ہے وہ جانتا ہے کہ بھلا میں کسی کو نفع پہنچاؤں یا میں کسی کی اصلاح کروں۔

ترک ثناء

عظمت حق جب دل پر غالب ہوتی ہے تو یہ سب خیالات پاش پاش ہو جاتے ہیں۔[1] واللہ بعض دفعہ عارف کو حمد و ثناء کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ میرا منہ اور خدا تعالیٰ کی ثناء ہائے

خود ثناء کردن زمن ترک ثناء است   کایں دلیل ہستی و ہستی خطا ست

(میرا حمد و ثناء بیان کرنا ترک ثناء کے حکم میں ہے اس لئے کہ یہ دعویٰ ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے)

جب یہ حال غالب ہوتا ہے تو زبان سے ذکر بھی نہیں نکلتا۔ لوگ اس کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے کہ خود ثنا کردن زمن ترک ثناء۔ کیونکر ہے مگر مجھے برسوں سے اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اُس کا واقعہ بیان کرتا ہوں۔ میرے پاس حضرت استادی مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کے ترجمہ قرآن کا ایک پارہ صاحب مطبع نے بھیجا تھا کہ اس ترجمہ کے متعلق اپنی رائے لکھ دو واللہ! اس وقت مجھے اس بات کے تصور سے بھی شرم آئی کہ میں اور حضرت کے ترجمہ کی تعریف کروں۔ کیا مولانا کا ترجمہ بھی میری تقریظ کا محتاج ہے۔ استغفر اللہ اس وقت سے مجھے بے ساختہ اس کا انکشاف ہو رہا ہے ۔

خود ثنا کردن زمن ترک ثنا است   ایں دلیل ہستی و ہستی خطا است۔

(میرا حمد و ثنا بیان کرنا ترک ثناء کے حکم میں ہے۔ اسلئے کہ یہ دعویٰ ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے) مولانا کے سامنے تو ہمارا یہ حال ہونا چاہئے کہ ۔

باوجودت زمن آواز نیاید کہ منم (تیری موجودگی میں میرے لئے یہ زیبا نہیں کہ میں کہوں کہ میں ہوں)

صاحبو ! جب ایک مخلوق کی عظمت حمد سے مانع ہوگئی تو خالق کی عظمت کیوں نہ مانع ہو خود سید العارفین صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ۔

لَا اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ

(لم أجد الحديث بهذا اللفظ فی موسوعة اطراف الحديث النبوی الشريف)

(میں آپ کی تعریف کا حق ادا نہیں کر سکتا جیسا کہ آپ نے اپنی تعریف خود فرمائی)

اور بڑا کامل ہے وہ شخص جو اس عظمت کے انکشاف کے بعد بھی کچھ ثناء کر لے حضرت

---

[1] اس وقت مجمع پر عالم تحیر تھا، بعض پر گریہ طاری تھا اور حضرت قدس سرہٗ پر نہ معلوم کیا کیفیت طاری تھی بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت عظمتِ حق کا پورا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ لفظ لفظ سے فنا اور عجز کا ظہور تھا۔ چہرہ پر آثار جلال نمودار تھے۔ متع اللہ المسلمین بطول بقاۂ ۱۲)

مرزا جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے خوب حمد کی ہے جو دونوں حالت کی جامع ہے ۔

خدا در انتظار حمد ما نیست محمد چشم برراہ ثنا نیست

(خدا اور سول ہماری حمد وثناء کے منتظر نہیں ہیں)

خدا مدح آفریں مصطفےٰ بس محمد حامد حمد خدا بس

(خالق کی تعریف، تعریف مصطفےٰ کے لئے کافی ہے خدا کی حمد وثناء بیان کرنے کے لئے محمد کافی ہے۔)

سبحان اللہ کیا پاکیزہ مضمون ہے آگے فرماتے ہیں ۔

مناجات اگر خواہی بیان کرد بہ بیتے ہم قناعت میتواں کرد

اگر تو دعا ہی مانگنا چاہتا ہے۔ تو اس ایک شعر پر بھی قناعت کرسکتا ہے

محمد از تو می خواہم خدا را الٰہی از حب مصطفےٰ را

(اے محبوب خدا تجھ سے خدا کو پہچاننا چاہتا ہوں اے اللہ! تجھ سے محمد مصطفےٰ کی محبت چاہتا ہوں)

اہتمام فصل

غرض کمال کی ہوس نہ کرو۔ جہاں تک ہو سکے اعمال کا اہتمام کرو اس طرح سے کہ وصل کے ساتھ فصل کا بھی اہتمام کرو جس کا اس آیت میں امر ہے اور دوسرے مقامات پر بھی اس کی تعلیم بھری ہوئی ہے کہ خدا تعالیٰ کے تعلق کو تمام تعلقات پر غالب کرو۔ اور یہی مراد ہے فصل سے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ : اس سے پہلے کفار کے بارہ میں فرمایا ہے۔ **يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ** کہ وہ اپنے اصنام سے ایسی محبت کرتے ہیں۔ جیسی خدا تعالیٰ سے یہاں شبہ ہوگا کہ کفار کو خدا تعالیٰ سے محبت کہاں تھی جو اس کے برابر بتوں سے محبت کرتے تو خوب سمجھ لو کہ کاف مماثلت میں نص نہیں ہے بلکہ مشابہت کے لئے ہے، مطلب یہ ہے کہ بتوں کے ساتھ ان کی محبت مشابہ اس محبت کے ہے جو خدا سے محبت رکھنے والوں کو خدا سے ہوا کرتی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ کہ مسلمانوں کو خدا سے زیادہ محبت ہے۔ اس میں مشابہت مذکورہ پر بھی نکیر ہے یعنی کسی مخلوق کی محبت خدا تعالیٰ کی محبت کے مشابہ بھی نہ ہونا چاہئے برابر ہونا تو در کنار محبت خدا کا رنگ ایسا غالب ہونا چاہئے کہ سارے عالم پر ظاہر ہو جائے کہ ان کو سوائے حق تعالیٰ کے کسی کی محبت نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔

قُلْ[۱] اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآءُ كُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْ هَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۔

فرما دیجئے ۔ اگر تم کو اپنے باپ ماں اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور خاندان اور وہ مال جن کو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کے مندا ہونے کا خطرہ ہے خدا اور رسول سے اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو منتظر رہو۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ اپنا (دوسرا) حکم بھیج دیں۔ اس میں بھی دوسری چیزوں کی احبیت پر وعید ہے۔ اور اس کا امر ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت تمام محبتوں پر غالب ہونا چاہئے ورنہ حکم ثانی کی وعید ہے کہ تا صدور حکم ثانی مقدمہ ملتوی ہے ایک مقام پر ارشاد ہے کہ ان تعلقات سے خدا تعالیٰ کا قرب نہیں ہوتا۔

وَمَا اَمْوَالُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۔

ترجمہ:۔ اور تمہارا مال اور اولاد ایسی چیز نہیں کہ تم کو ہمارا مقرب بنا دیں ہاں (ہمارا مقرب وہ ہے) جو ایمان لایا اور نیک عمل کرتا رہا۔

اس میں قرب کا طریقہ بتلایا گیا ہے کہ اعمال سے قرب ہوتا ہے۔ پہلی آیتوں میں فصل کا امر تھا، اور اس میں وصل کا طریقہ بتلایا گیا ہے۔ پس یہ مسئلہ صوفیہ کا گھڑا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ تمام نصوص اس سے بھری ہوئی ہیں کہ وصل و فصل دونوں کی ضرورت ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل فصل عن الغیر کا بالکل اہتمام نہیں (یہاں پہنچ کر عصر کی اذان کا وقت ہو گیا اور اذان ہونے لگی حضرت قدس سرہٗ تھوڑی دیر خاموش رہے۔ اذان کے بعد فرمایا۔

تقدیم وصل یا فصل

بس اب میں ختم ہی کرنے والا ہوں۔ جب وصل و فصل کی ضرورت نصوص سے معلوم ہو گئی تو ان دونوں کی ضرورت میں تو کلام نہ رہا۔ مگر مشائخ و مربیین کا اس میں اختلاف ہے کہ تقدیم کس کی کی جائے۔ بعض مشائخ کا طریق یہ ہے کہ وہ وصل کی تدبیر پہلے کرتے ہیں پھر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ غیر اللہ سے تعلق قطع ہو جاتا ہے اور دوسرے فصل کو مقدم کرتے ہیں پھر اس کا

---

[۱] کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جن کو پسند کرتے ہو۔ خدا اور اس کے رسول سے اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے تمہیں زیادہ عزیز ہوں تو ٹھہرے رہو۔ یہاں تک کہ خدا اپنا حکم یعنی عذاب بھیجے۔

اثر یہ ہوتا ہے کہ جتنا غیر سے تعلق قطع ہوتا ہے اتنا ہی خدا سے بڑھتا ہے کیونکہ دو ہی تعلق ہیں ان میں اگر ایک بڑھے گا دوسرا گھٹے گا اور ایک گھٹے گا تو دوسرا بڑھے گا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے اطباء میں اختلاف ہے کہ مریض کو صحت وقوت کی طرف لانا ہو تو اول صحت یعنی ازالۂ مرض کی تدبیر کرنا چاہئے یا قوت کی۔ اطباء یونانی صحت یعنی ازالۂ مرض کی تدبیر مقدم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ازالۂ مرض وصحت کے بعد قوت خود بخود آنے لگتی ہے اور ڈاکٹر تقویت طبع کی تدبیر مقدم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب طبیعت میں قوت پیدا ہو جائے گی تو مرض خود ہی جاتا رہتا ہے، یہی اختلاف اطباء روحانی میں ہے کہ بعض ازالۂ مرض کا اہتمام اوّل کرتے ہیں یہ فصل ہے اور بعض تقویت کی تدبیر پہلے کرتے ہیں۔ یہ وصل ہے اور ان دونوں میں سے کسی ایک طریق کو کسی ایک خاندان کی طرف منسوب کرنا مناسب نہیں کیونکہ ہر شیخ مجتہد ہوتا ہے وہ کسی کی تقلید نہیں کرتا اگر ایک شیخ چشتی ہو اور کسی وقت اس کے اجتہاد میں مذاق چشتیہ سے نقشبندیہ کا مذاق راجح ہو تو وہ نقشبندی مذاق اختیار کرے گا اور اگر شیخ نقشبندی ہو اور اس کے مذاق میں چشتیہ کا مذاق راجح ہو تو وہ اُسی کو اختیار کرے گا۔ فروع میں ہر شیخ مجتہد ہے۔ کوئی بھی کسی خاص طریقہ کا پابند نہیں ہوتا۔ مگر اصول میں اکثر اپنے سلسلہ کا تبع ہوتا ہے۔ اس لئے اصولاً نقشبندیہ کی طرف تقدیم وصل منسوب ہے اور چشتیہ کی طرف تقدیم فصل منسوب ہے۔

اور گو دونوں خاندانوں کے مشائخ ہر وقت اس کے پابند نہیں ہوتے۔ بلکہ طالب کے مناسب جو طریق ہوتا ہے اُسی کو اختیار کرتے ہیں۔ لیکن نقشبندیہ پر اکثر تقدیم وصل کا رنگ غالب ہوتا ہے اور چشتیہ پر تقدیم فصل کا رنگ۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ایک طالب کی مناسبت کا اسی اصل سے امتحان فرمایا تھا وہ واقعہ اس طرح ہوا تھا کہ مولانا منیر احمد صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت حاجی صاحب سے عرض کیا کہ میں بیعت ہونا چاہتا ہوں۔ مگر متردد ہوں کہ سلسلہ چشتیہ میں بیعت ہوں یا نقشبندیہ میں۔ تو آپ بتلا دیجئے کہ میرے لئے زیادہ کیا مناسب ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا یہ بتلاؤ کہ ایک شخص ایسی زمین میں تخم پاشی کرنا چاہتا ہے جس میں جھاڑ جھنکار بہت کھڑے ہیں تو اُسے کیا کرنا چاہئے، آیا اول زمین کو جھاڑوں سے صاف کرے پھر تخم ریزی کرے یا پہلے تخم ریزی کردے پھر جھاڑوں کو صاف کرتا رہے۔ مولوی منیر احمد صاحب نے فرمایا کہ حضرت میرے نزدیک تو مناسب یہ ہے کہ اول تخم ریزی کردے تاکہ کچھ تو ثمرہ حاصل ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ جھاڑوں کی صفائی میں موت آ

جائے۔ پھر یہ خالی ہاتھ ہی جائے۔ حضرت نے ہنس کر فرمایا کہ تم نقشبندیہ میں جاؤ۔

شاہ ابو سعیدؒ کی تربیت

شرح اس کی یہ ہے کہ نقشبندیہ کا مذاق یہ ہے کہ وہ پہلے ہی دن ذکر کی تلقین کر کے تخم ریزی شروع کر دیتے ہیں۔ اور چشتیہ اول ازالۂ رذائل کا کام شروع کر کے ناک چنے چبواتے ہیں۔ مگر چبواتے نہیں۔ بلکہ چبواتے تھے۔ کیونکہ اب تو وہ بھی طالب علموں کی ضعفِ ہمت کی وجہ سے نقشبندیہ کے طریق پر عمل کرنے لگے ورنہ پہلے یہ حالت تھی کہ حضرت شیخ ابو سعید گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جب طلب طریق سلطان نظام الدین بلخیؒ کی خدمت میں پا پیادہ گنگوہ سے بلخ پہنچے اور حضرت شیخ کو اطلاع ہوئی تو اوّل تو بڑی خاطر کی۔ شہر کے باہر تک استقبال کو تشریف لائے اور ساتھ میں سلطان بلخ بھی تھا۔ کیونکہ وہ شیخ کا معتقد تھا۔ غرض مرشد زادہ کا بڑی شان سے استقبال کیا۔ اور شہر میں لے جا کر خوب خدمت کی۔ اور کئی روز تک بادشاہ اور وزراء و امراء کے یہاں اُن کی دعوتیں ہوتی رہیں۔ جب کئی دن ہو گئے تو شاہ ابو سعیدؒ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میں گنگوہ سے بلخ تک پیادہ چل کر دعوتوں کے لئے نہیں آیا۔ فرمایا صاحبزادے پھر جو خاص مطلب ہو وہ بیان فرمایئے۔ کہا میں تو وہ دولت لینے آیا ہوں۔ جو آپ میرے گھر سے لائے ہیں۔ بس یہ سنتے ہی شیخ کا رنگ بدل گیا۔ اور بزبان حال فرمایا ؎

ناز پروردہ تنعم نبرد راہ بدوست ‏ ‏ ‏ ‏ عاشقی شیوۂ رندانِ بلا کش باشد

نازونعمت میں پلا ہوا دوست تک نہیں پہنچ سکتا۔ عاشقی تو رندان جفا کش ہی کا حصہ ہے۔

فرمایا صاحبزادے اگر وہ دولت لینا چاہتے ہو تو پھر یہ شان وشوکت رخصت کرو۔ اور آج سے عوام کی خدمت تمہارے سپرد ہے۔ جا کر حمام جھونکو اور نقیب خانقاہ سے فرمادیا کہ ان کو لنگر کی روٹی صبح و شام دے دیا کرو اور فرمایا کہ جب تک ہم اجازت نہ دیں اس وقت تک ہمارے سامنے نہ آؤ نہ ذکر بتلایا نہ شغل۔ پس نماز روزہ کرتے اور حمام جھونکتے رہو۔ اسی حالت میں ایک عرصہ گزر گیا۔ اس کے بعد حضرت شیخ نے بھنگن سے فرمایا کہ آج کوڑا ابوسعید کے سر پر ڈال دینا۔ بھنگن نے ایسا ہی کیا تو شاہ ابوسعید نے غصہ سے فرمایا کہ گنگوہ نہ ہوا جو آج تجھے حقیقت معلوم ہو جاتی۔ بھنگن نے عرض کر دیا کہ ابوسعید نے یہ کہا تھا۔ فرمایا ارے ابھی تو خناس دماغ میں گھسا ہوا ہے۔ گنگوہ کی بوئے ریاست نہیں نکلی ابھی اور حمام جھونکیں۔ چنانچہ اور عرصہ گزر گیا۔ پھر دوبارہ بھنگن کو وہی حکم دیا۔ چنانچہ اس نے پھر ایسا ہی کیا، اس دفعہ شاہ ابوسعید نے زبان

سے کچھ نہیں کہا مگر تیز نظروں سے گھور کر دیکھا۔ شیخ نے یہ حال سن کر فرمایا کہ ابھی کسر باقی ہے۔ چنانچہ ایک عرصہ تک اور یہی خدمت جاری رکھی اس کے بعد پھر وہی حکم دیا اس نے پھر ایسا ہی کیا۔ اس وقت شاہ ابوسعید کا نفس بالکل مل دل گیا تھا۔ کوڑا جو گر گیا تھا۔ اپنے اوپر ڈالنے لگے بھنگن نے جا کر شیخ سے یہ حال عرض کیا تو فرمایا الحمد للہ اول قدم تو طے ہوا۔ واقعی یہ تکبر راستہ میں حائل ہے۔ نکل جائے تو پھر بہت جلد طریق طے ہو جاتا ہے۔ عارف فرماتے ہیں ؎

میاں عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست   تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

(اللہ اور بندے کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہے۔ تو اپنے حجاب خودی کو اے حافظ درمیان سے اٹھا دے۔)

مگر یہ تکبر بڑی مشکل سے نکلتا ہے چنانچہ اس ریاضت شاقہ کے بعد اب شاہ ابوسعید کو اتنی اجازت ملی کہ شیخ کی مجلس میں آجایا کریں اور باتیں سُنا کریں۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد ذکر تعلیم کیا گیا گویا اب وصل کی تدبیر شروع ہوئی۔ ذکر شروع کرنے کے بعد کچھ حالات و کیفیات طاری ہوئیں تو شیخ کو معلوم ہوا کہ ابوسعید میں عجب پیدا ہو گیا ہے۔ تو فوراً سب ذکر و شغل چھوڑا دیا، اور کتوں کی خدمت سپرد کی وہ شکاری کتے تھے ایک دن شاہ ابوسعید ان کو جنگل ٹہلانے کو لے جا رہے تھے کہ راستہ میں کوئی شکار کتوں کو نظر آیا۔ شکار کو دیکھ کر وہ تو ہوا ہو گئے۔ شاہ ابوسعید بھی کچھ دور تک زنجیر کو تھامے ہوئے ان کے ساتھ دوڑتے رہے۔ آخر کہاں تک دوڑتے۔ تھک گئے اور وہ شکاری کتے مضبوط اور قوی ان کے قابو سے باہر ہو گئے۔ ان کو اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ زنجیر میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے اور کُتے چھوٹ کر بھاگ جائیں تو شیخ کا عتاب ہوگا۔ آپ نے زنجیر کو اپنی کمر سے باندھ لیا اور کچھ دور تک اس طرح دوڑے آخر کو تھک کر گر گئے۔ اب یہ حال ہے کہ کتے بھاگے جا رہے ہیں اور یہ ساتھ ساتھ گھسٹتے ہوئے جا رہے ہیں۔ کہیں ڈھیلوں میں سر لگتا ہے۔ کہیں کانٹوں سے بدن زخمی ہوتا ہے۔

اسی حالت میں اُن پر غیبی فضل ہوا کہ ایک تجلی خاص ان کے اوپر ہوئی جس کی لذت نے تمام تکلیف کو بھلا دیا۔ اُدھر حضرت شیخ کو یہ حالت منکشف ہوئی اور انہوں نے خدام سے فرمایا کہ اس وقت ابوسعید پر فضل ہو گیا۔ اور ایک خاص تجلی سے حق تعالیٰ نے اُن کو مشرف فرما دیا۔ جاؤ جنگل سے اُن کو اٹھا لاؤ۔ خدام تو ادھر دوڑے اور ادھر سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ پر شیخ الشیوخ حضرت شاہ عبدالقدوس قدس اللہ سرہٗ کی روحانیت منکشف ہوئی اور فرمایا نظام الدین تم کو اس سے زیادہ مشقت لینے کا بھی حق تھا مگر ہم نے تو تم سے اتنی مشقت نہ لی تھی۔ یہ

ایک محبت آمیز عتاب تھا۔ جس سے سلطان نظام الدین کے دل پر بہت بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ اب جو شاہ ابو سعید سامنے آئے ہیں تو سلطان جی نے ان کو محبت سے سینہ لگایا اور پھر ذکر و شغل میں لگا دیا۔ اور اسی طرح خاطر و مدارت ہونے لگی۔ شاہ ابو سعید کو اس روز کی تجلی کا بہت اشتیاق تھا۔ کہ وہی تجلی پھر ہو۔ روزانہ ذکر کر کے اس کے مشتاق رہتے تھے جب کئی روز تک نہ ہوئی تو ایک دن حبسِ دم کر کے بیٹھ گئے۔ اور پختہ ارادہ کر لیا کہ جب تک وہ تجلی نہ ہوگی۔ سانس نہ چھوڑوں گا، چاہے دم نکل جائے کیونکہ ایسی زندگی سے مر جانا بھی اچھا ہے۔ اس طریق میں بھی کیا کیا حالتیں پیش آتی ہیں جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ چنانچہ کئی گھنٹے تک سانس روکے بیٹھے رہے بالآخر وہ تجلی پھر ہوئی اور اس کی مسرت میں سانس اس زور سے چھوٹا کہ پسلی پر ضرب پہنچی اور ٹوٹ گئی، اسی وقت غیب سے ایک ہاتھ نمودار ہوا جس میں چمچہ کے کوئی دوا تھی وہ ان کے منہ میں لگا دی گئی۔ اس کے کھاتے ہی پسلی فوراً جڑ گئی وہی حالت غیر ہوگئی کہ ؎

در دم نہفتہ زطبیباں مدعی   باشد کہ از خانہ غیبش دوا کند

خود ساختہ اطباء سے اپنے درد کو چھپائے ہوئے ہوں اس امید پر کہ وہ اپنے خزانہ غیبی سے میری دوا کریں۔

اور اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ چوزہ کا شوربا چند روز تک پینا۔ انہوں نے حالت فرو ہونے کے بعد شیخ سے یہ قصہ عرض کیا، شیخ نے فوراً چوزوں کا انتظام کر دیا، اور کئی روز تک چوزے کھلائے گئے۔ اب حق تعالیٰ کی طرف سے خود حکم ہوتا ہے کہ عمدہ عمدہ غذائیں کھاؤ اور پہلے وہ مشقت تھی کہ حمام جھونکو، جو کی روٹی کھاؤ اس کے بعد خلافت عطا ہوئی اور شیخ کامل بن کر گنگوہ آئے۔

اجتہادِ طریقت

تو صاحب پہلے تو چشتیوں کے یہاں یہ مصیبت تھی اُن کے یہاں پہلے فصل مقدم تھا اور نقشبندیہ کے یہاں وصل مقدم تھا مگر اب تو چشتی بھی نقشبندی ہوگئے۔ کیا کریں طالب علموں کی ہمتیں اب ویسی نہیں رہیں۔ چونکہ اب ہمتوں میں ضعف ہے اور شیوخ مجتہد ہوتے ہیں اس لئے مجتہدین طریق نے اب یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وصل و فصل دونوں کو ساتھ ساتھ لے چلتے ہیں۔ اب چشتیہ نے تقدیر فصل کو ترک کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ صورت اس وقت کے مناسب نہیں اور طبیب مجتہد ایک بات کا پابند نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ مناسب کو اختیار کرتا ہے۔ سو آج کل یہی صورت مناسب ہے کہ دونوں ساتھ ساتھ ہوں اور جو شیخ مجتہد نہ ہو وہ شیخ بنانے کے قابل نہیں اور یہ فیصلہ معیت ویسا

ہی ہے جیسے درس ظاہر میں مدرسین کی رائے پہلے مختلف تھی۔ بعض معقول کی تقدیم کرتے تھے بعض منقول کی اور ہر ایک کے پاس اپنی رائے کی ترجیح کے دلائل تھے مگر اب محققین نے فیصلہ کردیا ہے کہ دونوں کو ساتھ ساتھ رکھنا چاہئے۔ اس طرح باطن میں محققین نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وصل وفصل دونوں کو دوش بدوش لے چلو۔ مگر آج کل ایک نئی بدعت ایجاد ہوئی ہے کہ بعض نے محض وصل ہی کو لے لیا ہے اور فصل سے بالکل ہاتھ روک لیا ہے نہ اُس کو مقدم رکھا نہ مؤخر نہ ساتھ ساتھ ہی رکھتے ہیں۔ چنانچہ بعض اہل غلو جن پر جوگیہ کا مذاق غالب ہے وہ تو وصل یعنی اعمال کو چھوڑ بیٹھے اور بڑا اہتمام جنگل میں رہنے اور لذات کے ترک کا کرنے لگے تو یہ اہلِ باطل کا طریق ہے اور اہلِ حق میں سے اکثر مشائخ محض تعلیم ذکر پر اکتفا کرنے لگے۔ تزکیہ رذائل کا اہتمام مطلق نہیں کرتے، نہ مرید کے اعمال واخلاق پر روک ٹوک کرتے ہیں نہ تعلقات بڑھانے پر اُسے زجر کرتے ہیں اور جو ایسا کرے وہ بدنام ہے مگر میں نصوص سے بتلا چکا اور صوفیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ بدوں وصل و فصل دونوں کے طریق طے نہیں ہوسکتا۔ اس کا تو اختیار ہے کہ تقدیم وتاخیر کسی کی کردی جائے مگر ایک سے بالکل ہاتھ روک لینا یہ طریق کے بالکل خلاف ہے اور جب تقدیم وتاخیر کا آج کل خلاف مصلحت ہونا اور معیت ہی کا مناسب ہونا اوپر معلوم ہو چکا تو دونوں کام ساتھ ساتھ ہونے چاہئیں کہ سالک کو ذکر وشغل کی تعلیم کے ساتھ اصلاح رذائل کا بھی امر کیا جائے اور ہر رذیلہ کی اصلاح کا علاج بتلایا جائے اور گو زیادہ ضروری یہی علاج ہے رذائل کا مگر ذکر کے ساتھ رذائل کا علاج بہت سہل ہو جاتا ہے اس لئے ذکر میں لگانا ضروری ہے کیونکہ ذکر سے خود بھی ان بہیمی وسبعی قوتوں میں کسی قدر ضعف ہو جاتا ہے اب اگر تھوڑی سی توجہ سے کام لیا جائے تو اس طرح جمع کرنے سے وصل کے ساتھ فصل بھی کامل ہو جائے گا، اب وقت تنگ ہے اور تنگی وقت کی وجہ سے میں فروع کو مفصل نہ کرسکا۔ مگر اصول بحمد اللہ مذکورہ ہو گئے گو ان کی بھی تفصیل نہ ہوسکی۔

خلاصہ یہ ہے کہ وصل وفصل دونوں کا اہتمام کرو۔ خدا سے تعلق بڑھاؤ اور غیر سے تعلق کم کرو اور اس کا طریقہ کسی محقق سے پوچھو اور اگر شیخ میسر نہ ہو تو محققین کی کتابوں کا مطالعہ کر کے کام شروع کرو۔ انشاء اللہ ناکامی نہ ہوگی اور اگر مشائخ محققین موجود ہوں تو ان سے مل کر طریق معلوم کرو۔ اگر ملنا نہ ہو سکے تو خط وکتابت سے مراجعت کرو۔ اور عمل کا اہتمام کرو کیونکہ بدوں عمل کے باتیں یاد کر لینا اور تصوف کے مسائل رٹ لینا محض بے کار ہے، اس طریق میں باتیں بنانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ صاحب حال ہونے کی ضرورت ہے پھر حال بھی خود مطلوب نہیں۔

بلکہ اصل مطلوب عمل ہے کیفیات واحوال کی ضرورت بھی عمل ہی کے لئے ہے ورنہ خود کیفیات و احوال مقصود نہیں ہیں مگر چونکہ حال سے عمل میں سہولت ہو جاتی ہے اس لئے صاحب حال ہونے کی ضرورت ہے۔ بدوں حال کے عادۃً کام نہیں چلتا۔

اور یاد رکھو کہ حال بھی عمل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ بدوں عمل کے حال وغیرہ کچھ حاصل نہیں ہوتا عمل ہی کی برکت سے ظاہر حال بن جاتا ہے۔ اس پر شاید یہ شبہ ہوا کہ ابھی تو تم نے عمل کے لئے خال کی ضرورت بتلائی تھی اور اب حال کے لئے عمل کو ضروری کردیا یہ تو دور ہو گیا تو یہ بات ہے کہ دور جب لازم آتا ہے کہ موقوف وموقوف علیہ متحد ہوں اور یہاں ایسا نہیں بلکہ یہاں حصول حال اختیار عمل پر موقوف نہیں عمل بدوں حال کے بھی ہو سکتا ہے۔ گو مشقت سے ہو تو ایک جگہ حصول موقف ہے اور دوسری جگہ سہولت ودوام اس لئے دور نہیں۔ پس حاصل یہ ہوا کہ اول تو ہمت کر کے عمل میں لگے یہاں تک کہ حل پیدا ہو جائے پھر حال پیدا ہونے کے بعد عمل میں ہمت ومجاہدہ کی ضرورت نہ رہے گی۔ بلکہ سہولت سے ہونے لگے گا۔

اب میں ختم کرتا ہوں دعا کرو کہ حق تعالیٰ ہم کو حال وعمل عطا فرمائیں۔ (آمین)

وَ صَلَّی اللّٰهُ علیٰ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِهٖ
وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
تمَّ بِحَمْدِاللّٰهِ الَّذِیْ وَجَلَالہ و عزتہ تتم الصّٰلِحٰتِ۔
اشرف علی............۱۳ شعبان ۲۸ھ

فناء النفوس

فناء النفوس سے موسوم وعظ بوقت صبح بروز جمعرات 8 محرم الحرام ۱۳۴۴ھ کو بعض مہمانوں کی درخواست پر کرسی پر بیٹھ کر حضرت اقدس رحمۃ اللہ نے ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً پچاس تھی۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہٗ نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ للّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلَّمْ. اَمَّا بَعْدُ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ۔

اور بعضا آدمی ایسا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کرڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ (ایسے) بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں۔ (البقرۃ آیت:۲۷)

قوت تکرار

اس وقت بیان کرنے کی کوئی خاص ضرورت داعی نہیں محض چند مہمانوں کی رغبت معلوم ہوئی۔ ان کو خوش کرنے اور ان کو نفع پہنچانے کے لئے اور یہی اُن کا خوش کرنا بھی ہے اس وقت بیان اختیار کیا گیا ہے اسی لئے کوئی خاص نیا مضمون کا جوش اور داعیہ قلب میں پیدا ہوتا ہے مگر اس وقت یہ بات نہیں اس لئے شاید مضامین وہی ہوں جو اکثر سنتے ہیں۔ لیکن تکرار کی وجہ سے وہ فضول و بیکار نہ سمجھے جائیں۔ کیونکہ تکرار سے تائید وقوت تو ضرور ہو جاتی ہے اور یہ بھی ایک جدید نفع ہے دوسرے مضامین مکررہ سبب ہو جاتے ہیں۔ مضامین جدیدہ غیر مکررہ کے لئے یعنی مضامین مکررہ کے بیان کرتے ہوئے جدید مضامین بھی اکثر بیان ہو جاتے ہیں۔ اس لئے تکرار کو بے رغبتی کا سبب نہ بنایا جائے خواہ سب مضامین مکرر ہوں یا بعض غیر مکرر ہوں یہ خلاصہ ہے اس وقت کے مضمون کے اختیار کرنے کا۔

نظر فی السباق

میں نے جس آیت کی تلاوت کی ہے اس کے ترجمہ سے مضمون کی تعیین ہو جائے گی اور

تفسیر سے اس کی تفصیل ہو جائے گی ۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ بعض لوگ وہ ہیں جو اپنے نفسوں کو بدل کر دیتے ہیں ۔ یعنی خرچ کر دیتے ہیں اللہ کی مرضی طلب کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ بندوں پر بہت مہربان ہیں ۔ حاصل یہ ہے کہ اس جگہ ایک عمل کی فضیلت مذکور ہے ۔ یعنی شراء نفس کی اور ایک اس کی غایت مذکور ہے یعنی ابتغاء مرضاۃ اللہ اور گو غایت بھی ایک فعل ہی ہے مگر اس میں جہت مقصودیت غالب ہے اس لئے بہ نسبت عمل کہنے کے اس کو غایت کہنا زیادہ زیبا ہے اور ایک ثمرہ مذکورہ ہے وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ (اور اللہ تعالیٰ بندوں پر بہت مہربان ہیں) کہ اس فعل اور غایت کا ثمرہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت اور راحت متوجہ ہوتی ہے یہ تین مضمون اس آیت میں مذکور ہیں اور اس کی تفسیر میں سیاق وسباق پر نظر کر کے مفسرین نے اس کی دو توجیہیں بیان کی ہیں ۔ بعض نے ایک توجیہ بیان کی ہے اور بعض نے دوسری توجیہ بیان کی ہے اس میں بھی سیاق و سباق پر نظر ہے مگر دور تک نہیں ۔ انہوں نے صرف قریب کی آیت پر نظر کی ہے سیاق کا لفظ ویسے ہی زبان سے نکل گیا ۔ مقصود صرف سباق ہے کیونکہ ان توجیہات میں سباق ہی کو دخل ہے اور سباق پر نظر کرنا بھی تفسیر کا بڑا جزو ہے خصوصاً ربط سمجھنے کے لئے اس کی بہت ضرورت ہے ورنہ بعض اشکالات واقع ہونے لگتے ہیں ۔ اس کی نظیر میں ایک آیت اس وقت یاد آئی ہے جس میں سباق پر نظر نہ کرنے سے اشکال واقع ہوا ہے ۔ آیت یہ ہے وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْ مِنِيْنَ سَبِيْلًا یعنی حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے ۔ اگر اسی آیت کے الفاظ پر نظر کو مقصود کر دیا جائے تو اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ تو خلاف مشاہدہ ہے ، ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ کفار کو مسلمانوں پر غلبہ ہو گیا ہے اس کا جواب بھی دیا گیا ہے اور اچھا جواب ہے کہ غلبہ سے غلبہ فی الحجت مراد ہے ۔ مطلب یہ ہوا کہ حجت میں کافروں کو کبھی غلبہ نہ ہوگا اور یہ مشاہدہ کے موافق ہے ۔ حجت میں ہمیشہ اسلام ہی کو غلبہ ہوا ہے اور ہوتا ہے گو یہ جواب فی نفسہٖ صحیح ہے مگر کیا اچھا ہو کہ اشکال ہی نہ پڑے جو جواب دینے کی ضرورت ہو تو سباق میں نظر کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں اوپر سے فیصلہ قیامت کا ذکر ہے اور یہ جملہ اسی فیصلہ کے متعلق ہے پوری آیت یوں ہے ۔

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا یعنی پس اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے قیامت کے دن اور (اس فیصلہ میں) حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے ۔ دیکھئے سباق میں نظر کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہ اشکال وارد ہی نہیں ہوتا کیونکہ یہاں غلبہ فی الدنیا کا ذکر ہی نہیں بلکہ فیصلہ قیامت میں غلبہ نہ ہونے کا ذکر ہے ۔ علماء کو یاد کر لینا چاہئے کہ تفسیر آیت کے وقت صرف آیت کے اسی ٹکڑے کو نہ دیکھیں جس کی تفسیر مقصود ہے بلکہ اوپر سے ملا کر دیکھیں ۔ انشاء اللہ اس طرح اول تو اشکال ہی وارد نہ ہوگا اگر ہوا بھی تو جواب بھی اسی موقع پر مل جائے گا ۔

دوسری نظیر[1] ایک اور یاد آئی کہ وہاں بھی سباق پر نظر نہ کرنے سے اشکال واقع ہوا ہے۔ آیت یہ ہے یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ یَقُصُّوۡنَ عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ ۙ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۔

ترجمہ: اے اولاد آدم اگر تمہارے پاس تمہارے میں سے کچھ رسول آئیں جو میری آیتیں تمہارے سامنے پڑھیں تو پھر جو شخص (اُن کے حکم کے موافق) تقویٰ اختیار کرے اور (اعمال کی) اصلاح کرے گا اُن پر کچھ اندیشہ نہ ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (سورۂ اعراف رکوع ۴)

اس آیت کے الفاظ پر نظر کر کے بعض اہل باطل نے استدلال کیا ہے کہ ارسال رُسل کا باب منقطع نہیں ہوا کیونکہ اس آیت میں حق تعالیٰ جملہ بنی آدم کو جن میں امت محمدیہ بھی داخل ہے خطاب فرما رہے ہیں کہ اگر تمہارے پاس رسول آئیں الخ۔ اگر باب رسالت مسدود ہو چکا ہے تو اب اس قسم کے خطاب کے کیا معنے ہوئے۔ یہ اشکال اس لئے ہوا کہ ان لوگوں نے محض اسی آیت کے الفاظ کو دیکھا اگر سباق پر نظر کی جائے تو پھر قصہ سہل ہو جاتا ہے وہ یہ کہ اوپر سے آیات میں نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سے اوپر آدم علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے کہ وہ پیدا کئے گئے پھر جنت میں رکھے گئے پھر وہاں سے زمین پر اُتارے گئے۔ اور اس وقت آدم علیہ السلام کو اور ان کی ذریت کو کچھ خطابات ہوئے ہیں چنانچہ

قَالَ اہۡبِطُوۡا بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ ، قَالَ فِیۡہَا تَحۡیَوۡنَ وَ فِیۡہَا تَمُوۡتُوۡنَ وَ مِنۡہَا تُخۡرَجُوۡنَ (اے اولاد آدم علیہ السلام شیطان تم کو کسی خرابی میں نہ ڈال دے جس نے تمہارے دادا اور دادی کو جنت سے باہر کرادیا کہ ان کا لباس بھی ان سے اتار دیا اور پردہ کا بدن دکھائی دینے لگا)

میں آدم علیہ السلام و ذریت آدم دونوں کو خطاب ہے پھر یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا (اے اولاد آدم علیہ السلام ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہارے پردہ اور بدن کو بھی چھپاتا ہے اور موجب زینت بھی ہے اور تقویٰ کا لباس اس سے بڑھ کر ہے) اور یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ لَا یَفۡتِنَنَّکُمُ الشَّیۡطٰنُ کَمَاۤ اَخۡرَجَ اَبَوَیۡکُمۡ مِّنَ الۡجَنَّۃِ یَنۡزِعُ عَنۡہُمَا لِبَاسَہُمَا لِیُرِیَہُمَا سَوۡاٰتِہِمَا ۔ (اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسی حالت میں جاؤ کہ تم باہم بعض دوسرے کے دشمن رہو گے اور تمہارے واسطے زمین میں رہنے کی جگہ ہے اور نفع حاصل کرنا ایک وقت تک اور فرمایا تم نے وہاں زندگی بسر کرنا اور وہاں مرنا پیدا ہونا ہے)

---

[1] یہ نظیر مع تقریر اشکال و جواب کے غیر مکرر ہے احقر نے اب تک کسی وعظ میں اس آیت کے اشکال و جواب کی تقریر نہیں سنی ۱۲ ظ

میں اُسی وقت اولادآدم علیہ السلام کوخطاب ہوا ہے اُسی وقت کے خطاب کا یہ بھی تتمہ ہے یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ (الآیۃ)۔ پس یہ سب خطابات قصہ ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت یا اُس کے متصل ہی ارواح بنی آدم کو ہوئے جن کو اس وقت اس لئے نقل کر دیا گیا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ یہ عہود ہم سے قدیم زمانہ میں لے لئے گئے ہیں کوئی نئی بات نہیں اور اُس وقت باب رسالت بند نہ تھا۔ لہٰذا اب کوئی اشکال نہیں (اور اس خطاب کے قدیم ہونے کی تائید آثار سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ بیان القرآن میں بروایت ابن جریر ابوسیار سلمی کا قول نقل کیا گیا ہے) دوسرے القرآن یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا (قرآن حکیم کے بعض حصے بعض کی تعریف کرتے ہیں) کے قاعدہ سے سورہ بقرہ کی آیت بھی اس کی موید ہے کیونکہ وہاں ارسال رسل کا مضمون حکم ہبوط کے ساتھ متصل ہی بیان ہوا ہے۔ فرماتے ہیں

قَالَ اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ.

اس خطاب میں بجز اس وقت کا خطاب ہونے کے اور کوئی احتمال ہو ہی نہیں سکتا۔ پس ایسے ہی یہاں بھی یہ خطاب یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ الخ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ سے مربوط ہے۔ گو بیچ میں اور مضامین بھی آ گئے ہیں اس کا کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ بات میں سے بات نکل ہی آیا کرتی ہے۔ بلاغت کا مسئلہ ہے۔ الکلام یَجُرُّ بَعْضَہٗ بَعْضًا چنانچہ بلغاء کا قاعدہ ہے کہ ایک بات کو شروع کرتے ہیں اُس سے دوسری بات نکل آئی تو حبعًا اُس کو بھی بیان کر دیا اس کے بعد پھر پہلی بات کی طرف عود کرتے ہیں۔ قرآن کا نزول اسی طرز محاورہ پر ہوا ہے۔ معقولیین یا مصنفین کے طرز پر نہیں ہوا۔ لہٰذا یہاں ربط سمجھنے اور تفسیر دریافت کرنے کے لئے دور تک آیات کو دیکھنے کی ضرورت ہے لطف تفسیر کا اسی میں ہے اور اس سے سب اشکالات حل ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی یہاں بھی سیاق میں نظر کر کے آیت کی تفسیر کرنا چاہئے۔ گو یہاں سباق میں نظر نہ کرنے سے کوئی اشکال تو واقع نہ ہوگا۔ مگر لطف بھی حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے مفسرین نے سباق پر نظر کر کے اس کی دو توجیہیں کی ہیں بعض نے تو سباق قریب پر نظر کی ہے اور وہ یہ ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِیْ قَلْبِهٖ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (الآیات)

اعتبار عموم الفاظ

اس پر نظر کر کے تو تفسیر آیت کی یہ ہوئی کہ حق تعالیٰ نے یہاں تقسیم کی ہے کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو معجب بالحیوۃ الدنیا ہے۔ دوسرے وہ جو حیاتِ دنیا کو ابتغاء رضاء الٰہی میں

بیع کر چکا ہے۔ اس کا بیان وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهٗ ابْتِغَآءَ الخ میں ہے اور اس پر سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُکَ قَوْلُهٗ الخ۔ یہ آیت مع اپنے توابع کے ایک منافق کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جس کا نام غالبًا اخنس تھا۔ گو حکم مذکور میں اس کی تخصیص نہیں بلکہ جو بھی ویسا ہو اُس کا وہی حکم ہے جو یہاں بیان ہوا ہے۔

جو لوگ استرسال نفس کے لئے بہانہ ڈھونڈتے ہیں وہ تخصیص شان نزول سے بے فکر ہو جاتے ہیں کہ جہاں کسی فعل شنیع پر وعید نظر آئی انہوں نے فوراً کہہ دیا کہ یہ تو فلاں شخص یا فلاں جماعت کے بارہ میں نازل ہوئی ہے ہم اس سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ مگر خدا جزائے خیر دے۔ اصولیین کو کہ انہوں نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔

اَلْعِبْرَةُ لعموم اللفظِ لَا لِخُصُوْصِ السَّبَبِ کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہے۔ خصوص سبب نزول کا اعتبار نہیں پس جہاں کسی فعل پر کوئی وعید عموم الفاظ کے ساتھ وارد ہوگی یا کوئی حکم مرتب ہوگا۔ اس کو عام ہی کہا جائے گا۔ مورد کے ساتھ خاص نہ کیا جائے گا ورنہ چاہئے کہ لعان کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ ہوتا۔ کیونکہ اس کا نزول ایک خاص واقعہ میں ہوا ہے مگر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس واقعہ کے بعد دوسرے واقعہ میں اس حکم کو جاری کیا ہے اور خلفاء نے بھی ہمیشہ اس کو جاری رکھا ہے۔ اسی طرح یہاں رکھا جائے گا کہ گو نزول آیت کا ایک خاص منافق کے باب میں ہے مگر حکم اسی کے ساتھ خاص نہیں۔ شانِ نزول صرف محرک نزول ہوجاتا ہے مقصود اصلی وہی نہیں ہوتا۔

لسّانی کا طبعی اثر

غرض وہ منافق وہ بڑا لسّان تھا ایسا کہ کبھی کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی طبعًا اس کی لسّانی کا اثر ہوجاتا تھا۔

اسی لئے تو **یُعْجِبُکَ قَوْلُهٗ** حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ باوجود یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے عاقل تھے۔ کہ میں آپ کے عاقل پر ایک لطیفہ بیان کیا کرتا ہوں وہ یہ کہ مسلمان تو آپ کو عاقل مانتے ہی ہیں وہ تو غلام ہیں اپنے آقا کو اچھا کہیں ہی گے اور جتنا کچھ کہیں تھوڑا ہے۔ مگر لطیفہ یہ ہے کہ کفار مسلمانوں سے زیادہ آپ کو عاقل مانتے ہیں کیونکہ اس کا اقرار کفار کو بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی سی مدت میں اتنے بڑے بڑے کام کئے ہیں جو دوسرا نہیں کرسکتا۔ عرب کے جاہلوں کو تھوڑے ہی دنوں میں ایسا شائستہ اور مہذب بنا دیا کہ تمام تعلیم یافتہ قومیں اُن کے سامنے پست ہوگئیں پھر اس کے ساتھ قواعد متعلقہ معاش و معاد ایسے ممہد کئے جن

کی نظیر نہیں مل سکتی یہ سب باتیں کفار کو تسلیم ہیں مگر ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محض سلطان نہیں کہتے بلکہ نبی بھی کہتے ہیں اور ان فیوض و برکات کو تائید من اللہ اور نبوت کی برکت سمجھتے ہیں اور کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہیں مانتے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سب کارناموں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل سے ناشی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) بہت بڑے عاقل انسان تھے کہ تھوڑی سی مدت میں آپ نے ایسے ایسے کام انجام دیئے تو وہ آپ کو ہم سے زیادہ عاقل مانتے ہیں کہ جو کام ہمارے نزدیک خدا کے کرنے کا تھا۔ اُن کے نزدیک وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کا نتیجہ ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے عاقل تھے کہ موافق و مخالف سب کو آپ کا عاقل کامل ہونا مسلّم ہے مگر وہ منافق ایسا لسان تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عاقل پر بھی اس کی لسانی کا طبعًا اثر ہو جاتا تھا۔ طبعًا اس لئے کہا کہ عقلاً آپ کو دھوکہ نہ ہوتا تھا کیونکہ عاقل دھوکہ نہیں کھایا کرتا۔ چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تفسیر موجود ہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ یُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ۔

ترجمہ: جن لوگوں کے دلوں میں مرض (نفاق) ہے کیا یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی دلی عداوتوں کو ظاہر نہ کرے گا۔ اور ہم تو اگر چاہتے تو آپ کو اُن کا پورا پتہ بتلا دیتے۔ سو آپ اُن کو حُلیہ سے پہچان لیتے اور آپ اُن کو طرز کلام سے (اب بھی) ضرور پہچان لیں گے۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ نہ ہوتا تھا۔ طرز کلام سے آپ ہر شخص کو پہچان لیتے تھے کہ یہ مؤمن ہے یا منافق، سچا ہے یا جھوٹا، کیونکہ ولتعرفنهم میں میں لام تاکید اور نون تاکید کے ساتھ کلام کو مؤکد کیا گیا ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور پہچان لیں گے۔ پس عقلاً آپ کو ہرگز دھوکہ نہ ہوتا تھا۔ اور یہاں جو فرمایا ہے یُعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (بعض شعر میں حکمت ہوتی ہے اور بعض بیان میں جادو ہوتا ہے) اس سے طبعی اثر مراد ہے کہ آپ پر اس منافق کی لسانی سے طبعًا ایک گونہ اثر ہو جاتا تھا اور یہ بشری خاصہ ہے کہ فصیح و بلیغ زوردار کلام سے تھوڑی دیر کے لئے انسان ضرور متاثر ہو جاتا ہے (جیسے کوئی شاعر عمدہ غزل سُنا دے تو سننے والا ضرور متاثر ہوتا ہے گو اس سے عقلاً دھوکہ نہیں ہوتا کیونکہ جانتا ہے کہ شاعر مبالغہ بہت کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح کوئی بلیغ آدمی زوردار تقریر کرے تو کلام کا اثر تھوڑی دیر کے لئے ضرور ہوگا یہ بھی جانتے ہوں کہ یہ شخص جھوٹی باتیں بہت بنایا کرتا ہے۔ اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً وَّ اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْراً (۱۲جامع)

(مسند أحمد 4:59، سنن النسائی 2:228، کنز العمال: 19006)

پس اب دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں رہاایک میں طبعی تاثر کااثبات ہے دوسری میں عقلی تاثر کی نفی ہے۔

آثارِ طبعیہ

اور یہ بھی حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان آثار طبعیہ ولوازم بشریہ کوظاہر کردیا تاکہ آپ پر الوہیت کا شبہ نہ ہو۔ گوبعض جہال نے اس پر آپ کو الوہیت تک پہنچا دیا ہے۔ بلکہ آپ تو آپ جہلاء نے حضرت غوث اعظمؒ کوبھی الوہیت پر پہنچا رکھا ہے۔ چنانچہ ایک حکایت مشہور کی جاتی ہے کہ آپ کے پاس ایک بڑھیا آئی جس کالڑکا مرگیا تھا کہ حضرت اس کو زندہ کردو۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی عمر تو ختم ہوچکی اب زندہ نہیں ہوسکتا۔ وہ رونے اور اصرار کرنے لگی تو آپ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کیا کہ اس لڑکے کو زندہ کردیا جائے۔ وہاں سے خطاب ہوا کہ اس کی تقدیر میں اور حیات نہیں۔ اس لئے اب زندہ نہیں ہوسکتا۔ تو حضرت غوث اعظمؒ حق تعالیٰ سے کہتے ہیں ذرا ملاحظہ کیجئے یہ حق تعالیٰ سے باتیں ہورہی کہ حضرت آپ سے کہنے کی تو اسی لئے ضرورت ہوئی کہ اس کی تقدیر میں اور حیات نہیں۔ اور اگر اس کی تقدیر میں کچھ اور زندگی ہوتی تو آپ سے کہنے کی ہی کیا ضرورت تھی پھر تو آپ مجبور ہو کر خود ہی زندہ کرتے (نعوذ باللہ) وہاں سے حکم ہوا کہ پھر تقدیر کے خلاف تو نہیں ہوسکتا۔ اس پر غوث اعظمؒ کو جلال آیا اور آپ نے اپنے قوت کشفیہ سے ملک الموت کوٹٹولا کہ وہ کہاں ہیں آخر نظر آئے تو دیکھا کہ وہ ایک تھیلے میں اُس دن کے مردوں کی روحیں بھر کر لے جارہے ہیں۔ ابھی تک ہیڈ کوارٹر پر نہ پہنچے تھے کہ غوث اعظمؒ نے اُن کو ٹوکا۔ اور کہا بڑھیا کے لڑے کی روح واپس کردو تم اُس کو نہیں لے جاسکتے۔ وہ انکار کرنے لگے۔ آپ نے وہ تھیلا اُن کے ہاتھ سے چھین کر کھول دیا۔ جتنی روحیں تھیں سب پھر پھر اڑ گئیں۔ اور اُس دن جتنے مردے مرے تھے سب زندہ ہوگئے۔ تو غوثِ اعظمؒ نے حق تعالیٰ سے کہا کہ کیوں اب راضی ہوگئے ایک مُردے کے زندہ کرنے پر تو راضی نہ ہوئے اب بہت جی خوش ہوا ہوگا جب ہم نے سارے مُردوں کو زندہ کردیا۔ توبہ توبہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ

کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ اس طرح گفتگو کرنے کی کسی کو مجال ہے۔ مگر یہ سب حکایتیں جاہلوں نے گھڑی ہیں اور اُن کو بیان کر کے کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ غوث اعظمؒ وہ کام کرسکتے ہیں جو خدا بھی نہیں کرسکتا۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس کفر کا۔ جب جاہلوں نے غوث اعظم رحمۃ اللہ کو اس رُتبہ پر پہنچا دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آثار طبعیہ اور لوازمِ بشریہ کو ذکر نہ کیا جاتا تو نہ

معلوم یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں پہنچاتے۔ اور اب اگر کوئی ایسی غلطی کرے تو یہ محض حماقت ہے کیونکہ قرآن میں سب باتیں بیان کر دی گئیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھاتے بھی تھے۔ سوتے بھی تھے۔ بیوی کی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرورت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لسان میں آدمی کی بات سے متاثر بھی ہوتے تھے۔ ان آثار کے ہوتے ہوئے الوہیت کا احتمال کہاں؟

مجاہدہ اور لوازم بشریت

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجاہدہ سے لوازم بشریت اور امور طبعیہ زائل نہیں ہوا کرتے۔ اس میں بعض لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مجاہدہ سے لوازم بشریت و تقاضائے طبعی مسلوب ہو جاتے ہیں، پھر بعد اعتدال و تمکین کے جب ان آثار کا عود ہوتا ہے تو پریشان ہوتا ہے کہ ہائے میری ساری محنت برباد اور میرا سارا مجاہدہ ضائع گیا۔ حالانکہ یہ اعتقاد غلط ہے۔ مجاہدہ سے امور طبعیہ مسلوب نہیں ہوتے بلکہ جوش مجاہدہ سے صرف مغلوب ہو جاتے ہیں پھر بعد اعتدال کے جب ہنڈیا پک جاتی ہے تو وہ جوش نہیں رہتا بلکہ سکون ہو جاتا ہے۔ مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ جو شاہ فضل الرحمٰن صاحب کے مجاز بھی ہیں فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے شاہ صاحب سے شکایت کی کہ ذکر میں اب وہ لطف نہیں آتا جو پہلے آتا تھا۔ فرمایا تم کو معلوم نہیں کہ پرانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔ صاحبو! قاعدہ ہے کہ جس محبوبہ سے ابھی تک وصال نہ ہوا ہو اس سے جب اول اول وصال ہوتا ہے تو کیا حال ہوتا ہے مگر بعد میں یہ حال نہیں رہتا۔ بلکہ سکون ہو جاتا ہے یہ مطلب نہیں کہ وصال کے بعد محبت نہیں رہتی۔ محبت تو اب پہلے سے زیادہ ہوتی ہے چنانچہ تجربہ ہے کہ جو تعلق پرانی بیوی سے ہوتا ہے اور اس سے جتنا دل کھلا ہوا تھا نئی بیوی کے ساتھ ویسا تعلق نہیں ہوتا۔ اس میں کس قدر اجنبیت سی ہوتی ہے۔ مگر جوش نئی بیوی کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے۔ پرانی بیوی کے ساتھ وہ جوش نہیں ہوتا تو بات یہ ہے کہ ابتداء میں محبت شوق کے رنگ میں ہوتی اور بعد میں اُنس کا رنگ غالب ہوتا ہے اس وقت وہ کیفیتیں نہیں رہتیں جو شوق کے وقت ہوا کرتی ہیں مثلاً بات پر رونا اور استغراق کا غلبہ ہونا وغیرہ۔ مگر لوگ انہی آثار کو مقصود سمجھتے ہیں۔ اور اُنس کی حالت میں جب یہ آثار کم ہو جاتے ہیں تو پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ مقصود نہیں کہ ہر وقت شوق غالب رہے اور تقاضائے طبعی مرغوبات نفسانیہ کا کبھی نہ ہونا یہ مقصود ہے کہ دل میں حرکت پیدا ہو جائے۔ ہم جب غار ثور پر گئے جہاں سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت تین دن مخفی رہے تھے۔ تو پہاڑ پر چڑھنا پڑا اور بحمد اللہ اس غار کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ مگر جب پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا تو سانس پھول گیا اور دل دھڑکنے لگا۔ اور ایسا کھٹکا پیدا ہوا جو مسموع بھی ہوتا تھا۔ میں نے دوستوں سے کہا کہ لو بھائی اگر یہی

حرکت قلب مدار ولایت ہے تو سب ولی ہوگئے اور اگر یہی ولایت ہے تو اس کا یہ طریقہ بہت آسان ہے کہ پہاڑ پر چڑھ لیا کرو نہ مجاہدہ کی ضرورت ہے نہ اعمال واشغال کی۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے والد مولانا شاہ عبدالرحیم کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ حضرت میرا قلب جاری ہوگیا ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا مبارک ہو۔ اُس وقت اُس کے دعویٰ کو رد نہیں کیا کیونکہ وہ مُرید نہ تھا۔ مدعی تھا اور مدعی کے ساتھ اہل طریق کا یہی معاملہ ہوتا ہے۔ کہ اس کی تردید نہیں کرتے۔ نہ اُس کے سامنے حقائق ومعارف بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ عارف شیرازیؒ کا ارشاد ہے ۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی　　بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی کے سامنے عشق و مستی کے اسرار مت بیان کرواسے اپنے حال پر چھوڑ و تا کہ وہ خود پرستی کے رنج میں مر جائے)

بعد میں فرمایا کہ غریب کو خفقان ہوگیا ہے یعنی اختلاج قلب اس سے قلب جاری ہونے کا دھوکہ ہوگیا۔ حالانکہ ذکر قلبی[1] اور چیز ہے اختلاج قلب اور چیز ہے۔ ذکر قلبی کے معنی ہیں رسوخ الذکر فی القلب اس کو اختلاج[2] سے کیا تعلق۔

بکاء بالقلب

اسی طرح بعض لوگ رونے کو مقصود سمجھتے ہیں اور اعتدال کے بعد جب زیادہ رونا نہیں آتا تو اس سے مغموم ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ اگر رونا ہی ولایت ہے تو رونا کیا مشکل ہے، لاؤ ایک لاٹھی میں مارنا شروع کروں۔ ایک طرف سے سب رونے لگیں گے۔ خوب کہا ہے ۔

عرفی گر بگریہ میسر شدے وصال　　صد سال میتواں بتمنا گریستن

(عرفی اگر رونے سے وصال میسر ہوسکتا تو میں سوسال (وصال کی) تمنا میں روسکتا)

---

[1] میرے ایک عالم دوست اس غلطی میں مبتلا تھے وہ اختلاج قلب ہی کو بزرگی سمجھتے تھے ایک زمانہ میں میں نے اختلاج قلب کی شکایت کی تو کہنے لگے یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم کو نسبت حاصل ہوگئی اور دل جاری ہوگیا۔ یہ تو اہل نسبت کے لئے لازم ہے۔ میں نے کہا بندۂ خدا نسبت کو اختلاج سے کیا واسطہ۔ پھر میں نے اس کی حقیقت بیان کی تو کہنے لگے کہ مجھ کو دھوکہ اس سے ہوا کہ اکثر اہل نسبت اختلاج قلب کے مریض ہیں، میں سمجھا کہ بس یہی نسبت ہوتی ہوگی۔

[2] میں نے کہا اہلِ نسبت سے چونکہ ذکر کی کثرت کرتے ہیں اور جہر وضرب میں بے اعتدالی بھی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے نسبت کے حصول کے ساتھ یہ مرض بھی جمع ہو جاتا ہے۔ ورنہ نسبت سے اُس کو کوئی تعلق نہیں۔ نسبت تو لذیذ ہے اور اختلاف باعث کلفت ہے۔ (فشتان بینهما ۱۲ جامع)

حدیث میں ہے: ابکوا فان لم تبکوا فتباکوا

(الصحیح لمسلم کتاب الذبائح: 57، سنن الدارمی 2:82، الدرالمنثور 4:181)

روؤ اور اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت بناؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ بکا مقصود نہیں کیونکہ یہ ہر حال میں امر غیر اختیاری ہے اور ایسا غیر اختیاری مقصود نہیں ہوتا، پس جس کو رونا نہ آتا ہو وہ رونے کی صورت ہی بنالے یہ بھی کافی ہے۔ میں اس کی ایک سہل عنوان سے توضیح کرتا ہوں کہ بُکاء بالقلب بھی کافی ہے۔ کیونکہ تباکی سے مقصود بکاء بالقلب ہی تو ہے اور اس کے لئے تباکی کو اس لئے اختیار کیا گیا کہ ظاہر کا بھی باطن پر اثر ہوتا ہے جیسا کہ باطن کا ظاہر پر ہوتا ہے آپ تجربہ کرلیں کہ ایک مغموم آدمی کچھ دیر بہ تکلف ہنسے اور دل لگی کرے تو تھوڑی دیر میں دل پر فرحت ونشاط کا اثر محسوس ہوگا۔ اور کوئی بے فکر خوش آدمی تھوڑی دیر مغموموں کی سی صورت بنا کر بیٹھ جائے تو کچھ دیر کے بعد قلب میں گرفتگی اور انقباض کا اثر پائے گا۔ جب تباکی سے مقصود یہ ہے تو جس کا بکاء بالقلب حاصل ہو وہ بے فکر رہے اور اس کو تباکی صوری کی بھی ضرورت نہیں۔

میرے پاس بعض ذاکرین کے خطوط آتے ہیں کہ ہم کو رونا نہیں آتا۔ اس کا افسوس ہے میں لکھ دیتا ہوں کہ تمہارا دل روتا ہے اور کیا چاہتے ہو اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تم کو نہ رونے پر رنج وافسوس ہے۔ بہرحال یُعْجِبُکَ قَوْلُہٗ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی گفتگو مزہ دار معلوم ہوتی ہے) میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تاثر بالطبعیات کا ذکر اس مسئلہ کو حل کررہا ہے کہ امور طبعیہ مجاہدہ سے زائل نہیں ہوتے ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو سید المجاہدین ہیں، اس کے سب سے زیادہ مستحق تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس منافق کی باتوں کا کچھ بھی اثر نہ ہونا چاہئے تھا۔ پس یہ غلطی ہے کہ غلبۂ شوق سے جو امور طبعیہ مغلوب ہوگئے تھے پھر اُنس کے وقت وہ عود کر آئیں تو اُن سے مغموم ہو، آخر تم نے یہ کہاں سے سمجھ لیا کہ مجاہدہ ہے۔ یہ امور مسلوب ہوجاتے ہیں، اسی لئے عارف شیرازی جن کو لوگ رند سمجھتے ہیں، حالانکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صورتاً وسیرتاً ہر طرح ثقہ تھے گو کلام رندانہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

در راہِ عشق وسوسۂ اہرمن بسے ست ہشدار و گوش رابہ پیام سروش دار

پیام سروش سے مراد وحی ہے مطلب یہ ہے کہ اس طریق میں شیطان بہت دھوکے دیتا ہے بس تم کو ہر حال میں وحی کو پیش نظر رکھنا چاہئے اور تمام امور کو وحی پر منطبق کرو جو اعتقادات اور احوال شریعت پر منطبق نہ ہوں وہ زندقہ ہے۔ اب بتلاؤ شریعت نے یہ کہاں کہا ہے کہ امور طبعیہ کا زوال مطلوب ہے یا رونا اور چلانا مقصود ہے یا تقاضائے معصیت کا نہ ہونا مطلوب ہے۔

امتیاز انسانیت

بلکہ میں کہتا ہوں کہ جس میں تقاضا ہو اور پھر مقتضاء پر عمل نہ کرے وہ اُس سے اکمل ہے جس میں تقاضا ہی نہیں۔ اندھا اگر دعویٰ کرے کہ میں نامحرم کو کبھی نہیں دیکھتا تو کیا کمال ہے وہ دیکھ ہی نہیں سکتا۔ گونگا اگر کہے کہ میں غیبت اور کذب کا کبھی ارتکاب نہیں کرتا کیا کمال ہے وہ تو بول ہی نہیں سکتا۔ کمال تو اُس کا ہے جو دیکھ سکتا ہے بول سکتا ہے، سُن سکتا ہے اور پھر کچھ نہیں کرتا۔ انسان کو ملائکہ سے امتیاز اسی لئے ہے کہ اُن میں تقاضا نہیں اور اُس میں تقاضا ہے۔ باقی یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ابتداء میں لذتِ ذکر کو ایسا غالب کر دیتے ہیں کہ یہ تقاضا مغلوب ہو جاتا ہے۔ اگر ابتداء میں بھی لذت ذکر غالب نہ ہوتی تو عمر بھر کو تقویٰ دشوار ہو جاتا پھر جب مجاہدہ اور ذکر کو ایسا رسوخ ہو گیا کہ تقاضائے نفس کی مقاومت سہل ہو گئی اُس وقت یہ تقاضا پھر عود کر آتا ہے تاکہ مقاومت تقاضا سے کمال ظاہر ہو اور درجات بڑھیں، بلکہ یوں کہئے کہ اس وقت ظہور ہو جاتا ہے کیونکہ عود تو وہ شے کرے جو جاتی رہی ہو اور میں کہہ چکا ہوں کہ مجاہدہ سے طبعیات کا زوال نہیں ہوتا اس لئے ظہور تقاضا کے وقت پریشان نہ ہونا چاہئے۔ بس یوں سمجھے کہ میں کون ہوں جو طبائع سے متاثر نہ ہوں جب کہ کاملین اور سید الاکملین صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان سے متاثر ہوتے تھے۔ گو عمل کبھی نہ کرتے تھے۔ چنانچہ یہاں اعجاب ہی کا ذکر تو ہے عمل کا تو ذکر نہیں۔ غرض یہ آیت ایسے منافق کے بارہ میں نازل ہوئی ہے۔

دین کے اعتبار سے لوگوں کی اقسام

میں نے شروع ہی میں اس پر تنبیہ کر دی ہے۔ پھر ضمناً اور بھی مسائل بیان ہو گئے۔ غرض ایک قسم تو یہ ہوئی دوسری قسم وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِیْ نفسہ الآیۃ میں مذکور ہے اس کو پہلے کا مقابل ہونے کی وجہ سے مخلص کہئے اب دونوں کو ملانے سے تکلف کی دو قسمیں ہوئیں ایک مخلص ایک غیر مخلص عام مفسرین نے تو یہاں دو ہی قسمیں بیان کی ہیں انہوں نے صرف سباق قریب کو دیکھا ہے اور بعض مفسرین نے جس کی تعیین ذہن میں نہیں رہی، اور قاضی ثناء اللہ صاحب نے اس کا ربط دور سے لیا ہے۔ بہت عرصہ ہوا کہ میں نے یہ تفسیر دیکھی تھی اس سے بہت جی خوش ہوا، تفصیل مقام کی یہ ہے کہ اس سے اوپر حق تعالیٰ نے حج کے احکام کے ساتھ فرمایا ہے۔

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَا سِکَکُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَاءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ الخ۔

یعنی جب تم مناسک حج پورا کر چکو تو خدا تعالیٰ کو یاد کرو۔ جیسا اپنے آباؤ اجداد کو یاد کرتے تھے۔ یا اُن کے ذکر سے بھی زیادہ یاد کرو۔ زمانہ جاہلیت میں حج کے بعد منیٰ میں اہل عرب قیام کرتے اور وہاں مشاعرہ ہوتا۔ اور مفاخرت کے طور پر اپنے خاندانی فضائل کا مذاکرہ ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ذکر اللہ سے بدل دیا کہ اب بجائے ذکر دنیا کے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ جاہلیت کا طریقہ چھوڑ دو۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اب ذکر اللہ یعنی دین کے اعتبار سے لوگوں کی چند قسمیں ہیں، چنانچہ ارشاد ہے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَمَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ

یعنی بعض آدمی تو وہ ہیں جو (دعا میں) یوں کہتا ہے کہ اے پروردگار! ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دُنیا میں ہی دیدے۔ اور اس کے لےء آخرت میں کوئی حصہ نہیں یہ تو کافر ہے کیونکہ جس کو آخرت میں کچھ نہ ملے وہ کافر ہی ہے، مسلمان اس کا مصداق نہیں ہوسکتا۔ اگے دوسری قسم ہے۔

وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ

(اور بعضے آدمی (جو کہ مومن ہیں) ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ آئے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچایئے)

اس آیت کا سیاق کلام بتلا رہا ہے کہ اس کے مصداق وہ مسلمان ہیں جو طالب آخرت ہیں اس پر شاید یہ سوال ہو کہ جبؓ یہ لوگ مسلمان طالب آخرت ہیں تو انہوں نے دنیا کیوں مانگی۔ اور اس سے بعض انگریزی خوانوں نے طلب دنیا کا مضمون سمجھ کر یہ کہا ہے کہ دنیا جس کی مذمت کی جاتی ہے اور جس کی طلبؒ سے علماء منع کرتے ہیں، ایسی چیز ہے جس کی طلب نص میں بیان کی گئی ہے اور اس پر مدح کی گئی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دنیا کو کہاں مانگا گیا ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا دُنْیَا تو نہیں فرمایا۔ اگر یوں فرماتے تو بے شک طلب دنیا مفہوم ہوتی۔ مگر نص میں تو رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وارد ہے جس میں مطلوب حسنہ ہے اور دنیا محض ظرف ہے پس اس سے طلب دنیا لازم نہیں آتی، بلکہ طلب **حسنۃ فی الدنیا** لازم آئی اس لئے ان کو طالب دنیا کہنا غلط ہے بلکہ وہ تو طالب حسنہ فی الدنیا ہیں۔ اس پر شاید سوال ہو کہ پھر اُن کو طالب آخرت کہنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ طالب حسنہ فی آخرۃ کہنا چاہئے اس کا جواب یہ ہے کہ طلب آخرت کے تو معنی یہی ہیں کہ طالب حسنہ ہو۔ اب چاہے تم اُس کو طالب آخرت کہو یا طالب حسنہ فی الآخرۃ کہو۔ دونوں برابر ہیں۔

اس پر اگر تم کہو پھر ہم بھی طالب دنیا نہیں ہیں۔ بلکہ طالب حسنہ فی الدنیا ہیں۔ یعنی مال

ودولت حسنہ ہے اور ہم اُس کے طالب ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حسنہ سے مراد حسنہ واقعیہ ہے نہ کہ حسنہ مزعومہ اور یہ شریعت سے معلوم ہوسکتا ہے کہ حسنہ واقعیہ کیا ہے اور جس چیز کے تم طالب ہو وہ تمہارے نزدیک حسنہ ہے۔ مگر شرعاً تو وہ حسنہ نہیں ہے۔ پس شریعت پر فیصلہ ہے پس اس آیت کا مصداق وہی شخص ہوسکتا ہے جو حسنہ شرعیہ کا طالب ہو اور حسنہ شرعیہ سے بھی وہ مراد ہے جو حقیقتاً حسنہ شرعیہ ہو۔ محض صورۃً ہی حسنہ نہ ہو کیونکہ بعض افعال صورۃً دین کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقتاً دین نہیں ہوتے۔ ہم اُن سے بھی منع کرتے ہیں۔

اس سے آپ کو ہمارے انصاف کا اندازہ ہوگیا ہوگا ہم صرف صورت دُنیا ہی کے مخالف نہیں بلکہ دنیا بصورت دین کے بھی مخالف ہیں جیسے بدعات وغیرہ کہ گو ظاہر میں وہ دین کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر ہم اُن سے بھی منع کرتے ہیں۔ کیونکہ دنیا کہتے ہیں مانع عن اللہ کو اور یہ مال ودولت کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ بعض ایمان میں مانع عن اللہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے وہ ایمان جس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَاهُمْ بِمُؤْ مِنِيْنَ

(اور لوگوں میں جو شخص کہتا ہے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر حالانکہ وہ ایمان والے نہیں)

یعنی ظاہری ایمان جس میں حقیقت کا پتہ بھی نہ ہو۔ ایسے ہی بعض اعمال بھی جو صورۃً دین ہیں۔ مگر حقیقت دین اُن میں موجود نہیں۔ مَانع عن اللہ ہیں۔ یہاں سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ہم صرف طالبان دنیا ہی کی مذمت نہیں کرتے۔ بلکہ طالبان دین کی بھی مذمت کرتے ہیں۔ جو حقیقت میں دین کی صورت میں دُنیا ہی کے طالب ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی نسبت مولانا فرماتے ہیں ۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست ۔ پس بہر دستے نباید داد دست

گر بصورتِ آدمی انسان بدے ۔ احمد و بوجہل ہم یکساں بدے

ایں کہ می بینی خلاف آدم اند ۔ نیستند آدم غلاف آدم اند

بہر حال اس میں تو شک نہیں کہ پہلی آیت کا مصداق کافر ہے اور دوسری آیت کا مصداق مومن عام مفسرین نے تو یہی دو قسمیں سمجھی ہیں اور آگے مِنَ النَّاسِ من يعجبك سے مستقل کلام لیا ہے۔ مگر قاضی ثناء اللہ صاحب نے مجموعہ کلام میں چار قسمیں سمجھی ہیں دو تو وہ ہی جو ابھی مذکور ہوئیں اور دو من الناس من يعجبك الخ اور من الناس من يشرى الخ۔ خلاصہ فرق دونوں توجیہوں کا یہ ہے کہ عام مفسرین کے نزدیک تو یہاں پر دو تقسیمیں ہیں۔ تقسیم اول انسان کی تقسیم ہے۔ مومن و کافر کی طرف تقسیم ثانی انسان کی تقسیم ہے۔ منافق اور مخلص کی طرف مگر یہ اقسام باہم جمع ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ کافر و منافق جمع ہوسکتے ہیں اور مومن و مخلص جمع ہوسکتے ہیں۔ اس تقسیم کی ایسی مثال

ہے جیسے نحاۃ نے کلمہ کی تقسیم کی ہے اسم وفعل وحرف کی طرف، پھر دوبارہ تقسیم کی ہے مذکر ومونث کی طرف۔ وعلیٰ ھٰذا تو یہ اقسام باہم جمع ہوسکتی ہیں۔ یہ تو جمہور مفسرین کی توجیہ کا حاصل ہے۔

اور بعض دوسرے مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں ایک ہی تقسیم ہے اور مقسم بھی واحد ہے، یعنی انسان مقسم ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں، مومن وکافر، پھر کافر کی دو قسمیں ہیں مجاہر ومنافق اور مومن کی دو قسمیں ہیں ایک طالب آخرت اور ایک طالب حق۔ پس کل چار قسمیں متبائن ہو گئیں کافر مجاہر اور کافر غیر مجاہر۔ اور مومن طالب آخرت اور مومن طالب حق بدوں التفات الی الآخرۃ بدوں اس کے کہ آخرت کا طالب ہو۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ

(پس بعض آدمی (جو کافر ہیں) ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو جو کچھ دینا ہے دنیا ہی میں دے دیجئے اور ایسے شخص کا اخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

میں کافر مجاہر کا ذکر ہے جو کہ دنیائے محضہ کا طالب ہے اور وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔ (اور بعضے آدمی (جو کہ مومن ہیں) ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بہتری دیجئے اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے) الخ میں مومن طالب آخرت کا ذکر ہے۔ اور مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ میں کافر غیر مجاہر یعنی منافق کا ذکر ہے۔ اور مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ میں مومن طالب حق کا ذکر ہے جو محض طالب رضاء ہے۔ آخرت اور دنیا دونوں کی طرف ملتفت نہیں۔ یہ تو تفسیر آیت کی تقریر تھی۔ اور میں نے تفسیر کو اس وقت اس لئے بیان کیا حالانکہ مجھے اس وقت چند مسائل سلوک کے بیان کرنا ہیں۔ علوم کا بیان مقصود نہ تھا کیونکہ مخاطب خود اہل علم ہیں اُن کو اُس کی ضرورت نہ تھی مگر خود میرا مقصود تفسیر ہی پر موقوف ہے۔ اس لئے تفسیر کو بطور مقدمہ کے بیان کر دیا۔

طلب کا درجہ علیا

اب میں مسائل کو بیان کرنا چاہتا ہوں وہ مسائل بہت ضروری ہیں اس لئے اس وقت اُن کے بیان کو اختیار کیا ہے گو وقتی ضرورت نہیں ہے بلکہ ضرورت عامہ ہے جو کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہیں اور اس جہت سے یہ وقتی ضرورت سے بھی زیادہ اہم ہے اس لئے غور سے سُننا چاہئے اور چونکہ اب اقتضاء عمر کے لحاظ سے حافظہ اچھا نہیں رہا تو میں نے سہولت ضبط کے لئے ان مسائل کو ایک پرچہ پر لکھ لیا ہے تاکہ کوئی بات رہ نہ جائے۔ آج کل مجھے اثناء بیان میں یاد نہیں رہتا کہ کیا کیا باتیں بیان کرنا ہیں اسی لئے درمیان میں اکثر کاتب سے پوچھنا پڑتا ہے۔ اور گو ایسا اتفاق پہلے بھی ہوتا تھا مگر کم اور اب یہ بات زیادہ پیش آتی ہے اب وہ مسائل سنئے۔

ایک مسئلہ تو اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ طلب کا درجہ علیا کیا ہے؟ یہاں بطور دفع دخل مقدر

کے اس بات پر تنبیہ کئے دیتا ہوں کہ چونکہ تفسیریں دونوں محتمل ہیں۔اس لئے بعض مسائل ایک تفسیر پر مستنبط ہیں اور بعض دوسری تفسیر پر کیونکہ تفسیریں دونوں صحیح اور آیت پر منطبق ہیں۔پس طلبہ کو

اِذَ جَآءَ الْاِحْتِمَالُ بَطَلَ الْاِسْتِدْلَالُ کے قاعدہ سے ان مسائل کو رد نہ کرنا چاہئے، کیونکہ یہ قاعدہ وہاں ہے جہاں دونوں احتمال صحیح نہ ہوں۔ بلکہ لَا عَلَی التَّعِیِیْنِ ایک ہی احتمال صحیح ہو اور یہاں یہ بات نہیں بلکہ دونوں احتمال صحیح ہیں کیونکہ ان میں باہم کچھ منافات نہیں ہے۔اس لئے جس تفسیر پر بھی استنباط ہو صحیح ہوگا۔سوان دونوں تفسیروں میں سے ایک تفسیر پر (جب یہ کہا جائے کہ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نفسہ (اور بعضا آدمی ایسا بھی ہے جو اپنی جان تک بھی صرف کر چکا ہے) میں طالب حق غیر طالب آخرت کا بیان ہے اور یہ چوتھی قسم ہے) یہ معلوم ہوا کہ طلب کا درجہ علیا یہ ہے کہ محض حق کی طلب ہو جنت وغیرہ کی طلب نہ ہو اور مومنین کی اس قسم خاص کا پہلی قسم یعنی طالبانِ جنت سے علیحدہ ہونا دوسری نصوص سے بھی موئید ہے چنانچہ سورہ واقعہ میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

فَاَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ وَاَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ وَ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ مَااَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ

(پس جو داہنے ہاتھ والے ہیں وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں اور بائیں ہاتھ والے وہ بائیں والے کیسے برے ہیں)

ظاہر ہے کہ یہاں اصحٰب المیمنہ سے مراد اصحٰب جنت ہیں اور اصحٰب المشئمة سے مراد کافر ہیں۔

مگر اصحٰب المیمنة سے مراد کل اصحاب جنت ہیں بلکہ صرف عامۂ مومنین مراد ہیں اور خواص کا ذکر آگے ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُوْلٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ (اور جو اعلیٰ درجہ کے ہیں وہ تو اعلیٰ درجہ کے ہیں اور جو خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص قرب رکھنے والے ہیں)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ تیسری قسم ہے جو اصحٰب الجنۃ سے بھی ممتاز ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ کہیں جنت سے الگ رہیں گے۔نہیں سکونت کے اعتبار سے بھی اصحاب جنت ہیں۔مگر طلب کے اعتبار سے اُن سے الگ ہیں۔

پس اصحٰب الجنة کی دو قسمیں ہیں۔ایک من یطلب الجنة دوسرے من طلب الحق وان سکن الجنة اور سابقون کے تکرار سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ دونوں مذکورہ طبقوں سے سابق ہیں پس اصحاب جنت سے بھی سابق ہوئے یہی معنی ہیں اہل جنت سے ان کے ممتاز ہونے کے آگے اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ اُوْلٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ (وہ اللہ تعالیٰ کے خاص مقرب ہیں) کے بعد فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ بھی فرما دیا تا کہ یہ شبہ نہ کہ شاید مقرب ہونے سے مراد یہ ہے کہ نعوذ باللہ وہ خدا تعالیٰ کی گود میں بیٹھیں گے۔تو بتلا دیا کہ وہ بھی جنت ہی میں ہوں گے۔مگر دوسروں سے مقرب ہوں

گے۔ بہر حال اہل جنت میں دو قسمیں ہونا نصوص سے صراحۃً معلوم ہو رہا ہے اور اہل طریق کے کلام میں تو اس کی بہت تصریح ہے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ طلب کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی چیز کا طالب نہ ہو، نہ جنت کا نہ دوزخ سے بچنے کا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنت کو طلب نہ کرے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ بالذات طلب نہ کرے۔ گو بعض اہل حال ایسے بھی ہیں جنہوں نے یہ "صاف کہہ دیا کہ ہم کو نہ جنت کی پرواہ ہے نہ دوزخ کی۔ مگر یہ لوگ محقق نہیں ہیں ہاں مغلوب ہیں۔ چنانچہ اہل حال ایسے بہت گزرے ہیں جنہوں نے طالبانِ جنت پر انکار کیا ہے۔

حضرت رابعہ بصریہ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک دن ایک ہاتھ میں پانی اور ایک ہاتھ میں آگ لئے ہوئے دوڑی جا رہی تھیں کسی نے پوچھا حضرت یہ کیا ہے فرمایا لوگ کہیں جنت کے طالب ہیں کوئی دوزخ سے ڈرتا ہے میرے محبوب کا نام کوئی نہیں لیتا۔ حضرت رابعہ کی یہ بات ویسی ہی تھی۔ جیسے کالے خاں وکیل ہمارے ایک دوست تھے۔ کانپور میں ایک بار اُن کا لکھنؤ جانا ہوا تو ایک شیعی نے اُن سے کہا کہ امام صاحب کی مجلس میں نہیں چلتے۔ کالے خان نے کہا۔ امام صاحب کی مجلس کہاں ہے۔ کہاں سُبحان اللہ! آج کل تو سینکڑوں جگہ امام کی مجلس ہو رہی ہے آپکو معلوم ہی نہیں۔ کالے خان نے کہا میں نے تو آج ہی نام سُنا ہے۔ مجھے لکھنؤ میں آئے ہوئے کئی روز ہو گئے۔ اس وقت تک بھی نہیں سُنا کہ یہاں امام صاحب کی مجلس بھی ہوتی ہے۔ اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو تھوڑی دیر تشریف رکھئے۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔ چنانچہ کچھ دیر میں ایک شخص آیا کہ فلاں نواب صاحب کے یہاں مجلس ہے پوچھا کاہے کی مجلس ہے کہا فیرینی کی۔ اسی طرح کئی آدمی آئے کسی نے حلوے کی مجلس بتلائی اور کسی نے نان گوشت کی کالے خان نے کہا حضرت آپ نے دیکھ لیا ان میں سے کسی نے بھی یہ کہا کہ امام صاحب کی مجلس ہے۔ ہر شخص کھانے کی مجلس بتلاتا ہے۔ وہ شیعی کہنے لگا کہ تم تو دل لگی کرتے ہو میاں یہ سب مجلسیں امام ہی کی ہیں۔ امتیاز کے لئے کھانے کا نام لے دیا۔ گو یہ تاویل صحیح تھی مگر وہ شیعی امام کا عاشق ہوتا تو اُس کو اس عنوان ہی سے ضرور ناگواری ہوتی۔ اسی طرح حضرت رابعہ نے فرمایا کہ میں آج جنت دوزخ کا فیصلہ کئے دیتی ہوں۔ آگ سے جنت کو جلا دوں گی اور پانی سے دوزخ کو ٹھنڈا کر دوں گی، تاکہ پھر کوئی ان کا نام نہ لے۔ میرے محبوب ہی کا نام لیں مگر یہ لوگ صاحب حال تھے یہ لوگ معذور ہیں غیر صاحب حال کو ایسی بات کہنے کی اجازت نہیں جیسے بچہ باپ کی داڑھی کھینچ لے تو غصہ نہیں آتا۔ مگر اُس کو دیکھ کر سیانا لڑکا بھی یہ حرکت کرنے لگے جس کے ہوش وحواس درست ہیں وہ جوتے کھائے گا کہ یہ کیا نالائق حرکت ہے مگر آج کل اہل حال کو دیکھ کر بعض غیر اہل حال بھی ایسی باتیں بنانے لگتے ہیں۔ ایسے مدعیوں کو مولانا خوب لتاڑتے ہیں۔

حرف درویشاں بدزود مردِ دوں تابہ پیش جاہلاں خواند فسوں

اور فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند   ازسخنہا عالمے راسو ختند

مولانا نے ان کی ایسی خبر لی ہے کہ ایسا تو کسی عالم نے بھی نہیں کیا۔ غرض ایسے مغلوب بہت گزرے ہیں۔ جنہوں نے طلب جنت سے انکار کیا اور کہا ہم کو نہ جنت کی پرواہ ہے، نہ دوزخ کی۔

اقسام طلب

مگر محققین یوں کہتے ہیں کہ طلب جنت کی دو قسمیں ہیں اسی طرح استغناء عن الجنۃ کی بھی ایک تو یہ کہ براہ راست جنت کو طلب کیا جائے گو اعتقاد تو تبعاً طلب کرنے کا ہے مگر اُس وقت طالب کی نظر میں نعماء جنت منحصر ہوتی ہے۔ اُن کی وجہ سے جنت کو مانگتا ہے جیسے شادی سے اعتقاداً تو اولاد بھی مطلوب ہے۔ مگر شادی کے وقت اس کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ محض تمتع کا خیال ہوتا ہے۔ یہ درجہ ادنی ہے اور اس کی بھی اجازت ہے کیونکہ نصوص میں ہے۔

لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ (اس طرح عمل کرنے والے اسکی طرح عمل کر سکتے ہیں)

اور **وَ فِیْ ذٰلِکَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ** (اور حرص کرنیوالوں کو ایسی چیز کی حرص کرنا چاہئے)

جس کے اطلاق میں یہ درجہ بھی داخل ہے۔ دوسرے یہ کہ جنت کے طالب اس لئے ہیں کہ وہاں حق تعالیٰ کی رضاء ولقا حاصل ہوگی۔ یہ عشاق کا مذاق ہے۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

عاشقان جنت برائے دوست می دارند دوست

اور مطلقاً طلب جنت پر کیسے نکیر ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس درجہ میں جنت کی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی طلب میں فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْجَنَّةَ وَمَا قرب اِلَيْهَا من قول او عمل

(اتحاف السادة المتقين8:310، كنز العمال:2912، صفة الصفوة:208)

اے اللہ میں جنت کا سوال کرتا ہوں اور اس چیز کا جو اس سے قریب کر دے قول یا عمل۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنت مطلقاً غیر مطلوب نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طلب کیوں فرماتے اور ایک درجہ اور ہے وہ اس سے بھی باریک ہے وہ یہ کہ جنت کو براہ راست طلب کرتے ہیں۔ مگر نعماء کی وجہ سے نہیں بلکہ عبدیت کی وجہ سے یہ وہ لوگ ہیں جن پر عبدیت کا غلبہ ہے وہ اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اپنے کو طالب حق کہیں۔ بلکہ وہ محبوب سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس چیز کو طلب کریں۔ وہاں سے حکم ہوا کہ جنت مانگو۔ اس لئے مانگتے ہیں، اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک معشوق کی نسبت کسی کو خبر ہو جائے کہ جو کوئی اس سے آم مانگتا ہے اُس سے بہت خوش ہوتا ہے۔

اب بعضے تو آم کے عاشق تھے۔ اس لئے مانگنے آئے اور بعضے محبوب ہی کے عاشق تھے۔ انہوں نے محبوب کے سوا کسی اور چیز کو مانگنا غیرت عشق کے خلاف سمجھا اور بعضے وہ تھے جنہوں نے یہ خیال کیا کہ جب محبوب آم مانگنے سے خوش ہوتا ہے تو اُسے خوش کرنے کے لئے ضرور مانگنا چاہئے۔ پھر اُن میں بھی دو جماعتیں ہیں ایک تو وہ جو آم ہی مانگنے آئے۔ مگر ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ چونکہ آپ آم مانگنے سے راضی ہوتے ہیں اس لئے مانگتے ہیں ورنہ اصل مطلوب تو آپ ہیں۔ یہ عشاق متوسطین ہیں۔ کاملین اس کو بھی بے ادبی سمجھتے ہیں کہ زبان سے آم کا مطلوب نہ ہونا جتلایا جاوے اور محبوب میں مطلوبیت کے حصر کا دعویٰ کیا جاوے۔ اُن کی یہ حالت ہے کہ مطلوب تو اُن کو محبوب ہی ہے مگر اپنے عشق اصلی کو ظاہر کرتے ہوئے شرماتے ہیں کہ اپنے کو کس منہ سے محبوب کا عاشق کہیں ہم اس قابل تو نہیں ہیں لاؤ محبوب کے محبوب ہی کا عشق ظاہر کریں۔ اب وہ سامنے آ کر آم کی طلب اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ جس سے دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی آم ہی کے عاشق ہیں۔ اسی کے واسطے آئے ہیں، اسی طرح یہاں سمجھو کہ کاملین غلبۂ عبدیت کی وجہ سے جنت کو اس طرح طلب کرتے ہیں جیسے خود جنت ہی مطلوب ہے۔ حالانکہ حقیقت میں اُن کو محض رضا مطلوب ہے۔ مگر اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتے۔ کہ اپنے کو طالب حق کہیں۔ اس لئے جس چیز کے مانگنے کا محبوب نے امر کر دیا ہے۔ نہایت شوق سے اُسی کو مانگتے ہیں، پس پہلی جماعت تو جنت کی طالب من حیث الجزائر ہے اور دوسری جماعت مغلوب الحال ہے اور تیسری جماعت کی طلب لامتثال الامر ہے جس میں رضا غایت ہے اور جنت اس کا ذریعہ ہے اور چوتھی جماعت کی رغبت الی الجنت اس لئے ہے کہ وہ محبوب کی محبوب ہے اس لئے ان کو بھی محبوب ہے۔

مقامِ کمال

اسی وجہ سے وہ براہ راست جنت کی طلب کرتے ہیں یہ کاملین کا درجہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کاملین اسی مقام پر ہیں ان کا پہچاننا مشکل ہے کیونکہ ان کی طلب ظاہر میں جنت پرستوں کی طلب سے مشابہ ہوتی ہے تو ظاہر میں ان کی حالت کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اس میں کون سا کمال ہے۔ یہ تو وہی ہے جس پر ذوق فتویٰ لگا رہا ہے۔

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے　　　حوروں پہ مر رہا ہے شہوت پرست ہے

اس مرتبہ والے کو ذوق نہیں سمجھ سکتا، ہاں صاحب ذوق سمجھتا ہے کیونکہ یہ شخص جنت سے تو کیا محبوب کی ادنیٰ نعمت سے بھی استغناء ظاہر نہیں کر سکتا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی سید العباد ہیں آپ جنت سے تو کیا استغناء فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ کھانا کھا کر فرمایا کرتے تھے۔

غیر مودع ولا مکفور ولا مستغنی عنہ ربّنا

(الصحیح لمسلم :1626، مسند أحمد2:6، فتح الباری9:581)

یعنی اس کھانے کو ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں کرتے۔ شام کو پھر مانگیں گے اور نہ اس کی بے قدری کرتے ہیں اور نہ اس سے استغناء ظاہر کرتے ہیں بلکہ ہم ہر وقت اس کے محتاج ہیں کیونکہ آپ کی عطا ہے، اس حدیث میں آپ کھانے کی طرف اس طرح احتیاج ظاہر کررہے ہیں، جیسے کوئی کھانے کا عاشق ظاہر کیا کرتا ہے مگر حقیقت میں آپ کو کھانے کا عشق بالذات نہ تھا۔ بلکہ عطاءِ حق کی محبت تھی۔ مگر منتہی کی حالت مبتدی جیسی ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کا پہچاننا مشکل ہے اسی لئے انبیاء علیہم السلام کو کفار نے نہ پہچانا کیونکہ اُن میں کوئی شانِ امتیاز ظاہر میں نہ تھی، چنانچہ کفار کہتے تھے۔

مَالِ ھٰذَ االرَّسُوْلِ یَاْ کُلُ الطَّعَامَ وَ یَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاق

یعنی اس رسول کو کیا ہوا کہ کھانا بھی کھاتے ہیں اور بازار میں بھی چلتے پھرتے ہیں ایسے تو ہم بھی ہیں اگر کوئی متوسط صوفی ہوتا جو حجرہ سے آگے قدم نہ بڑھاتا اور چالیس دن کا فاقہ کیا کرتا اس کے سب معتقد ہو جاتے اس لئے کفار متوسطین سے بہت ڈرتے ہیں کہتے ہیں یہ تو اوتار ہے اس نے چالیس دن سے کچھ بھی نہیں کھایا، بھلا انسان سے کہیں ایسا ہو سکتا ہے۔

قیاسِ فاسد

اور انبیاء علیہم السلام کو بازار میں پھرتا ہوا دیکھا۔ اُن کو اپنے اوپر قیاس کرنے لگے۔ ہاں پہچاننے والا جانتا ہے کہ ابس میں اور دوسروں میں کیا فرق ہے۔ دوسرے بازار کے اندر ہیں اور اس کے اندر سارا بازار ہے بلکہ تمام عالم ہے ؎

آسماں ہاست در ولایتِ جاں کار فرمائے آسماں جہاں

درہ رہ روح پست و بالا ہاست کوہ ہائے بلند و صحرا است

ولایت جان میں بہت سے آسمان ہیں جو ظاہری آسمان میں کارفرمائیں روح باطن کے راستہ میں پست وبالا (نشیب وفراز) اور کوہ وصحرا موجود ہیں۔

اور اُن کے اس قیاس فاسد کی ایسی مثال سمجھتا ہے جیسے ایک گنوار کی حکایت میرے ایک دوست نے ابھی قریب زمانہ میں بیان کی تھی۔ کہ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ سے اُس نے قرآن سنانے کی درخواست کی۔ قاری صاحبؒ نے سُنا دیا تو وہ کیا کہتا ہے کہ جیسا میں پڑھوں ویسا ہی تو پڑھے۔ میں مَردانی بولی میں پڑھوں تو جاتا ی (زنانی) بولی میں پڑھے ہے۔ اُس نے یہ قدر کی قاری احب کے علم تجوید کی۔ اسی طرح مولانا نے طوطی کی حکایت لکھی ہے۔ کہ ایک تاجر کی دکان پر ایک طوطی تھی وہ بہت باتیں کرتی تھی۔ اُس کی وجہ سے دُکان کی بڑی رونق تھی۔ ایک دفعہ تاجر کہیں گیا

ہوا تھا۔ کہ دکان میں بلی آ گئی طوطی اُس کو دیکھ کر ڈری اور تیل کی بوتلوں کے پیچھے چھپ گئی۔۔اس کی اس حرکت سے روغن بادام کی شیشی گر پڑی جس سے تمام تیل گر گیا تاجر جو واپس آیا تو بادام روغن کی شیشی ٹوٹی ہوئی پائی اور طوطی کو جگہ سے بے جگہ بیٹھا ہوا دیکھا اُس کو غصہ آیا کہ یہ شیشی اس نے گرائی ہے طوطی کو بہت مارا۔ یہاں تک کہ گنجا کر دیا۔ اب طوطی نے بولنا ہی چھوڑ دیا۔ ہر چند تاجر خوشامد کرتا وہ بول کر ہی نہ دیتی۔ اب وہ جگہ جگہ دعائیں کراتا پھرتا اور اپنی حرکت پر پچھتاتا تھا۔ کہ میں نے اسے کیوں مارا۔ اس کے گونگا ہونے سے تو میری دکان کی رونق ہی جاتی رہی۔ اتفاق سے ایک دن دکان کے سامنے سے ایک گنجا گزرا اُس کو دیکھ کر طوطی بے ساختہ بولی۔

از چہ اے کل باکل آمیختی　　تو مگر از شیشہ روغن ریختی

کہ میاں تم کیوں گنجے ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے تم نے بھی بوتل میں سے تیل گرایا ہوگا۔

طوطی نے اس کو بھی اپنے اوپر قیاس کیا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

از قیاسش خندہ آمد خلق را　　اوچو خود پنداشت صاحب دلق را

(اسکے خیال س لوگ مسکرا اُٹھے کیونکہ اس نے گدڑی والے کو اپنی طرح سمجھا)

اس کے بعد فرماتے ہیں۔ کہ یہی حال ہمارا ہے کہ ہم بھی سب کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیرد　　گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیرد

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد　　کم کسے زابدلال حق آگاہ شد

گفتہ اینکہ ما بشر ایشاں بشیر　　ما وایشاں بستہ خوابیم و خور

(نیک لوگوں کو اپنے اوپر قیاس مت رکھو جیسے لکھنے میں شیر (درندہ) اور شیر (دودھ) یکساں ہے) تمام دنیا اسی خام خیالی کی وجہ سے گمراہ ہوگئی کہ انہوں نے اولیاء اللہ کو نہیں پہنچانا کہنے لگے ہم بھی انسان ہیں وہ بھی انسان ہیں وہ بھی کھاتے پیتے ہیں وہ بھی کھاتے پیتے ہیں۔

حقیقت میں کاملین کو اپنے اوپر قیاس کرنا غلطی ہے۔

منتہی کی حالت

مگر کاملین کو لوگ اس واسطے اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں کہ وہ متوسطین کی طرح شانِ امتیاز کے ساتھ نہیں رہتے۔

چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ حج کو گئے اور طواف کیا تو کعبہ کو ندار پایا یعنی روح کعبہ کو موجود نہ پایا۔ جو ایک خاص تجلی ہے۔ حق تعالیٰ سے دریافت کیا کہ کعبہ کہاں چلا گیا الہام ہوا کہ فلاں بزرگ کی زیارت کو گیا ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن بھی اس پر اکتفاء نہ

کیا۔ بلکہ خود جہاد کر کے خود زیارت کعبہ کو تشریف لے گئے۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور جملہ انبیاء علیہ السلام نے اپنے اختیار سے کبھی فاقہ نہیں کیا اور روزہ بھی رکھا تو سحری میں پیشگی کچھ ضرور کھالیا۔ چاہے ایک چھوہارہ ہی ہو۔ کھانے کا نام تو ہو گیا اب اس حالت کو دیکھ کر لوگ کہیں گے کہ یہ کھانے کے کیسے پابند ہیں۔ روزہ بھی رکھا تو وہ وقت کھانے کا معمول نہ چھوڑا۔ اس حالت میں کامل کو کون پہچانے، اور اُس سے کون ڈرے۔ غرض منتہی کی حالت مبتدی کے مشابہ ہوتی ہے۔ اور یہ مبتدی کے لئے بھی فضیلت ہے کہ اس کو کاملین سے مشابہت ہے اس طرح مبتدی

مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ: (الصحیح للبخاری8:110، سنن الترمذی:2333، سنن ابن ماجة:4114، مشکوٰۃ المصابیح 5274) (جو شخص جن لوگوں کی مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں سے ہے)

کے قاعدے سے صورۃً منتہین میں داخل ہو گیا۔ سُبحان اللہ! شریعت بھی کیا عجیب ہے کہ مبتدی کو بھی فضیلت سے محروم نہ رکھا ؎

برنگ اصحاب صورت را ببوار باب معنیٰ را بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد

(اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بو سے تازہ رکھتی ہے)

صوفیہ نے لکھا ہے کہ سالک کی دو قسمیں ہیں ایک تو صوفی ہے ایک متصوف ہے۔ یعنی صوفیوں کی صورت بنانے والا اس طریق میں متصوف کی بھی فضیلت ہے یہ بھی محروم نہ رہے گا۔ بہرحال چار قسم کے آدمی ہوئے۔ (۱) ایک طالب دنیائے محضہ مجاہر (۲) ایک طالب دنیائے محضہ منافق (۳) ایک طالب آخرت (۴) ایک طالب حق اور مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ میں چوتھی قسم کا ذکر ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ يَشْرِىْ نَفْسَهُ کے کیا معنیٰ ہیں۔ شانِ نزول پر نظر کر کے مفسرین نے اس کی توجیہ میں اختلاف کیا ہے۔

شانِ نزول

شانِ نزول اس کا حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہجرت ہے جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کو چلے تو کفار نے اُن کا تعاقب کیا۔ اس وقت کفار اسلام سے تو روکتے ہی تھے۔ ہجرت سے بھی روکتے تھے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی تعاقب کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ راتوں رات مکہ سے چل کر غارِ ثور میں چھپ گئے تھے۔ اس لئے کفار کو پتہ نہ چلا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کدھر تشریف لے گئے ہیں۔ مگر اُس زمانہ میں قیافہ شناس بڑے ستم کے تھے جو پیر کا نشان دیکھ کر بتلا دیا کرتے تھے کہ یہ فلاں شخص کا قدم ہے اور وہ اس طرف سے گیا ہے۔ چنانچہ کفار نے ایک قیافہ شناس کو بلایا جس نے نشان قدم دیکھ کر پہچان لیا اور نشان دیکھتا دیکھتا غارِ ثور تک پہنچ گیا۔

یہاں پہنچ کر ٹھہر گیا اور کہنے لگا کہ بس یہاں سے آگے نہیں بڑھے۔ کفار نے اُس کو احمق بنایا کہ تو پاگل ہوا ہے اگر یہاں سے آگے نہیں بڑھے تو کیا آسمان پر چلے گئے یا زمین میں اُتر گئے۔ قیافہ شناس نے کہا چاہے کچھ ہی ہو۔ مگر یہاں سے آگے نہیں بڑھے۔ کفار یہ سب باتیں غار کے اوپر کھڑے ہوئے کر رہے تھے۔ اگر ذرا اپنے قدموں کی طرف دیکھ لیتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر پڑ جاتی۔ مگر خدا تعالیٰ نے اُن کو اندھا کر دیا کہ پَیروں کی طرف نظر نہ کر سکے۔ اُس وقت حضرت ابوبکر صدیق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال سے ہراساں ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ اگر یہ لوگ اپنے پَیروں کی طرف نظر کرنے لگیں تو ہم کو دیکھ لیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت استقلال سے جواب دیا۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (آپ غم نہ کریں بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں)

(وفی الصحیح انه قال ایضاً ما ظنک با ثنین اللّٰه ثالثهما ۱۲)

(کشف الخفاء للعجلونی 323:1)

اسی طرح حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا بھی کفار نے تعاقب کیا تھا۔ حضرت صہیبؓ نے فرمایا تم جانتے ہو کہ میں نہایت اعلیٰ درجہ کا تیر انداز ہوں اور دیکھ رہے ہو کہ میری بغل میں ترکش تیروں سے بھرا ہوا موجود ہے اگر تم نے مقابلہ کے لئے قدم آگے بڑھایا تو یاد رکھنا ابھی تیروں سے مار مار کر سب کو یہیں ختم کر دوں گا۔ اس بات سے کفار کچھ مرعوب ہوئے اور چلتے چلتے ٹھہر گئے۔

حضرت صہیبؓ نے اب دوسری ترکیب سے کام لیا فرمایا اور اگر تم کو مال مطلوب ہے تو مکہ میں میرا مال بہت ہے لو میں تم کو پتہ بتلائے دیتا ہوں تم جا کر فلاں جگہ سے مال نکال لو۔ اپنے محض تخویف پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ سلاح طمع سے بھی کام لیا۔ چنانچہ یہ سُن کر کفار لوٹ گئے۔ اور حضرت صہیب اطمینان کے ساتھ مدینہ پہنچے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر قصہ بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ربح البیع ابا یحییٰ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس واقعہ سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں یَشْرِیْ نَفْسَهٗ سے خریدنا مراد ہے۔ کیونکہ حضرت صہیب نے اپنے نفس کی بیع کہاں کی تھی بلکہ تخویف واطماع کے ذریعہ سے اپنی جان کو بچایا تھا اور بچانا گویا خریدنا ہے۔

حقیقت نفس

اور اس تفسیر پر ایک اشکال بھی ہوتا ہے کہ حضرت صہیب نے اپنی جان کیوں بچائی۔ عاشق کو تو ایسا نہ چاہئے بلکہ عاشق کو تو جان دینا چاہئے۔ یہ اشکال متقشفین صوفیان خشک کو ہوا ہے جو نفس کے دشمن ہیں نہ عمدہ غذائیں کھاتے ہیں نہ ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ یہ نفس کافر ہے اس کو مارنا چاہئے۔ اے

صاحب اللہ کے واسطے نفس کو کافر نہ کہئے۔ آپ کو معلوم بھی ہے نفس کون ہے یہ آپ ہی تو ہیں کیونکہ نفس آپ کی ذات بعض حیثیات سے ہے تو گویا آپ خود کو کافر کہتے ہیں اپنے ہی اوپر حملہ کرتے ہیں۔

جیسے مولانا نے ایک شیر کا قصہ لکھا ہے کہ وہ جنگل میں سے شکار کر کے کھاتا تھا۔ نخچروں نے باہم کمیٹی کی، یہ کمیٹی کی رسم پہلے ہی سے چلی آرہی ہے۔ مگر پہلے نخچیروں نے کی تھی۔ اب سب ہی کرنے لگے تو یہ رائے پاس ہوئی کہ شیر سے کہنا چاہئے کہ یوں اچانک حملہ نہ کیا کرے۔ اس طرح تو سب کی زندگی تلخ رہتی ہے۔ بلکہ ہم خود اپنے میں سے ایک کو روزانہ اُس کے پاس بھیج دیا کریں گے، شیر نے منظور کرلیا۔ اب انہوں نے یہ کیا کہ روزانہ قرعہ ڈالتے جس کا نام نکل آتا اُس کو بھیج دیتے۔ ایک دن خرگوش کا نام نکلا اُس کو بھیجنا چاہا تو اُس نے انکار کر دیا۔ نخچیروں نے کہا ارے ایسا غضب نہ کرنا ورنہ شیر غصہ ہو کر پھر وہی کرے گا جو پہلے کرتا تھا۔ خرگوش نے کہا میری بلا سے اگر وہ ایسا کرنے لگا تو بیش بریں نیست کہ مجھے کھالے گا۔ سو یہی تم بھی میرے لئے تجویز کر رہے ہو۔ نخچیروں نے کہا کہ اگر تو خود نہ جائے گا تو ہم سب جبراً تجھے پہنچا کر آئیں گے۔ خرگوش نے دیکھا کہ انکار سے کام نہیں چلتا تو اُس نے کہا اچھا میں جاتا ہوں اور راستہ میں سوچنے لگا کہ کسی تدبیر سے اس شیر ہی کا پاپ کاٹنا چاہئے۔ راستہ میں اُسے ایک کنواں ملا اُسے دیکھ کر بڑا خوش ہوا اور دوڑا ہوا شیر کے پاس پہنچا۔ چونکہ آج بحث وتکرار میں معمول سے کچھ دیر ہوگئی تھی۔ اس لئے شیر غصہ میں زمین کی خاک اُڑا رہا تھا۔ پھر خرگوش کو آتا دیکھ کر غرایا کہ آج اتنی دیر کیوں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نیتوں میں فساد آگیا ہے۔ شیر نے کہا۔ حضور میں تو آپ کو ایک اطلاع کرنے آیا ہوں اگر امن ہو تو عرض کروں کہا کہہ کیا کہتا ہے۔ خرگوش نے کہا حضور آپ کی سرحد میں ایک دوسرا شیر آگیا ہے وہ کہتا ہے کہ تم راتب مجھے دیا کرو۔ اور کسی کو نہ دیا کرو۔ آج حضور کے حصہ میں ایک بڑا موٹا تازہ خرگوش آتا تھا۔ میں اُس کو اپنے ساتھ لا رہا تھا۔ دوسرے شیر نے اُس کو پکڑ لیا۔ میں دوڑا ہوا آپ کو اطلاع کرنے آیا ہوں کہ اگر آپ اپنے راتب کی خیر چاہتے ہو تو اس غنیم کو اپنی سرحد سے نکال دیجئے ورنہ آج سے راتب بند ہے۔ یہ دشمن کسی کو آپ تک نہ آنے دے گا۔ شیر کو یہ قصہ سُن کر غصہ آگیا اور کہا چل میرے ساتھ چل کر بتلا کہ وہ دوسرا شیر کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ خرگوش ساتھ ہوگیا اور کنویں پر لا کر کھڑا کر دیا اور کہا حضور دیکھئے وہ اس کنویں میں رہتا ہے۔ شیر نے جو جھانک کر دیکھا تو پانی میں اپنا عکس نظر آیا اور اُس کے پاس ایک موٹا تازہ خرگوش بھی نظر آیا وہ اس خرگوش کا عکس تھا اور قاعدہ ہے کہ پانی میں ہر شے

کا عکس بڑا نظر آیا کرتا ہے۔ خرگوش نے کہا حضور دیکھئے۔ یہ دوسرا خرگوش آپ کے واسطے بھیجا گیا تھا اس نے قبھا لیا۔ شیر نے غصہ میں آ کر حملہ کیا۔ اور دھڑام سے کنویں کے اندر پہنچا۔ خرگوش کچھ دیر ٹھہرا جب دیکھا کہ شیر غوطے کھانے لگا تو کہا حضور! بس میرا اسلام لیجئے۔ اور آپ یہیں آرام کیجئے۔ مولانا اس حکایت کو بیان کر کے فرماتے ہیں ۔

حملہ برخود می کنی اے سادہ مرد   ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(اے بے وقوف تو اپنے اوپر خود ہی حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا)

اور جیسے ایک احمق بڈھے کی حکایت ہے کہ اُس کے بچہ کا روٹی کا ٹکڑا لوٹے میں جا پڑا، اس نے جھانک کر دیکھا کہ پانی میں اپنی صورت نظر آئی وہ سمجھا کہ اس میں کوئی دوسرا بچہ ہے۔ جس نے میرا ٹکڑا چھین لیا ہے۔ اُس نے بڈھے باپ سے کہا کہ ابا اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا ہے۔ کہا کس نے کہا کہ یہ جو لوٹے کے اندر بیٹھا ہے۔ بڈھے میاں نے اُٹھ کر دیکھا تو آپ کو لوٹے میں اپنی صورت نظر آئی تو اُس کو خطاب کر کے فرماتے ہیں تف ہے تیری اوقات پر۔ اتنی بڑی سفید داڑھی لگا کر بچہ کا ٹکڑا چھینتے شرم نہ آئی۔ اور جیسے ایک حبشی کی حکایت ہے کہ اس کو راستہ میں ایک آئینہ پڑا ہوا ملا۔ آپ نے اسے اٹھا کر جو دیکھا تو اُس میں اپنی ڈراؤنی صورت نظر آئی، جھلا کر پھینک دیا اور کہا ایسا بدصورت تھا جبھی تو کوئی تجھے پھینک گیا ہے۔ تو جس طرح یہ لوگ حقیقت میں اپنے آپ کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ اور اپنے ہی اوپر حملہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح نفس کو کافر کہہ کر آپ ہی اپنے کو کافر کہہ رہے ہیں۔

حقوق وحظوظ

بھائی ہمارا نفس تو کافر نہیں بلکہ بحمد اللہ مومن ہے گو گنہگار ہے تو نفس کو کافر کہنا اور اس کو اس طرح مارنا مناسب نہیں مگر بہت زیادہ بھی نہ کھائیے گو بعض جاہلوں، صوفیوں نے زیادہ کھانے میں بھی تاویل کی ہے۔ ایک سجادہ نشین بہت کھایا کرتا تھا۔ مٹھائیوں اور نذرانوں سے بدن خوب پھول گیا اور توند نکل آئی کسی نے اُس کو نصیحت کی کہ صوفی لوگ تو زیادہ نہیں کھایا کرتے تم کیسے صوفی ہو کہ کھا کھا کر اتنے پھول گئے ہو تو وہ کہتا کہ یہ بات نہیں بلکہ میرے پھولنے کی وجہ یہ ہے کہ میرا نفس مر گیا ہے اور نفس کتا ہے اور کتا مر کر پھول جاتا ہے۔ اس لئے پیٹ پھول گیا تو اس نے کہا حضور کتا جب پھول جاتا ہے تو اُس کو کوڑے پر ڈال آتے ہیں، پھر آپ اس پھولے کتے کو گہوارہ میں لے کر

کیوں سوتے ہیں۔ یہ تو کوڑے پڑ ڈالنے کے قابل ہے۔ خوب جواب دیا، پس نہ تو بہت کھاؤ اور نہ نفس کو مارو۔ بلکہ اعتدال کا لحاظ رکھو۔ جس کا فیصلہ محققین نے خوب کیا ہے وہ یہ کہ ایک تو نفس کے حقوق ہیں اور ایک حظوظ ہیں۔ حقوق کو تو ضائع نہ کرو اور حظوظ کے درپے نہ ہو۔

جمعیت قلب

اور حقوق کے ضائع کرنے کی جو شریعت نے ممانعت کی ہے اُس کا ایک راز ہے جو حاجی صاحب کے پاس رہنے سے معلوم ہوا۔ حضرت کی زبان پر یہ لفظ بہت آیا کرتا تھا کہ جمعیت قلب کا اہتمام کرنا چاہئے۔ حضرت کو ہر بات میں اس کا بہت اہتمام رہتا تھا کہ قلب کی جمعیت فوت نہ ہو اس لئے حضرت کو تعلقات سے بہت نفرت تھی اور صوفیہ کے اقوال واحوال میں بھی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلق مع اللہ پیدا ہونے کے لئے جمعیت قلب بہت ضروری ہے۔ جمعیت قلب جیسا کہ زیادہ کھانے سے فوت ہوتی ہے۔ کم کھانے سے فوت ہوتی ہے۔ زیادہ کھانے سے خطرات کا ہجوم ہوتا ہے کیونکہ معدہ کی تبخیر دماغ کی طرف صعود کرتی ہے۔ تو دماغ پریشان ہو جاتا ہے اور کم کھانے سے ہر وقت روٹیوں کی طرف دھیان لگا رہتا ہے۔ تو اس کی عبادت بھی ناقص ہوگی۔ رسالہ مکیہ میں لکھا ہے کہ عبادت کا کمال تشبہ بالملائکہ ہے یعنی آدمی فرشتوں کے مشابہ بن کر عبادت کرے اور فرشتوں کے مشابہ وہ شخص ہوگا جو نہ تو بہت کھانے کی وجہ سے ڈکاریں لے رہا ہو نہ کم کھانے کی وجہ سے کھانے کو یاد کر رہا ہو۔ غرض جیسے کسل طعام تشبہ بالملائکہ کے خلاف ہے ایسے ہی تشویش جوع بھی اس تشبہ کے خلاف ہے۔ فرشتوں کے مشابہ وہ شخص ہے جو حالت اعتدال میں مشغول عبادت ہو۔

اس لئے شریعت نے حظوظ نفس سے تو اعلیٰ درجات الحظوظ روکا ہے اور حقوق نفس کی رعایت کا امر کیا ہے۔

محبت منعم

اور یہاں سے معلوم ہوا ہوگا کہ شریعت سراسر مغز ہے بعض جاہل صوفی اس کو قشر سمجھتے ہیں مگر درحقیقت وہی قشر ہیں۔ محققین سے اس کی قدر پوچھو۔ اور حظوظ کی ممانعت بھی جب ہے جبکہ وہ حظ نفس کے طور پر استعمال کئے جائیں۔ مطلقاً ممانعت نہیں بلکہ ایک درجہ حظوظ کا بھی مطلوب ہے وہ یہ کہ اس لئے حظوظ کا استعمال کیا جائے تاکہ منعم سے محبت بڑھے۔ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے میرا نام لے کر فرمایا تھا کہ میاں اشرف علی پانی جب پیو خوب ٹھنڈا پیو۔ بال بال سے الحمدللہ نکلے گا۔ یہ راز تھا۔ اس تعلیم میں تاکہ حق تعالیٰ کی نعمت کا شکر پوری طرح ادا ہو پھر منعم سے محبت زیادہ ہو۔ یہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کا مغز ہونا معلوم ہوتا ہے کہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھنڈے پانی سے رغبت کیوں تھی۔

حدیث میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ٹھنڈا پانی تلاش کر کر کے لایا جاتا تھا۔ کوئی متقشف صوفی تو اس کو سن کر یہ کہے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ابوالہیثمؓ صحابی کے یہاں ٹھنڈے پانی کی درخواست کی تھی۔ یہ کیسا مجاہدہ تھا مگر اس میں راز یہ تھا تا کہ منعم کی محبت بڑھے۔ گرم پانی پی کر تو صرف زبان ہی سے تو الحمد للہ نکلے گا باقی اعضا شریک نہ ہوں گے اور ٹھنڈا پانی پی کر جذر قلب سے بلکہ رگ رگ سے الحمد للہ نکلتا ہے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ ہم ایسا مجاہدہ کریں گے کہ گرم پانی بھی ٹھنڈا ہی معلوم ہوگا اور گرم پانی پی کر بھی رگ رگ سے الحمد للہ نکلے گا تو میں کہوں گا کہ یہ بھی اس کی برکت ہے کہ وہ تم کو ٹھنڈا لگنے لگا تو زیادت محبت میں اب بھی ٹھنڈے کو ہی دخل ہے۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ نہیں ہم کو تو وہ گرم ہی لگتا ہے مگر ہمارے نزدیک گرم اور ٹھنڈا برابر ہو گیا ہے تو میں کہوں گا کہ حس کا خراب ہو جانا کچھ کمال نہیں۔ بلکہ نقص ہے کمال یہ ہے کہ حواس بشریہ سب درست رہیں اور پھر کمالات حاصل ہوں۔ ورنہ کافور کھا کر بے حس بن جانا کیا کمال کی بات ہے۔

صاحبو! جو لوگ اس نیت سے حظوظ کا استعمال کرتے ہیں کہ اُن سے منعم کی محبت زیادہ ہوگی، اُس کو کھانے میں انوار کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب انگور وغیرہ سب چیزیں جو ہدیہ میں آتی کھاتے تھے۔ اور یہ فرماتے تھے کہ جب کوئی شخص محبت سے ہدیہ لاتا ہے تو اُس کو کھا کر قلب میں ایک نور پیدا ہوتا ہے۔ سبحان اللہ! کیا شان ہے کہ انگور کھا رہے ہیں اور نور پیدا ہو رہا ہے۔ قافیہ بھی مل گیا۔

حاجی صاحب کے کلام پر تو شاید آپ کو شبہ ہوا ہوگا۔ کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ انگور سے نور پیدا ہو۔ کیونکہ حاجی صاحب نے اس کی دلیل نہیں بیان فرمائی۔ لیجئے میں آپ کو اس کی دلیل مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں دکھلا دوں۔ اُن کے علم کے تو سب قائل ہیں۔ ایک بار مولانا کے لئے ایک شخص گاڑھے کی ٹوپی لایا جس پر شال باف کی گوٹ لگی ہوئی تھی اور کہا حضرت فلاں شخص نے یہ ٹوپی آپ کے لئے بھیجی ہے۔ مولانا نے اُسی وقت اپنی قیمتی ٹوپی سر سے اُتار کر فوراً وہ گاڑھے کی ٹوپی اوڑھ لی۔ پھر جب قاصد چلا گیا تو آپ نے گاڑھے کی ٹوپی اتار کر کسی کو دیدی۔ اور اپنی پہلی ٹوپی پھر اوڑھ لی۔ ایک خادم نے پوچھا کہ حضرت جب اس کو رکھنا منظور نہ تھا تو آپ نے اوڑھی ہی کیوں تھی۔ فرمایا اس لئے اوڑھ لی تھی۔ تا کہ یہ قاصد جا کر مُہدی کو اطلاع کرے کہ تمہارے ہدیہ کی قدر کی گئی۔ تیری بھیجی ہوئی ٹوپی فوراً سر پر رکھ لی گئی۔ اس سے مُہدی خوش ہوگا اور تطییب قلب مومن طاعت ہے اسی طرح جب ہدیہ کا انگور کھایا مُہدی کا دل خوش ہوا تو کھانے والے نے

---

[1] مجمع الزوائد231:10، المعجم الكبير للطبراني234:19، كنز العمال:21324

طاعت کی۔ اس کے ساتھ ایک مقدمہ بدیہیہ اور ملا لیجئے کہ طاعت سے قلب میں نور پیدا ہوتا ہے جس پر دلائل شرعیہ شاہد ہیں۔ پس لیجئے دلیل سے حاجی صاحب کا دعویٰ ثابت ہو گیا۔

اخفاء کاملین

دوسرا راز نعماء کے استعمال میں ہے کہ اس سے شہرت نہیں ہوتی۔ جب لوگ اس کو لذائذ و نعم کھاتے ہوئے دیکھیں گے یوں کہیں گے کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جو عمدہ کھانے کھاتے ہیں تو اس سے ایک گونہ حالت کا اخفاء رہتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ کاملین اخفاء کا بھی زیادہ اہتمام نہیں کرتے کیونکہ اس اہتمامِ اخفاء سے بھی شہرت ہو جاتی ہے۔

چنانچہ جنگل میں جا کر بیٹھو تو میلہ لگ جائے گا۔ چلہ کشی کرو اور عزلت اختیار کرو، تو مخلوق کا ہجوم ہو جائے گا۔ اس لئے اخفاء کا زیادہ اہتمام بھی طلب شہرت میں داخل ہے۔ صائب کہتا ہے ۔

اگر شہرت ہوس داری اسیرِ دامِ عزلت شو   کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقارا

(اگر تم کو شہرت کی تمنا ہے تو گوشہ تنہائی کے دام میں اسیر ہو جاؤ کیونکہ گوشہ گیری کی وجہ سے نام عنقا ہو گیا)

اس لئے کاملین ایسا اخفاء بھی نہیں کرتے جس سے شہرت ہو کیونکہ اصل چیز بچنے کی یہی شہرت تھی جو ایک بلاء ہے جس کی بابت مولانا فرماتے ہیں ۔

تن قفس شکل است اما خارِ جاں   از فریب داخلاں و خار جہاں

آتش گوید نے منم ہمراز   انیش گوید نے منم انبازِ نو

از تکبر می رود از دستِ خویش   او چو بیند خلق را سرمست خویش

(تن قفس کے مثل ہے اسی وجہ سے وہ جان اور روح کے لئے مثل خار کے ہو رہا ہے ایک اس کو کہہ دیا ہے میں آپ کا ہمراز ہوں دوسرا کہتا ہے نہیں صاحب میں آپ کا شریک حال ہوں وہ بے شخص بے چارہ جب ایک مخلوق کو اپنا سرمست اور عاشق دیکھتا ہے بس تکبر کی وجہ سے باشیوں نکل جاتا ہے)

آگے شہرت سے بچنے کا امر فرماتے ہیں ۔

خویش رارنجور ساز و زار زار   تاترا بیرون کنند از اشتہار

اشتہار خلق بند محکم است   بند ایں از بند آہن کے کم است

(اپنے آپ کو رنجور اور گمنام رکھو تا کہ لوگ تم کو شہرت سے باز رکھیں۔ مخلوق کی شہرت اللہ اور ان کے بندہ کے درمیان مضبوط بند ہے یہ بند لوہے کی بند سے کیا کم ہے)

آگے فرماتے ہیں کہ شہرت سے بعض معاصرین کو حسد بھی ہو جاتا ہے۔

چشمہا و خشمہا در شکمہا   برسرت ریزد چو آب از مشکہا

(غصے اور آنکھیں اور اشک تیرے سر بر اس طرح ٹپکتے ہیں جس طرح مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے)

مگر یہ شہرت مذمومہ وہ ہے جو طلب سے حاصل کی جائے اور جو بدوں طلب بلکہ باوجود طلب عدم کے حاصل ہو وہ بلا نہیں ہے۔ حق تعالیٰ اس میں اعانت فرماتے ہیں اور غوائل سے محفوظ رکھتے ہیں۔ بہر حال کاملین اعتدال کے ساتھ اپنی حالت کا اخفاء کرتے ہیں۔ اس لئے بھی نعمتیں کھاتے ہیں۔

حضرت غوث اعظمؒ کا قصہ ہے کہ ایک بڑھیا نے اپنے لڑکے کو آپ کے حوالہ کیا کہ اس کو اپنی خدمت میں رکھئے وہ یہ سمجھی ہوگی کہ حضرت کے یہاں ہدایہ بہت آتے ہیں۔ میرا لڑکا کھا کھا کر خوب تیار ہو جائے گا۔ مگر چند روز کے بعد دیکھا کہ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ دُبلا تھا اور معلوم ہوا کہ اُس کو جو کی دو روٹیاں صبح وشام ملتی ہیں۔ پہلے تو اُس کو خیال ہوا کہ شاید حضرت کے یہاں آج کل فتوحات کم ہوگئی ہوں گی۔ اس لئے میرے بیٹے کو عمدہ غذائیں نہیں ملیں۔ مگر جب وہ حضرت کے پاس آئی تو دیکھا کہ آپ مرغ کھا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر جھلا ہی تو گئی اور کہا حضرت یہ کیا مروت ہے کہ آپ تو مرغ کھائیں۔ اور میرے بیٹے کو جو کی روٹیاں دیں۔ حضرت نے فرمایا کہ بی تیرا بیٹا ابھی مرغ کھانے کے قابل نہیں ہوا۔ اُس نے کہا کیوں کیا میرے بیٹے کو کھانا نہیں آتا۔ آپ نے فرمایا ٹھہر جا۔ ابھی بتلاتا ہوں جب آپ کھانا کھا چکے تو مرغ کی ہڈیوں کو جمع کر کے فرمایا۔ قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ۔ قدرت خداوندی سے اُسی وقت وہ زندہ ہوگیا اور پر جھاڑ کر چلتا پھرتا نظر آیا۔ حضرت غوث اعظم نے فرمایا کہ جب تیرا بیٹا ایسا ہو جائے گا۔ اُس وقت وہ بھی مرغ کھایا کرے گا۔ یہ جواب تو آپ نے بڑھیا کی عقل کے موافق دیا۔

کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ. (لوگوں سے انکی عقل کے مطابق کلام کرو) کے قاعدے پر

عکس نعمائے جنت

اور حقیقی جواب یہ تھا کہ بڑھیا کے بیٹے کو نعمتوں میں حظ نفس حاصل ہوتا اور حضرت کو حظ نفس مطلوب نہ تھا۔ بلکہ وہ نعمتیں اس لئے کھاتے تھے کہ اُن کو نعمائے جنت کا عکس ان میں نظر آتا تھا۔ اُس راز کو فقہاء نے بھی سمجھا ہے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ نے مردوں کے لئے چار انگشت حریر کی اجازت کی علت یہ لکھی ہے۔

لتکون انمو ذجًا لحریر الْجَنَّةِ تاکہ وہ حریر جنت کا نمونہ بن کر سامنے رہے۔

اور اس سے نعماء جنت کی رغبت ہو اور اسی لئے تو حق تعالیٰ نے قرآن میں جا بجا جنت کا ذکر فرمایا ہے تاکہ اُن کو سُن کر جنت کی رغبت اور اعمال صالحہ کی ہمت ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِیْهَا اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ، وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ

لَمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُہٗ وَاَنْھٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّۃٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ وَ اَنْھٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّی۔

کہیں حوروں کا ذکر ہے کہیں پھل پھلواری کا بیان ہے کہیں نہروں کا تذکرہ ہے۔ اسی لئے تا کہ ان کی رغبت سے اعمال کا شوق پیدا ہو۔ پس کاملین اس لئے بھی نعمتیں کھاتے ہیں۔ تا کہ نعماء جنت ہر وقت یاد رہیں۔

نہروں کے ذکر پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ جب میں ڈھاکہ گیا تو وہاں کھانے میں گھی بہت ہوتا تھا۔ میں نے منع کیا کہ (اتنا گھی مت ڈالا کرو، میں اتنا گھی نہیں کھا سکتا) تو نواب صاحب کے ایک عزیز کہنے لگے کہ ہم تو آپ کی وجہ سے گھی بہت کم ڈالتے ہیں ورنہ ہمارے یہاں تو سیر بھر گوشت میں سیر بھر گھی ڈالا جاتا ہے۔ میں نے کہا ہمارے یہاں تو اتنا گھی جانوروں کو دیا کرتے ہیں۔ جب بیل منزل چل کر آتے ہیں تو آدھ سیر یا سیر بھر گھی نال میں بھر کر اُن کو پلایا جاتا ہے۔ آدمی تو اتنا گھی کبھی نہیں کھاتے اور قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ گھی انسانوں کے لئے کوئی زیادہ مرغوب شئے نہیں۔ کہنے لگے صاحب! قرآن سے کیونکر معلوم ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ حق تعالیٰ نے جنت کے اندر نہریں بتلائی ہیں ایک پانی کی، ایک دودھ کی ایک شراب کی، ایک شہد کی اگر گھی مرغوب شئے ہوتا تو جنت میں ایک نہر گھی کی بھی ضرور ہوتی ہے۔ مگر گھی کی نہر کوئی بھی نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی مرغوب شئے نہیں۔ یہ تو درمیان میں ایک لطیفہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ کاملین دنیا کی نعمتوں کو نعماء آخرت کا نمونہ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔

مگر یہ شرط ہے کہ نمونہ نمونہ کے طور پر ہو۔ ویسا نمونہ نہ ہو جیسا کہ ہمارے ایک دوست نے بیان کیا تھا کہ وہ اور اُن کے ایک ساتھی ریل میں سوار تھے۔ اناؤ کے سٹیشن پر جب پہنچے۔ تو ہم نے وہاں کے پیڑے خریدنا چاہئے۔ کیونکہ اناؤ کے پیڑے مشہور ہیں تو ریل میں ایک اور صاحب سوار تھے۔ وہ کہنے لگے۔ کہ صاحب میں نے یہ دو بڑے پیڑے خریدے ہیں پہلے آپ ان کو چکھ لیجئے۔ اس کے بعد اگر اچھے لگیں تو خرید لیجئے گا ورنہ نہیں۔ کیونکہ اب یہاں کے پیڑے پہلے جیسے نہیں رہے۔ تو میرے ساتھی نے یہ حرکت کی کہ چکھنے کے واسطے ایک سالم پیڑا اٹھا لیا۔ تو اس مسافر نے دوسرا میرے سامنے کر دیا۔ کہ یہ آپ چکھ لیجئے۔ اُس کی اُس بات سے مجھ پر ایسی ندامت سوار ہوئی۔ کہ تمام راستہ آنکھ اوپر کو نہ اٹھی۔ اور اب بھی جب کبھی اُن کا سامنا ہو جاتا ہے۔ شرما جاتا ہوں۔ اور جیسے انبہٹہ میں ایک صاحب شکر لینے دکان پر گئے اور چادرہ پھیلا دیا اور دکاندار سے کہا کہ پہلے ہم کو شکر کا نمونہ دکھلاؤ۔ وہ چادر پھیلی ہوئی دیکھ کر یہ سمجھا کہ شاید چار پانچ روپیہ کی خریدیں گے، اُس نے سکوری بھر کر نمونہ کی دکھلائی۔ آپ نے چکھ چکھ کر ساری سکوری ختم کر دی اور کہا بہت عمدہ ہے ایک پیسہ کی دیدو، دکان دار جھلا گیا کہ سبحان اللہ! چار پیسہ کی شکر تو آپ نمونہ ہی میں کھا گئے اب ایک پیسہ کیلئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تو صاحبو! یہ کیا خاک

نمونہ ہے جواصل سے بھی بڑھ گیا۔ پس نمونہ کے طور پر نعمتیں کھانے کا یہ مطلب نہیں کہ رات دن اسی میں منہمک ہوجائے اور کھانے کے نشہ میں نمازیں بھی جماعت سے نہ پڑھے۔

ترک لذائذ

باقی جن لوگوں نے ترک نعماء اور تقلیل لذائذ کیا ہے اُن پر اعتراض بھی نہ کیا جائے۔ کیونکہ ترک لذائذ مطلقاً رہبانیت نہیں۔ بلکہ جو اس کو عبادت سمجھے وہ راہب ہے اور اگر عبادت نہ سمجھے بلکہ علاج سمجھ کر ترک کرے وہ راہب نہیں۔ آج کل میں نے ایک ماہ سے گوشت نہیں کھایا۔ کیونکہ پیر میں درد کی وجہ سے اطباء نے منع کر رکھا ہے تو کیا مجھے بھی راہب کہو گے۔ اسی طرح سمجھ لو کہ جن بزرگوں نے لذائذ کو ترک کیا ہے۔ انہوں نے عبادت یا ثواب سمجھ کر ترک نہیں کیا۔ بلکہ علاج اور دوا سمجھ کر ترک کیا ہے۔ سو اس کا اب بھی مضائقہ نہیں۔ اگر کسی کو اصلاح مزاج کے لئے اس کی ضرورت ہو وہ ترک کرسکتا ہے۔ مگر تم اپنی رائے سے نہ چھوڑو بلکہ کسی شیخ سے پہلے پوچھو۔ اور کسی ایک کو اپنا بڑا بنالو۔ اور اس کے ساتھ یہ برتاؤ رکھو ۔

دلا رامے کہ داری دل دروبند   دگر چشم از ہمہ عالم فروبند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگایا ہے تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو)

اور یہ معاملہ کرو ۔

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیال ماہے   چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگاہے

(سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے اور میں ایک چاند کے خیال میں مست ہوں کیا کروں کاش بدخوئی نظر کسی پر بھی نہ پڑی)

میں یہ نہیں کہتا کہ تم اس سے بیعت ہوجاؤ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ دین کا ہر کام اس کے مشورہ سے کرو۔

اطلاع واتباع

بس میں نے دو لفظوں میں معاملہ بالشیخ کا خلاصہ نکالا ہے اس کے موافق عمل کرنا چاہئے۔ یعنی اطلاع واتباع اپنے احوال کی اُسے اطلاع کرتے رہو اور جو وہ حکم دے اس کے موافق عمل کرو پھر میں بقسم اور پھر بقسم کہتا ہوں کہ انشاء اللہ ایسا شخص ضرور کامیاب ہوگا۔ بلکہ اگر اس کو اس تمام مشقت کے بعد صرف یہی معلوم ہوا کہ میں ناکام رہا تو یہی کامیابی ہے کیونکہ اس نایافت سے عبدیت پیدا ہوگی اور یہی کمال مقصود ہے اسی کو کہتے ہیں ۔

ارید و صاله و یرید هجری   فاترک ما ارید لما یرید

(میں اس کا وصال چاہتا ہوں اور وہ مجھے چھوڑنا چاہتا ہے پس میں نے اپنا ارادہ اسکے

ارادہ کی بناء پر چھوڑ دیا) اور عارف کہتے ہیں

میل من سوئے وصال ومیل اوسوے فراق ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میرا میلان اس سے ملنے پر ہے اور اس کا میلان فراق کی طرف ہے پس میں نے اپنا کام چھوڑ دیا تا کہ دوست کا کام بن جائے) اور جامی کہتے ہیں

ہمینم بس کہ داند ماہر ویم کہ من نیزاز خریداران اویم

(یہی کافی ہے کہ میرا محبوب جان لے کہ میں اس کے خریداروں میں سے ہوں)

حضرت حاجی صاحب سے جب کوئی شکایت کرتا کہ حضرت ذکر سے کچھ نفع نہیں ہوا تو فرماتے یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم محبوب کو یاد کر رہے ہو پھر یہ شعر پڑھے

یا بم اور ایا نہ یابم جستجوئے میکنم حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

(میں اسے پاؤں یا نہ پاؤں میں اسکی جستجو کرتا ہوں مجھے حاصل ہو یا نہ ہو میں آرزو کرتا ہوں)

جو شخص شیخ کی تعلیم پر عمل کرتا رہے گا اُس کو اور کچھ بھی نہ ملے تو رضا تو ملے گی۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَا هَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِ يَنَّهُمْ سُبُلَنَا (جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو قرب وثواب یعنی جنت کے راستے ضرور دکھلائیں گے) اور ظاہر ہے کہ یہ ہدایت اراۃ طریق نہیں ہے کیونکہ اُس میں مجاہدہ شرط نہیں ہے۔ بلکہ ایصال الی المطلوب ہے۔ اور مطلوب ہے رضا۔ پس رضا کا ملنا ثابت ہو گیا۔ اور اصل مطلوب یہی ہے۔

قطع وساوس

پس اے سالکین جن چیزوں کی طلب میں تم رات دن رہتے ہو یعنی حالات کو کیفیات ذوق و شوق وغیرہ بتلاؤ ان کا وعدہ شریعت میں کہاں ہے نہ یہ اختیاری امور ہیں، نہ طلب پر ان کے ترتب کا وعدہ ہے پھر تم ان کے پیچھے کیوں پڑتے ہو۔ اور اگر تم ان کو اختیاری سمجھتے ہو تو پھر ان کے حاصل نہ ہونے کی شکایت کیوں ہے۔ بسم اللہ حاصل کرو، ہم بھی تو دیکھیں کہ تم اختیار سے ان کو کیونکر حاصل کرتے ہو۔

صاحبو! یہ کون سی حدیث میں آیا ہے کہ نماز سے کیفیت وجد یہ اور صوم سے فناء میلان الی المعاصی اور ذکر سے عدم وسوسہ کا ترتب ضرور ہوگا اور چونکہ وسوسہ یا اس کا ازالہ اختیاری نہیں اسی لئے حدیث میں وسوسہ قطع کرنے کی کوئی تدبیر بھی نہیں آئی۔ اور جو کچھ اس باب میں آیا ہے وہ قطع وسوسہ کی تدبیر نہیں ہے بلکہ اُس کا حاصل صرف دو امر ہیں۔ ایک یہ کہ وساوس کے آنے سے خوش ہو۔ دوسرے یہ کہ ان کی طرف التفات نہ کرے۔ چنانچہ ایک جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے جواب میں یہ فرمایا ہے۔

الحمد لِلّٰهِ الّذی رد کید ہ الی الوسوسة (الصحیح لمسلم کتاب البروالصلة:115، مسند أحمد2:244، فتح الباری11:3)

(سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اسکے مکروفریب کو وسوسہ میں تبدیل کر دیا)

اور فرمایا ہے **ذاک صریح الایمان** ۔ یہ تو خوش ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اور ایک حدیث میں یہ آیا ہے کہ جب شیطان اس قسم کا وسوسہ ڈالے۔

فلیستعذ باللہ ثم لینتہ اعوذ باللہ پڑھ دے اور وسوسہ سے باز رہے، یہ عدمِ التفات ہے اور دونوں میں مشترک بھی ہے کہ اُس کے دفع کا اہتمام نہ کرے۔

اور بعض علماء جو اس کے یہ معنی کرتے ہیں کہ وسوسہ سے رُک جائے گویا اس کی دفع وسوسہ کی تدبیر سمجھتے سو یہ صحیح نہیں کیونکہ وسوسہ کا روکنا اختیاری امر نہیں۔ صاحب وسوسہ تو خود ہی اس سے پریشان ہو رہا ہے اُس کو یہ حکم کیونکر ہوسکتا ہے کہ وسوسہ کو روک دے۔ صحیح مطلب اس کا صوفیہ نے سمجھا ہے وہ کہتے ہیں کہ **فلینتہ** کے معنی یہ ہیں۔ **فلا یلتفت الیہ** یعنی اس کی طرف التفات نہ کرے۔ اور التفات نہ کرنا یہ ہے کہ نہ جلباً التفات کرے نہ سلباً۔ یعنی نہ اس کو متحضر کرے اور نہ دفع کرے۔ بلکہ یہ بھی نہ دیکھے کہ وسوسہ گیا یا نہیں۔ کیونکہ یہ بھی ایک درجہ کا التفات ہے۔

صاحبو! محققین نے جو کچھ کہا ہے وہ سب نصوص سے ثابت ہے۔ مگر نص میں اجمال ہوتا ہے وہ اپنے اجتہاد سے اس کی تفصیل کر دیتے ہیں اور یہ کوئی جرم نہیں۔ آخر فقہاء بھی تو احادیث احکام ظاہرہ کو قیاس سے مفصل کرتے ہیں، پس محققین کا یہ فرمانا کہ نہ جلباً التفات کرے نہ سلباً۔ اسی حدیث **فلیستعذ باللہ ثم لینتہ** (تعوذ پڑھیے اور وسوسہ سے باز رہئے) کی تفصیل ہے۔

اس کے بعد محققین نے ایک بے التفاتی و عدمِ توجہ کے متعلق ایک اور بات بتلائی ہے وہ یہ کہ وسوسہ سے پوری بے توجہی اُس وقت تک نہیں ہوسکتی۔ جب تک نفس کو کسی اور شئے کی طرف متوجہ نہ کیا جائے۔ اس لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ وسوسہ سے توجہ ہٹا کر کسی اور شئے کی طرف متوجہ ہو جائے چاہے کعبہ کا تصور کر لے یا مدینہ کا یا کسی علمی مضمون کا یا اخیر میں بچا کچھا یہ شیخ رہ گیا ہے۔ اس کا تصور کر لے اس سے بھی وسوسہ کی طرف بے توجہی ہو جاتی ہے۔

تصورِ شیخ

اور مسئلہ تصورِ شیخ کا یہی حاصل ہے۔ مگر بعض نے اس کو قبلہ و کعبہ اور مقصود ہی بنا لیا ہے۔ اسی کو مولانا محمد اسماعیل صاحب شہیدؒ منع فرماتے ہیں۔ ورنہ مطلقاً تصورِ شیخ کو وہ منع نہیں کرتے جب کہ محض اس لئے تصور کیا جائے تا کہ نفس کی توجہ وسوسہ سے ہٹ جائے اور اس کے لئے کچھ تصورِ شیخ ہی کی ضرورت نہیں۔ بلکہ جس چیز کا بھی تصور کر لیا جائے۔ کافی ہے کیونکہ مقصود تو یہ ہے کہ نفس کی توجہ دوسری طرف مشغول ہو کر وسوسہ سے ہٹ جائے۔

لان النفس لا تتوجہ الی شیئین فی آن واحد

(نفس کی توجہ ایک وقت میں دو چیزیں کی طرف نہیں ہوسکتی)

اس کے لئے ایک طفلِ گہوارہ کا بھی تصور کافی ہے بلکہ شاید وہ تصور شیخ سے زیادہ نافع ہو۔ کیونکہ وہ پاک اور معصوم ہے اور شیخ تھوڑے سے گنہگار بھی ہیں۔ گو مُرید سے زیادہ نہیں، مُرید کو یہی سمجھنا چاہئے کہ شیخ میرے برابر گنہگار نہیں گو واقع میں وہ اس سے بھی زیادہ ہو۔ مگر مُرید کو اسی خیال سے نفع ہوگا اور اگر کسی کے بچہ نہ ہو تو وہ اپنے گائے بیل یا بھینس ہی کا تصور کرلے۔ چنانچہ ایک بزرگ نے اپنے مرید کو اسی کا شغل کرایا تھا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ مُرید کے قلب میں بہت چیزوں کے تعلقات بھرے ہوئے ہیں تو پوچھا کہ بھائی تم کو کسی چیز سے محبت بھی ہے۔ اُس نے کہا جی ہاں بھینس سے محبت ہے۔ فرمایا جاؤ چالیس روز تک اسی کا تصور کرتے رہو۔ وہ بے چارہ اسی کا تصور کرتا رہا، جب چلہ پورا ہوگیا، تو شیخ خود اس کے پاس گئے کیونکہ وہ اس میں ایسا مستغرق ہوگیا تھا کہ دن پورے ہونے کی بھی خبر نہ رہی۔ شیخ نے حُجرہ پر جاکر آواز دی کہ بھائی باہر نکلو بس چلہ پورا ہوگیا وہ نکلا اور دروازہ پر آکر کھڑا ہوگیا۔ شیخ نے کہا باہر آؤ تو وہ کہ کہتا ہے کیونکر آؤں سینگ اٹکتے ہیں وہ بالکل ہی فنافی الھینس ہوگیا تھا۔ شیخ نے ہاتھ پکڑا اور کہا اب نکل آؤ ہم نے سینگ کو نکال دیا ہے۔

اس پر شاید اہلِ ظاہر کو اعتراض ہوگا کہ یہ کیسا مراقبہ تھا مگر یاد رکھو طُرق میں محققین پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ علوم میں جتنا چاہو کلام کرلو اور وہ بھی محققین پر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ محققین جو کچھ کہتے ہیں۔ واللہ شریعت کے موافق کہتے ہیں۔ صاحبو! ان بزرگ نے وہ کیا ہے جو رات دن آپ خود کرتے ہیں۔ بلکہ ایک ایک جاہل بھنگن بھی وہی کرتی ہے۔ جو انہوں نے کیا۔ اگر آپ بھنگن سے یہ کہیں کہ گھر کوڑے کباڑ سے صاف کردے تو بتلائیے وہ کیا کرے گی۔ آیا ہر تنکے کو الگ الگ باہر پھینک کر آئے گی یا جھاڑو لے کر سارے کوڑے کو ایک جگہ جمع کرکے ٹوکرے میں بھر کر پھینکے گی، ظاہر ہے کہ وہ اوّل جھاڑو سے سارے کوڑے کو اکٹھا کرے گی اسی طرح یہاں سمجھئے کہ وہ بھینس کا تصور ایک جھاڑو تھی۔ جس نے تمام تعلقات کو سمیٹ لیا وہ عصائے موسیٰ علیہ السلام تھا جس نے سب سانپوں کو نگل لیا۔ بس اب صرف یہ ایک رہ گیا۔ شیخ نے اپنی توجہ سے یا اشغال واذکار کے ذریعہ سے اس کو بھی دل سے نکال دیا۔ بتلائیے اس میں کیا خرابی ہوئی۔ (یہاں پہنچ کر حضرت کو ربط یاد نہ رہا۔ اس لئے ٹھہر گئے اور کاتب سے ربط دریافت فرما کر ارشاد فرمایا ۱۲)

نگاہِ قلب کی حالت

بس یاد آگیا میں یہ کہہ رہا تھا کہ قطع وسوسہ کی کوئی تدبیر حدیث میں نہیں آتی یعنی ایسی تدبیر جس کے بعد وسوسہ آئے ہی نہیں۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی تدبیر بتلائی ہے کہ اگر وسوسہ آئے بھی تو پریشانی نہ ہو اور وہ عدم التفات ہے اس پر میں نے کہا تھا کہ عدم التفات کے بعد یہ بھی

نہ دیکھو کہ وسوسہ گیا نہیں یہ بھی التفات ہے بلکہ مجاہدہ کے بعد بھی اگر وساوس موجود ہوں تو پریشان نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ نگاہ قلب کی وہ حالت ہے جو نگاہ بصر کی حالت ہے اگر تم کسی شخص کے سامنے چند نقطے بنا کر یہ کہو کہ ان میں سے صرف ایک ایک کو دیکھو تو گو اس کا قصد ایک ہی دیکھنے کا ہوگا۔ مگر بلا قصد خود بخود اور بھی نظر آئیں گے۔ تو کیا دوسروں کے نظر آنے سے اُس ایک نقطہ کے دیکھنے میں اس کو ناکام کہا جائے گا ہرگز نہیں اسی طرح شعاع قلب کی حالت ہے کہ ایک شے کی طرف متوجہ ہونے سے دوسری اشیاء خود بخود سامنے آجاتی ہیں۔ اس سے پریشان نہ ہونا چاہئے۔ غرض یہ کہ قطع وسوسہ اور ذوق وشوق اور کیفیات واحوال یا ترک لذات، یہ کچھ مقصود نہیں۔ مقصود رضا ہے جس کے طرق میں شیخ کا اتباع شرط ہے۔ وہ اگر لذات کی بھی اجازت دے تو وہ منافی رضا نہیں۔ کیونکہ میں بتلا چکا ہوں کہ حظوظ کا بھی ایک درجہ مطلوب ہے پس جب حظوظِ نفس کی رعایت بھی مطلقاً مذموم نہیں تو حفاظت نفس مطلقاً کیسے مذموم ہو جائے گی۔ اب حضرت صہیب کے واقعہ پر سے اشکال رفع ہو گیا۔

حقیقت عشق

دوسرے یہ کہ یہاں مقصود اشتراء نفس من حیث النفس نہ تھا۔ بلکہ بامر حق تھا یہ جو کہا جاتا ہے۔ کہ عاشق کو جان دینا چاہئے بچانا چاہئے یہ مطلقاً صحیح نہیں عاشق کے بذلِ نفس کی حقیقت وہ ہے جس کو ایک شاعر کہتا ہے ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن   دل بدست دگرے دادن وحیران بودن

(عاشقی کیا ہے محبوب کا غلام بن جانا اپنا دل دوسرے کے ہاتھ میں دے دینا اور خود حیران رہ جانا)

پس عاشقی نام بندگی کا ہے کہ ہر وقت حکم کا تابع رہے جہاں جان دینے کا حکم ہو وہاں جان دے اور جہاں بچانے کا حکم ہو وہاں بچائے۔ خلاصہ یہ ہے عشق کی حقیقت تفویض ہے کہ اپنے کو خدا تعالیٰ کے سُپرد کر دے وہ جس طرح چاہیں اس میں تصرّف کریں، شرعاً بھی اور تکویناً بھی اور یہ ہر حاصل میں راضی رہے یہ حقیقت ہے تفویض کی جس کی ابتداء شیخ کے ہاتھ میں اپنے کو تفویض کرنے سے ہوتی ہے۔

اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ تفویض جب خالص حق۔ اللہ تعالیٰ کا ہے تو شیخ کے ہاتھ تفویض کرنا غیر اللہ کو حق دینا ہے جواب یہ ہے کہ چونکہ یہ تفویض اس تفویض مطلوب کا مقدمہ ہے۔ اس لئے تفویض الی الشیخ تفویض الی غیر الحق نہیں ہے اور اسی تعلق خاص کی بناء پر کبھی قوم کے کلام میں یہ تعبیر بھی پائی جاتی ہے کہ شیخ غیر حق نہیں اگر اس پر سوال ہو کہ پھر کیا شیخ عین حق ہے اور صوفیہ پر ایک اعتراض اس سے بڑھ کر ہوا ہے کہ یہ ہر چیز کو عین حق کہہ دیتے ہیں۔ سو میں اس کی حقیقت بھی بتلاتا ہوں۔ دراصل یہ صوفیہ کی اصطلاح ہے جس سے وہ معنی مراد نہیں جو اہل علم کے

نزدیک متبادر ہوتے ہیں ۔ اصطلاحاتے ست مر ابدال را

مذاق العارفین

رہا یہ اشکال کہ یہ اصطلاح تو خلاف شرع ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح تو نحو کی اصطلاحات بھی تو خلاف شرع ہیں کیونکہ حدیث میں آتا ہے الف حرف لام حرف م حرفٌ ۔ مگر نحویوں سے پوچھو تو وہ ان کو اسماء کہتے ہیں تو کیا خشک مولوی اُن پر بھی کفر کا فتوی لگادیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو ان کو حروف فرماتے ہیں ۔ اور یہ لوگ آپ کی خلاف اصطلاح مقرر کر کے ان کو اسم کہہ رہے ہیں، سو ہر شخص سمجھتا ہے کہ اس میں کفر کی کوئی بات نہیں نحوی اپنی اصطلاح کے موافق ان اسماء کو کہہ رہا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محاورہ کے موافق اُن کو حروف فرمایا ہے کیونکہ محاورہ میں حرف کلمہ کو کہتے ہیں جو اسم و فعل وغیرہ سب کو عام ہے۔ ہمارے یہاں بھی تو حرف عام ہے چنانچہ معلم بچہ سے قرآن میں پوچھا کرتے ہیں۔ کہ یعلمون سے آگے کیا حرف ہے حالانکہ اُس سے آگے نحوی حرف ہونا ضروری نہیں ۔ بلکہ ممکن ہے کہ اصطلاح نحو کے موافق اس کے آگے اسم میں ہو تو جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں محاورہ کے موافق خلاف اصطلاح اہل نحو کے کلام فرمایا ہے۔

اسی طرح صوفیہ نے بھی عالم کو یا شیخ کو خلاف اصطلاح اہل علم محاورہ کے موافق عین حق فرمایا ہے کیونکہ محاورہ میں عین کہتے ہیں، متعلق غیر اجنبی کو۔ چنانچہ ایک دوست دوسرے سے کہا کرتا ہے کہ ہم تم غیر تھوڑا ہی ہیں، ہم اور تم تو ایک ہی ہیں ۔ کہئے اس کا کیا مطلب ہے کیا اس سے عینیت مطلقہ مراد ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ مطلب وہی ہے کہ تم اجنبی نہیں ہو اپنے ہی آدمی ہو۔

اسی طرح صوفیہ رسول کو اور شیخ کو کبھی عالم کو اس معنی کر عین حق کہتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ سے اجنبی نہیں ہیں، بلکہ اُس کے ساتھ علاقہ رکھنے والے ہیں، اور وہ علاقہ رسول اور شیخ میں تو ایصال کا ہے ۔ اور عالم میں مظہریت کا بھی جواب میں نے مولوی اسحاق کانپوری کو دیا تھا۔ انہوں نے لا الٰہ الا اللہ کے متعلق یہ اشکال کیا تھا۔ کہ ضیاء القلوب میں حاجی صاحب نے لکھا ہے کہ لا الٰہ میں یہ تصور کرے کہ غیر حق کو دل سے نکال دیا۔ مولوی صاحب نے پوچھا تھا کہ غیر حق میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل ہیں تو کیا نعوذ باللہ! آپ کو بھی دل سے نکال دے۔ میں نے یہی کہا تھا کہ غیر سے جو مراد ہے۔ اس معنی کر آپ غیر حق نہیں۔ جیسا ابھی مذکور ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو بڑی چیز ہیں۔ سالک تو جس وقت یہ دیکھتا ہے کہ ہمارے اعضاء نے قُرب حق میں ہماری اعانت کی ہے۔ وہ اس حیثیت سے اُن سے محبت کرتا ہے۔ وہ اپنی آنکھ کی بھی رعایت کرتا ہے۔ اور دماغ کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ نہ اس واسطے کہ یہ اپنی چیزیں ہیں بلکہ اس واسطے کہ یہ خدا تعالیٰ کی چیزیں ہیں اور جو لوگ ان کو اپنی چیزیں سمجھتے ہیں اُن کا دوسرا برتاؤ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک قصہ ہے ۔

زاہدے راگفت یارے در عمل | کم گری تا چشم رانا ید خلل
گفت زاہد از دو بیروں نیست حال | چشم بیند یا نہ بیند آں جمال
گر بہ بیند نورِ حق راچہ غم ست | در وصال حق دو دیدہ کے کم ست
ورنہ نہ بیند نور حق را گو برو | ایں چنیں چشم شقی گو کور شو

(کسی نے ایک زاہد سے کہا کہ کم رویا کروتا کہ آنکھیں نہ جاتی رہیں۔ زاہد نے کہا سنو کہ آنکھ یا تو وہ جمال دیکھے گی یا نہیں دیکھے گی اور دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ انکی پرواہ نہ کی جائے اور اگر وہ جمال دیکھے گی تو وصال حق کے مقابلہ میں دونوں آنکھوں کی کیا پرواہ۔ اور اگر جمال حق نظر نہ آئے تو ایسی کم بخت آنکھوں کو لے کر کیا کروگے۔ ان کا اندھا ہونا ہی بہتر ہے)

یہ زاہدوں کا مذاق ہے اور پہلا عارفین کا مذاق ہے جس کا ماخذ یہ حدیث ہے۔

اِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَ اِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا (کشف الخفاء للعجلونی1:323)

(بیشک تیری جان کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھ کا بھی تجھ پر حق ہے)

جس کو ایک عارف اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

نازم بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است | اُفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہردم ہزار بوسۂ نم دستِ خویش را | کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(مجھے اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ اُنہوں نے تیرا جمال دیکھا ہے اور اپنے پیروں پر رشک کرتا ہوں کہ وہ تیرے کوچہ میں پہنچے ہیں میں اپنے ہاتھوں کو ہزار مرتبہ بوسہ دیتا ہوں کہ ان سے تیرا دامن پکڑ کر اپنی طرف کھینچا ہے)

کلامِ حق برزبانِ سالک

اور اسی کو حضرت غوث اعظم اس طرح فرماتے ہیں ۔

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست | آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما

(اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے دوست تک پہنچ گئے ہماری اس ہمت مردانہ پر آفرین)

ظاہر بیں کی نظر میں اس پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ یہ تو اپنی تعریف ہونے لگی۔ مگر میں تو یہ کہوں گا ارے تم کیا جانو آخر شجرۂ طور نے جو کہا تھا۔

اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (بے شک میں اللہ سارے جہانوں کا پروردگار ہوں) کیا یہ اُس نے خود کہا تھا اور منصور نے انا الحق کہا تھا کیا وہ خود کہہ رہے تھے نہیں۔ بلکہ منصور مجبور تھے جیسے شجرۂ طور مجبور تھا۔ گو منصور کامل نہ تھے۔ جسے شجرہ کامل نہ تھا۔ کامل موسیٰ علیہ السلام تھے۔

اُنہوں نے ایک دن بھی انی انا اللہ نہیں کہا اسی طرح کامل حضرت جنید اور حضرت غوث اعظم تھے۔ انہوں نے انا الحق کبھی نہیں کہا، حضرت غوث اعظم کا ارشاد ہے کہ منصور کی کسی نے مدد نہیں کی وہ ایک ورطہ میں گرفتار تھے۔ اگر میں اس زمانہ میں ہوتا تو اُس کو اس ورطہ سے نکال دیتا۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ منصور نے انا الحق خود نہیں کہا تھا۔ بلکہ کوئی اُن سے کہلوار ہا تھا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ الہام میں حق تعالیٰ کا کلام سالک کے قلب پر وارد ہوتا ہے اور بے ساختہ اُس کی زبان سے نکل جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ متکلم ہے حالانکہ متکلم حقیقت میں حق تعالیٰ ہے۔ مگر کلام حق بدوں قصد وارادہ کے اس کی زبان سے نکل رہا ہے۔

جیسا کہ غالباً احمد جام رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ ان کی خدمت میں ایک مرد عورت اپنے لڑکے کو لائے جو کہ اندھا تھا اور آ کر عرض کیا حضرت ہمارے یہی ایک لڑکا ہے جو قسمت سے اندھا ہے اس کو سوانکھا کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا کیا میں عیسیٰ ہوں جو اندھو کو سوانکھا کردوں وہ بے چارے چپکے ہی لوٹ چلے تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ آپ نے فرمایا ما کُنیم ما کُنیم اور اُن کو واپس کرنے کا حکم دیا۔ خدام نے اُن کو واپس بلایا۔ آپ نے لڑکے کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور دُعا کی فوراً بینا ہوگیا۔ بعد میں خدام نے عرض کیا کہ حضرت یہ کیا بات تھی کہ آپ نے اوّل تو انکار اور یہ فرمایا کہ کیا مَیں عیسیٰ ہوں۔ اور بعد میں اتنا بڑا دعویٰ کیا کہ ما کُنیم ما کُنیم فرمایا کہ ما کُنیم میں نے نہیں کہا تھا بات یہ ہے کہ جب میں نے یہ کہا کہ میں کیا عیسیٰ ہوں تو حق تعالیٰ نے عتاب فرمایا کہ سُبحان اللہ کیا آپ عیسیٰ علیہ السلام کو مؤثر سمجھتے ہیں بلکہ اُس وقت بھی ہم ہی کرتے تھے اور ہم اب بھی موجود ہیں۔ پس ما کُنیم ما کُنیم دراصل حق تعالیٰ کا کلام تھا جو بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔ اسی طرح حضرت غوث اعظم سے جو بعض دُعادی منقول ہیں۔ وہ سب بامرِ حق تھے یہ باتیں ان کی زبان سے حق تعالیٰ کے حکم سے نکلی ہیں وہ خود نہیں کہہ رہے تھے اسی لئے وہ فرماتے ہیں۔

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدست　　　آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما

(اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے دوست تک پہنچ گئے ہماری اس ہمت مردانہ پر آفریں)

جب سالک تعلق بالحق کے سبب اپنے اعضاء اور اپنی ذات کو خدا کا سمجھنے لگتا ہے۔ تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا کیوں نہ سمجھیں گے۔ یہ معنے ہیں آپ کے غیر حق نہ ہونے کے اور اسی درجہ میں نفس کی حفاظت بھی مطلوب ہوگی کیونکہ وہ نفس من حیث ہی نفس کی حفاظت نہیں۔ بلکہ اس حیثیت سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے کہ وہ خدا کی چیز ہے اور خدا تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا امر فرمایا ہے۔

شراء نفس

اس لئے مِنَ النَّاسِ مَنْ یَشْرِیْ نفسهُ (اور بعض آدمی اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے) میں شراء کی اشتراء نفس کے ساتھ تفسیر کرنے پر بھی کچھ اشکال نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ اشتراء لاجل الاذخانہ تھا بلکہ لاجل البیع مِن اللّٰہ تھا۔ دوسری تفسیر یہ کہ یَشْرِیْ سے مراد بیع ہے۔ اس پر یہ سوال ہوگا کہ یہ تفسیر تو واقعہ نزول کے خلاف ہے۔ صہیبؓ نے اپنے نفس کو بیع کہاں کیا تھا۔ بلکہ بچایا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ گو وہاں صورۃً بیع نہ تھی۔ مگر نیت بیع ہی کی تھی۔ کیونکہ حضرت صہیبؓ اس کے لئے تیار ہو کر نکلے تھے۔ کہ اگر بذل نفس کی نوبت آئے گی تو اس سے بھی دریغ نہ ہوگا۔ اس کی نوبت نہیں آئی۔ مگر اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ کے قاعدہ سے یہ اشتراء بحکم بیع ہی ہے۔

اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قصہ سُن کر فرمایا ربح البیع اَبَا یحییٰ (تاریخ بغداد للخطیب 75:7) کہ صہیبؓ اس بیع میں ملک الموت سے جیت گئے۔ ابو یحییٰ ملک الموت کا لقب ہے اور واقعی یہ لقب عمدہ ہے ابو یموت لقب نہیں رکھا۔ ہم سے اس کی وجہ پوچھو تو ہم تو یہ کہیں گے کہ جس کو تم موت کہتے ہو۔ حقیقت میں حیات وہی ہے کیونکہ وہ لقاء حق کا وسیلہ ہے۔ اور لُغت کے اعتبار سے یہ بھی ممکن ہے کہ ابو یحییٰ اس لئے کہا گیا ہو کہ ملک الموت کے فعل قبض روح کا تعلق ذی حیات سے ہوتا ہے کیونکہ موت تو زندہ ہی کو آتی ہے۔ مُردہ کو نہیں آیا کرتی یا اور کوئی وجہ ہو لُغت پر میری نظر نہیں ہے۔ مطلب جیتنے کا یہ ہے کہ صہیبؓ نے ملک الموت کو جان نہ دی۔ بلکہ خدا تعالیٰ کے حوالہ کر دی۔ اگر ملک الموت کے حوالہ کرتے تو اتنا نفع نہ ہوتا اور خدا تعالیٰ کے حوالہ کرنے سے یہ ملا۔

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد — آنچہ در وہمت نیاید آں دہد
خود کہ یابد ایں چنیں بازار را — کہ بیک گل می خری گلزار را

(آدھی جان لیتے ہیں اور سینکڑوں جانیں عطا کرتے ہیں جو زیں وہمت میں نہیں آتا وہ عطا کرتے ہیں تم ایسا بازار کہاں سے لاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلے سارا گلزار خرید لو)

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ آپ نے بھی حضرت صہیبؓ کے فعل کو بیع قرار دیا ہے۔ اس لئے یَشْرِیْ نَفْسَہٗ (اپنی جان صرف کر ڈالتا ہے) کی تفسیر یبیع نفسہ (اپنی جان کی بیع) سے بھی صحیح ہے۔ غرض حضرت صہیبؓ خدا تعالیٰ کے سُپرد اپنی جان کو کر چکے تھے۔ یہ درجہ اعلیٰ ہے طلب کا۔

شاید کوئی یہ کہے کہ صاحب جان دینا تو بڑا مشکل کام ہے ایسا مشکل کام مامور بہ کیسے ہو سکتا ہے جان تو انسان کو ایسی پیاری ہے کہ ایک بڑھیا کی بیٹی بیمار ہوگئی تھی وہ روز دعا کیا کرتی

کہ اے اللہ میری جان لے لی جائے میری بیٹی کی جان نہ لی جائے ایک دن اس کے گھر میں گائے اس صورت سے گھس آئی کہ اُس کے منہ میں ہنڈیا پھنسی ہوئی تھی بڑھیا یہ سمجھی کہ یہ موت ہے کیونکہ گائے کو اس ہیئت سے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اب وہ کیا کہتی ہے ؎

گفت اے موت من نہ مہتیم　　　　پیر زالِ غریب محنتیم

اے موت مہتی میں نہیں ہوں (یہ اُس کی بیٹی کا نام ہے) میں تو ایک غریب محنتی بڑھیا ہوں۔ یہ دیکھ مہتی وہ پڑی ہے اُس کو لے لے۔ ایسی ہی کانپور میں ایک بڑھیا کے لڑکے کو سرسام ہو کر غشی ہوگئی تھی۔ لوگ سمجھے کہ مرگیا ہے۔ کفن دفن کی فکر میں لگ گئے تھوڑی دیر میں اُس کو ہوش آگیا۔ تو عورتوں نے یہ سمجھا کہ یہ مر کر بھوت ہوگیا ہے اب وہی ماں جو پہلے اس کی صحت کے لئے دعائیں کراتی تھی۔ جابجا یہ کہتی پھرتی تھی کہ کوئی ایسا تعویذ کردو کہ میرا بیٹا مرجاوے کیونکہ اب اس کو اپنی جان کا خطرہ ہوگیا تھا کہ دیکھئے یہ بھوت کیا کر ڈالے گا۔ اپنی جان آدمی کو ایسی عزیز ہے اور یہ جو کسی نے کہا ہے کہ ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست　　　　ورزر طلبی سخن دریں ست

(اگر جان مانگو کوئی حرج نہیں اور اگر نقدی طلب کرو کلام اسی میں ہے)

یہ اُس نے بدوں دیکھے کہہ دیا ہے۔ اگر موت کو دیکھ لیتا تو ایسا ہرگز نہ کہتا۔ بھلا جو شخص مال نہیں دے سکتا۔ وہ جان کیا خاک دے گا۔

تفصیل تفویض

تو صاحب آگ گھبرائیے نہیں یہاں جان دینے مراد یہ نہیں ہے کہ آپ سچ مچ مرجائیں بلکہ جان دینا یہ ہے کہ انسان خود کسی چیز کا طالب نہ ہو۔ سوائے اُس کے جس کا خدا تعالیٰ نے امر فرمایا ہے جس کا مختصر عنوان تفویض ہے جس کے متعلق یہ آیت وارد ہوئی ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ ۔

ترجمہ: (اور اُس شخص سے اچھی کس کی عبادت ہے، جو اپنی ذات کو خدا تعالیٰ کے سپرد کردے اس حال میں کہ وہ محسن ہو)

اِحْسَانٌ کی تفسیر شرع میں اخلاص ہے پس بیع نفس سے مراد اسلام وجہ ہے کہ اپنی خواہش اور ارادہ کو خدا تعالیٰ کی خواہش اور ارادہ میں فنا کردے۔ یہ مضمون پہلے بھی بیان ہوا ہے۔ گو اس کا موقعہ یہاں نہ تھا۔ مگر کچھ حرج نہیں جہاں بھی بیان ہوجائے مفید ہے۔ مگر کچھ حصہ اس کا پہلے بیان ہونے سے رہ گیا تھا۔ اُس کو اب بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ تفویض میں ایک تفصیل ہے کیونکہ مطلوب

سالک دوقسم کے ہیں بعض غیر اختیاری ہیں اور بعض اختیاری۔ اور غیر اختیاری کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو شرعاً بھی مطلوب ہیں اور ایک وہ شرعاً مطلوب نہیں۔ یہ کل تین قسمیں ہوئیں۔ پس ان میں سے امور اختیاریہ کا تو یہ حکم ہے کہ اُن کو عمل کر کے حاصل کرو۔ اور غیر اختیاری امور میں جو شرعاً غیر مطلوب ہیں اُن کا یہ حکم یہ ہے کہ اُن کی طلب دل سے نکال دو اُن کے درپے نہ ہو۔

احضارِ قلب

اور جو غیر اختیاری شرعاً مطلوب ہے اُس کے لئے دُعا کرو مثلاً احضار قلب نماز میں مامور بہ ہے اور یہ اختیاری ہے اس کو تو عمل سے حاصل کرو۔ یاد رکھئے میں نے احضارِ قلب کہا ہے۔ اس کے حضور قلب نہ سمجھئے گا وہ اختیاری نہیں اور نہ اس کا مکلّف کیا گیا ہے۔ بلکہ حکم اس کا ہے کہ تم اپنی طرف سے قلب کو حاضر رکھنے کی کوشش۔ اس احضار قلب کی حقیقت اُن لوگوں سے پوچھو جو عمل کرتے ہیں۔ اُن سے نہ پوچھو جو ہر کام کو بدوں عمل ہی کے دشوار کہہ دیتے ہیں۔

مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اس کی حقیقت یہ بیان فرمائی ہے کہ نماز فعلِ مرکب ہے جس کے مختلف اجزاء ہیں۔ قیام وقعود و رکوع وسجود اور قرأت واذکار وغیرہ۔ پس احضار قلب یہ ہے کہ اس کے اعمال واقوال کو حفظ سے ادا نہ کرو۔ بلکہ ارادہ اور توجہ سے ادا کرو کہ اب زبان سے یہ نکال رہا ہوں۔ اب یہ لفظ کہہ رہا ہوں اور اب رکوع میں جاتا ہوں۔ اب سجدہ کر رہا ہوں ہر ہر فعل اور ہر لفظ پر جدید ارادہ کرو۔ اس طرح احضار قلب حاصل ہو جائے گا۔ مولانا کے اس ارشاد کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے۔

صلی رکعتین مقبلاً علیهما بقلبه (لم اجد الحدیث فی موسوعة اطراف الحدیث النبوی الشریف) اس میں ضمیر علیہما کا مرجع رکعتین یعنی صلوٰۃ ہے حاصل یہ ہوا کہ اپنے دل سے نماز پر متوجہ رہے اور وہ مرکب ہے تو اس پر توجہ داقبال وہی ہے جو مولانا نے بیان فرمایا یہ تو امر اختیاری ہے اس کو تو ہمت و عمل سے حاصل کرنا چاہئے۔ اور ایک ہے حضورِ قلب یہ اختیاری نہیں۔ یعنی اُس کا وہ درجہ اختیاری نہیں جس کی سالکین کو طمع ہے ورنہ جو درجہ حضور کا مطلوع احضار ہے وہ تو اختیاری ہے اس حضور زائد کے لئے صرف دعا کرنا چاہئے۔ اسی طرح ذوق وشوق وغیرہ بھی غیر اختیاری ہیں ان کے لئے بھی دعا کرنا چاہئے مجاہدہ وغیرہ اس کی تدبیر نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیث میں اُن کے لئے صرف دُعا آئی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ شَوْقًا اِلٰی لِقَائِکَ (مسند احمد 5:324) سو مجاہدہ وغیرہ حصول شوق کی غرض سے نہ کرو نہ شیخ سے اُس کے حصول کی تدبیر پوچھو نہ اس سے یہ شکایت کرو کہ ہمارے اندر شوق پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے لئے محض دعا کرو اور شیخ محقق کو چاہئے کہ اگر کوئی اس سے ان امور کے لئے تدبیر پوچھے تو صاف کہہ دے کہ ان کے حاصل ہونے کی کوئی تدابیر اختیاری نہیں ہے بس دعا

کرو پھر دعا کر کے اس کو بھی مت دیکھو کہ شوق حاصل ہوا یا نہیں کیونکہ تم کو کیا خبر ہے کہ تمہارے لئے کیا مناسب ہے ممکن ہے تمہارے لئے عدم شوق ہی مناسب ہو اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ جب یہ امور شرعاً مطلوب ہیں تو ہمارے لئے ان کا نہ ہونا کیونکر مناسب ہوگا۔ کیونکہ مطلق مطلوبیت لِلکُل لازم نہیں۔ بعضوں کے لئے بعض مطلوبات بھی بہتر نہیں ہوتے۔ دیکھو صحت وعافیت شرعاً مطلوب ہے جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی دعا فرمائی ہے اور امت کو بھی سوالِ عافیت کا امر فرمایا ہے

سلو الله العافية فانه ما سئل من الله شيء احب اليه من العافية

(مجمع الزوائد10:231، المعجم الكبير للطبرانى19:234، كنز العمال 21324)

مگر پھر بھی بعضوں کے لئے بیمار رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ نہ معلوم تندرست رہ کر وہ کیا ستم ڈھاتے۔ اسی طرح سوانکھا ہونا نعمت مطلوبہ ہے مگر بعض کے لئے اندھا ہونا ہی بہتر ہے۔ نہ معلوم آنکھیں ہوتیں تو وہ کتنی عورتوں کو گھورتا۔ پس معلوم ہو گیا کہ بعض مطلوبات بھی بعض کے لئے بہتر نہیں ہوتے۔ مگر یہ تقسیم مطلوب غیر اختیاری میں ہے مطلوب اختیاری میں یہ تفصیل نہیں وہ سب کے لئے بہتر ہیں جس کی دلیل شریعت کا امر ہے اگر وہ سب کے لئے بہتر نہ ہوتے تو سب کو اُن کا امر نہ ہوتا۔ خوب سمجھ لو۔ بہرحال حضور زائد اور کیفیات و جدید اور شوق و ذوق کے لئے دعا تو کرو۔ مگر دعا کے بعد اُن کے منتظر بن کر نہ بیٹھو۔ بلکہ اپنے کو خدا کے سپرد کرو کہ ہمارے لئے جو بہتر ہوگا ہو رہے گا۔ خواہ حصول ہو یا عدم حصول۔

آنکس کہ تو انگرت نمی گرداند　　　او مصلحت تو از تو بہتر داند

(جس نے تجھے دولت مند نہیں بنایا وہ تیری مصلحت تجھ سے بہتر جانتا ہے)

اب اس تفصیل کے بعد شیخ سے کچھ مانگنے کا کسی کا منہ نہیں نہ شکایت کی گنجائش ہے کیونکہ جس چیز کو تم شیخ سے مانگو گے یا عدمِ حصول کی شکایت کرو گے اگر وہ شرعاً مطلوب نہیں ہے تو شیخ کہہ دے گا کہ اس خیال کو دل سے نکالو۔ اور اگر مطلوب ہے اور اختیاری ہے تو وہ کہے گا کہ عمل سے اس کو حاصل کرو۔ اور اگر مطلوب غیر اختیاری ہے تو وہ کہے گا کہ اس کے لئے تم بھی دُعا کرو ہم بھی دُعا کریں۔ مگر دعا کر کے اس کا انتظار کر نہ کرو کہ حصول ہوا یا نہیں بلکہ برابر دعا میں لگے رہو۔ اس پر شاید یہ سوال ہو کہ جب کچھ دنوں دعا کر کے مطلوب کا ظہور نہ ہوا تو یہ اس کی علامت ہوگی کہ اس مطلوب کے عطا میں حکمت نہیں پھر اب آئندہ اس کے لئے دعا کی اجازت نہ ہونا چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں دعا کی پھر بھی اجازت ہے کیونکہ اب تک عطا میں حکمت نہ تھی۔ تو یہ کیا ضرور ہے کہ آئندہ بھی عطا میں حکمت نہ ہو۔ اور دعا گو ظاہر میں مطلق ہے۔ مگر حقیقت میں مقید ہے۔ معنی یہ ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ شَوْقًا ان كان لی خیر (مسند احمد 2:413، مجمع الزوائد10:196، کنز العمال:1179) (اے اللہ میں تجھ سے شوق کا سوال کرتا ہوں اگر وہ میرے حق میں خیر ہے)

مگر چونکہ اپنے نزدیک یہ مطلوب خیر ہی تھا اس لئے اِن شرطیہ کو حذف کر دیا گیا۔

عبدِ کامل

یہ حاصل ہے تفویض کا جس کی اس طریق میں سخت ضرورت ہے اسی کو عارف فرماتے ہیں۔

فکر خود ورائے خود در عالمِ رندی نیست　　　کفرست دریں مذہب خود بینی وخود رائی

(اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں اس راہ میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)

اس راستہ میں سالکین کو قبض وبسط وغیرہ بڑے بڑے حالات پیش آتے ہیں دل پر آرے چلتے ہیں مگر بجز تفویض کے کوئی تدبیر نہیں۔ ایسے ہی قبض شدید کی نسبت عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش　　　بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

اے دل اندر بند زُلفش از پریشانی منال　　　مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

(اے باغبان اگر پانچ روز بھی گل کی صحبت میسر آ جائے تو جدائی کے کانٹوں کی تکالیف پر بلبل کو صبر آ سکتا ہے۔ اے دل تو اسکی زلفوں میں گرفتار ہو کر پریشان مت ہو کیونکہ عقلمند پرندہ جب جال میں پھنستا ہے تو اسکو صبر کرنا چاہئے)

بعض نے اس حالت میں جان دے دی ہے کیونکہ قبض میں واردات بھی بند ہو جاتے ہیں اور انوار بھی بند کیفیات بھی بند، اس وقت تفویض ہی سے کام چلتا ہے جو شخص اس وقت بھی کام پر جما رہے اور کیفیات وانوار کے بند ہو جانے پر یوں کہے ؎

روزہا گرفت گورو باک نیست　　　تو بماں اے انکہ چونتو پاک نیست

(ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہئے اگر گئے بلا سے گئے عشق جو اصلی دولت ہے سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا رہنا کافی ہے) اور یوں کہے ؎

میل من سوئے وصال ومیل اوسوئے فراق　　　ترک کام خود گرفتم تا برآید کامِ دوست

(میرا میلان وصال کی طرف ہے اور میرے محبوب کا میلان فراق کی طرف ہے میں نے اپنا کام چھوڑ دیا تا کہ میرے دوست کا کام بن جائے)

وہ عبد کامل ہے وہ واقعی بڑا عارف ہے۔ شیخ شیرازیؒ نے ایسے ہی موقع پر ایک عارف کا قول نقل فرمایا ہے ؎

تو انی ازاں دل بہ پرداختن　　　کہ دانی کہ بے اوتواں ساختن

(اس سے دل کیسے خالی کر سکتے ہو جس کے بارے میں یقین ہو کہ اسکے بغیر گزرنا ممکن ہے)

ان کو ایک رات غیب سے یہ آواز آئی تھی کہ جو چاہے کر یہاں کچھ قبول نہیں یہ آواز اُن کے ایک مرید نے بھی سُن لی۔ عارف اگلے دن پھر رات کو لوٹا لے کر وضو کو چلے۔ مرید نے کہا ایسی بھی کیا بے غیرتی ہے کہ وہ تو دھکے دیتے ہیں قبول ہی نہیں کرتے اور آپ پھر بھی پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ جب وہ قبول نہیں کرتے تو آپ ہی اپنا آرام کیوں کھویا۔ پڑ کے سو رہیے۔ عارف نے جواب دیا ؎

بنو میدی انگہ بگردیدے | ازیں رہ کہ راہے دگردیدے
چو خواہندہ محروم گشت ازدرے | چہ غم گر شناسد در دیگرے۔
شنیدم کہ راہم دریں کوئے نیست | ولے ہیچ راہے دگرروئے نیست
تو انی ازاں دل بہ پردا ختن | کہ دانی کہ بے اوتواں ساختن

سبحان اللہ! کیالا جواب جواب دیااس پر معارحمت حق کو جوش آیا۔ جوش میں نے ویسے ہی کہہ دیاوہ اس سے پاک ہیں۔مگراب سمجھانے کو کیا کہوں کون سالفظ اختیار کروں۔غرض آواز آئی ؎

قبو ل ست گرچہ ہنر عیستت | کہ جز ماپنا ہے دگر عیستت

کہ جاؤ قبول کرلیا کیونکہ ہمارے سواتمہاری کہیں پناہ نہیں ہے۔ عارفین فرماتے ہیں کہ عارف اور مفوض کامل وہ ہے کہ اگر عمر بھرغیب سے اس کے کان میں یہ آواز آئی کہ

اِنَّکَ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ (تواہل جنت میں سے ہے)

یا یہ آواز آتی رہے کہ...... اِنَّکَ مِنْ اَھْلِ النار (تو دوزخیوں میں سے ہے) توکسی بھی وقت عمل میں ذرہ برابر بھی کمی نہ کرے۔ بدستور کام میں لگا رہے۔ نہ پہلی آواز سے بےفکر ہو نہ دوسری آواز سے دلبرداشتہ ہو۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِمَّنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَ ھُوَ مُحْسِنٌ (جوکوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکادے اور وہ مخلص بھی ہوتوایسے شخص کواس کا عوض ملتا ہے اپنے پروردگار کے پاس پہنچ کر)

یہی ہے اسلام وجہ اور یہی ہے بذلِ نفس ۔ ہاں احسان شرط ہے۔ جس کی تفسیر حدیث میں یہ آئی ہے۔ اَنْ تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

(لم أجد الحدیث فی موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی الشریف)

(تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرجس طرح تو اللہ تعالیٰ کو دیکھتا تو عبادت کرتا کیونکہ تواگراسے نہیں دیکھ رہا مگر وہ تجھے یقیناً دیکھ رہا ہے)

طلب رضاء

میں اس کی شرح بھی کئے دیتا ہوں۔ کیونکہ بہت لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں مشہورتو یہ ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کا طریقہ دومراقبوں سے بتلایا ہے کہ اول تو یہ تصور کرو کہ ہم خدا کو دیکھ رہے ہیں۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو یہی تصور کرو۔ کہ خدا تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ مگران مراقبات سے حدیث کو کوئی علاقہ نہیں۔ بلکہ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ عبادت ایسی اچھی طرح کرو جیسی خدا تعالیٰ کو دیکھ کر کرتے آگے فاء تعلیلیہ ہے جس میں پہلے کلام کی علت مذکور ہے کہ تم کو عبادت ایسی ہی کرنی چاہئے کیونکہ اگر تم خدا تعالیٰ کو اس وقت نہیں دیکھتے تو اس کا تو یقین ہے کہ وہ دیکھ رہے ہیں اوراُن کے دیکھنے کا بھی وہی مقتضاء ہے جوتمہارے دیکھنے کا مقتضاء ہے کیونکہ ایک

مزدور کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت حاکم میرے کام کو دیکھ رہا ہے گو اُس کو نظر نہ آتا ہو تو یہ علم بھی اُس کے حسن عمل کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ یہ تفسیر لغت کے بھی موافق ہے کیونکہ لغت میں احسان کے معنی نکو کردن ہیں اور شریعت نے اپنی اصطلاحات میں لغت کا بہت لحاظ کیا ہے صرف اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ معنیٰ لغوی عام تھے۔ شریعت نے اس کو کسی قید کے ساتھ مقید کر دیا ہے۔ سو اس تفسیر پر معنی شرعی کو لغت سے زیادہ بعد نہیں ہے لغت میں احسان نکو کردن ہے اور شریعت میں نکو کردن عبادت ہے اور تفسیر مشہور پر جب کہ احسان کی تفسیر مراقبات سے کی جائے گی لغت میں بہت بعد ہو جائے گا۔ میں اس حدیث کا مطلب بحمد اللہ اوّل تو خود بھی یہی سمجھا تھا جو اوپر بیان کیا گیا ہے پھر کتابوں میں دیکھا تو غالباً علی قاری اور نووی نے بھی یہی لکھا ہے اور اخیر میں مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ کی تقریر دیکھی تو حضرت نے بھی یہی لکھا ہے۔ اس سے میرا بڑا جی خوش ہوا۔ پھر میں نے کسی مقام پر غالباً تکشف میں حضرت گنگوہیؒ ہی کی طرف منسوب کر کے یہ تقریر لکھ دی ہے کہ حضرت نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کیونکہ بڑوں کی بات لوگ جلدی مان لیتے ہیں۔ ہماری کون سنتا ہے۔ یہ تومن یشری نفسہ کی تفسیر تھی آگے فرماتے ہیں ابتغاء مرضاۃ اللّٰہ (اللہ کی رضا کی خاطر) ایک مسئلہ اس سے مستنبط ہوتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں من یشری نفسہ لا رضاء نہیں فرمایا۔ بلکہ ابتغاء مرضاۃ اللّٰہ (اللہ کی رضا کی خاطر) فرمایا ہے تو لفظ ابتغاء کے بڑھانے سے ایک مسئلہ پر تنبیہ ہوئی کہ مقصود طلب رضاء ہے حصول رضاء مامور بہ نہیں۔ یہ علوم صوفیہ کی صحبت میں رہنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ علماء یہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں نے بچپن میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے ایک جملہ سنا تھا۔ اس وقت تو اُس کی حقیقت منکشف نہ ہوئی تھی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ واقعی علم عظیم ہے۔ بچپن میں میرا حافظہ بہت اچھا تھا۔ اُس وقت کی باتیں بہت محفوظ ہیں۔ اب خراب ہو گیا ہے۔ اب تو چار دن کی بات بھی یاد نہیں رہتی۔ مگر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پھر بچپن کی باتیں اس وقت کیونکر یاد ہیں، بات یہ ہے کہ اس وقت یبس کا غلبہ ہے اور پتھر کی خاصیت ہے کہ اُس میں نئی لکیر تو مشکل سے پڑتی ہے لیکن جو لکیریں پہلے سے پڑی ہوئی ہیں وہ نہیں مٹتیں۔ تو مولانا نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ طلب مطلوب ہے وصول مطلوب نہیں۔ کیونکہ طلب تو اختیاری ہے اور وصول غیر اختیاری ہے اور بندہ اختیاریات کا مکلّف ہے نہ کہ غیر اختیاری امور کا۔ اس سے بڑی مشکلات حل ہو گئیں۔ کیونکہ طالب اگر کسی وقت شاکی ہو تو اُس سے کہنا چاہئے کہ تم کو طلب بھی ہے یا نہیں ہے تو پھر ثمرہ کا انتظار کیسا۔ اوّل طلب تو پیدا کرو۔ اور اگر کہے مجھے طلب تو ہے تو اُس سے کہنا چاہئے کہ بس مدعا حاصل ہے تم طلب ہی کے مکلّف ہو۔ تمہارا اتنا ہی کام ہے۔ وصول کے تم مکلّف نہیں ہو۔ نہ وہ تمہارا کام ہے بلکہ وہ خدا کا کام ہے۔ اُن کو اختیار ہے تم اپنے کام میں لگو۔ خدا تعالیٰ کے کام میں دخل نہ دو

؎ کار خود کن کار بیگانہ مکن (اپنا کام کرو دوسرے کا کام نہ کرو)

آبِ محبت

مولانا رومیؒ اس مضمون کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان فرماتے ہیں

آب کم جو تشنگی آور بدست   تا بجوشد آبت از بالا وپست

(کم پانی والی ندی سے پیاس بڑھتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بالا پست سے جوش میں آجاتی ہے)

یعنی پانی کی تلاش میں نہ لگو بلکہ اپنے اندر پیاس پیدا کرو پانی خود بخود آجائے گا۔ مگر اس سے یہ پانی مراد نہیں جو آپ روز مرہ میں پیا کرتے ہیں کیونکہ یہ تو پیاسے کے منہ میں از خود کبھی نہیں پہنچتا چاہے پیاسا مرنے بھی لگے کوئی جمنا تھوڑا ہی ہے جو بہہ کر آجائے گی۔ نہ معلوم اس کا نام جمنا کس نے رکھ دیا۔ اس کو تو بہنا کہنا چاہئے۔ کہ ہر سال کہیں سے کہیں بہہ کر نکل جاتی ہے اور گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیتی ہے۔ بہر حال وہ دوسرا پانی ہے جس کا کچھ پتہ آگے دیا ہے۔ کہ وہ پانی ایسا ہے کہ ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں   آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(اگر پیاسے دنیا میں پانی کو تلاس کرتے ہیں تو پانی بھی دنیا میں پیاسوں کو تلاس کرتا ہے)

وہ پانی اپنے پیاسوں کی تلاش میں خود رہتا ہے مگر اب بھی پوری تفسیر نہیں ہوئی۔ آگے ذرا اور واضح کر کے فرماتے ہیں ؎

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں   کو بہ نسبت ہست ہم این و ہم آن

(جس عاشق کو دیکھو اس کو معشوق سمجھو اگر چہ نسبت دونوں طرف ہے)

اب صاف کہہ دیا کہ آبِ محبت مراد ہے جس کا قاعدہ یہ ہے کہ جو پیاسا ہوتا ہے۔ یعنی عاشق وہ محض عاشق ہی نہیں ہوتا بلکہ معشوق بھی ہوتا ہے۔ جیسا یہ محبوب کا طالب ہے محبوب بھی اس کا طالب ہے۔ یہ مطلب ہے آب ہم جوید بعالم تشنگاں کا ایک مقام پر اور زیادہ وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

بانگ می آید کہ اے عاشق بیا   جود محتاجِ گدایاں چوں گدا

(آواز آتی ہے کہ سخاوت خود فقیروں کی محتاج ہے)

یہاں مولانا بہت مغلوب ہو گئے ہیں۔ کہ جود کو محتاج گدا کہہ دیا۔ عارف شیرازیؒ نے اس مضمون کو خوب ادب سے ادا کیا ہے۔ حالانکہ وہ مولانا سے زیادہ مغلوب ہیں۔ مگر اس مضمون کو بہت بچا کر بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

سایۂ معشوق گر افتاد بر عاشق چہ شد   با دمحتاج بودیم او بما مشتاق بود

(معشوق کا سایہ عاشق پر پڑ گیا تو کیا ہو گیا ہم اس کے محتاج ہیں وہ ہمارا مشتاق ہے)

سبحان اللہ! کیا پاکیزہ الفاظ ہیں کہ ہم تو اُن کے محتاج تھے اور وہ ہمارے مُشتاق تھے۔ ان کو محتاج نہیں کہا۔ بہر حال دونوں کا حاصل یہ ہے کہ طالب مطلوب بھی ہوتا ہے لیکن ایک فرق بھی ہے کہ ؎

عشق معشوقاں نہاں ست دستیر　　　عشق عاشق باد وصد طبل و نفیر

(معشوق کا عشق پوشیدہ اور چھپا ہوا ہے عاشق کا عشق ظاہر و باھر ہے)

یعنی اُن کی محبت تو مستور ہے اور عاشق کی محبت نے عالم میں شور مچا رکھا ہے اور ؎

لیک عشق عاشقاں تن زہ کند　　　عشق معشوقاں خوش وفربہ کند

(لیکن عاشقوں کا عشق انہیں دبلا کر دیتا ہے اور معشوق کا عشق انہیں فربہ اور موٹا کر دیتا ہے)

مطلب یہ ہے کہ عاشق کا عشق تو اُس میں موثر ہے جس سے یہ متاثر ہو کر لاغر وحقیر ہو جاتا ہے اور محبوب کا عشق اُس میں موثر نہیں۔ نہ وہ اس سے متاثر ہیں۔ مطلب تو ہے کہ جس کے ادا کرنے کے لئے مجازاً فربہ کند فرما دیا۔ اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں۔ مجاز و استعارات میں ایسے الفاظ معاف ہیں۔ باقی معنی سب موافق اصول ہیں۔ بہرحال ابتغاء کے لفظ نے اس جگہ یہ مسئلہ حل کر دیا کہ طلب مطلوب ہے وصول مطلوب نہیں ہے۔

وعدۂ رضاء

رہا یہ سوال کہ گو وصول کی طلب نہ کی جائے مگر وہ حاصل بھی ہوگا یا نہیں اس کو دوسری نصوص نے حل کر دیا ہے۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا

(جو شخص آخرت کے ثواب کی نیت رکھے گا اور اس کی پہلے جیسی سعی کرنا چاہیے ویسی ہی سعی بھی کرے گا بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو پس ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی)

اس سے معلوم ہوا کہ طالب کو رضا ضرور حاصل ہوتی ہے دوسرا مسئلہ لفظ مرضاۃ سے حاصل ہوا کہ مفوض کو رضا طلب کرنا چاہیئے۔ بعض لوگ ذات کے طالب بنتے ہیں۔ عارف شیرازیؒ ان کو بھی لتاڑتے ہیں ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چین　　　کہیں جاں ہمیشہ باد بدست ست دام را

(جس طرح عنقا کو کوئی شکار نہیں کر سکتا جال پھیلانا اور کوشش کرنا لا حاصل ہے اسی طرح جس جب تو خراست خداوندی کا ادراک نہیں کر سکتا تو اس کیلئے سوچ وفکر بے کار ہے)

عنقا سے مراد ذات ہے۔ یہ ان کی خاص اصطلاح ہے مطلب یہ ہے کہ [illegible] ات محبوب تو وراء الوراء ثم ورار الوراء ہے جہاں تمہارا ادراک نہیں پہنچ سکتا۔ اور طلب ہوتی ہے معرفت سے اور ذات کی معرفت ہوا کرتا ہے اور اسی وقت [illegible] رہتا ہے جب تک افراد متحقق ہیں اگر تمام جزئیات فنا ہو جائیں تو کلی طبعی بھی فنا ہو جاتی ہے تو یہ شخص نعوذ باللہ فنائے خلق کے وقت حق تعالیٰ کو فانی کہے گا۔ بلکہ اس نے تو ابھی فانی کہہ دی [illegible] نکہ مخلوق کے لئے فنا لازم ہے۔ یہ آپ نے وحدۃ

الوجود کی گت بنائی۔ اسی لئے حاجی صاحب نے اس توحید کا لقب حمر توحید رکھا یعنی چماروں کی سی توحید۔ کیونکہ یہ عقیدہ کفار کا ہے وہ مخلوق میں حلول واجب کے قائل ہیں سو خوب سمجھ لو کہ یہ مثالیں حقیقت پر محمول نہیں ہیں۔ ذات واجب کے لئے کوئی مثال نہیں ہوسکتی۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (اسکی مثل کوئی چیز نہیں) پس سالکین کو معرفت ذات اور طلب ذات کی ہوس نہ کرنا چاہئے۔ محض رضا طلب کرنا چاہئے یہ مسئلہ لفظ مرضاۃ سے مستنبط ہوا۔

ثمرۂ تفویض

آگے ثمرہ کا ذکر ہے وَاللّٰهُ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ میں نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے بندوں پر (جو اس طرح اپنے کو تفویض کر دیتے ہیں) شفقت وعنایت فرماتے ہیں۔ میں نے اَلْعِبَادُ میں لام عہد کا لیا ہے۔ اور یہ تفسیر بالرائے نہیں۔ کیونکہ قواعد عربیہ کے موافق ہے اور جو تفسیر قواعد پر منطبق ہو اور اُس میں کلماتِ قرآنیہ کا ربط زیادہ واضح ہوتا ہے۔ اس کے اختیار کرنے کا مضائقہ نہیں گو منقول بھی نہ ہو اور ظاہر ہے کہ اس جگہ لام عہد لینے سے اِنَّ اللّٰهَ رَؤُفٌ بِالْعِبَاد کا تعلق ماقبل سے اچھی طرح واضح ہوگیا۔ اس میں بھی مسئلہ مستنبط ہوا وہ یہ کہ وصول کا حاصل صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس شخص پر شفقت وعنایت فرماتے ہیں۔ یہ معنی نہیں کہ وہ نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی گود میں جا بیٹھتا ہے۔ یا قطرہ کی طرح دریا میں مل جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ تم بذل نفس کرو۔ اور رضا کے طالب بنو۔ اس پر یہ ثمرہ مرتب ہوگا کہ حق تعالیٰ تم پر عنایت فرمائیں گے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس وعظ کا نام فناء النفوس فی رضاء القدوس رکھتا ہوں۔ لُغت دیکھنے سے معلوم ہوا کہ رضاء بالقصر کے معنی مطلق خوشنودی کے ہیں اور رضاء بالمد باب مفاعلت کا مصدر ہے جس کے معنے طرفین کی خوشنودی کے ہیں چونکہ بذل نفس میں سالک کی طرف سے بھی رضاء بالحق ہوتی ہے اور اس پر رضا حق تعالیٰ کی بھی مرتب ہوئی ہے۔ اس لئے یہاں رضاء بالمد ہی مناسب ہے اور اُس میں قافیہ فناء کی بھی رعایت ہے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو یہ دولتیں عطا فرمائیں، (آمین)

وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

(اشرف علی ۳۰ شوال ۱۳۴۸ھ)

نشر الرحمة

۲۸ شوال المکرم ۱۳۳۶ھ کو بارش نہ ہونے کے باعث نماز استسقاء سے پہلے ایک گھنٹہ تک بیان فرمایا۔ یہ بیان عید گاہ تھانہ بھون میں ہوا۔ حکیم محمد یوسف صاحب بجنوری مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَھُوَ[1] الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ بَعْدِمَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَہٗ وَ ھُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ

تمہید

اس وقت تھوڑا سا بیان ہوگا۔ سب صاحب متوجہ ہو کر سُن لیں یہ ایک آیت ہے جس میں حق جل شانہٗ وعم نوالہ کی وسعت رحمت کا ایسے عنوان سے بیان ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی عنوان کسی کے ذہن میں آنہیں سکتا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہر چیز[2] حصول وجود شرائط اور ارتفاع موانع پر موقوف ہے۔ چنانچہ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ ہر چیز کے لئے کچھ شرائط وجود اور کچھ اس کے روکنے والے موانع ہوتے ہیں۔ مثلاً بادشاہ سے کچھ لینا ہو تو اس کی خوشامد اطاعت کرو۔ یہ تو شرائط و اسباب ہیں اور اگر کسی نے اس کی شان میں گستاخی کی۔ گالی دیدی۔ سخت کلامی کی تو یہ موانع ہیں اس کے بعد سے انعام موقوف ہو جاتا ہے۔ یا بادشاہ سے نوکری کی درخواست کی اور یہ شرط تھی اور وہ دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے بعد فوراً اس شخص نے یہ کہہ دیا کہ مجھے تو آپ سے امید نہیں ہے۔ فضول ہے آپ سے مانگنا یہ مانع ہے۔ اس صورت میں نوکری دینا تو درکنار دینے کا قصد بھی نہ کرے گا اور کہے گا کہ جا ایسے بے حیا کو ہم نوکری نہ دیں گے، ہماری خوشامد کرتا اور ہم سے امید رکھتا تو ہم دیتے۔

غرض کیا کوئی عاقل کہہ سکتا ہے کہ اس صورت میں بادشاہ اس کو نوکری دے گا۔ یقیناً تمام عقلاء کی رائے یہی ہوگی ایسے شخص کو نوکری دینا نہ اب سلطنت کے خلاف ہے۔ خلاصہ یہ کہ موانع[3] عطاء میں سب سے بڑھ کر مانع یہ ہے کہ کھلے لفظوں میں ناامیدی ظاہر کر دے اور یوں کہہ دے

---

[1] اور وہی وہ ہے جو اتارتا ہے مینہ پیچھے اس سے کہ آس توڑ چکے اور پھیلاتا ہے اپنی رحمت اور وہی کام بنانے والا تعریف کیا گیا۔ (الشوریٰ: ۲۸) [2] ہر چیز کا حصول وجود اسباف وارتفاع موانع پر موقف ہے۔

[3] موانع عطا میں سب سے بڑا مانع اظہار ناامیدی ہے۔

کہ آپ کیا دیں گے۔ اس میں تو کوئی تاویل بھی نہیں ہوسکتی۔

اول تو آداب شاہی کا مقتضاء یہ ہے کہ بشرہ سے بھی یہ بات ظاہر نہ ہونا چاہئے کہ ہم کو امید نہیں ہے چہ جائیکہ زبان پر لائی جاوے۔ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی عظمت اس کے قلب میں بالکل نہیں ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ سمجھ لو۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جیسے حق[1] سبحانہ تعالیٰ سے زبان کے کلمات مخفی نہیں ہیں۔ اسی طرح دل کی باتیں اور خیالات بھی ان سے مخفی نہیں ہیں جیسے وہ علیم باللسان ہیں اسی طرح علیم بذات الصدور بھی ہیں۔ پوشیدہ لفظوں میں کلام کرویا ظاہر الفاظ میں۔ یہ ان کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔ ان کے نزدیک پنہاں اور علانیہ یکساں ہے۔ کوئی بھی فرق نہیں۔ ان کی تو وہ شان ہے۔ جیسا کہ لقمان علیہ السلام نے فرمایا۔

یٰبُنَیَّ[2] اِنَّهَآ اِنْ تَکُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْ دَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْفِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ

حاصل مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز پوشیدہ ہو اور پھر سخت پتھر کے اندر ہو چاہے آسمان میں ہو یا زمین میں ہو اللہ تعالیٰ کو سب کا علم ہے جب یہ دونوں مقدمے سمجھ میں آگئے۔ تو اب آیت کا ترجمہ سنیئے۔ جس سے معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ موانع رحمت کے ہوتے بھی وہ اپنی رحمت کو نہیں روکتے۔ فرماتے ہیں کہ اس اس کی وہ شان ہے کہ اتارتا ہے مینہ نااُمیدی کے بعد اور پھیلاتا ہے رحمت اپنی۔

یہاں ینزل[3] الغیث پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ ینشر رحمت بھی لائے تاکہ محض نزول بارش کے سننے سے طوفان نوح کا شبہ نہ ہوسکے۔ کیونکہ بارش کی یہ بھی ایک صورت تھی کہ بارش ہو۔ مگر اتنی کثرت سے ہو کہ سب غرق ہو جائیں۔ پس ینشر رحمته سے بتلا دیا کہ بارش بھی ایسی نہیں جو موجب ہلاکت ہو۔ بلکہ اس کے ساتھ رحمت بھی شامل ہوتی ہے۔ اور یہاں ینزل کے مقابلہ میں یَنْشُرُ اور غیث کے مقابلہ میں رحمت لائے ہیں۔ اس سے اشارہ ہے اس طرف کہ بارش دور دراز تک ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ ایک یا دو کھیت میں ہو کر رہ جاتی ہو۔ بلکہ وہ رحمت کی طرح پھیل جاتی ہے۔ پس ینشر رحمته جملہ سابقہ ہی کی تفسیر ہے۔ یہ تو آیت کا ترجمہ ہو۔

---

[1] خدا تعالیٰ کے نزدیک کلمات زبان وخبایا قلب دونوں برابر ہیں۔ [2] اے بچے میرے اگر کوئی چیز ہو برابر رائی کے دانہ کے پھر ہو کسی پتھر میں۔ یا آسمانوں میں یا زمین میں حاضر کرے اس کو اللہ بے شک اللہ چھپی بات جانتا ہے خبردار ہے۔۱۲۔ [3] عجیب نکتہ۔

وُسعتِ رحمت

اس سے وسعت رحمت کیسی کچھ ثابت ہوتی ہے۔ ان مقدمات میں غور کر کے دیکھئے جو ابھی بیان کئے گئے ہیں۔ جن میں ایک مقدمہ تو یہ تھا کہ نا امیدی مانع عطاء ہے مگر خدائے[1] تعالےٰ کے یہاں وہ بھی مانع نہیں۔ بلکہ نا امیدی کے بعد بھی فضل فرماتے ہیں۔ دوسرا مقدمہ یہ کہ حق تعالےٰ کو خفایا کی اطلاع مثلِ ظواہر کے ہے۔ فالقلب عندہٗ لِلّسان ان کے نزدیک دل کی بات ایسی ہے جیسے زبان سے کہی ہوئی۔ اس لئے قلب کی نا امیدی مانع ہونی چاہئے تھی۔ مگر خدا تعالیٰ کے یہاں بالکل مانع نہیں اور یہ واقعی ہے کہ معاملہ اللہ تعالیٰ کا بندوں کے ساتھ ایسا ہی ہے کہ وہ باوجود موانع کے بھی فضل فرماتے رہتے ہیں۔

غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ روزمرہ ہمارے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں کچھ بارش ہی کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر نظیریں موجود ہیں۔ خدا تعالیٰ کی رحمت ایسی وسیع ہے کہ ایک بزرگ کے الہاموں میں سے ایک الہام یہ بھی ہے کہ رزق میرا ایسا ہے کہ اگر کوئی شخص پانچوں وقت نماز کے بعد دعا کرے کہ اَللّٰھُمَّ لَا تَرْزُقْنِیْ یعنی اے اللہ! مجھے رزق مت دیجیو۔ تب بھی میں رزق نہ بند کروں تو مانگنے پر تو کیوں نہ دوں گا۔ اب خیال کیجئے کہ ہمارا یہ گمان کتنا غلط ہے کہ ہم خدا تعالیٰ سے نا امید ہوں۔ غرض کہ جو کچھ کمی ہے ہماری طرف سے اُدھر سے کوئی دریغ نہیں ہے۔

علامتِ مقبولیت

ہاں کبھی توقف ہو جاتا ہے جس سے خفیف سی کلفت ہوتی ہے تاکہ متنبہ ہو کر بندے متوجہ ہو جائیں۔ کیونکہ[2] جس لڑکے کو استاد یہ چاہتا ہے کہ کل کو زیادہ نہ پٹے۔ تو اس کے ایک دو چپت آج ہی مار دیتا ہے تاکہ وہ اپنا سبق یاد کرلے اور کل کو نوبت زیادہ پٹنے کی نہ آئے اور جسے کل کو خوب پیٹنا ہے اسے مہلت دیتا ہے۔ جب کل ہوئی اور وہ سبق میں غوطے کھانے لگا تو اب اس کی خوب مرمت ہوگی۔ مگر پہلے دن یہ دوسرا لڑکا استاد کی ظاہری مہربانی دیکھ کر یہ سمجھتا تھا کہ میاں جی کو مجھ سے عشق ہے کہ مجھے کچھ نہیں کہتا۔ اور اپنے دل میں خوش ہے مگر چوبیس گھنٹہ کے بعد اس عشق کی حقیقت معلوم ہوگئی۔ اس طرح آج بھی بعض لوگ[3] اس دوسرے لڑکے کی طرح خدا تعالیٰ

---

[1] خدا تعالیٰ کے یہاں نا امیدی بھی مانع عطا نہیں [2] خدا تعالیٰ کی بلیات نازل کرنے کی مثال
[3] خدا تعالیٰ کی عطاؤں کو مستمر دیکھ کر رضا سمجھنا غلط ہے۔

کی عطاؤں کو اپنے اوپر مستمر دیکھ کر اس کو خدا تعالیٰ کی رضا سمجھتے ہیں اور مغرور ہیں۔

تھانہ بھون کے ایک متکبر رئیس کی حکایت ہے کہ ایک شخص حضرت حاجی صاحب کے مریدوں سے اللہ کا نام لینے والے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے مگر غریب قوم کے ان کے سامنے کو نکلے۔ اللہ کا نام لینے سے طبیعت میں لطافت آ ہی جاتی ہے۔ ان رئیس صاحب نے کہا کہ یہ کون ہے جو ہماری برابری کرتا ہے۔ بڑا صاف ستھرا بن کر نکلتا ہے۔ اور اٹھ کر غریب کے پانچ جوتے مار دیئے۔ اس نے یہ کہا کہ قیامت میں کسر نکلے گی۔ ان رئیس صاحب نے مسخرا پن سے جوتا سامنے رکھ دیا کہ تو میرے مار لے۔ اس نے کہا کہ میری کیا مجال۔

تو آپ کیا کہتے ہیں۔ اب بھی معلوم ہوا کہ ہم کو خدا ہی کا حکم ہے کہ تم کو مارا کریں۔ کیونکہ دیکھ لے ہم نے تو تیرے بلا کہے جوتے مار لئے اور تو اجازت پر نہیں مار سکتا۔ کیا ٹھکانہ ہے اس تکبر کا یہ استدراج ہے اگر نعمتیں دلیل ہوتیں۔ سب سے زیادہ ولی فرعون ہوتا اور اگر مصائب علامت غضب ہوتیں تو انبیاء سب سے زیادہ (نعوذ باللہ) مغضوب ہونے چاہئیں کیونکہ سب سے زیادہ مصائب انہی کو پیش آئی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔

انّ اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فا لامثل

کہ سب سے زیادہ بلاء انبیاء پر آتی ہے پھر اس پر جو ان کے بعد افضل ہو چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام آرہ سے چیرے گئے۔ نوح علیہ السلام کی قوم نے نوسو سال تک ان کے پتھر مارے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا کیا تکالیف پیش آئیں تو کیا انبیاء مقبول نہیں تھے۔ خوب سمجھ لو کہ نہ دنیا کا عیش علامت ہے قرب ومقبولیت کی اور نہ اس کی تکالیف دلیل ہیں مردویت کی چنانچہ خود صریح نص اس کی ساتھ ساتھ ناطق ہے۔

اِذَا مَاابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ وَ اَمَّا اِذَا مَاابْتَلٰهُ فَقَدَرَعَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ كَلَّا

ترجمہ:۔ آدمی کا یہ حال ہے جب جانچے اس کو رب اس کا پھر اس کو عزت دے اور اس کو نعمت دے تو کہے میرے رب نے مجھے عزت دی اور جس وقت اس کو جانچے پھر کھینچ کرے اس پر روزی کی تو کہے میرے رب نے مجھے ذلیل کیا کوئی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔

حقیقت نعمت مصیبت

یاد رکھو کہ مقبولیت وقرب کا مدار عیش پر اور مردودیت کا مدار تنگی پر نہیں کبھی عیش وعشرت

استدراج ہوتا ہے اور کبھی بلا مصیبت رحمت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ بھی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ہماری کوتاہی پر چرکہ لگادیں۔ اس طرح اسے امساک باراں بھی رحمت ہے تا کہ کوتاہیوں سے باز آجائیں سرکشی کو چھوڑ دیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِىْ عَمِلُوْا

اگر اس کے بعد بھی تنبیہ نہ ہو اور متوجہ نہ ہوں تو حقیقی غضب نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے

وَمَا اَرْسَلْنَا فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا اَخَذْنَا اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَاءَ نَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ

ترجمہ: اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی کہ نہ پکڑا ہو وہاں کے لوگوں کو سختی اور تکلیف میں۔ شاید وہ گڑ گڑائیں پھر بدل دی ہم نے برائی کی جگہ بھلائی۔ (یعنی تکلیف کی جگہ آرام) یہاں تک کہ وہ بڑھ گئے اور کہنے لگے کہ پہنچتی رہی ہمارے باپ داداؤں کو بھی تکلیف اور خوشی (یعنی زمانہ کا انقلاب ہے، اس میں طاعت و معصیت کا کیا دخل) پھر پکڑا ہم نے ان کو ناگہاں اور وہ خبر نہ رکھتے تھے۔

مطلب یہ ہے کہ سختی اور تکلیف اس لئے بھیجتے ہیں تا کہ رجوع کریں جب رجوع نہیں کرتے تو بجائے اس کے کہ اور تکالیف بھیجتے ان کے لئے راحت کا ساماں کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ سب مصیبت گناہ کے سبب نہ تھی کیونکہ دیکھ لو ہم نے گناہ بھی کئے اور اب بھی کر رہے ہیں اور مصیبت خود ٹل گئی اور ہمارے باپ داداؤں کے وقت میں بھی ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ کبھی تکالیف ہوتی تھیں اور کبھی راحت، یہی زمانہ کی روش ہے، ہم پر بھی گزر گئی۔ دنیا کا یہی دور چلا آتا ہے اور کچھ بھی نہیں بس زمین سے تبخیر ہوئی بارش ہوگئی۔ تبخیر نہ ہوئی بارش بند ہوگئی۔ اگر گناہ پر مدار ہوتا تو اب بارش کیوں ہوگئی کیونکہ ہم تو اب بھی ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ پس یہ جو علماء کہتے ہیں کہ گناہوں سے مصیبت آتی ہے غلط ہے۔ اگر گناہوں سے مصیبت آتی تو ہمیں اب راحت کیوں پہنچتی۔

فَاَخَذْنَا هُمْ بَغْتَةً یعنی جب راحت کے سامان دیکھ کر غافل ہو گئے تو ہم نے اچانک پکڑ لیا۔ یاد رکھو کہ مصیبت بحیثیت متنبہ اور متوجہ کرنے کے نعمت ہے اور نعمت بحیثیت ڈھیل اور دھوکہ کھانے کے مصیبت ہے۔ اگر ایک دفعہ بارش ہوگئی تو نازمت کرو اور امساک ہوا تو اس کو غضب مت خیال کرو بلکہ رحمت سمجھو کہ ایک چپت لگی ہے۔ سو ادھر سے سزا بھی رحمت ہے۔

شانِ عطاء اور عطا کی تو یہ شان ہے کہ ناامیدی پر بھی عطا فرماتے ہیں تو امید پر کیوں نہ

عطا کریں گے اور آیت میں مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا جو واقع ہے۔ بظاہر سیاق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قنوط (ناامیدی) سبب ہے بارش کے لئے جیسے ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔

مِنْ بَعْدِ مَا هَاجَرُوْا کہ وہاں ہجرت سبب ہے مغفرت کے لئے دونوں جگہ یکساں عنوان ہے۔ سو سمجھ لیجئے کہ یہاں ایسا نہیں ہے کہ قنوط بارش کا سبب ہو۔ بلکہ حقیقت میں تو وہ موانع میں سے ایک مانع ہے۔ اجابت میں اس کو کوئی دخل نہیں۔ یہ جدا بات ہے کہ خدا تعالیٰ باوجود مانع ہونے کے پھر بھی نعمت کو نہیں روکتے۔

صاحبو! اس وقت بھی بہت سے قلوب میں تردد ہے کہ دیکھئے نماز استسقاء سے بارش ہوگی، یا نہیں، اور یہ پہلے آ چکا ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک دل سے کہنا ایسا ہی ہے جیسے حاکم مجازی صرف الفاظ پر مطلع ہوتا ہے۔ اور حاکم حقیقی ضمیر کو امید سے مامور رکھو۔

میرے استادؒ ایک حکایت عالمگیر کے زمانہ کی بیان کرتے تھے کہ ایک راجہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس نے ایک لڑکا چھوڑا خوردسال اور راجہ کا ایک بھائی جوان تھا۔ لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ عالمگیر بھائی کو راجہ بنائیں گے۔ مگر وزیر اعظم کی رائے بیٹے ہی کو راجہ بنانے کی تھی۔ اس لئے اس بچہ کو عالمگیر کے روبرو پیش کرنے کی رائے قائم کر کے شاید اس کو دیکھ کر عالمگیر رحم کھا کر اسی کے لئے گدی تجویز کر دیں۔ اس کو اپنے ساتھ لے چلا اور تمام راستہ سکھاتا ہوا لایا کہ بادشاہ سلامت فلاں بات پوچھیں تو یوں کہنا۔ اور اگر یہ دریافت کریں تو یوں جواب دینا۔ جب قلعہ کے دروازہ پر پہنچے لڑکے نے کہا کہ ان باتوں کے علاوہ اگر اور کچھ پوچھا تو کیا کہوں گا۔ وزیر اس سوال سے دنگ رہ گیا۔ اور کہا کہ صاحبزادے جس خدا نے یہ سوال تجھے سکھلایا ہے ان باتوں کے جواب بھی وہی سکھا دے گا۔ غرض عالمگیر کو اطلاع ہوئی وہ حویلی میں تھے۔ لڑکے کو بوجہ خوردسال ہونے کے اندر بلا لیا۔ اور اس وقت لنگی باندھے حوض کے کنارے پر غسل کے لئے کھڑے تھے۔ لڑکے نے زنانہ میں جا کر عالمگیر کو سلام کیا۔ بادشاہ نے مزاحاً اس لڑکے کے دونوں ہاتھ پکڑ کر حوض کے مقابل کر دیا اور کہا چھوڑ دوں۔ لڑکا قہقہہ مار کر ہنسا اور کہنے لگا کہ آپ مجھ کو ڈوبنے سے کیا ڈراتے ہیں۔ میں کیسے ڈوب سکتا ہوں۔ آپ کی تو وہ شان ہے کہ کسی کی اگر انگلی بھی پکڑ لیں تو وہ ڈوب نہیں سکتا۔ اور میرے تو دونوں ہاتھ آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔ میں کیسے ڈوب سکتا ہوں؟ عالمگیر اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور اسی کو راجہ بنا دیا۔ اور بالغ ہونے تک وزیر کو

---

[1] ناامیدی بارش کے لئے سبب نہیں ہے۔

سرپرست مقرر کردیا۔ دیکھئے اس واقعہ میں تعلق اور وثوق وتوکل ظاہر کرنے سے یہ اثر ہوا حالانکہ یہ شاعرانہ نکتہ تھا اور حق تعالیٰ کے یہاں تو حقائق ہیں اور حقیقت میں وہ کیا عالمگیر تھے۔ حقیقی عالمگیر تو خدا تعالیٰ ہیں مگر اتنا معلوم ہوا کہ یہ عمل ہے کامیابی کا یعنی وثوق ظاہر کرنا پس تم بھی حسن ظن اور قوت رجاء کو اپنا نقد وقت رکھو پھر ثمرہ دیکھو۔

طریق دعاء

بدوی خوب دعا مانگتے ہیں۔ خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر دعا کرتے ہیں کہ مجھ کو بخش دے۔ پھر کہتے ہیں ضرور بخشے گا۔ کیوں نہیں بخشے گا۔ جیسے کوئی لڑتا ہے۔ یہ گمان نہ کرنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ اس سے ناراض ہوتے ہیں۔ بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ حدیث میں ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُلِحِیْنَ فِی الدُّعَآءِ کہ اللہ میاں دعاء میں الحاح کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ خود چاہتے ہیں کہ ہم سے کوئی لے۔ چنانچہ روزانہ شب کے وقت شہنشاہ حقیقی آسمان اول کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کوئی ہے ایسا اور کوئی ہے ایسا جو مانگے (**کذافی جمع الفوائد با وقت الدّعاَ عن الستة الانسائی**) آسمان دنیا چھت ہے۔ آپ کے گھر کی شہنشاہ حقیقی گویا آپ کے گھر تشریف لاتے ہیں۔ اس وقت یہ کیفیت ہوتی ہے شعر امروز شاہ شاہاں مہمان شدہ است مارا جبریل با ملائک دربان شدہ است مارا۔ کوئی کریم ایسا نہیں جو سائلوں کے گھر پر ان کی حاجات کو دریافت کرنے آئے۔ اگر ایک دن ایسا کرے بھی تو ہر روز نہیں کرسکتا۔ اور وہ ایسے کریم ہیں کہ ہر روز تشریف لاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جی ہی چاہتا ہے کہ کوئی سوال کرے اور لے۔ (جی میں نے مجازاً کہا جیسے **تعلم ما فی نفسی ولا اَعلم ما فی نفسک** میں ہے۔ ورنہ خدا تعالیٰ جی سے پاک ہیں مگر لینے کا بھی طریقہ ہوتا ہے کریم کو ناراض کر کے نہیں لیا جاتا۔ تو ان کو اپنی اطاعت سے بھی راضی رکھو۔

شانِ کریمی

اور ایک اور کرم دیکھئے کہ جس قدر بھی نیک کام ہیں وہ سب ہمارے ہی کام ہیں ان کا نفع ہمارے ہی لئے ہے وہ خدا تعالیٰ کے نفع کے کام نہیں۔ مگر بایں ہمہ پھر ان کو طلب کرتے ہیں اور نہ کرنے سے ناراض ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی آقا باورچی سے نارض ہو کہ تو نے کھایا کیوں نہیں۔ حالانکہ کھانا خود کام باورچی کا ہے اور اس کا نفع بھی اسی کو ہے۔ یہ غایت کرم کی دلیل

ہے۔ مثلاً نماز حقیقت میں ہمارا کام ہے اور اس کا نفع ہمارے ہی لئے ہے خدا تعالیٰ کو کوئی نفع نہیں۔ مگر پھر بھی ہمارے نہ کرنے پر ناراض ہوتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں پڑھی۔ یہ غایت کرم ہے اور اس کو حق تعالیٰ یعنی خدا تعالیٰ کا کام کہنا مجازاً ہے۔ ہمارے اعمال نہ کرنے پر خدا تعالیٰ کا ناراض ہونا خود دلیل رحمت کی ہے۔

مجھے بچپن میں گھی اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ اس کے کھانے میں میرا ہی نفع تھا، مگر پھر بھی میرے والد صاحب اس میں روٹی چور چور کر زبردستی مجھے کھلاتے یہی معاملہ اللہ میاں کا ہے کہ نماز مثلاً ا س کا کام نہیں ہمارا کام ہے۔ ہمارا ہی نفع ہے مگر پھر بھی حکم کرتے ہیں کہ کرو گویا زبردستی ہم کو نفع پہنچانا چاہتے ہیں حالانکہ ان کی کوئی غرض متعلق نہیں۔

زبردستی کھلانے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی وہ یہ کہ مراد آباد میں ایک صدر اعلیٰ میری دعوت کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کسی عذر سے انکار کیا تو انہوں نے میرے سامنے تفسیر کبیر رکھ دی اور کہا کہ اس مقام پر مجھے کچھ پوچھنا ہے۔ میں نے دیکھا تو اس جگہ دعوت کے مسائل تھے۔ میں نے کہا کہ آپ مجھ پر حجت قائم کر کے دعوت کرتے ہیں یہ کیا تہذیب ہے کہنے لگے کہ مجھے یہاں شبہ تھا۔ اس لئے یہ موقع کھولا ہے۔ ایک بزرگ مولوی روشن خان صاحب وہاں موجود تھے۔ میں نے اس امر کی ان سے شکایت کی مجھ سے کہنے لگے کہ خدا کا شکر کرو کہ لوگ تفسیر دکھلا دکھلا کر اور حجت قائم کر کر کے دعوت کھلاتے ہیں۔ میری کوئی دعوت کرے تو جلدی سے منظور کرلوں۔ یہ حکایت بطور لطیفہ کے بیان کی۔ خدا تعالیٰ کی کیسی رحمت ہے کہ اگر کوئی نہ لے تب بھی دیتے ہیں۔ جیسے دوا پینے میں مریض کا ہی نفع ہے اگر نہ پئے اور ہلاک ہو تو طبیب کا کچھ نہیں بگڑتا۔ مگر کوئی طبیب اگر ایسا شفیق ہو کہ اس کے دوا نہ پینے پر ناراض ہو اور کہے کہ تم نے دوا کیوں نہیں پی۔ تو یہ غایت درجہ اس کا کرم ہے۔ یہی حال حق تعالیٰ کا ہے کہ ہم اعمال کرنا نہیں چاہتے اور اپنے ہی حق میں کانٹے بوتے ہیں۔ مگر وہ زبردستی کرانا چاہتے ہیں اور اُدھر سے روزانہ طلب ہے کہ بندے ہم سے مانگیں۔

سبب امساکِ رحمت

حدیث میں ہے۔ مَنْ لَّمْ يَسْئَلِ اللّٰهِ يَغْضُبُ عَلَيْهِ

کہ جو اللہ میاں سے سوال نہ کرے تو اللہ میاں اس پر غصہ کرتے ہیں۔ مگر اب لوگوں نے یہ وتیرہ سیکھ لیا ہے کہ امساک باراں تو ہو رہا ہے۔ مگر نہ اعمال درست کرتے ہیں نہ موروثی زمین چھوڑتے ہیں نہ پرائی زمین دبا لینے کا کچھ خیال کرتے ہیں۔ نہ لڑکیوں کا حق دیتے ہیں وغیرہ

وغیرہ سب باتوں کو چھوڑ کر بس ایک بات اختیار کر رکھی ہے کہ سیر سیر بھر اناج جمع کیا اور روٹی پکائی اور بانٹ دی اور لینے والے کون آدھے کے تو مہتمم صاحب مالک اور باقی کے اپنے عزیز و نائی وغیرہ مساکین کے نام کا کچھ بھی نہیں۔ مثل مشہور ہے اندھا بانٹے شیرنی اپنے اپنوں کو دے

جھنجھانہ میں ایک شخص کے یہاں گیارہویں تھی۔ دس آدمیوں کی دعوت کی اور اس میں بلائے گئے کون ڈپٹی تحصیلدار، نائب تحصیلدار وغیرہ وغیرہ جب وہ کھانا کھا کر نکلے تو ایک شخص نے کہا کہ جس نے مساکین نہ دیکھے ہوں وہ ان کو دیکھ لے۔ اول تو آج کل لنگر کی یہ حقیقت ہے دوسرے اگر تسلیم بھی کرلیا جاوے کہ مستحقین ہی کو دیتے ہیں تو صرف اسی پر اکتفا کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ تاوقتیکہ پورا کام نہ ہو اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کسی کو دق کا مرض ہو کہ اس میں بخار تو ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ سینہ میں جلن بھی ہو۔ اور بھی عوارض لاحق ہوں۔ کوئی شخص جملہ تدابیر کو نظر انداز کر کے صرف سینہ پر صندل کا لیپ کردے تو کیا کہہ سکتے ہیں کہ اس کو پورا فائدہ ہوگا۔ ہاں سینہ کی سوزش کو نفع ہوگا۔ کامل نفع کی صورت تو یہ ہے کہ سینہ پر صندل کا لیپ ہو اور پینے کے لئے ایک نسخہ ہو کوئی مناسب روغن دماغ کی مالش کے واسطے ہو اور کوئی چیز تقویت کی غرض سے ہو۔

ہماری حالت تو یہ ہے۔ جیسے مولاناؒ نے مثنوی میں ایک حکایت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں

ہرچہ کردند از علاج و ازدوا ۔۔۔ رنج افزوں گشت و حاجت ناروا

ایک روحانی طبیب آیا اور اُس نے کہا

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند ۔۔۔ آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

بے خبر بود نداز حالِ دروں ۔۔۔ استعیذ باللہ مما یفترون

یادرکھو کہ نہ روٹی کھلانے سے کچھ ہوتا ہے نہ اناج بانٹنے سے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ عمل مبارک اور نیک نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ کافی نہیں ہے۔ سپاہی اور جرنیل فوج میں ہوتے ہیں مگر جرنیل اکیلا کچھ نہیں کرسکتا۔ صدقہ کو بھی ضرور دخل ہے۔ بارش میں مگر نرا کافی نہیں ہے۔ جب تک اس کے ساتھ دوسری چیزیں نہ ہوں۔ اصلی تدابیر امساک باراں کی اس کے سبب کا ازالہ ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کی ناراضی کا علاج کرنا۔ وہ علاج کیا ہے۔ ماضی سے استغفار اور توبہ اور آئندہ کے لئے اصلاح، اس کے بعد وعدہ ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ

اور حق تعالیٰ کا وعدہ خلاف نہیں ہوتا۔ اسی واسطے یہ مجمع ہوا ہے کہ نماز اور خطبہ ہو۔ پھر

استغفار وعزم اصلاح اور تضرع سے اُمید کے ساتھ دُعا ہو اور دل سے پورا یقین ہو۔ ملنے کا۔ حاکم کا یہ کہنا کہ مانگو دلیل ہے اجابت کی یہ کیوں شبہ کیا جاوے کہ نامعلوم حضور دیں گے بھی یا نہ دیں گے۔ اگر دیر بھی ہو جاوے تو اس میں بھی حکمت سمجھیں۔

شرطِ قبولیت دعا

اب دُعا کیجئے کہ ہم لوگوں کے قلب میں اخلاص اور حضور قلب پیدا ہو اور اس کی توفیق ہو فقط۔ اس کے بعد نماز اس کے بعد خطبہ اور دُعا ہوئی ہے۔ بعد ازاں حضرت والا نے تھوڑا بیان اور بھی فرمایا جو ذیل میں منقول ہے

ایک بات[۱] اور سُن لیجئے سب صاحب! وہ بات یہ ہے کہ اس وقت دعائیں مانگ کر بے فکر نہ ہونا چاہئے کہ ہم نے حق تعالیٰ کا پورا حق ادا کر دیا۔ گویا ان کے ذمہ قبول کرنا فرض ہو گیا۔ اب کسی چیز کی انتظار نہیں۔ یہ سخت غلطی ہے۔

صاحبو! دنیا میں اس کی مثال موجود ہے کہ حاکم کے یہاں ایک عرضی کافی نہیں سمجھی جاتی، خواہ کتنی خوشامد کی بھری ہوئی ہو۔ بلکہ عادۃً انتظار کیا کرتا ہے کہ اس کی خواہش سچی بھی ہے یا ایک دن محض مضمون نگاری کی ہو اور اگر شوق اور ضرورت ہے تو ایک عرضی پر بس نہیں کرتے۔ بلکہ عرضی پر عرضی دیتے ہیں کبھی تھکتے نہیں۔ حدیث میں ہے۔ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

انَّ اللّٰہ یستجیب ما لم یعجل قالو اوما العجلة قال ان یقول دعوت فلم یستجب لی او کمال قال ۔

یعنی اللہ میاں دعا کو قبول فرماتے ہیں جب تک جلدی نہ کرے۔ صحابہ نے عرض کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ جلدی کی حقیقت کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جلدی یہ ہے کہ دعا کی مقبولیت میں دیر ہوئی تو اس نے خیال کر لیا کہ دعا تو قبول ہوتی نہیں۔ اس لئے اس قصہ کو جانے ہی دو۔ دعا کرنا چھوڑ دی۔ اس لئے معلوم ہوا کہ شرط[۲] عادی عطا کی یہ ہے۔ جلدی نہ مچایئے۔ مانگے جایئے۔ اس لئے پانچوں نمازوں کے بعد بھی اسی عجز و زاری کے ساتھ مانگتے رہیں۔ تنگ نہ ہوں اور اپنے ہر عمل کو شرع کے موافق درست رکھیں۔

استعجال پر ایک قصہ یاد آیا۔ ایک شخص کو جو میرے ملاقاتی تھے ایک بغدادی بزرگ نے فراخی رزق کا عمل بتایا اور کہا کہ اس کے بعد ایک پری حسین آوے گی اور کچھ دے جاوے گی وہ

---

[۱] بیان بعد نماز و خطبہ و دعاء [۲] شرط عادی عطا کی جلدی نہ کرنا ہے۔ لوگوں کی ایک خراب حالت کا بیان

کہتے تھے کہ میں نے عمل پورا کیا۔ اور اس کے آنے کا منتظر رہا اور جب وہ نہ آئی تو اٹھ کر تھیٹر میں چلا گیا۔ میں نے مزاحاً کہا کہ وہ اسی وجہ سے نہ آئی کہ تم نے وظیفہ کے وقت نیکی اختیار نہیں کی تھی ہماری حالت بھی ایسی ہی ہے کہ یہاں تو تضرع وزاری کرتے ہیں اور وہاں جا کر معاصی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ہم کو اس قسم کے قصوں پر تو ہنسی آتی ہے مگر اپنے حالات پر ہنسی نہیں آتی۔ مثلاً ابھی جا کر کہیں گے کہ جیسے گئے تھے ویسے ہی آئے۔

صاحبو! اس کا عقلی یا نقلی ثبوت کیا ہے کہ نماز استسقا سے فوراً اسی وقت بارش ہو جاتی ہے۔ صاحب کلکٹر سے کوئی نہیں کہتا کہ ہم نے چار عرضیاں دیں کچھ جواب اب تک نہیں ملا۔ آپ دیں گے یا نہیں۔ بس برابر نمازوں کے بعد دعا کرتے رہو۔ یہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ ختم ہو جائے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کا تعلق تو ساری عمر کا ہے چاہے ان کی طرف سے کچھ ظاہر نہ ہو۔ تم اپنا انکسار مت چھوڑو۔ تاخیر میں بھی مصلحتیں ہوتی ہیں۔

رہا یہ سوال کہ پھر وہ مصلحتیں کیا ہیں تو آپ کوئی پارلیمنٹ کے ممبر نہیں کہ آپ کو وہ مصلحتیں بتلائی جائیں یا آپ رائے دیں کہ ابھی بارش ہونی چاہئے۔ چونکہ یہ اکثر ہوتا ہے کہ دعا مانگ کر بیٹھ گئے کہ میاں جب اس کی بھی شنوائی نہیں تو تو جانے بھی دو۔ اس لئے میں نے اس غلطی پر متنبہ کر دیا۔ یاد رکھو۔ اس وقت زیادہ اندیشہ ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کے غصہ کا۔ کیونکہ پہلے تو یہ لوگ سمجھتے تھے۔ کہ ہماری کوتاہی ہے۔ اب اس طرف کی کوتاہی کا خیال ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت بہت اندیشہ ناک ہے کیونکہ خدا تعالیٰ پر یہ الزام ہے جو عبودیت کے قطعاً خلاف ہے اس لئے ضروری ہے کہ برابر مانگتے رہو۔ وہ اگر چاہیں بالمعنی العرفی قبول کریں یا نہ قبول کریں تم اپنا منصبی کام پورا کرتے رہو کیونکہ بندہ کے لئے مناسب یہی ہے کہ ہمیشہ عجز وانکسار ظاہر کرتا رہے۔ اب دعا کرنا چاہئے۔ پس دعا ہوئی اور مجمع منتشر ہو گیا۔ فقط۔

نوٹ: اس کے بعد وعظ شکر العطاء کا ملاحظہ فرما لینا مناسب ہے۔

فقط

اشرف علی

۶ شعبان ۱۳۵۱ھ

اَلتعرف بالتصرف

التعرف بالتصرف سے موسوم وعظ ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ بروز منگل کو حضرت حکیم الامت کی اہلیہ صغریٰ صاحبہ کے مکان پر تین گھنٹہ تک کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب مرحوم نے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد مستورات کے علاوہ تقریباً چالیس تھی۔

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَ مَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ۔

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ .

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ! اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔

(بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا پھر عرش پر قائم ہوا وہ چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے آلیتی ہے اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اسکے حکم کے تابع ہیں یاد رکھو کہ اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حکم ہونا بڑی خوبیوں سے بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو تذلل ظاہر کر کے اور چپکے چپکے بھی البتہ یہ بات کہ اللہ تعالیٰ ناپسند کرتے ہیں جو حد سے نکل جائیں اور دنیا میں بعد اس کے کہ اسکی درستی کر دی گئی ہے فساد مت پھیلاؤ اور اس اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرو ڈرتے اور امید رکھتے ہوئے بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی رحمت قریب ہے نیک کام کرنے والوں سے)

تمہید: جن آیتوں کی اس وقت تلاوت کی گئی ہے ان میں مقصود بالبیان صرف ایک جزو ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ باقی آیات میں جو اس سے سابق ہیں وہ محض ربط کے لئے پڑھی گئی ہیں اور جو لاحق ہیں وہ تکمیل مضمون کے لئے تلاوت کی گئی ہیں۔ حاصل مضمون کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہر حال میں جو تعلق بندہ کا ہونا چاہئے ان آیات میں اس کا ذکر ہے اور یہ مضمون فی نفسہ ضروری بھی ہے اور آسان بھی بلکہ آسان گر بھی ہے کہ اُس پر عمل کرنے سے تمام دشواریاں سہل

اور تمام پریشانیاں زائل ہو جاتی ہیں۔اس لئے سبھی کو اس کی تعلیم دینا ضروری ہے۔خصوصاً جب کہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کی طرف سے عام طور پر غفلت ہے عوام کی تو وہاں تک نظر ہی نہیں جاتی۔لیکن خواص سے بھی توجہ اس میں بہت کوتاہی ہو رہی ہے۔

بات یہ ہے کہ جو تعلیم پرانی ہو جاتی ہے اُس کی طرف خواص کو بھی توجہ نہیں ہوتی تا عوام چہ رسد۔گو اس مضمون پر عقیدہ تو سب کا ہے جو آج بیان کیا جائے گا اور اعتقاد کی علامت یہ ہے کہ جس سے اس بیان تعلیم کو بیان کر کے پوچھا جائے گا کہ تم اس کو تسلیم کرتے ہو تو سب اس کو تسلیم کریں گے مگر اس کا استحضار نہیں ہے۔اور یہ بھی غنیمت ہے کہ بیان کے بعد اس کو تسلیم کر لیتے ہیں ورنہ بلا بودے اگر ایں ہم نبودے بیان کے بعد تسلیم کر لینا بھی اعتقاد کا ایک درجہ ہے گو دوسرا درجہ ہے جیسے جو شخص ایمان کی خود تفصیل نہ کر سکے۔اس کے ایمان میں علماء نے بحث کی ہے بعض نے تو تفصیل نہ کر سکنے والے کو کافر کہہ دیا ہے۔مگر محققین نے کہا ہے کہ اگر خود تفصیل نہ کر سکے لیکن تفصیل کو سن کر تصدیق و تسلیم کر لے وہ بھی مومن ہے۔

اس وقت جو مسئلہ میں بیان کرنا چاہتا ہوں اُس مسئلہ میں خواص کی وہ حالت ہے جو تفصیل ایمان میں عوام کی حالت ہے کہ جیسا اُن کو تفصیل ایمان متحضر نہیں۔مگر بعد بیان کے تسلیم کر لیتے ہیں۔اسی طرح علماء ظاہر کو یہ مسئلہ متحضر نہیں۔مگر بیان کے بعد تسلیم کر لیں گے۔ غرض اس کی طرف التفات نہ عوام کو ہے نہ خواص کو۔مگر ضروری ہونا سب کو مسلم ہے سو یہ بڑی کوتاہی ہے کہ ایک نہایت ضروری مسئلہ اور اس کی طرف التفات نہیں۔

اقرارِ تصرف

حاصل اس مسئلہ کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے تصرف و اختیار کا اقرار و استحضار رکھنا چاہئے اور ہر تصرف حق کے ساتھ راضی رہنا چاہئے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (خبردار خالق ہونا اور حاکم ہونا اسی کے لئے خاص ہے) میں اسی کا بیان ہے کیونکہ یہ قاعدہ ثابت ہو چکا ہے کہ کلام مفید میں خبر سے مقصود انشاء ہوتا ہے اخبار محض مقصود نہیں ہوتا۔جیسے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (کہہ دو کہ وہ اکیلا ہے) خبر ہے لیکن اس سے مقصود یہ ہے کہ تم اس کا اعتقاد رکھو۔اسی طرح اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے) سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خالق و حاکم با اختیار ہونے کا اعتقاد رکھو جس کا مقتضاء یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے جو تصرف بھی ہو اس کے ساتھ رضا متعلق رہے۔

اگر یہ مقتضاء ظاہر نہ ہوگا تو یہ عدم اعتقاد یا ضعف اعتقاد کی علامت ہے کیونکہ ہر اعتقاد کا ایک اثر ہے جس کا ترتب اعتقاد پر لازم ہے مثلاً اپنے باپ کے متعلق کے جو اعتقاد ابوت کا ہے

اُس کا ایک اثر ہے کہ اُس کی تعظیم وادب کو ملحوظ رکھا جائے اگر یہ اثر مرتب نہ ہوگا تو کہا جائے گا کہ یہ شخص باپ کو باپ نہیں سمجھتا۔ یا ابوت کے حقوق نہیں جانتا۔ اسی طرح اعتقاد خالقیت و آمریت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ہر تصرف حق کے ساتھ راضی رہے اور حق تعالیٰ پر اعتراض نہ کرے اگر یہ اثر مرتب نہ ہوا تو اعتقاد معدوم یا ضعیف ہوگا۔ اس تقریر سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس مضمون کا گو اعتقاد تو سب کو ہے مگر استحضار بہت کم لوگوں کو ہے کیونکہ ہر معاملہ میں ہر حالت میں اس کا استحضار کون کرتا ہے کہ یہ تصرف حق تعالیٰ کا ہے اس لئے مجھ کو اس پر راضی رہنا چاہئے بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض دفعہ بعض لوگوں کو کسی حالت یا کسی معاملے سے جو ناگواری ہوتی ہے اگر یہ ناگواری صرف اضطراری میں ہو تو یہاں تک بھی خیر ہے کیونکہ اس کو طبعی ناگواری پر محمول کیا جائے گا اور ناگوار سے طبعاً گرانی ہونا محل ملامت نہیں۔ لیکن غضب یہ ہے کہ بعض لوگوں کی ناگواری حد اعتراض کو پہنچ جاتی ہے جو اختیاری ہے یعنی وہ حق تعالیٰ پر اعتراض کرنے لگتے ہیں تو زبان سے کفریات بکنے لگتے ہیں۔ اور بعضے زبان سے تو کچھ نہیں کہتے۔ مگر دل میں خدا تعالیٰ پر اعتراض ہوتا ہے۔ دل کھول کر اللہ تعالیٰ کے ہر تصرف پر راضی نہیں ہوتے۔ اور یہ سخت مرض ہے کہ جس کی سرحد کفر سے ملی ہوئی ہے اس لئے یہ مضمون نہایت ضروری ہے اور اس پر التفات دائم اور استحضار دائم لازم ہے۔ کہ حق تعالیٰ کو ہر تصرف کا اختیار ہے۔ اور بندہ کو اُس پر راضی رہنا چاہئے۔

ہر چند کہ یہ بیان پہلے بھی ہوا ہے جیسا کہ یاد پڑتا ہے مگر پہلے اس کا بیان ضمناً ہوا ہے آج اس کا بیان قصداً ہوگا یعنی پہلے دو چیزوں کا بیان ہوا ہے ایک اپنی تجویز وارادہ کو فنا کر دینا یہ جزو تو مقصوداً بیان ہوا ہے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کی تجویز سے راضی رہنا یہ جزو ضمناً بیان ہوا ہے کیونکہ اپنی تجویز ورائے کے فنا کو یہ بات لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجویز کو مقدم سمجھے اور اس پر راضی رہے چونکہ یہ جزو پہلے جزو کو لازم تھا اس لئے استطراداً اس کا بیان بھی ہو گیا تھا۔ قصداً اس کا بیان نہ ہوا تھا۔

نیز پہلے بیان میں عنوان یہ تھا فنائے تجویز خود و رضا بتجویز حق اور آج دوسرا عنوان ہے۔ پہلا بیان بھی ضبط ہو چکا ہے صرف صاف ہونا اور طبع ہونا باقی ہے۔ اسباب مساعد ہوئے تو انشاء اللہ جلد سامنے آجائے گا۔

پریشانی کی اصل

میں نے پہلے بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ تمام پریشانیوں کی اصل یہی ہے کہ انسان اپنے لئے بعض احوال وکیفیات وغیرہ تجویز کر لیتا ہے کہ یوں ہونا چاہئے اور یہ تمام پریشانیوں کی جڑ اس واسطے ہے کہ یہ تجویز کرنے والا گویا اُس ذات مقدس پر حکومت کرنا چاہتا ہے جو اس کے قبضہ میں نہیں بلکہ یہ

تجویز کنندہ خود اُس کے قبضہ میں ہے، اسی لئے حق تعالیٰ نے اپنے تصرف واختیار کو قرآن میں صاف صاف بیان کر کے انسان کے اختیار کی صاف صاف نفی کردی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اَم لِلِا نسَانِ مَا تَمَنّٰی فَلِلّٰهِ الْاٰ خِرَةُ وَالْاُوْلٰی

(کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے پس خدا ہی کے اختیار میں ہے آخرت اور دنیا)

ایک مقام پر ارشاد ہے

وَ رَبُّکَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَ یَخْتَارُ، مَا کَانَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ، سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ.

(اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس حکم کو چاہتا ہے پسند کرتا ہے ان لوگوں کو تجویز احکام کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے)

ما كان لهم الخيرةُ میں صراحۃً اختیار عبد کی نفی ہے مگر یہاں اس اختیار کی نفی نہیں جو جبر کے مقابل ہے کیونکہ اس کے تو استعمال کا امر ہے بلکہ اس اختیار کی نفی ہے جس کے استعمال کی اجازت نہیں۔ جس کا عنوان ثانی تجویز ورائے ہے۔ مثلاً بیمار کے متعلق یہ تجویز کرنا کہ یہ اچھا ہی ہوجائے پھر اُس کے ظہور و قوع کا انتظار کرنا کہ کب اچھا ہوگا۔ پھر تاخیر صحت سے پریشانی اور کلفت کا بڑھنا اُس کی تو ممانعت ہے۔

اَم لِلِا نسَانِ مَا تَمَنّٰی فَلِلّٰهِ الْاٰ خِرَةُ وَالْاُوْلٰی

(کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے پس خدا ہی کے اختیار میں ہے آخرت اور دنیا)

میں اس تجویز کی جڑ کاٹی گئی ہے کہ دنیا و آخرت کے تمام واقعات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں تم کو ان میں تجویز کا کوئی نہیں اور تجویز کی علامت یہ ہے کہ اُس کے وقوع کا تقاضے کے ساتھ انتظار کیا جائے یعنی ایسا انتظار جس کی جانب مخالف کا تصور ناگوار ہو۔

حقیقت رجاء یہ اس واسطے کہا تا کہ یہ شبہ نہ ہو کہ میں انتظار الفرج بعد الشدۃ کی نفی کرتا ہوں سو خوب سمجھ لیجئے میں اس کی نفی کرتا کیونکہ یہ تو رجاء ہے بلکہ میں خاص انتظار کی نفی کرتا ہوں مثلاً کسی کا بچہ بیمار ہے تو اگر اس کو اس کی صحت کا ایسا انتظار ہے کہ اس کے نہ اچھا ہونے اور ہلاک ہونے کا تصور بھی ناپسند ہے تو یہ انتظار مذموم ہے اور وہ ناپسندیدگی یہ ہے کہ اس کی عدم صحت سے ناراض ہو اس پر اعتراض کرے اور اگر صحت وعدم صحت دونوں پر راضی ہو اور یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ جو کچھ بھی کریں گے وہ عین حکمت ہے مگر دل چاہتا ہے کہ اس کو صحت ہو جائے اور عدم صحت کے تصور یا وقوع سے رنج ہوتا ہے تو یہ حُزن ہے اور حُزن مذموم نہیں، حُزن تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہوا ہے مگر اس کے ساتھ رضا بھی ہوتی ہے حزن میں پریشانی اور ناراضی نہیں ہوتی۔ گو ظاہر میں ناگواری کی صورت ہو مگر دل میں ناراضی نہیں ہوتی۔ بلکہ رضا موجود ہوتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ڈاکٹر نے کسی شخص کا آپریشن بدوں کلورا فام سنگھائے کیا ہو تو یہ شخص نشتر لگنے سے روئے گا بھی چلائے گا بھی۔ ناک منہ بھی چڑھائے گا۔ مگر دل میں اندر سے نہایت خوش ہوگا۔ چنانچہ ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ اس مثال سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کراہت ظاہرہ کے ساتھ رضا مجتمع ہو سکتی ہے تو اس میں کراہت کی بھی نفی نہیں کرتا بلکہ میں صرف اس کراہت کی نفی کرتا ہوں جس کے ساتھ رضا مجتمع نہ ہو کہ دل میں بھی ناگواری ہو اور ظاہر میں بھی ناگواری ہو یہاں تک کہ اگر اس پر نسبت فعل الی اللہ منکشف ہو جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ سے بھی عداوت و شکایت ہونے لگے۔

اسی لئے ہمارے حاجی صاحب نے اس زمانہ میں مراقبہ توحید اصطلاحی سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس کے لئے محبت کاملہ کی ضرورت ہے جس سے محبوب کا ہر تصرف محبوب ہو جائے خواہ وہ تصرف ملائم طبع ہو یا ناملائم کیونکہ محبت کی یہ شان ہے کہ ؎

از محبت تلخہا شیریں شود

اور عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر بھی پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش ہے)

تیرا رنجیدہ کرنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے دل قربان ہے ایسے یار پر جو میرے دل کو رنجیدہ کرنیوالا ہے۔

مگر ایسی محبت آج کل کس میں ہے۔ بہت لوگ اس سے خالی ہیں۔ تو اس حالت میں اگر مراقبہ توحید اصطلاحی کیا گیا اور ہر فعل کو براہ راست بلا واسطہ اسباب حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھا گیا اور فعل ہے ناگوار تو فاعل سے بھی ضرور ناگواری ہوگی۔ اسی لئے جس شخص میں محبت حق نہ ہو صرف معرفت ہی ہو اس کا ایمان خطرہ میں ہے۔ بہرحال انتظار مذموم وہ ہے۔ جس کی شق مقابل نہ پسند ہو۔ اور اگر شق ثانی ناپسند نہ ہو۔ یہ انتظار مذموم نہیں بلکہ وہ انتظار ہی نہیں صرف رجاء یا خیال کا درجہ ہے۔

اور یہی تحقیق انتظار مذموم کی وہ بات ہے جو میں نے ایک بزرگ سے بہاولپور کے سفر میں عرض کی تھی اور وہ اس سے بہت خوش ہوئے اور مجھے دعائیں دیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ نے بہاولپور کے سفر میں مجھ سے فرمایا کہ مولوی رحیم بخش صاحب کی عادت ہے کہ جب ہم بہاولپور جاتے ہیں تو وہ کچھ ہدیہ دیا کرتے ہیں اور اس عادت کی وجہ سے پہلے سے کبھی یہ خیال بھی ہو جاتا ہے کہ وہ ہدیہ دیں گے۔ اب اس خیال کے بعد اُن کا یہ ہدیہ قبول کرنا اشراف و انتظار کی وجہ سے خلاف سنت تو نہیں۔ سبحان اللہ! یہ تدقیق اتباع سنت کی کیسے نصیب؟ یہ حضرت ہی کا کمال تھا ان کو اتنی دقیق

باتوں پر نظر تھی اور دوسرا کمال یہ تھا کہ اپنے چھوٹوں سے اشکال کا حل چاہا۔ میرا کیا رتبہ تھا کہ حضرت کے اشکال کو حل کرتا۔ مگر محض ارشاد کی وجہ سے جواب عرض کیا۔ اس جواب کا حاصل یہی تھا کہ میں نے کہا حضرت انتظار مذموم یہ ہے کہ اگر اس کے خلاف کا وقوع ہو تو اس سے رنج ہو۔ فرمایا یہ تو بحمد اللہ نہیں ہے اگر وہ عمر بھر بھی خدمت نہ کریں تو مطلق پرواہ نہیں ہوتی۔ میں نے عرض کیا پھر یہ اشراف نہیں بلکہ محض احتمال ہے اس پر مولانا بہت مسرور ہوئے اور اس تحقیق کو پسند فرمایا۔

طولِ امل

پس خوب سمجھ لیجئے کہ محض تصور و رجاء سے منع نہیں کیا جاتا ہے بلکہ تجویز ہندی سے منع کیا جاتا ہے جس کے خلاف سے رنج و ملال ہو جیسے شیخ چلی کی حکایت ہے واللہ اعلم یہ کوئی شخص ہے بھی یا نہیں جیسے بعض مورخین کا قول ہے کہ مُلّا دو پیازہ کوئی تاریخی شخص نہیں محض فرضی نام ہے کیونکہ تواریخ معتبرہ[1] میں اس کا ذکر نہیں پس میں شیخ چلی کے بارہ میں بھی اس کا جزم نہیں کرتا کہ آیا وہ تاریخی شخص ہے اور یہ حکایت جو تیل کا گھڑا اگر پڑنے کی عام زبانوں پر بیان کی جاتی ہے آیا واقعی حکایت ہے ممکن ہے فرضی قصہ ہو مگر کارآمد بات کے بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں (جیسے بعض حکماء نے پرندوں کی حکایات و اقوال بیان کئے ہیں) غرض شیخ چلی کی جو حکایت مشہور ہے یہ طول امل اور تجویز میں داخل ہے اسی سے منع کیا جاتا ہے۔

یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہوا ہو کہ محققین نے طول امل سے منع کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ طول امل علماء کے لئے مذموم نہیں مگر اُن کی مراد خاص طول امل ہے جو حقیقت میں طول امل نہیں صورۃً طول امل ہے یعنی جس طول امل سے ممانعت ہے وہ ہے جو دنیا کی ہوس کے لئے ہو اور جس کی اجازت علماء کے لئے ہے وہ وہ ہے جو خدمت دین کے لئے چنانچہ ابھی واضح ہوتا ہے یعنی وہ یہ ہے کہ عالم یہ خیال باندھے کہ میں طالب علموں کی تکمیل کروں گا۔ عوام کی اصلاح کروں گا۔ فلاں فلاں مسائل میں کتابیں لکھوں گا یہ کام مدتوں کے ہیں۔ ان کے متعلق حدیث النفس بظاہر طول امل ہے لیکن دین کے لئے ہے۔

اس پر اگر کوئی اشکال کرے کہ حدیث میں یہ استثناء کہ **الطول الامل من العلماء** کہاں ہے اور استثناء۔ بلا دلیل ایسا ہے جیسے مولانا شاہ عبدالغنی صاحب قدس سرہٗ کے یہاں درس

---

[1] یہ ایک قول ہے جو نقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک عزیز نے کسی انگریزی تاریخ سے ان کا پتہ لکھ کر دیا وہ پرچہ لکھ کر دیا وہ پرچہ اس وقت ملا نہیں ۱۲۔

حدیث میں جب بول آدمی کے نجس ہونے کی تحقیق ہوئی تو ایک بدعتی پنجابی طالب علم صاحب جلدی سے بولے۔ الا بول الاَوْلِیَاءِ کہ اولیاء کا پیشاب ناپاک نہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ نامعقول حدیث میں یہ استثناء کہاں ہے اور بہت دھمکایا۔ مگر وہ اپنا کام کر کے خاموش بیٹھے رہے۔ غرض علماء کے طول امل کو جائز کہنا اور حدیث سے اس کو مستثنیٰ کرنا کہیں ایسا تو نہیں جیسا اس بدعتی پنجابی نے بول الاولیاء کو مستثنیٰ کیا تھا۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس کو طول امل باعتبار ظاہر کے کہہ دیا گیا ہے ورنہ حقیقت میں یہ نیت عبادت کی ہے اور طول امل حقیقی کی اجازت کسی کو نہیں۔

اسی کے متعلق حدیث میں ہے۔

يَا عَبْدَ اللّٰهِ اِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْنِيْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ وَ اِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّ ثَنِيْ نَفْسَكَ بِا الصَّبَاحِ وَ عِدْ نَفْسَكَ مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ.

اے عبداللہ! جب صبح ہو تو شام کے متعلق اپنے دل میں کچھ تجویز نہ کرو اور جب شام ہو تو صبح کی کچھ فکر نہ کرو اور اپنے کو اصحاب قبور میں شمار کرو۔

مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا اسی حدیث کی تفسیر ہے مگر صوفیہ نے روایت بالمعنیٰ کے طور پر اس جملہ کو بھی حدیث کہہ دیا ہے یہ لفظ حدیث میں وارد نہیں۔ ہاں اس کے معنی حدیث میں موجود ہیں۔ اس حدیث سے طول امل کی ممانعت صاف معلوم ہو رہی ہے۔ بلکہ ایک دن کے لئے بھی تجویز کی اجازت نہیں طول امل تو بہت دور ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تدبیر کی بھی اجازت نہیں تدبیر تو ایک دن کیا بعض تدبیر ایک سال کے لئے بعض تدبیر صدیوں کے لئے بھی جائز ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کو سال بھر کا نفقہ ایک دم سے دیا ہے مگر اس تجویز کی اجازت نہیں کہ تم اپنے واسطے ایک شق ایک حالت معین کر کے رائے قائم کرلو کہ بس یوں ہونا چاہیے۔ اس کا تم کو کیا حق ہے کیا خدا تعالیٰ پر حکومت کرنا چاہتے ہو؟

طولِ امل کا اثر

یہ تو کلام تھا طول امل کی حقیقت کے متعلق اب اُس کے اثر و غایت میں غور کیجئے کہ اس طول امل کی جو غرض ہے یعنی ترقی اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص کو تو ترقی ہے اور پچاس کا ضرر ہے جس کی نسبت ایک میاں جی نے کہا تھا کہ سب روؤ۔ قصہ یہ ہوا کہ میاں جی ایک گاؤں میں کسی غریب زمیندار کے گھر ۲ روپے اور کھانے پر ملازم تھے وہ زمیندار تنگی معاش کے سبب

ملازمت کی فکر میں باہر چلا گیا اور بہت دنوں کے بعد اُس کا خط آیا کہ میری تنخواہ پانچ سو روپے ہوگئی ہے۔ یہ خط گھر میں سے بچہ کے ہاں میاں جی کے پاس بھیجا گیا کہ ذرہ دروازہ پر آ کر خط پڑھ دو کیا لکھا ہے سارے گاؤں میں خط پڑھنے والے وہی تھے میاں جی نے خط پڑھ کر رونا شروع کیا۔ زمیندار کی بیوی گھبرائی کہ خیر تو ہے کیا لکھا ہے۔ میاں جی کہا بتلاؤں گا تو بھی رو۔ وہ بھی رونے لگی۔ اس پر سارا گھر جمع ہوگیا اور یہ سوچ کر کہ کوئی غم کا قصہ ہے سب رونے لگے۔ یہ کہرام سُن کر محلّہ والے اکٹھے ہوگئے کہ کیا بات ہے میاں جی نے کہا بتلاؤں گا تم بھی رو۔ وہ بھی رونے لگے پھر ایک شخص نے کہا کہ بات تو بتلاؤ کیا لکھا ہے کہا خط میں یہ لکھا ہے کہ میری تنخواہ پانچ سو روپے ہوگئی ہے لوگوں نے کہا کمبخت یہ بات رونے کی تھی یا خوشی کی میاں جی نے کہا تم سمجھے نہیں یہ بات رونے ہی کی ہے۔ میرے لئے تو اس واسطے کہ اب وہ اتنی تنخواہ کے بعد اپنے بچوں کو انگریزی پڑھائیں گے کوئی قابل ماسٹر اُن کے واسطے بلائیں گے مجھے الگ کردیں گے اور بیوی کے لئے اس واسطے کہ اب وہ اس گاؤدہی بیوی سے کیا خوش ہوگا کوئی تعلیم یافتہ عورت ڈھونڈے گا۔ اس کو طلاق دے گا یا باندی بنا کر رکھے گا۔ اور تمہارے واسطے اس لئے کہ اب وہ بہت سا روپیہ لے کر آئے گا۔ اور اپنا مکان عالی شان بنائے گا جس کے لئے تمہارے مکانات خرید کر ان کو اصطبل اور بیٹھک میں شامل کرے گا۔ بتلاؤ یہ بات خوشی کی ہے یا رونے کی۔

واقعی میاں جی نے بات تو ٹھکانے کی کہی۔ جب کانپور میں مدرسہ بڑھنے لگا تو سچ یہ ہے۔ کہ محلّہ کے مکانات پر ہماری نظر تھی کہ یہ مکان بھی مدرسہ میں آجائے وہ بھی آجائے اور بعض مکانات کے لئے خریدنے کا پیام بھی دیا جو اہل مکان کو ناگوار گزرا۔ مگر پھر وہ مکان مدرسہ میں ہی آ گیا۔ یہ طول امل اس کا انجام ہے کہ ایک کی ترقی ہے اور دس آدمیوں کا ضرر ہے۔

لطافت شریعت

اور یہ وہ مرض ہے جو ہمارے ساتھ تمام معاملات میں لگا ہوا ہے اور اسی لئے پریشانی ہوتی ہے کیونکہ رنج خلاف توقع سے ہوتا ہے اگر آپ کو کسی سے یہ توقع ہو کہ میری تعظیم کرے گا۔ اس کے خلاف سے رنج ہوگا اور اگر توقع کچھ نہ ہو تو کچھ رنج نہ ہوگا۔ یہی تفویض کا حاصل ہے کہ تجویز وتوقع کو قطع کردیا جائے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمام فلاسفہ کی کتابیں چھان مارو۔ راحت کا جو طریق شریعت نے بتلایا ہے وہ کہیں نہ ملے گا۔ مگر شریعت سے تو لوگوں کو جاڑا چڑھتا ہے۔ حالانکہ اس کے حُسن کی یہ شان ہے

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　　کرشمہ دامن دل من می کشد جا اینجا است

(سر سے پاؤں تک (اول سے آخر تک) جس جگہ نظر کرتا ہوں میرے دل کا شوق دامن کھینچتا ہے کہ جگہ یہی ہے۔

مگر شریعت کا حسن سادگی کے ساتھ ہے بناوٹ کے ساتھ نہیں۔ اسی لئے سطحی نظر والوں کی نظر میں وہ نہیں آتا عارف فرماتے ہیں ۔

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند　　(ترجمہ) پھل والے درخت زیر بار ہوتے ہیں۔

اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد　　(ترجمہ) سرو بہت اچھا ہے

دلفریباں نباتی ہمہ زیور بستد　　　دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد

دل کو لبھانے والی نباتات　　　(جڑی بوٹیاں) تمام زیور پہنے ہیں۔

اور متنبی کہتا ہے ۔

حُسْنُ الْحِظَارَةِ مَجْلُوْبٌ بتطرِيَةٍ　　وَ فِی الْبَدَاوَةِ حُسْنٌ غَيْرُ مَجْلُوْبٍ

کہ قید غم سے آزاد ہے۔ میرا معشوق ہے کہ حسن خداداد رکھتا ہے

بناؤ سنگھار سے حسن پیدا کرنا تو بازریوں کا پیشہ ہے حُسن وہ ہے جو اس کا محتاج نہ ہو ۔

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست　بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

یار کا جمال (خوبصورتی) ہمارے ناکام عشق سے علیحدہ ہے　خوبصورت آدمی کے لئے خط و خال اور رنگ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

قدرتی حسین کو بناؤ سنگھار کی اصلاً احتیاج نہیں ہوتی وہ سادگی میں بھی عجیب دلربا ہوتا ہے اور اگر اس کے ساتھ کچھ زینت بھی ہو جائے تو نُورٌ علیٰ نُور ہے مگر ایسی زینت نہ ہو کہ سیر بھر کے کڑے پیروں میں ہوں بلکہ وہ بھی لطیف ہو۔ تو شریعت مقدسہ میں حسین اصلی کے ساتھ زینت بھی ہے۔ مگر لطیف غرض اس کا حسن بھی لطیف ہے اور زینت بھی لطیف ہے جس کو اہل لطافت ہی ادراک کرتے ہیں۔ بھدی طبیعتوں کو اگر اس کا ادراک نہ ہو تو ان کی ایسی مثال ہے جیسے مولانا محمد یعقوب صاحب سے میں نے حکایت سنی ہے کہ شیخ نہال احمد صاحب رئیس دیوبند کی تقریب شادی میں اُن کے والد شیخ کرامت حسین نے مہمانوں کو پلاؤ زردہ فیرینی کھلایا کچھ رعایا کے چمار بھی بیگار میں آئے تھے۔ اُن کو بھی دینے کا حکم دیا۔ وہ لوگ گڑ کے کھانے والے اُن کو زردہ کی کیا قدر ہوتی۔ مگر خیر ناک منہ چڑھا کر زردہ تو کھالیا۔ لیکن جب فیرینی کھانے لگے تو اُن سے نہ رہا گیا۔ کہنے لگے یہ

تھوک سا ئے ہے (کیا ہے ۱۲) پہلے لوگ کمینوں کو بھی وہی کھانا کھلاتے تھے جو خود کھاتے تھے۔ اُن کے واسطے الگ کھانا نہیں پکتا تھا جیسا کہ آج کل کے بعض رؤسا کا دستور ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی تو کمینوں کو کمین بھی نہ کہتے تھے۔ بلکہ متعلقین کا لفظ فرمایا کرتے تھے کہ متعلقین کو کھانا کھلادو۔ متعلقین کو غلہ دیدو۔ یہ اسلامی تہذیب ہے کیونکہ اپنے سے چھوٹے کو ذلیل کرنا اور ذلیل لقب سے یاد کرنا اس کا دل توڑنا ہے آدمی سب ایک باپ ماں کی اولاد ہیں۔ معزز وہ ہے جو خدا کے یہاں معزز ہو۔ اور ذلیل وہ ہے جو خدا کے یہاں ذلیل ہو ہم کو کسی کے ذلیل کرنے کا کیا حق ہے۔ کیا خبر انجام کس کا کیسا ہے۔ باقی امور انتظامیہ میں فرق یہ اور بات ہے یہ گفتگو درمیان میں آ گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ چماروں نے فیرینی کو تھوک سا بتلایا تھا کیونکہ وہ بھدی طبیعت کے تھے۔ اُن کو لطیف غذاؤں کی لطافت کیا معلوم ہوتی۔ اسی طرح شریعت کی لطافت کے ادراک کو لطیف دماغ کی ضرورت ہے۔ بھدے لوگ شریعت کی لطافت کو کیا سمجھیں۔ واللہ شریعت نہایت حسین ہے تم اس سے گھبراؤ نہیں۔ شریعت کے برابر کوئی تعلیم حسین نہیں۔

تجویز وتفویض

میں آج کل کے محاورہ کے موافق چیلنج دیتا ہوں کہ تلخی کا شیریں کرنے والا بجز منزل وحی یا من منزل علیہ الوحی کے کوئی نہیں۔ اور واقع میں تو یہاں بھی حق تعالیٰ ہی فاعل ہیں مگر بظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کے سوا کوئی ایسی تعلیم نہیں کر سکتا جو تلخ کو شیریں کر دیں اور وہ تعلیم تفویض ہے کہ اپنے کو خدا کے سپرد کر دے اور اپنے لئے کوئی حالت خود تجویز نہ کرے میں ناگواری کی نفی نہیں کرتا کہ تفویض کے بعد ناگواری پیش نہ آئے گی بلکہ اس کا اثبات کرتا ہوں کیونکہ اس سے میرا مقصود زیادہ عجیب ہو جاتا ہے کہ ناگواری بھی پیش آئے گی۔ مگر اُس کا اثر ظاہر ہوگا بلکہ عین تلخی میں شیرینی ولذت ہوگی۔ یہ وہ مضمون ہے جو پہلے بیان نہیں ہوا پہلے (ایک وعظ میں) یہ مضمون بیان ہوا تھا کہ اپنی تجویز کو فنا کر دو۔ اور اس کے لئے تفویض لازم نہیں کیونکہ فنائے تجویز وتفویض میں جانبین سے تلازم نہیں بلکہ تفویض الی الحق کے لئے تو فناء تجویز لازم ہے مگر فنائے تجویز کے لئے تفویض الی الحق لازم نہیں کیونکہ احتمال تفویض الی الغیر کا بھی ہے گو یہ احتمال طالب حق میں ضعیف ہے کیونکہ فنائے ارادہ وفنائے تجویز احتراز عن الشرک کے لئے کیا جاتا ہے اور جو شخص شرک سے بچنے کے لئے اپنے ارادہ وتجویز کو فناء کر دے گا وہ غیر حق کی طرف تفویض کیسے کرے گا۔ کیونکہ تفویض الی الغیر تو شرک ہے۔ غرض ہر چند کہ تحقیق کے اعتبار

سے یہ احتمال ضعیف ہے مگر نفس مفہوم کے اعتبار سے احتمال تو ہے۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ طرفین سے لزوم نہیں صرف ایک طرف سے لزوم ہے پس اگر میں اولاً تفویض کا بیان مقصوداً کر چکتا تو اس کے بعد قطع تجویز وفنائے ارادہ کا بیان نہ کرتا۔ لیکن پہلے قطع تجویز وفنائے ارادہ کا بیان ہوا ہے اور اس کے لئے تفویض لازم نہیں اس لئے آج تفویض کا بیان قصداً کرتا ہوں۔

اور اس تفویض کی ضرورت کا اعتقاد تو سب کو ہے مگر اعتقاد کا ثمرہ تو مطلق دخولِ جنت ہے گو آخر ہی میں ہو۔ باقی ایک ثمرہ تفویض کا جو عاجلہ بھی ہے یعنی دنیا میں راحت حاصل ہونا اور با اعتبار آخرت کے کاملہ بھی ہے وہ محض اعتقاد سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لئے استحضارِ دائم کی ضرورت ہے اور اسی کا بیان اس وقت مقصود ہے۔

تفویض بغرضِ راحت

پھر اہل تفویض میں بھی دو فرقے ہیں ایک وہ جو صاحب تفویض اس لئے ہیں تاکہ راحت حاصل ہو۔ اور چونکہ راحت ایک دنیوی مقصود ہے اس لئے ان کی مثالیں کاملین کے سامنے جن کا ذکر عنقریب آتا ہے۔ ایسے ہے جیسے ایک دیہاتی کو کسی مولوی صاحب نے نماز کی تاکید کردی تھی وہ نماز پڑھنے لگا۔ مولوی صاحب کا جو دوبارہ گزر ہوا اس سے پوچھا کہ نماز جاری ہے یا چھوڑ دیا۔ کہا اللہ تیرا بھلا کرے تو نے بڑا اچھا نسخہ بتایا یار مجھے بادی پھولنے کا مرض تھا جو بہت ستاوے تھا۔ اب جب سے نواج (نماز) شروع کی ہے جب ہی (سجدہ میں مونڈھا (اوندھا) پڑوں جب ہی بادی تکڑے (نکلے) بھلا پھر میں نماز کو کیوں چھوڑتا۔ (اس حکایت پر سب لوگ ہنسنے لگے فرمایا کہ) جیسے اس دیہاتی پر آپ لوگ سب ہنستے ہیں ایسے ہی کاملین ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو محض راحت کی غرض سے تفویض اختیار کرتے ہیں۔

حضرت منصورؒ حالانکہ کاملین سے نہیں۔ کیونکہ کمال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ حالت ہو جو شخص جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہوگا۔ اتنا ہی کامل ہوگا اور حضرت منصورؒ پر احوال ومواجید کا غلبہ تھا۔ اور غلبہ حال میں خلاف سنت اقوال اُن سے صادر ہوئے۔ گو یہ معذور تھے۔

چنانچہ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ارشاد ہے کہ منصورؒ ایک ورطہٗ میں تھا۔ افسوس کسی نے اس کی دستگیری نہ کی۔ اگر میں اس وقت ہوتا تو اس ورطہ سے نکال دیتا اور ہمارے سلسلہ کے بزرگ شیخ عبدالحق ردولویؒ کا مقولہ ہے کہ منصورؒ بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد۔ ایں جا مردانند کہ دریاہا فروبُردہ اند و آروغے نہ زدند (منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ میں اچھل پڑا یہاں ایسے لوگ

ہیں کہ دریا پی گئے اور ڈکار تک نہ لی) بہر حال گو یہ کامل نہیں مگر اہل طریق سے ہیں۔ انہوں نے ایک سالک سے پوچھا۔ کس شغل میں ہو کہا مقام توکل کی تصحیح کر رہا ہوں۔ فرمایا کہ ساری عمر پیٹ ہی کے دھندے میں رہے۔ فَاَیْنَ الْمُحَبَّۃُ یعنی محبت کا وقت کب آئے گا۔ توکل کے قبل تو کھانے کمانے اور پیٹ بھرنے کی فکر تھی۔ اور اب فکر بطن سے قطع نظر کی فکر ہے یہ بھی فکر بطن ہی ہو۔ گو بصورت اثبات نہیں بصورت نفی سہی۔ غرض جس طرح یہ فکر مجذوب تصحیح توکل کو پیٹ کا دھندا بتلاتے ہیں اسی طرح محققین تفویض بغرض راحت کو دنیائے محض کہتے ہیں۔

کمال عبدیت

دوسرا فرقہ محققین کا ہے جو تفویض کے طالب محض اس لئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ حقوق بندہ پر ہیں منجملہ ان کے یہ حق بھی ہے کہ بندہ اپنے ارادہ اور تجویز کو ان کے ارادہ اور تجویز کو فناء کردے اُن کو محض عبدیت مطلوب ہے اور حق الوہیت کا ادا کرنا یہی عبدیت ہے اور کمال عبدیت یہ ہے کہ بندہ اپنے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے۔ واقعی اُن کا وظیفہ ہر حالت میں یہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ جو تصرف اُن کے اندر کریں اس پر راضی رہیں۔ میں کیا عرض کروں کہ اس سے کیسی راحت ہوتی ہے جہاں اس کا تصور ہوا کہ یہ تصرف حق ہے بس برف سا دل پر رکھا جاتا ہے۔

حضرت! یہ تو بندہ کے اختیار میں نہیں کہ اس کو ناگوار امور پیش نہ آئیں مگر ناگوار کو گوارا بنا دینا تو اس کے لئے ممکن ہے۔ سالکین کو بہت سی سخت حالتیں پیش آتی ہیں۔ بعض ناگوار امور بھی اُن کو طریق میں پیش آتے ہیں۔

تکمیل تام

چنانچہ ایک مشترک ناگواری کا مثال کے طور پر ذکر کرتا ہوں وہ یہ کہ ہر شخص اپنی حالت کو ٹٹول کر دیکھ لے کہ تکمیل تام کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ حالانکہ ہر شخص تکمیل تام کا طالب ہے ہاں اکثر کو کسی خاص خاص بات میں کمال حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص کو حب مال سے نجات حاصل ہوگئی اور زہد میں کمال ہو گیا۔ مگر اہل وعیال کی محبت میں مبتلا ہے۔ تو اس کا کمال ایسا ہوگا۔ جیسے ایک شخص معقول میں کامل ہے۔ مگر فقہ وحدیث سے کورا ہے۔ تو اس کا کمال کنزالدقائق پڑھاتے ہوئے کھل جائے گا۔ وہاں مُسْتَحَبُّهُ التَّيَامُنُ کی تفسیر میں یہ کہے گا کہ وضو میں اٰمَنْتُ باللہ (میں اللہ پر ایمان لایا) کہنا مستحب ہے اور حدیث پڑھاتے ہوئے عبدالرحمٰن بن

عوف کے قصہ نکاح میں رَاٰی عَلَیْهِ اَثَرُ الصُّفْرَةِ کی تفسیر میں یہ کہے گا کہ مبالغہ فی الجماع کی وجہ سے چہرہ پر زردی آ گئی تھی۔ میں نے دوسرا قصہ مولانا محمود حسین صاحب سے اور پہلا قصہ ایک اور راوی سے سُنا تھا کہ کسی معقولی نے اس کی یہی تفسیر کی تھی اور اس کے برعکس اگر منقولی معقول پڑھائے گا تو وہ قطبی میں تصدیق کے متعلق امام رازی کے مذہب کی نقل میں قال الامام سے امام ابوحنیفہؒ مراد لے گا تو کمال یہ نہیں کہ ایک ہی عضو حسین ہو بلکہ حسن یہ ہے کہ مجموعہ حسین ہو ورنہ اگر کوئی حسین ہوا کوئی غیر حسین تو اہل معقول کے قاعدہ پر تو مرکب حسین وقبیح سے قبیح ہی ہے۔

اس بات پر ابھی ہفتہ عشرہ ہی میں تنبہ ہوا ہے کہ بعض ملکات کے کامل ہونے کا نام کمال نہیں بلکہ کمال یہ ہے کہ سب ملکات کامل ہوں چونکہ یہ بات بڑی قابل قدر ہے اور علم عظیم ہے اس لئے میں دوستوں کو اس پر تنبیہ کرتا ہوں کیونکہ اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں کہ چند ملکات کے کمال کو کمال سمجھ لیتے ہیں۔

مثلاً میرے اندر بحمد اللہ تعلق مع المال اس حیثیت سے تو کم ہے کہ مجھے تحصیل مال کی زیادہ فکر نہیں اس سے میں سمجھتا تھا کہ مجھے مال کی محبت نہیں ہے مگر بعض دفعہ یہ بات دیکھی کہ اگر باوجود احتیاط کے کچھ مالی نقصان ہوگیا تو زیادہ قلق نہیں ہوا۔ لیکن اگر بے احتیاطی سے کچھ نقصان ہوگیا تو قلق زیادہ ہوتا تھا۔ ایک دن مجھے اس پر تنبہ ہوا کہ یہ تو ناقص حالت ہے۔ آخر نقد مال پر اتنا زیادہ قلق کیوں ہے۔ اس وقت جو کچھ میرے دل پر حالت گزری کچھ نہ پوچھئے اور اس مرض کے علاج کی فکر ہوئی کہ اس قلق کا علاج ہونا چاہئے بس فوراً ہی قلب پر اس قلق کا علاج وارد ہوا الہام کا لفظ تو بڑا لفظ ہے میں اس کا دعویٰ نہیں کرتا ہاں ورود کہتا ہوں کہ اس وقت یہ علاج وارد ہوا کہ یہ بھی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ بے احتیاطی کی حالت میں یہ نقصان ہوگیا بس یہ تصور کرنا تھا کہ ایک ہی جلسہ میں مرض کی اصلاح ہوگئی اور وہ جو زیادہ قلق ہوتا تھا۔ معاً جاتا رہا۔

اس کے بعد یہ قلق ہوا کہ ہائے ہم اب تک ناقص ہی رہے اس کا علاج بھی اسی وارد سے کیا کہ یہ بھی تصرف حق ہے اس پر بھی راضی رہنا چاہئے۔ اس سے دوسرا قلق بھی جاتا رہا۔ اب بتلایئے اس علاج کی ضرورت ہر شخص کو ہے یا نہیں کیونکہ پورا کمال کس کو حاصل ہے کسی نہ کسی وقت کسی شعبہ میں نقصان کا ضرور مشاہدہ ہوگا پھر اس پر قلق بھی ہوگا اگر اللہ تعالیٰ دستگیری نہ فرماتے تو نہ معلوم اس قلق کا نتیجہ کیا ہوتا مگر فوراً ہی اس وارد نے دل پر برف سا رکھ دیا اب تم ہر ناگوار امر میں اس تصور سے کام لو، انشاء اللہ بہت نفع ہوگا۔

مراقبہ تقدیر

شایدکوئی یہ کہے کہ پھرازالۂ نقص کی تدبیرہی کی کیا ضرورت ہے مجاہدہ وریاضت کی کیا حاجت ہے بس جیسا خدا نے ملکہ دیدیا اسی پرراضی رہنا چاہئے۔ تکبردیا تواس پرراضی، بخل دیا ہوتواس پرخوش، کیونکہ تصرف حق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ترک تدبیرکوتم کواجازت نہیں تم تدبیر کے مامور ہواس لئے تدبیرواجب ہے ہاں تدبیر کے بعد بھی اگرنقص رہے گا تو یہ بھی تصرف حق ہے اس پرراضی رہو۔

اور یہاں سے یہ شبہ بھی رفع ہوگیا کہ کوئی یوں کہتا کہ گناہوں پربھی راضی رہنا چاہئے کیونکہ یہ بھی تصرف حق ہے اورموافقت کی تقدیرکی۔ توسمجھ لوکہ عین گناہ کے وقت یا گناہ سے پہلے عزم کے وقت اس تصور سے کام نہیں لے سکتے کیونکہ تم کوابھی سے کیا خبر ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمہارے واسطے یہ تصرف مقدر کیا ہے کہ فلاں گناہ کروگے نیز جس وقت تم گناہ کرتے ہواس وقت وقت موافقت تقدیرکی نیت کب ہوتی ہے۔ اس وقت تو اپنی خواہش کا پورا کرنا مقصود ہوتا ہے کیونکہ قبل از وقوع تقدیرکی خبرکس کو ہے یہی جواب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو دیا تھا (ذکرہ بعض اہل الفریق) جب کہ شیطان نے کہا کہ آپ نے تومیرا سجدہ نہ کرنا مقدرہی کیا تھا تو اگر میں نے اس تقدیر کے موافق سجدہ نہ کیا تو مجھ پرلعنت وغضب کیوں ہوا وہاں سے ارشاد ہوا کہ کمبخت موافقت تقدیرکا علم تو بعدوقوع کے تجھ کوہوا وقوع کے وقت تو تو نے اس کا قصد نہیں کیا۔ بہرحال گناہ کے وقت اس مراقبہ سے کام نہیں لے سکتے ہاں گناہ ہوجانے کے بعدتوبہ نصوح کرکے بھی جب قلق زائل نہ ہواوراس قلق سے تعطل فی الاعمال کا اندیشہ ہوتواس وقت اس مراقبہ سے کام لواورزیادہ قلق میں نہ پڑو۔

یہ طریقہ ہے اس نسخہ کے استعمال کا طریقہ علاج تو صاف وصریح ہے۔ مگرکوئی قصداً اہی اُلٹا علاج کرنا چاہے تو وہ جانے جیسے میرٹھ میں ایک دیہاتی رئیس ایک شہری رئیس سے ملنے آئے اُن کے سامنے بڑا قیمتی عطرپیش کیا گیا تواس دیہاتی رئیس نے عطرکو چاٹ لیا تو ایسے عقلمندوں کا توکوئی علاج ہی نہیں۔ بہرحال یہ مراقبہ نہایت ضروری ہے اس پر دوام رکھو انشاء اللہ سب پریشانیوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ مگر دوام شرط ہے یعنی کسی وقت اس سے غافل نہ ہو۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

ترجمہ: اس بادشاہ (یعنی اللہ) سے تھوڑی دیر کے لئے بھی غافل نہیں رہنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تیری طرف متوجہ ہواور تجھ کوخبر نہ ہو۔

ہرآنکہ غافل ازحق یک زماں ست دراندم کافرست امانہاں ست

اللہ سے جوشخص تھوڑی دیر کے لئے غافل ہوجائے اس وقت وہ اندرونی طورپرکافر (نافرماں) ہے۔

دوام تفویض

شاید کوئی کہے کہ یہ تو بہت مشکل ہے تو سمجھ لیجئے کہ دوام کی تفسیر میں جو ہر وقت کا مفہوم ہے یہ استغراق ہر چیز میں جدا ہے پس ہر چیز کا دوام جدا جدا ہوا۔ بعض امور کا دوام تو اسی طرح ہوتا ہے۔ کہ کسی وقت غافل نہ ہو ہر وقت استحضار رہے۔ جیسے علم حضور میں ۔ اور بعض امور کا دوام یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ پیش آیا۔ اُس وقت اُس کا استحضار کر لیا۔ چنانچہ اس مراقبہ کے لئے یہی دوام مطلوب ہے کہ جب کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے اس وقت اُس کو فوراً حاضر فی الذہن کر لیا جائے کہ یہ حق تعالٰی کا تصرف ہے اور ایک قسم دوام کی یہ ہے کہ بعد حصول وعزم عدم ترک کے اُس کی ضد کا ارادہ نہ ہو۔ جیسے ایمان کا دوام یہی ہے کہ قلب ارادۂ کفر سے خالی ہو۔ بس جب تک کفر کا ارادہ نہ ہوگا۔ اُس وقت تک ایمان باقی ہے۔ اور اُس کو دوام حاصل ہے گو یہ شخص سو رہا ہو یا دُنیا کے کاروبار میں مشغول ہو کہ ایمان کی طرف التفات بھی نہ ہو۔ مگر یہ سوتے ہوئے اور چلتے پھرتے دکانداری کی باتیں کرتے ہوئے۔ ہر حال میں مؤمن ہے جیسے مشی فعل اختیاری ہے اور ہر قدم کی تحریک فعل اختیاری ہے لیکن باوجود مشاہد ہے کہ ہر قدم پر قصد نہیں ہوتا اور مشی کا وقوع ہوتا رہتا ہے۔ سو یہاں بھی وہی اصل ہے کہ شروع ہی میں تحصیل مشی و عدم توقف کا قصد کر لیا وہی ختم مشی تک حصول مقصود کے لئے کافی ہوگیا۔ چنانچہ ہم چلتے ہوئے باتیں بھی کرتے رہتے ہیں ۔ اخبار بھی دیکھتے رہتے ہیں اور مشی بھی برابر جاری ہے۔ بہرحال ہر شئے کا دوام جُدا ہے ۔ پس تفویض کا دوام یہ ہے کہ ضرورت کے وقت اس کا استحضار ہو جاوے لیکن تجربہ سے ثابت ہے کہ یہ وقت ضرورت پر استحضار ہو جاتا۔ اس کا حصول بھی اس پر موقوف ہے کہ چند روز ہر وقت اس کا استحضار اور مراقبہ رہے اور بدوں اس کے رسوخ نہیں ہوتا اور بدوں رسوخ وقت پر بھی استحضار نہیں ہوتا۔

اب رہا یہ سوال کہ جتنی مدت تک یہ مراقبہ ہر وقت کا رہے گا۔ اس مدت میں دوسرے کام کیسے ہوں گے۔ کیونکہ دوسرے کام بھی توجہ پر موقوف ہیں تو دو طرف کیسے توجہ ہوگی ۔ جواب یہ ہے کہ بتکلف سے ایسا ہونا ممکن ہے اور حکماء کا قول کہ دو طرف توجہ نہیں ہوتی ماؤل ہے کہ سہولت سے نہیں ہوتی ورنہ وہ قول غلط ہے اور اس قول پر کوئی دلیل نہیں۔ جس کو شک ہو وہ اس کو شروع کر کے دیکھے خود اس کے امکان اور وقوع سب کو مان لے گا۔ باقی جو لوگ بدوں کام شروع کئے اس کو محال کہنے لگتے ہیں اُن کو یہی جواب دیا جائے گا کہ ذرا کر کے تو دیکھو بہرحال استحضار دائم بالمعنی الاخیر چند روز اس لئے مطلوب ہے تا کہ اُس سے اصل مطلوب سہولت کے ساتھ حاصل ہو جائے باقی اصل مطلوب یہی ہے کہ جب کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے۔ اُس وقت اس کا استحضار کر لو اور اگر کوئی شخص ہمت کر کے اس پر قدرت حاصل کر لے کہ ہر ناگوار واقعہ کے ساتھ ساتھ اس کو حاضر فی الذہن کر لیا کرے تو اُس کو استحضار دائم کی

بھی ضرورت نہیں یہی کافی ہے کہ ضرورت کے وقت استحضار کرلیا کرے۔ پھر اس استحضار کے بعد ایک ناگوار واقعہ سے دوسرے ناگوار واقعہ تک اس کی برکات مستمر رہیں گی اور ثواب بھی دوام کا حاصل ہوگا کیونکہ اس کا یہی دوام ہے اور جب عمل دائم ہے تو اجر بھی دائم ہوگا۔

قلب کی نگہداشت

پھر اس میں یہ مت دیکھو کہ واقعہ چھوٹا ہے یا بڑا۔ بلکہ ہر واقعہ میں استحضار کو لازم کرلو۔ اور واقعات دو قسم کے ہیں گوارا اور ناگوار۔ یہ مراقبہ جو اس وقت بیان کیا جارہا ہے ناگوار واقعات کے متعلق ہے اور گوارا واقعات کے متعلق دوسری تعلیم ہے یعنی شکر کی تعلیم۔ اُس کو میں اس وقت بیان نہیں کرتا۔ اُس کا بیان پھر کبھی ہو جائے گا (خدا کرے یاد رہے) سارے سبق ایک ہی دن میں پڑھا دیئے گئے تو اندیشہ ہے کہ پہلا سبق بھی نہ بھول جاؤ۔

اگر کوئی بچہ کئی سورتیں ایک دم سے حفظ کرتا ہے تو اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک آیت الحمد کی یاد رہے گی۔ ایک **قل ھو اللّٰہ** کی ایک **قل یاَیھا الکفرون** کی۔ حفظ کا طریقہ یہی ہے کہ ایک ایک سورت کو الگ الگ محفوظ کیا جائے۔ اس لئے ہمارے حاجی صاحبؒ نے لطائف ستہ کی مشق کو نافع نہیں فرمایا۔ کیونکہ ایک لطیفہ کو ذاکر بناتا ہے تو دوسرا غیر ذاکر ہو جاتا ہے پھر دوسرے کو لیا تو پہلا غافل ہو جاتا ہے۔ اور ایک دم سے سب کو لیا گیا تو ہر ایک ناقص رہتا ہے پھر اس میں تشتت بھی ہے جو جمعیت کے منافی ہے ہمارے حاجی صاحبؒ صرف لطیفۂ قلب کی نگہداشت کا امر فرمایا کرتے تھے اور یہی اوفق بالسنۃ ہے۔ حدیث و قرآن میں قلب کا ہی ذکر ہے باقی لطائف کا ذکر نہیں ہے۔ دوسرے اہل کشف کی تحقیق یہ ہے کہ یہ لطائف مثل مرایا متقابلہ کے ہیں جو چیز ایک میں مرتسم ہوتی ہے وہ بوجہ انعکاس کے سب میں مرتسم ہو جاتی ہے۔ اس لئے حضرتؒ فرماتے تھے کہ قلب کو ذاکر بنالو بقیہ لطائف خود بخود ذاکر ہو جائیں گے اُن کی مشق کی مستقل ضرورت نہیں ایک کے منور ہونے سے دوسرے بھی منور ہو جائیں گے۔ اس کی دلیل حدیث میں بھی ہے جو قلب کے باب میں ہے۔

اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ (جب وہ درست ہو جاتا ہے تو سارا بدن صحیح ہو جاتا ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ اصلاح قلب سے تمام جسد کی اصلاح ہو جاتی ہے اور لطائف بھی جسد ہی سے متعلق ہیں جن کا اثر افعال جسد ہی پر پڑتا ہے۔

اور یہاں سے ایک مستقل فائدہ سمجھ لینے کے قابل ہے کہ لطائف ستہ کا وجود کشفی ہے اہل کشف کو یہ لطائف مکشوف ہوئے ہیں۔ نصوص میں ان کا کہیں ذکر نہیں نصوص میں صرف نفس و قلب کا ذکر ہے مگر بعض مدعیان تصوف نے صوفیہ کو بدنام کرنے کے لئے قرآن سے تمام لطائف کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ایک مدعی نے **اِنَّهٗ یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی** (پ

شک وہ ظاہر و باطن کو خوب جانتے ہیں)

سے استدلال کر کے کہا ہے کہ لطائف کا ذکر قرآن میں موجود ہے اور اس آیت میں کہا ہے کہ لطیفہ سر اور لطیفہ اخفیٰ مراد ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تیسرا سِرّ مراد ہے یہ تو ایسا استدلال ہے جیسا کہ ایک آج کل کے جاہل نے کہا ہے کہ عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (اُمید ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب آپ کو مقام محمود میں جگہ دے گا)

اور وَاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (اور مجھ کو چاہئے اس سے ایسا غلبہ کہ جس کے ساتھ نصرت ہو)

اس اشغال صوفیہ کا ذکر ہے کیونکہ ان کے یہاں مقاما محمودا اور سلطٰنا نصیرا بعض اشغال کا اصطلاحی لقب ہے۔ بھلا ان عقلمندوں سے کوئی پوچھے کہ قرآن کا نزول ان اصطلاحات کے بعد ہوا یا پہلے۔ یقیناً نزول قرآن اصطلاحات سے مقدم ہے۔ پھر قرآن میں ان کا ذکر کہاں سے ہوا کیونکہ ذکر تو اس طرح ہونا چاہئے کہ کلام کی دلالت ان پر ہو سکے اور جن آیات کا تم نے ذکر کیا ہے ان میں سوا اس کے کہ یہ الفاظ مذکور ہیں۔ ان اصطلاحات پر کسی طرح بھی دلالت نہیں۔

اور اگر استدلال کے لئے دلالت معنویہ کی ضرورت نہیں صرف الفاظ نص میں آ جانا ہی کافی ہے تو یہ ایسا استدلال ہوگا جیسا مرزا کا قول کہ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ (اور میرے بعد ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم آنے والے ہیں جن کا نام مبارک احمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوگا میں انکی بشارت دینے والا ہوں) میں میری پیشین گوئی ہے۔ ایک شخص تھے مولوی نعیم انہوں نے اس کا خوب جواب دیا کہ مرزا کا نام تو احمد نہیں بلکہ غلام احمد ہے اور قرآن میں غلام احمد کا کہیں ذکر نہیں، ہاں میرا نام قرآن میں پورا موجود ہے۔ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ (اس روز تم سے نعمتوں کی پوچھ گچھ ہوگی) اسی طرح ہمارے ایک دوست نے کہا تھا کہ مرزا سے بڑھ کر تو قرآن میں میری پیشین گوئی موجود ہے۔ میرا نام لقاء اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ. (وہ لوگ خسارہ میں ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو جھٹلایا) اور ایک مقام پر ہے فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ (جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہے (اسے پریشان نہ ہونا چاہئے کیونکہ) اللہ تعالیٰ سے ملنے کا وقت ضرور آنیوالا ہے) ۱۲ط اگر یہی طریقہ استدلال کا ہے تو پھر کسی کا نام محمد رکھ کر دعویٰ کردو کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کا ذکر ہے اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے۔ منطوق قرآن تو وہی بات ہو سکتی ہے جو قرآن کا مدلول صریح ہو یا قواعد عربیہ سے مفہوم ہو۔ اس کے بغیر کسی بات کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ قرآن میں اس کا ذکر ہے۔

جہالت محضہ ہے۔ بلکہ زندقہ ہے۔

اور مسائل تصوف کو ثابت کرنے کے لئے اس کی کیا ضرورت ہے۔ کہ قرآن ہی میں اُن کا ذکر ہو۔ کیونکہ مسائل تصوف کی صحت کے لئے ان کا منطوق قرآن ہونا شرط نہیں بلکہ مسکوت عنہا ہونا، اور خلاف قواعد شرعیہ نہ ہونا کافی ہے۔ اس لئے معمولات اشغال صوفیہ کا قرآن میں ذکر ہونا ضروری نہیں۔ مگر ہمارے حاجی صاحب نے جس لطیفہ کے اہتمام کی تاکید کی ہے وہ تو منطوق بھی ہے۔ کیونکہ حدیث وقرآن میں اس کا ذکر صراحۃً ہے۔

لطیفۂ قلب

رہا یہ اشکال کہ حدیث میں تو مُضْغَہ کا ذکر ہے جو مادی ہے۔ اور لطیفہ قلب جس کو صوفیہ نے لطائف میں شمار کیا ہے۔ مجرد ہے مادی نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں عین مضغہ مراد نہیں ورنہ مضغہ تو حیوانات میں بھی ہوتا ہے۔ بلکہ انسان سے بڑا ہوتا ہے۔ بلکہ وہ شے مراد ہے جس کو اس مضغہ سے تعلق ہے اور وہ وہی ہے جس کو صوفیہ نے لطیفہ کہا ہے کیونکہ اس مضغہ میں اصلاح وصلاحیت وادراک مسائل کی قوت نہیں۔ اور قلب کے لئے فہم وعقل کی نصوص سے ثابت ہے معلوم ہوا کہ عین مُضغہ مراد نہیں۔ بلکہ اُس کا متعلق مراد ہے۔ غرض حاجی صاحب نے لطائف کے اہتمام سے اسی لئے منع فرمایا ہے۔ کہ اس میں تشتت ہے اور ایک کے اہتمام سے دوسرا چھوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح میں نے اس وقت صرف ناگوار واقعات کے متعلق مراقبہ بتلایا ہے۔ گوارا واقعات کا ذکر نہیں کیا تاکہ یہ سبق نہ بھول جاؤ۔ علاوہ ازیں یہ کہ گوارا واقعات میں تو شکر دل سے خود بخود نکلتا ہے۔ اس کے بیان کی زیادہ حاجت نہیں، خوشحالی اور راحت میں شکر سے۔ مانع اور مزاحم کوئی نہیں ہوتا۔ بلکہ حالت خود اس کو مقتضی ہوتی ہے۔ بخلاف تفویض کے جو ناگوار واقعات کا حق ہے۔ کہ پریشانی کے وقت تفویض کا ازخود تقاضہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں کشاکشی زیادہ ہوتی ہے۔ کہ تفویض کروں یا تجویز کروں یا کچھ نہ کروں۔ اس لئے اس کے ذکر کی زیادہ ضرورت تھی۔

غلبۂ تفویض

اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ تمہارے بیان کے موافق تو تفویض کا حاصل یہ ہوا کہ نہ بچہ کو مارو نہ ملازم کو سزا دو۔ نہ بیوی کو کسی بات پر تنبیہ رو کہ نمک تیز کر دیا بلکہ جو ناگوار بات پیش آئے یہ سمجھ لو کہ حضرت حق کا تصرف ہے۔ اور ہر حالت میں راضی رہو۔ میں کہتا ہوں کہ میری تقریر کا یہ خلاصہ

ایسا نکالا گیا جیسے قنوج میں ایک صاحب نے کہا تھا کہ ساری شریعت کا خلاصہ میں نے یہ نکالا ہے کہ نہ خوشی میں ہنسو نہ غمی میں رؤو۔ نیز یہ خلاصہ ایسا ہوا۔ جیسے مولانا جامی کی حکایت مشہور ہے کہ ایک دفعہ سفر میں دسترخواں پر کھانا کم تھا تو رفیق سفر نے یہ چاہا کہ مولانا جامی کو باتوں میں لگا کر خود زیادہ کھا جائے تو اس نے مولانا سے پوچھا کہ ہم نے سُنا ہے آپ نے کوئی کتاب یوسف علیہ السلام کے قصہ میں لکھی ہے۔ فرمایا۔ ہاں لکھی ہے کہا ذرا قصہ ہم کو بھی سنا دو۔ مولانا نے فرمایا پیرے بود پسرے داشت گم کرد باز یافت بس یہ خلاصہ ہے ساری کتاب کا جو سوصفحہ سے زیادہ کی ہے ایسے ہی اس قنوجی نے شریعت کا خلاصہ نکالا کہ نہ خوشی میں ہنسو نہ غمی میں رؤو۔

بعض لوگوں نے **فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّ لْيَبْكُوا كَثِيرًا** (پس ہنسو تھورا اور رووٗ زیادہ) سے یہ سمجھا ہے کہ شریعت میں ہنسنے کی ممانعت ہے یہ استدلال غلط ہے کیونکہ یہاں ضحک و بکاء دینا مراد نہیں بلکہ **فی الآخِرَۃ** (آخرت میں) مقدر ہے اور **فَلْيَضْحَكُوا** (پس ہنسو) امر بمعنی خبر ہے کہ آخرت میں یہ لوگ زیادہ روئیں گے جیسے ہمارے محاورہ میں بولا کرتے ہیں اب سر پکڑ کے رووٗ یعنی اب رؤو گے یہ بھی خبر ہے امر بمعنی طلب نہیں اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ اس کے بعد **جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ** مذکور ہے جس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہاں وہ ضحک قلیل و بکاء کثیر مراد ہے جو ان کے اعمال پر بطور جزاء کے مرتب ہوگا ضحک و بکاء دنیوی مراد نہیں۔

علاوہ ازیں یہ کہ دوسری نصوص بھی اس معنی کی نفی کر رہی ہیں جو ان لوگوں نے اس آیت سے سمجھے ہیں کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ حضرات صحابہ اپنی مجالس میں ہنستے تھے مگر اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ رات کو خلوت میں رویا کرتے تھے۔

كانوا ليوث النهار و رهبان الليل (دن میں ہنستے اور رات کو روتے) نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہنستے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز ہنسی کے وقت نہ نکلتی تھی۔ صرف دندان مبارک نمایاں ہو جاتے تھے۔ **كان جل ضحكة التبسم** اور اس کا منشاء میرے خیال میں یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر غم کا غلبہ تھا۔

كان متواصل الاحزان دائم الفكرة اور غلبۂ حزن میں کھل کر ہنسی نہیں آیا کرتی۔ بہر حال اول تو وہ خلاصہ جو اس قنوجی نے نکالا ہے غلط ہے اور اگر مان بھی لیا جائے تو ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ خلاصہ ہے تو حرج کیا ہوا کوئی یہ ثابت کر دے کہ یہ خلاصہ قبیح ہے یقیناً کم ہنسنا اور زیادہ رونا قبیح نہیں بلکہ خدا پرستوں کی علامت ہی یہی ہے اور یہ جواب ایسا ہے جیسا کہ میں نے بعض

نیچریوں کو جواب دیا تھا وہ کہتے تھے کہ مسئلہ وقف علی الاولاد مسئلہ میراث ہے بہتر ہے کیونکہ میراث میں جائیداد کا تیا پانچا ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر شریعت کو یہی مقصود ہو تو کیا کرو گے۔ تا کہ مسلمان مست مال نہ ہو جائے۔تم نے مسئلہ میراث کا جو انجام بیان کیا ہے وہ تو مسلم ہے مگر یہ ثابت کرو کہ یہ انجام قبیح ہے اور اگر یہ انجام ہی شارع کو مقصود ہو تو پھر وقف علی الاولاد مسئلہ میراث سے کیونکر افضل ہوگا۔یہی جواب میں اس قنوجی ملخص شروع کر دوں گا۔ بہرحال مسئلہ تفویض پر بظاہر یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ بس نہ ملازم پر تنبیہ ہو نہ بیوی سے بازپُرس ہو نہ اولاد کو تادیب ہو(کیونکہ اپنے نفس کے لئے تادیب وانتقام ضروری نہیں اور اگر یہ لوگ خدا اور رسول کی مخالفت کریں تو اس پر رضا جائز ہی نہیں نہ اس پر سکوت کرنا تفویض کی ضد ہے۔ بلکہ وہاں تو تادیب ہی عین تفویض ہے)۱۲۔

تمکین اثر

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہاں جب غلبہ تفویض ہوگا تو اوّل اوّل حالت یہی ہوگی کہ مگر تمکین کے بعد ہر حالت کے حقوق کو صحیح انداز سے ادا کرے گا۔ جیسے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی حالت تھی کہ باوجود کامل صاحب تفویض ہونے کے سلطنت کا انتظام کرتے تھے اور ایسا انتظام کیا جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہ تمکین کامل کا نتیجہ تھا اسی تمکین وثبات فی المواطن وادائے حقوق جمع المقامات کی بناء پر حضرات صحابہ فرماتے ہیں۔ کان ابوبکر اشجع الناس بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ بہادر تھے۔اور یہ منافی تفویض اس لئے نہیں کہ یہ سب من جانب اللہ ماموربہ یا ماذون فیہ ہیں تو امتثالاً لامران کو اختیار رنا عین تفویض ہے۔اور حضرت صدیقؓ کے اشجع ہونے کے متعلق ایک مستقل اشکال اور جواب ہے۔ اس کو بھی تتمیما للفائدۃ ذکر کئے دیتا ہوں ۔ وہ اشکال یہ ہے کہ بادی النظر میں واقعات جنگ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ شجاعت میں زیادہ ہیں مگر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ نے اس کا جواب دیا ہے اور عمدہ جواب ہے کہ شجاعت دو ہیں ایک شجاعت امراء کی دوسری شجاعت فتیان کی اور اول اصعب ہے دوسروں سے کیونکہ ثانی کا تعلق صرف اپنی ذات سے ہے جان سے ہاتھ دھولیا کچھ بھی دُشواری نہ رہی اور ثانی کا تعلق جمہور سے ہے وہاں جان سے ہاتھ دھونے سے کام نہیں چلتا۔سو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی شجاعت شجاعت امراء کی تھی اور حضرت علیؓ کی شجاعت فتیان تھی کہ یعنی سپاہی کی شجاعت تو یہ ہے کہ میدان میں

دشمن کے مقابل قوی القلب رہے اور امراء سلاطین کی شجاعت یہ ہے کہ سخت خطرات و حوادث میں مستقل مزاج ہیں۔ پریشان و از جارفتہ نہ ہوں۔ ہر حادثہ کی تدبیر مناسب کریں واقعات شجاعت جو حضرت علیؓ کے زیادہ ہیں۔ وہ میدان حرب کے متعلق ہیں اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے واقعات شجاعت میدان حرب کے متعلق زیادہ نہیں بلکہ انتظام حوادث و خطرات کے متعلق ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ واقعی حضرت صدیق کی برابر قوی القلب صحابہ میں کوئی نہ تھا۔ حضرت صدیق کی شجاعت و قوتِ قلب یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت مستقل مزاج رہے خود بھی سنبھلے اور تمام صحابہ کو سنبھالا۔ پھر اس کے بعد جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر مشہور ہوئی اور تمام اطراف سے شورش برپا ہوئی مسلمان نرغہ میں آگئے۔ قبائل عرب مرتد ہونے لگے مخالف سلطنتوں نے پیش قدمی کا ارادہ کیا اس وقت تمام صحابہ گھبرا گئے مگر حضرت صدیق کے قلب کو تزلزل نہیں ہوا۔ چنانچہ خلافت پر متمکن ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ حضرت اسامہؓ کے لشکر کو شام کی طرف روانہ کیا۔ حالانکہ اس نرغہ کی حالت میں بظاہر اس کی ضرورت تھی کہ مدینہ میں لشکر رکھا جاتا کیونکہ ایسی حالت میں پائے تخت کو لشکر سے خالی کرنا خطرہ سے خالی نہیں مگر حضرت صدیقؓ نے فرمایا کہ جیش اسامہ کے بھیجنے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود انتظام فرما چکے تھے روانگی کا حکم دے چکے تھے اور اسامہ کے لئے جھنڈا خود باندھ چکے تھے۔ تو جس جھنڈے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا ہو میں اُس کو نہیں کھول سکتا چاہے مدینے والے زندہ رہیں یا فنا ہو جائیں یہ لشکر جائے گا اور ضرور جائے گا چنانچہ یہ لشکر روانہ ہوا اور خدا تعالیٰ نے اس کی روانگی سے دشمنوں کے دل پر رُعب طاری کر دیا اور وہ سمجھ گئے۔ کہ مسلمانوں میں اُن کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ ضعف نہیں آیا بلکہ وہ بدستور اُسی قوت کے ساتھ دشمنوں کی سرکوبی کو موجود ہیں۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھے اور وہی نظام قائم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تھا۔ اس کے بعد حضرت صدیق نے مرتدین کی سرکوبی کی طرف توجہ کی اور ایک لشکر اس کام کے لئے روانہ کیا۔ اس معاملہ میں حضرت عمر بھی گھبرا گئے تھے۔ مگر حضرت صدیق نہیں گھبرائے اور نہایت استقلال سے ایک سال میں تمام اہل عرب کو اسلام پر پختہ کر دیا جو ضعیف الاسلام مرتد ہو گئے تھے ان کو تہہ تیغ کیا یا اُنہوں نے توبہ کر کے اسلام کی طرف رجوع کیا، یہاں تک کہ جزیرہ عرب تمام فتنوں سے پاک ہو گیا۔ اور دوسرے سال حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے مخالف سلطنتوں کی طرف نہایت اطمینان سے از خود پیش

قدمی کی۔ کسی مخالف کو اپنی طرف پیش قدمی کرنے یا بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ محقق اہل سیر کا قول ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے دو سال میں وہ اصول سلطنت تمہید کئے تھے جن پر عمل کر کے حضرت عمر نے دس سال میں وہ انتظامات کئے اور وہ فتوحات کثیرہ حاصل کیں جن کی دنیا میں نظیر نہیں ملتی۔ عام طور پر لوگ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو فاتح اعظم سمجھتے ہیں مگر محققین حضرت صدیق کو فاتح اعظم کہتے ہیں۔ کیونکہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فتوحات کا راستہ ہموار کیا ایک نقشہ قائم کر دیا اور یہ کام سب سے زیادہ دشوار ہے۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ اسی راستہ پر اسی نقشہ کے مطابق چلتے رہے جس سے یہ فتوحات حاصل ہوئیں یہ جواب ہو گیا یہ اشکال تھا۔

توسط واعتدال

اب مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ یہ شجاعت صدیق رضی اللہ عنہ تمکین کا اثر ہے تمکین کے بعد تمام اشیاء کے حقوق بخوبی ادا ہوتے رہتے ہیں۔ اور اسی تمکین کا نام توسط ہے اسی توسط کی وجہ سے اس امت کا لقب امة وَسَطَ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً وَسَطَ (اور اسی طرح تمہیں صاحب اعتدال امت بنایا) تحریک الاوسط کے معنی ہیں۔ معتدل کیونکہ وَسَطَ وہ ہے جو بالکل درمیان میں ہو۔ اور وسط بسکون الاوسط عام ہے۔ مطلق مابین الطرفین کو اسی لئے اہل لغت کے یہاں اس کے متعلق ایک لطیفہ ہے الساکن متحرک والمتحرک الساکن کو وسط بالسکون تو متحرک ہے یعنی متعین نہیں اور وسط بالتحریک ساکن ہے یعنی متعین ہے اور وسط حقیقی تمام مراتب کے اعتبار سے مرتبہ اعتدال کا ہوگا۔ پس وسط کی حقیقت معتدل ہوئی اور تمکین اسی اعتدال کا نام ہے۔ استقیموا ولن تحصوا میں اسی اعتدال کا امر ہے اور اس اعتدال کی حقیقت حکماء نے یہ بیان کی ہے کہ تمام قویٰ کا مرجع دو قوتیں ہیں ایک علمیہ یعنی نافع و رضا کا سمجھنا۔ دوسری عملیہ یعنی نافع کو حاصل کرنا اور ضار کو دفع کرنا تو عملیہ دو قسم ہوئیں سو کل تین قسمیں ہوئیں اول کا نام قوۃ عقلیہ ہے دوسری کا نام شہوت تیسری کا نام غضب پھر ان تینوں میں تین تین درجے ہیں ایک افراط ایک تفریط ایک توسط واعتدال چنانچہ قوتِ غضب کے تین درجے ہیں ایک تھور یہ افراط ہے۔ ایک جبن یہ تفریط ہے۔ ایک شجاعت یہ اعتدال ہے اسی طرح قوت شہوت کے تین درجے ایک شبق و فجور یہ افراط ہے۔ ایک عنت یہ تفریط ہے ایک عفت یہ اعتدال ہے اسی طرح قوت عقلیہ کے تین درجے ایک جزیرہ یہ افراط ہے ایک سفہ یہ تفریط ہے ایک حکمت۔ یہ اعتدال ہے پس ان تینوں کے توسط کا مجموع عدل ہے جس کو یہ عدل حاصل ہو جاوے وہ صاحب تمکین ہوتا ہے تو صاحب تمکین کو ہر قوت میں اعتدال حاصل ہو جاتا ہے۔

صاحبِ تمکین

اسی لئے صاحب تمکین غالب علی الاحوال ہوتا ہے کیونکہ اعتدال کی وجہ سے کوئی حالت اس پر غالب نہیں ہوتی غلبہ حالت اُس وقت ہوگا جب کہ کوئی حالت حد افراط میں پہنچ کر اعتدال سے نکل گئی ہو۔ اور اسی لئے ابوالوقت کو کوئی نہیں پہچانتا کیونکہ اُس پر جوش وخروش وغیرہ کا غلبہ نہیں ہوتا بلکہ سکون غالب ہوتا ہے کیونکہ اعتدال کا خاصہ سکون ہے اور ابن الوقت کو سب پہچان لیتے ہیں کیونکہ وہ غلبۂ حال کی وجہ سے دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے۔ اس کی حرکات دوسروں سے جُدا ہوتی ہیں۔ غلبہ مواجید سے دوسروں پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

درنیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید واسلام

(جب خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا تو بات مختصر چاہیۓ طویل کلام سے کیا فائدہ سلامتی اس میں ہے ان فضا میں سکوت کیا جاوے)

میں نے اپنے بزرگوں میں سے بحمد اللہ بہت حضرات کی زیارت کی ہے مگر سب سے زیادہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو ابوالوقت دیکھا ہے۔ میں بچپن میں مولانا گنگوہیؒ کو متقی تو سمجھتا تھا لیکن صاحب مقامات نہیں جانتا تھا مگر جب مولانا کی اوّل زیارت مجھے دیوبند میں نصیب ہوئی تو صورت دیکھتے ہی ایک خاص کشش مولانا کی طرف ہوئی، اور ایسی زبردست کشش ہوئی کہ میں مولانا کی طرف دوڑا، دوڑتے ہوئے ایک اینٹ پر پیر رکھا گیا وہ اینٹ ہل گئی میرا پیر اس پر سے اُکھڑا اور میں گرنے لگا تو حضرت مولانا نے مڑ کر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سنبھالا، بس اس اُدا سے میرے اندر مولانا کے ساتھ عشق کی شان پیدا ہوگئی اور اعتقاد کامل اسی وقت سے پیدا ہوگیا جو بحمد اللہ ہمیشہ بڑھتا ہی رہا۔ مولانا ابوالوقت تھے حالت پر غالب تھے مغلوب نہ تھے اس لئے بہت کم لوگوں نے مولانا کو پہچانا۔ اکثر علماء مولانا سے مسائل فقہیہ پوچھا کرتے تھے (جو دوسری جگہ سے بھی معلوم ہوسکتے تھے ۱۲) مولانا کا جو خاص کمال تھا اس کو علماء میں سے بھی بہت کم لوگوں نے پہچانا کیونکہ کام کرنے والے کم تھے اور اس کمال کی خبر کام کرنے والے کو ہوتی ہے۔ مسائل ظاہرہ کی تحقیق کرنے والے کو نہیں ہوتی۔ کام کرنے کے بعد جو مولانا سے چند سوالات کئے گئے اور مولانا کے جوابات سنئے تو اس وقت معلوم ہوا کہ عجیب شان کے اور بڑے درجے کے بزرگ ہیں اور بزرگی کے ساتھ بڑے درجہ کے محقق بھی ہیں۔ مولانا کی شان یہ تھی کہ آپ سے ایک پردیسی بی بی بیعت ہوئی تھی مولانا نے اُسے اپنے گھر جا بیعت فرمالیا۔ تھوڑی دیر میں اس نے اپنی نہایت بے قراری کی اطلاع کر کے درخواست کی کہ اب میں جارہی ہوں۔ ایک بار زیارت کی اور تمنا ہے۔ مولانا نے صاف فرمایا کہ مجھے فرصت نہیں۔ یہ ابوالوقت کی شان ہے ظاہر میں یہ جواب بے رحمی کا تھا مگر حقیقت میں

یہ عین رحمت تھی۔ تا کہ قلق جلد قطع ہو جائے۔ کوئی ابن الوقت ہوتا تو غلبۂ رحمت سے فوراً جا کر اپنی زیارت کرا دیتا تا کہ ایک مسلمان کا جی بُرا نہ ہو۔ مگر مولانا نے اس پہلو کے ساتھ دوسرے پہلو پر بھی نظر فرمائی کہ اس وقت اس پر جُدائی کا قلق غالب ہے پھر نا معلوم اس کے رنج و غم میں وہ کہیں سامنے آ جائے تو پیروں میں گر پڑے یا کیا کرے اس لئے صاف فرما دیا کہ مجھے فرصت نہیں اور ذرا اس کی فرمائش سے متاثر نہیں ہوئے۔ حضرت بڑے کوہ وقار تھے۔ آپ کے یہاں مجلس میں بعض لوگوں پر وجد و حال بہت غالب ہوتا۔ بہت لوگ چلاتے تھے مگر مولانا میں کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا تھا۔ ظاہر میں ساکن معلوم ہوتے تھے مگر باطن میں رگ رگ میں اثر تھا۔ باطن میں ہر حال سے پورے متاثر تھے ۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی نے اہل حال پر اعتراض کر دیا کہ حضرت اب تو آپ کے یہاں ذکر میں تالیاں بجائی جاتی ہیں۔ مولانا کو جوش آ گیا اور فرمایا بس خاموش رہو تم کیا جانو! اور اس کے بعد اہل حال کی طرف سے دلائل بیان کرنا شروع فرمائے۔ جس سے اُن کی تائید و حمایت مترشح ہوتی تھی۔ معترض تو ان دلائل کو سُن کر دم بخود رہ گئے۔ کہ یہ کیا ہونے لگا ہم تو مولانا کو وجد وغیرہ کا منکر سمجھتے تھے۔ یہ تو حامی اور طرف دار ہو گئے مگر حقیقت میں مولانا محقق تھے۔ نہ منکر تھے نہ طرف دار تھے یعنی ہر چیز کو اس کی حد پر رکھتے تھے۔ جس درجہ میں وجد جائز ہے اس دَرجہ کا انکار نہ تھا اور جس درجہ میں حرام تھا اس کی تائید نہ تھی چونکہ اس ذاکر کا غلبہ حال میں تالیاں بجانا بوجہ بے اختیاری کے حد جواز میں تھا اس لئے اس کی تائید فرما دی اور قوالی والوں کا سماع حدِ جواز سے نکلا ہوا ہے اس کی مخالفت فرماتے تھے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ کی نظیر ہندوستان میں تو ہم نے نہیں دیکھی باقی ممالک کی ہم نے سیر نہیں کی اس لئے ان کے متعلق دعویٰ نہیں کیا جا سکتا مگر افسوس مولانا کو بہت کم لوگوں نے پہچانا۔ یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ تفویض کا ابتداء میں جب غلبہ ہوتا ہے تو اس وقت بے شک یہی اثر ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ شخص کسی سے نہ مؤاخذہ کرتا ہے نہ کسی کو تنبیہ کرتا ہے لیکن تمکین کے بعد تمام احوال کے حقوق کو ادا کرتا ہے۔ تمکین کے اوپر یہ گفتگو طویل ہو گئی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس مراقبہ کو ہر دم مستحضر رکھنا چاہئے کہ عالم میں جو تصرف ہوتا ہے وہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ہم کو تصرف حق پر راضی رہنا چاہئے۔ اگر ہر دم استحضار نہ ہو سکے تو کم از کم جب کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے اس وقت تو ان مقدمات کو مستحضر کر لیا جائے کہ یہ تصرف حق ہے اور تصرف حق پر مجھ کو راضی رہنا چاہئے یہ بھی ایک قسم کا دوام ہے۔ یہ تھا مقصود جو میں آج بیان کرنا چاہتا تھا۔

خلق و امر کی تفسیر

اب اس پر اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا) سے دلالت کی وجہ بتلانا چاہتا ہوں۔ اس میں الا تو تنبیہ کے لئے ہے اور لهُ کو حصر

کے لئے مقدم کیا گیا ہے۔ کیونکہ تقدیم ماحقہ التاخیر حصر کو مفید ہے۔ اور خلق اور امو کی تفسیر تقہٗ ظاہر ہے خلق کے معنی پیدا کرنا اور امو کے معنی حکم کرنا حاصل یہ ہوا کہ تکوین وتشریح دونوں قسم کے تصرفات اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں۔ وہی خالق ہیں وہی حاکم ہیں پس ہر قسم کے تصرفات اُنہی کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ تو لغت کے اعتبار سے خلق وامر کی تفسیر ہے اور جو ظاہر بھی ہے اور صحیح بھی مگر بعض لوگوں میں یہ مرض ہے کہ وہ اپنی اصطلاحات کو قرآن میں ٹھونستے ہیں۔ یہ بڑی جہالت ہے چنانچہ صوفیہ کی ایک اصطلاح ہے عالم مادی کو عالم خلق کہتے ہیں اور مجردات کو عالم امر جس کی تفصیل یہ ہے تجرد عالم کے بارہ میں تین مذاہب ہیں متکلمین کے یہاں تو اشیاء عالم میں مجرد کوئی نہیں۔ سب مادی ہیں اور فلاسفہ کے نزدیک بعض اشیاء مجرد بھی ہیں اور زیادہ مادی ہیں مگر مجردات کو قدیم مانتے ہیں، تیسرا مذہب صوفیہ کا ہے کہ عالم میں بعض اشیاء مجرد بھی ہیں اور مادی بھی مگر سب حادث ہیں کوئی مجرد قدیم نہیں، متکلمین نے نفی تجرد پر یہ استدلال کیا ہے کہ تجرد اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے حکماء وصوفیہ نے اس مقدمہ کو رَد کیا ہے اور کہا ہے کہ اس قول میں خود مصادرہ علی المطلوب ہے کہ چونکہ تم کسی کو مجرد نہیں مانتے اس لئے تجرد کو اخص صفات سے کہتے ہو۔ ورنہ اس مقدمہ کی کوئی دلیل نہیں صوفیہ وحکماء کہتے ہیں کہ اخص صفات باری سے وجود بالذات ہے۔ واجب بالذات حق تعالیٰ کے کوئی نہیں اور مجرد عن المادہ مخلوقات میں بھی ہیں مگر صوفیہ اور فلاسفہ میں فرق یہ ہے کہ صوفیہ مجردات کو حادث مانتے ہیں اور فلاسفہ قدیم کہتے ہیں۔ بہرحال صوفیہ کا مذہب یہ ہے کہ بعض اجزاء عالم مجرد عن المادہ ہیں چنانچہ روح کو وہ مجرد کہتے ہیں اور اس کے علاوہ انسان میں بعض لطیفے ان کو اور مکشوف ہوئے ہیں اور ان کے نزدیک حقیقت انسان ان مجردات اور جسد مادی سے مرکب ہے ان لطائف کو بھی صوفیہ نے مجرد کہا ہے اور یہ ان کو کشف صحیح سے معلوم ہوا ہے۔ بجز کشف کے اس کی اور کوئی دلیل نہیں۔ مگر ان میں نفس مادی ہے۔ بمعنی حال فی المادی اس کو لطائف میں تغلیباً شمار کرلیا ہے نیز صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ان کا مقام فوق العرش ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ فوق العرش ان کا جز ہے تاکہ مجرد کے لئے مکان وحیز لازم آئے بلکہ فوق العرش سے مراد یہ ہے کہ ان کا کوئی مکان نہیں تو جیہ اس ارادہ کی یہ ہے کہ عرش منتہی ہے۔ امکنہ کا اور فوق کے لئے خارج ہونا لازم ہے۔ پس فوق العرش کے معنی یہ ہوئے خارج عن الامکنہ باقی رہی یہ تحقیق کہ وراء العرش مکان تو نہیں لیکن پھر کیا ہے آیا خلاء ہے یا خلاء بھی نہیں تو دونوں امر ممکن ہیں لیکن حکماء نے بلا دلیل دعویٰ کیا ہے کہ محدد جہات

کے اُدھر نہ خلاء ہے نہ مُلا۔

خلاء تو اس لئے نہیں کہ محال ہے (اور یہ دعویٰ خود بلا دلیل ہے) اور ملا اس لئے نہیں کہ ہم کو اس کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ عجیب دلیل ہے کہ جس چیز کی آپ کو ضرورت نہ ہو وہ معدوم محض ہے۔ یہ حال ہے ان کے دلائل کا جو مضحکہ خیز ہیں۔ غرض صوفیہ نے عالم کی تقسیم مجردات و مادیات کی طرف کر کے یہ اصطلاح مقرر کی ہے کہ مجردات کو عالم امر سے تعبیر کرتے ہیں اور مادیات کو عالم خلق کہتے ہیں سو اول تو یہ ایک اصطلاح ہے ولا مشاحۃ فی الاصطلاح لیکن اس تسمیہ میں ایک مناسبت بھی ہے وہ یہ کہ خلق کے معنی لغت میں مادہ میں صورت پیدا کرنا اور اس کے مقابل ہے۔ ابداع یعنی خود مادہ کو پیدا کرنا جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض (آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے) چنانچہ اس کے متصل ہی وَ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَايَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ قضاء محض کن سے اس میں مادہ کا توسط نہیں اور اللہ تعالیٰ تو مادہ کے بھی خالق ہیں اور صورت وہیئت کے بھی باقی مادہ میں صورت بنانا یہ ایک درجہ میں بندہ سے بھی ممکن ہے چنانچہ رات دن ایجادات میں یہی ہوتا ہے کہ مادہ کے اندر نئی نئی صورتیں پیدا کی جاتی ہیں۔ مگر مادہ کا خالق سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں اسی واسطے قرآن میں فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ فرمایا ہے۔ احسن المبدعین نہیں فرمایا کیونکہ مبدع بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں۔ بہر حال مادیات کو عالم خلق اس لئے کہا کہ ان کا وجود مادہ اور صورت کے ملانے سے ہوا ہے ان میں مادہ اور صورت کی ترکیب ہوتی رہتی ہے۔ اور مجردات کو عالم امر اس لئے کہا کہ وہاں مادہ وصورت کی ترکیب نہیں ان کا وجود صرف کلمہ کن سے ہوا ہے جو کہ محض ایک حکم ہے یہ تو اس اصطلاح کی حقیقت اور وجہ تسمیہ کا بیان تھا۔

امر کی غلط تفسیر

اور میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ صوفیہ کی اس تحقیق کا منشاء محض کشف ہے کسی نص سے اس تقسیم کا دعویٰ نہیں کیا مگر اب لوگوں نے یہ غلو کیا ہے کہ اس اصطلاح کو قرآن میں ٹھونسا ہے یعنی اس آیت کو اصطلاح پر محمول کر کے الا له الخلق و الامر (خبردار اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا) کی تفسیر عالم خلق و عالم امر سے کی ہے اور قرآن سے اپنے دعویٰ پر استدلال کرنے لگے۔ یہ غلو اور تحریف ہے پھر بناء الفاسد علی الفاسد کے طور پر اس آیت میں امر کی تفسیر عالمِ امر سے کر کے دُوسری آیت قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ سے متکلمین پر رد کرنے لگے کہ اللہ تعالیٰ تو روح کو عالم امر

(مجردات) سے بتلاتے ہیں اور تم اس کو عالم خلق (مادیات) سے کہتے ہو یہ الزام بھی فاسد ہے کیونکہ اس پر کوئی دلیل نہیں کہ من امر ربی سے عالم امر مراد ہے۔ باقی متکلمین نے جو روح کو مادی کہا ان کو شبہ ان احادیث سے ہوا جن میں یہ مضمون وارد ہے کہ نسمہ مؤمن شہید کا طیر خضر کے حواصل میں شجرہ جنت میں معلق رہتا ہے اور کھاتا پیتا اور جنت میں اڑتا پھرتا ہے اور بعض احادیث میں روح اور نفس کے عنوان سے اس کا حرکت کرنا عروج ونقل کرنا وارد ہے اور یہ سب اوصاف مادی کے صفات ہیں، صوفیہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہاں وہ روح مجرد مراد نہیں بلکہ نسمہ اور روح یا نفس اس کے علاوہ اور چیز ہے جو اس روح مجرد کا مرکب ہے اور وہ ایک جسم لطیف ساری فی البدن اور بالکل ہیئت بدن پر ہے اور اس کا تعلق اس جسدِ عنصری کے ساتھ ایسا ہے جیسا تعلق جسم تعلیمی کو جسم طبیعی کے ساتھ ہے کہ مقدار اور ہیئت میں بالکل جسم طبعی پر منطبق ہے پس جس طرح جسم تعلیمی جسم طبعی میں ساری ہے یونہی وہ نسمہ جسد عنصری میں ساری ہے متکلمین کی نظر اس نسمہ تک ہی گئی اور وہ اسی کو روح کہتے ہیں اور ایک تیسری روح اور ہے جس کو روح طبی کہتے ہیں وہ ایک لطیف بخار ہے جو ہر دم اور جو ہر منی سے پیدا ہوتا ہے یہی بخار لطیف تمام بدن میں سرایت کر کے بدن کی طبعی تدبیر کرتا ہے اور اطباء اسی سے بحث کرتے ہیں۔ اور اُن میں جو مسلم اور محقق ہیں وہ روح حقیقی مجرد اور نسمہ کے منکر نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہماری بحث کا تعلق اس سے نہیں ہے کیونکہ یہ روح حقیقی یا نسمہ سے صحت ومرض کا کوئی تعلق نہیں اس کا تعلق اسی بخار لطیف سے ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک روح تو بخار لطیف سے ہے اور دوسری روح نسمہ ہے جو بواسطہ بخار لطیف کے جسد میں ساری ہے اور دونوں مادی ہیں، تیسری روح اصلی اور حقیقی روح ہے جس کے لئے نسمہ مرکب ہے وہ مجرد ہے۔ زیادہ تفصیل کا شوق ہو تو میرا رسالہ الفتوح فیما یتعلق بالروح مطالعہ کیا جائے۔ غرض قل الروح من امر ربی سے تجرد روح پر استدلال کرنا بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ کیونکہ یہاں عالم امر اصطلاحی مراد نہیں۔ رہا یہ کہ پھر کیا مراد ہے تو ہم کہتے ہیں کہ امر کے لغوی معنی مراد ہیں کہ روح خدا کے حکم سے پیدا ہوئی۔ رہا یہ کہ اس کے بیان سے کیا فائدہ یہ تو سائل کو بھی معلوم تھا کہ روح بھی اور روح کے سوا تمام مخلوقات بھی خدا کے حکم سے پیدا ہوئی ہیں۔ (کیونکہ سائل اہل کتاب تھے جو خدا تعالیٰ کی خالقیت کے منکر نہ تھے ۱۲) سو فائدہ اس جواب کا یہ ہے کہ مخاطب کو یہ بتلایا گیا ہے کہ تم اس کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے بس اتنا ہی سمجھ لو کہ وہ خدا کے حکم سے ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تم اس سے زائد نہیں سمجھ سکتے کیونکہ حقیقت روح فوق الفہم ہے اور اس کے بعد وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (اور تمہیں بہت تھوڑا

علم دیا گیا ہے) سے اس توجیہ کی تائید ہوتی ہے پس الا له الخلق والامر (یادرکھو اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا) کی یہ تفسیر تو غلط ہے جو اصطلاح سے کی گئی ہے رہا یہ سوال کہ پھر کیا معنی ہیں سو اس کے جواب کے لئے ہم کو کسی دوسری جگہ جانا نہیں پڑتا۔ بلکہ اسی آیت کے سیاق سے خلق وامر کے معنی کی تعیین ہو جائے گی حق تعالیٰ نے اس سے پہلے فرمایا ہے ان ربکم الله الّذِی خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (بیشک تمہارا پروردگار اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا) اس میں خلق بمعنی الایجاد کا ذکر ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں یہاں کسی نے خلق بمعنی عالم خلق اصطلاحی نہیں لیا۔ اس کے بعد ارشاد ہے والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہٖ۔ (اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم سے مسخر ہیں)

یہاں امر سے بالاتفاق حکم مراد ہے پس یہی معنی الا له الخلق والامر میں مراد ہیں کہ ایجاد وحکم اللہ کے لئے خاص ہے جس کو دوسرے عنوان سے یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ تکوین وتشریع خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور ہر چند کہ حکم عام ہے۔ تکوین وتشریع کو لیکن تکوین کی حقیقت خود خلق ہے اور یہاں امر اور خلق کو متقابل ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ قرینہ ہے اس کا کہ امر سے مراد امر تکوینی نہیں بلکہ تشریعی ہے یہاں تک الحمد لله الا له الخلق والامر (یادرکھو اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا) کی تفسیر تو واضح ہوگئی۔

علمی اشکال

اب میں تتمیم فائدہ کے لئے اس کے بعد کی آیات کی بھی تفسیر کرتا ہوں کیونکہ ان کو اس مضمون کی تتمیم میں دخل ہے اور اس سے پہلے ایک شبہ کو جو کلام سابق کے متعلق ہے رفع کرتا ہوں جو کہ خلق پر وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ جو معدوم کو موجود کرتے ہیں تو اس کی صورت دوسری آیات میں یہ وارد ہے کہ کن کہہ دیا اور موجود ہو گیا تو کن میں خطاب کس کو ہے کیا معدوم کو امر ہے میرے پاس ابھی ایک خط آیا تھا جس میں یہ سوال تھا کہ کن کس کو کہا جاتا ہے میں نے اس کو تو یہ جواب لکھ دیا کہ ؎

آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ   برنیا بدہ کوہ رایک برگ[1] کاہ

یعنی سوال اپنی حیثیت کے موافق کرنا چاہئے یہ سوال تمہاری قابلیت سے زیادہ ہے مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ سوال لاجواب ہے۔ لاجواب نہیں بلکہ اگر آپ اپنی قابلیت کے بعد ہم سے کہیں کہ لاجواب (لا امر کا صیغہ یعنی پیش کر اس میں صنعت کی رعایت ہے) تو ہم اس کا

---

[1] جو کچھ مانگو اندازہ سے مانگو۔ اُکھاڑ نہیں سکتا پہاڑ کو ایک پتہ گھاس کا۔

جواب دیں گے کہ موجودہ علمی کو یہ خطاب کیا گیا ہے کہ موجود خارجی ہوجا۔ یعنی جو شی خارج میں معدوم ہے وہ معدوم محض نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں موجود ہے پس ایجاد تو معدوم کا ہے۔ اور خطاب اس شئے کو ہے جو موجود ہے اور اس جواب کی ضرورت ایجاد اول میں ہے اور ایجاد ثانی یعنی قیامت کے بعث ونشر میں تو خطاب ایسی شئے کو ہے جو موجود خارجی بھی ہے اور علمی بھی۔ کیونکہ قیامت میں جو عالم معدوم ہوگا تو وہ عدم محض نہ ہوگا۔ بلکہ عدم خاص ہوگا کہ صورت عالم فنا ہوجائے گی۔ مادہ باقی رہے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عدم محض محال عقلی ہے۔ ہرگز نہیں عدم محض بھی حق تعالیٰ کی قدرت سے خارج نہیں وہ اس پر بھی قادر ہیں کہ صورت و مادہ دونوں کو فنا کردیں پھر ایجاد کردیں جیسا ایجاد اول میں ہوا۔ مگر عادۃ اللہ یوں ہی واقع ہے کہ ایجاد اول کے بعد وہ موجود کو معدوم محض نہیں کرتے۔ یہ عادت نصوص سے معلوم ہوئی کہ قیامت میں جو عالم فنا ہوگا وہ فنائے صورت ہے۔ فناء محض نہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں اس طرف اشارہ ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ یَفْنیٰ وَلَا یَبْقٰی مِنْهُ شَیءٌ اِلَّا عُجْبُ الذَّنَب (اوکمال قال) کہ انسان کے کل اجزا فناء ہوجائیں گے مگر ریڑھ کی ہڈی فنا نہ ہوگی۔ قیامت میں اسی ہڈی سے انسان کا تمام جسم بن جائے گا۔ جیسا کہ گٹھلی سے درخت پیدا ہوجاتا ہے گویا یہ جزو بمنزلہ تخم کے ہے۔ شاید کسی کو شبہ ہو کہ جب انسان کو جلا دیا جاوے گا جیسا کہ بعض اقوام مردہ کو جلاتے ہیں۔ تو اس وقت تو ہڈی بھی راکھ ہوجاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو مسلم نہیں کہ سب ہڈیاں راکھ ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ مرگھٹوں میں ہڈیاں دستیاب ہوتی ہیں اور مان بھی لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ ہڈیوں کی راکھ میں جو جزو ریڑھ کی ہڈی کا ہے وہ قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اور ممکن ہے کہ وہ اتنا چھوٹا ہو کہ محسوس بھی نہ ہوتا ہو۔ جیسا کہ جزولایتجزی سو حدیث تو یہ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت یا قیامت سے فناء محض نہ ہوگا، دوسرے ایک آیت یہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ارواح سب کی زندہ رہیں گی۔ ہاں نفخ صور سے ارواح بے ہوش ہوجائیں گی چنانچہ نص میں ہے۔ وَ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الارض۔ اور صعق کے معنی غشی اور بے ہوشی کے ہیں گو فناء بھی مراد ہوسکتا ہے۔ مگر متبادر معنی اول ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ نفخات تین ہوں گے ایک سے ارواح بے ہوش ہوجائیں گی اور دوسری سے تمام عالم مع ارواح کے فنا ہوجائے گا تیسری سے سب زندہ اور موجود ہوجائیں گے تو یہ دعویٰ بلا دلیل اور بلا ضرورت ہے۔ بلا دلیل تو اس لئے کہ نصوص سے صرف دو نفخہ معلوم ہوتے ہیں تین نہیں معلوم ہوتے اور بلا ضرورت اس لئے ہے کہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ نفخہ اولی سے جو فنا ہوگا تو اس کی

صورت یہ ہوگی کہ اجسام فنا ہو جائیں گے اور ارواح بے ہوش ہو جائیں گی پس فنا اجسام کے لئے ہے اور صعق ارواح کے لئے ہے اس تقریر سے بھی نصوص کا تعارض مرتفع ہو سکتا ہے پھر نفحات ثلث کا قائل ہونا بلا ضرورت نیز اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض ارواح بے ہوش بھی نہ ہوں گی، چنانچہ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ (پس آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں وہ بے ہوش ہو جائیں گے) کے بعد اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰہ (مگر جسے اللہ چاہے) مذکور ہے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مشیت استثناء کا وقوف بھی ہوگا چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

فَاِنَّ النَّاسَ یَصْعَقُوْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَاَصْعَقُ مَعَھُمْ فَاَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ یُّفِیْقُ فَاِذَا مُوْسٰی بَاطِشٌ بِجَانِبِ الْعَرْشِ فَلَااَدْرِیْ کَانَ فِیْمَنْ صَعِقَ فَاَفَاقَ قَبْلِیْ اَوْ کَانَ مِمَّنِ اسْتَثْنٰی اللّٰہُ مُتَّفِقٌ عَلَیْہِ

یعنی قیامت میں سب لوگ بے ہوش ہو جائیں گے اور مجھے سب سے پہلے افاقہ ہوگا تو میں موسیٰ علیہ السلام کو عرش کا پایہ پکڑے ہوئے دیکھوں گا اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا وہ بھی سب کے ساتھ بے ہوش ہوں گے پھر مجھ سے پہلے ہوش میں آ جائیں گے یا وہ بے ہوش ہی نہ ہوں گے (کیونکہ وہ ایک بار طور پر بے ہوش ہو چکے ہیں اُس کے عوض آج صعقہ سے محفوظ رہے کما فی روایۃ) اور اُن لوگوں میں داخل ہوئے جن کو اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ فرمایا ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور احتمال کے موسیٰ علیہ السلام کو ان لوگوں میں داخل فرمایا ہے جو صعق سے مستثنیٰ ہوں گے اس سے معلوم ہوا کہ مشیت استثنا کا وقوع ہوگا ورنہ احتمال ثانی صحیح نہ ہوتا یہ تو ایک اشکال علمی تھا جس کو میں نے رفع کر دیا۔

تصرف و حکمت

اب اگلے اجزا آیات کی تفسیر کرتا ہوں۔ الا له الخلق والامر سے ثابت ہو چکا ہے کہ خالق بھی اللہ تعالیٰ ہیں اور حاکم بھی وہی ہیں۔ یعنی پس ان کے ہر تصرف پر راضی رہنا چاہئے۔ کیونکہ ان کو ہر تصرف کا اختیار ہے۔ اس پر یہ ایہام ہوتا ہے کہ ہر تصرف پر راضی ہونا جب ممکن ہے جب کہ ہر تصرف مفید اور گوارا اور موافق مصلحت ہو اور اگر کوئی تصرف مضر یا خلاف حکمت ہوا تو اس پر کون راضی ہوگا۔ ہر چند کہ اس شبہ کا ایک جواب۔ الا له الخلق والامر (یاد رکھو اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا۔ مگر جسے اللہ چاہے) میں بھی آ گیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ غالب علی الحکمت ہیں مغلوب عن الحکمت نہیں وہ اپنے تصرفات و

احکام میں حکمتوں کے تابع نہیں بلکہ حکمت ان کی تصرف کے تابع ہے۔ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ حکمت کو سوچ کر تصرف کریں بلکہ وہ جو تصرف کرتے ہیں حکمت خود ادھر ہی ہو جاتی ہے۔ مگر یہ جواب اذہان عامہ سے بالا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ہمارے مذاق کے موافق گفتگو فرمایا کرتے ہیں۔ اس لئے آگے اس شبہ کا دوسرا جواب دیتے ہیں جو اذہانِ عامہ کے قریب ہے فتبارک اللہ رَبّ العلمین یعنی اللہ تعالیٰ خوبیوں کے بھرے ہیں ان کا کوئی قول و فعل حکمت سے خالی یا حکمت کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے۔ آگے اس کی دلیل مذکور ہے کہ وہ رب ہیں پالنے والے۔ ہیں یعنی ان کو تمہارے ساتھ پالنے کی محبت ہے۔ پھر یہ احتمال کیوں ہے کہ ان کا کوئی تصرف خلاف حکمت یا مضر ہوگا پھر یہاں ربکم کی جگہ رب العلمین فرمایا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ایسے پروردگار ہیں کہ انہوں نے تمہاری تربیت کی یہ صورت کی کہ محض تمہارے واسطے تمام عالم کی پرورش کرتے ہیں۔ بلا تشبیہ یہ شان ہے ؎

کشند از برائے دلے بارہا　　　خورند از برائے گلے خارہا[1]

خدا تعالیٰ بار و خار سے منزہ ہیں یہ شعر صرف اسی معنی کی تشبیہ و توضیح کے لئے پڑھ دیا ہے کہ ایک انسان کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا سامان پیدا کیا ہے اور اتنا بڑا کارخانہ جاری کیا ہے، رہا یہ کہ اس مقدمہ کا کہ سب عالم ہمارے سامنے پیدا کیا گیا ہے۔ یہاں کس لفظ میں ذکر ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن تو سارا ایک ہی کلام ہے اگر یہاں صراحۃً اس کا ذکر نہیں تو دوسری جگہ تو صراحۃً مذکور ہے چنانچہ ارشاد ہے ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعًا کہ تمام چیزیں زمین کی اللہ تعالیٰ نے تمہارے ہی خاطر پیدا کی ہیں۔ وسخر لکم مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیعًا منہ کو تمام چیزوں کو آسمان و زمین کی تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ تسخیر کے وہ معنی نہیں جو تسخیر حب کے اعمال میں سمجھے جاتے ہیں بلکہ یہاں معنی یہ ہیں کہ تمام عالم کو تمہاری خدمت اور تمہاری حاجات پورا کرنے میں لگا رکھا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ سب تمہارے حکم کے مطیع و تابعدار ہیں۔ غرض سب چیزیں انسان کے واسطے پیدا کی گئی ہیں۔ رَبّ العلَمِینَ میں اسی طرف اشارہ ہے اب تو بلا غبار ثابت ہو گیا کہ حق تعالیٰ کا ہر تصرف حکمت کے موافق ہوگا۔

دعا و تفویض

پھر اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب ہر تصرف حق تعالیٰ کا حکمت کے موافق ہے تو اب

---

[1] ایک دل کے واسطے بوجھ اٹھاتے ہیں۔ ایک پھول کے واسطے کانٹے اٹھاتے ہیں۔

تفویض کے ساتھ دعا کیونکر جمع ہوگی بس دعا کو چھوڑ دینا چاہئے، چنانچہ بعض صوفیہ کو جن پر تفویض غالب ہے۔ یہ شبہ ہوا ہے کہ تفویض و دعا جمع نہیں ہوسکتی۔ میں کہتا ہوں کہ دونوں جمع نہ ہو سکتے تو یہاں تفویض و دعا کو جمع کیونکر کیا جاتا کہ اول تعلیم تفویض کی گئی پھر دعا کا امر کیا گیا شاید کہو کہ یہاں ایک جز و ناسخ ہے ایک منسوخ ہے تو میں کہتا ہوں وہ ناسخ موخر ہوگا یا مقدم اگر ناسخ مقدم ہے تو خلاف قاعدہ ہے اور موخر ہے تو دعا مامور بہ رہی تفویض منسوخ ہوگئی اور یہ اجماع کے بھی خلاف ہے اور تمہارے مدعا کے بھی خلاف ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ ناسخ مقدم فی التلاوۃ ہے مگر یہ طالب علمانہ احتمال ہے اور لغو جواب ہے کیونکہ ناسخ کا مقدم ہونا خلاف قاعدہ ہے اس کے لئے کسی خاص دلیل کی ضرورت ہے بدوں دلیل کے ایسا احتمال مسموع نہیں ہوسکتا طلبہ میں یہ مرض یعنی بات کی پچ کرنا معقول پڑھنے کی بدولت پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک طالب علم نے منیۃ المصلی پڑھتے ہوئے جب یہ مسئلہ آیا کہ بال مردار کے بھی پاک ہیں بجز خنزیر کے اور میں نے تبرعاً اس کی تسلی بیان کردی کہ بال میں حیات نہیں اس لئے اس میں موت کا اثر نہیں ہوا۔ اس لئے وہ نجس نہیں ہوا تو اُنہوں نے اعتراض کیا کہ بال میں تو حیات ہے۔ میں نے کہا بال میں حیات نہیں اور یہ جو بعض دفعہ بال کھینچنے میں الم کا احساس ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بال کھینچنے میں کھال بھی کھنچتی ہے اور کھال میں حیات ہے اگر بال قینچی سے اس طرح تراشے جائیں کہ کھال نہ کھنچے تو پھر الم نہ ہوگا تو وہ طالب علم کیا کہتا ہے کہ مجھے تو بال تراشنے میں بھی ایذا ہوتی ہے میں نے کہا اس کا کچھ جواب نہیں۔ اسی طرح حضرت مولانا دیو بندیؒ کے درس میں ایک حدیث میں یہ آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غنیمت تقسیم کرتے ہوئے ایک اونٹ کو دس بکریوں کو برابر کیا تو ایک صاحب بولے کہ یہ تو نعوذ باللہ خلاف عدل ہے مولانا نے فرمایا پھر عدل کی کیا صورت تھی۔ کہنے لگا کہ اونٹ کے بدلہ میں ایک بکری ہوتی۔ مولانا نے فرمایا یہ کہیں دنیا میں بھی ہوا ہے کہ ایک اونٹ کے برابر ایک بکری ہو۔ کہنے لگا جی ہاں ہمارے ملک میں تو اونٹ بکری برابر ہوتے۔ بھلا اس بے ہودگی کی کوئی حد ہے بس ایسا ہی یہ احتمال ہے کہ شاید دعا کا حکم منسوخ ہو۔ غرض دعا اور تفویض جمع ہوسکتی ہے اور جن لوگوں کو اُن میں منافات کا شبہ ہوا ہے ان کو یا شبہ ہوا ہے یا وہ غلبہ حال میں ایسا کہتے ہیں۔ مثنوی میں مولانا نے ان دونوں جماعتوں کے اقوال نقل کئے ہیں ان کے بھی جو دعاء و تفویض میں منافات سمجھ کر تارک دعا ہو گئے اور ان کے بھی جو دعا اور تفویض کو جمع کرتے ہیں

چنانچہ ایک جماعت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کفر باشد نزد شان کردن دعا — کائے خدا از ما بگرداں ایں قضا[1]

کہ ان کے نزدیک دعا کرنا کفر ہے یعنی خلاف تفویض ہے جو کفر طریقت ہے یہ تو مغلوب الحال ہیں اور جو غالب علی الاحوال ہیں وہ یوں کہتے ہیں۔

ہم دعا از تو اجابت ہم زتو — ایمنی از تو مہابت ہم زتو[2]

کہ دعا بھی حق تعالیٰ کی طرف سے ہے قبول بھی اسی طرف سے ہے ہم خود نہیں دُعا کرتے آگے صاف کہتے ہیں۔

چوں خدا از خود سوال و کد کند — پس دُعائے خویشتن چوں[3] رد کند

یعنی جب خدا تعالیٰ خود اپنے ہی سے دعا کریں تو پھر وہ دعا خلاف تفویض کیونکر ہو سکتی ہے خود دعا کرنے کا مطلب یہ کہ ان کی مرضی اور حکم سے دعا کی جاتی ہے اس کو عاشقانہ عنوان سے تعبیر کر دیا۔ یہی مضمون دوسری جگہ ہے۔

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے — یک دہان پنہان است درلبہائے دلے

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما — ہای وہوئی درفگندہ درسما

ماچو چنگم و تو زخمہ می زنی — زاری ازمانے تو زاری میکنی[4]

غرض خدا کا اپنے سے مانگنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو مانگنے کا حکم کیا ہے تو ہمارا مانگنا خدا کے حکم سے ہے اور جو کام حکم سے ہوتا ہے وہ گویا حاکم ہی کا فعل ہے اور اس سے آگے بڑھنا وحدۃ الوجود والوں کو مبارک ہو اگر وہ بے سمجھے بڑھتے ہیں تو گنہگار ہوتے ہیں اور جو سمجھ کر کچھ کہتے ہیں دوسرے تو غلطی میں مبتلا ہوتے ہیں اس لئے ہماری ہمت نہیں۔

مقصود دعا و تفویض

اور سب سے بڑی دلیل دعاء کے شروع ہونے کی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ دعا کرنے کی فعلاً بھی اور قولاً بھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی

---

[1] دعا بھی تیری جانب سے اور قبولیت بھی تیرے جانب سے، بے خوفی تیری جانب سے اور خوف بھی تیری جانب سے [2] بانسری کی طرح دو منہ رکھتے ہیں ہم۔ ایک منہ لبوں کے نیچے اُس کے چھپا ہوا ہے۔
[3] ایک منہ تمہاری طرف پکارتا ہے۔ شور کرتا ہے دنیا میں۔ [4] ہم تو چنگ کی طرح ہیں گو مزارب مارتا ہے۔ ہماری طرف سے روتا نہیں تو روتا ہے۔

صاحب تفویض نہیں ہوسکتا اگر دعا تفویض کے خلاف ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیوں کرتے معلوم ہوا کہ منافی نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کا یہاں تک اہتمام فرمایا ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں ہر حاجت حق تعالیٰ سے مانگوحتی کہ نمک نہ ہے تو نمک بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو تسمہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ادب بتلایا ہے۔ کہ جو بعضوں کی عادت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بڑی ہی چیز مانگتے ہیں اور چھوٹی چیز نہیں مانگتے گویا ان کے نزدیک یہ بڑی چیز تو خدا تعالیٰ سے مانگنے کے قابل ہے اور چھوٹی اس قابل نہیں جس کے یہ معنی ہوئے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں بھی کوئی چیز گراں اور بڑی ہے اور کوئی معمولی اور یہ سمجھنا عظمت حق کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک لاکھ روپے اور نمک کی کنکری برابر ہے ہفت اقلیم کی سلطنت اور جوتی کا تسمہ برابر ہے اگر تم اس کو عظیم سمجھتے ہو تو تم خدا کی عظمت سے خالی ہو ۔سبحان اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم بھی کیسی عجیب تعلیم ہے کہ ادھر تو دعا کا اس قدر اہتمام اور اس کے باریک باریک آداب کی تعلیم فرمائی۔ ادھر تفویض کی بھی تعلیم ہے اور اس کے حقوق بتلائے گئے ہیں معلوم ہوا کہ دونوں میں منافات نہیں۔ محقق کو اسی واسطے جامع بین الضدین کہتے ہیں کہ جو باتیں ظاہر میں اضداد معلوم ہوتی ہیں وہ ان کو سہولت سے جمع کر دیتا ہے۔

برکفے جام شریعت برکفے سندان عشق — ہر ہوسناک نداند جام وسندان باختن

ایک ہاتھ میں شریعت کا جام اور دوسرے میں عشق کا جام ہر ہولناک ان دونوں کے ساتھ بیک وقت نمٹنا نہیں چاہتا۔

غرض آگے اس شبہ کو دفع کیا جاتا ہے کہ تفویض سے ترک دعا لازم نہیں آتا بلکہ ہم حکم دیتے ہیں کہ تفویض کے ساتھ دعا بھی کرو۔ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اپنے پروردگار سے الحاح کے ساتھ دعا کرو ذلت ظاہر کرتے ہوئے بھی اور آہستہ آہستہ بھی میرے نزدیک تضرع و خفیہ (پکارا کرو چپکے چپکے) دونوں کے مجموعہ سے الحاح و اظہار عبدیت مقصود ہے۔ کیونکہ الحاح اظہار بندگی کے وقت لہجہ ایک نہیں رہتا کبھی آواز بلند ہوتی ہے کبھی آہستہ ہوتی ہے اس لئے دو لفظ لائے گئے جس سے اس پر تنبیہ کر دی گئی کہ ایک لہجہ اور ایک وضع کے پابند نہ ہو کیونکہ تقید سے عبدیت و خشوع فوت ہو جاتا ہے اس میں تنبیہ کر دی گئی کہ دعا تفویض کے منافی نہیں کیونکہ تفویض کا منشا بھی عبدیت ہے اور دعا کا منشاء بھی عبدیت ہے بلکہ دعا میں شکستگی اور عجز و نیاز زیادہ ظاہر ہوتا ہے جو عین مقتضائے عبدیت ہے پھر یہ تفویض کے خلاف کیونکر ہو۔ تفویض

کے خلاف تو وہ دعا ہے جس سے مقصود یہ ہو کہ جو ہم نے تجویز کرلیا ہے جو ہم مانگ رہے ہیں وہی ہو جائے تو راضی ہیں ورنہ ناراض ہیں اور جس دعا سے محض اظہار عبدیت مقصود ہو اور دعا کرنے والا دل سے ہر شق پر راضی ہو، کہ خواہ دعا منظور ہو یا نہ ہو یعنی جو مانگا جارہا ہے وہ عطاء ہو یا نہ ہو میں ہر صورت پر راضی ہوں تو یہ دعا تفویض کے خلاف کیونکر ہوسکتی ہے۔ پس **تضرعا و خفیہ** (پکارا کرو چپکے چپکے) کے بڑھانے سے متنبہ کردیا گیا کہ دعا اظہار عجزت وعبدیت کے لئے ہونا چاہئے اور خفیہ کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تضرع سے مراد اعلان ہے مگر بعض دفعہ اعلان میں بے ادبی کا لہجہ ہو جاتا ہے اسی لئے رفع صوت عند النبی کی ممانعت ہے تو اعلان کو تضرع سے تعبیر کر کے بتلا دیا گیا ہے کہ دعا اعلاناً ہو تو تذلل کے ساتھ ہو۔

خلاف تفویض دعاء

آگے ارشاد ہے **انه لا يحب المعتدين** (اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو ناپسند کرتا ہے) اس میں متنبہ کردیا گیا ہے کہ دعا کے لئے حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرنا چاہئے مثلاً دعا میں استعجال نہ کرے۔ عدم ظہور اثر سے گھبرائے نہیں اور حرام چیزوں کی دعا نہ کرے اور مستحیل عادی وعقلی کی دعا نہ کرے جیسے یوں کہنے لگے کہ اے اللہ مجھے نبی کردے وغیرہ وغیرہ کیونکہ نبوت مانگنے سے نہیں ملا کرتی، افسوس نبوت ایسی تو چیز مانگے سے بھی نہیں ملتی اور بعض لوگ آج کل اس کے مدعی ہیں کہ ان کو بے مانگے اور بے دیئے ہی نبوت مل گئی ہے۔ بس میں تو ان کے بارہ میں یہ کہتا ہوں ؎

وقوم یدعون وصال لیلیٰ وَ لیلی لا تقرلهم بذاكا. انه لا يحب المعتدين[1]

میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تفویض کے خلاف وہ دعا ہے جو حدود سے متجاوز ہو اور جو دعا حدود شرعیہ کے اندر ہو تو چونکہ وہ حدود اسی ذات کے مقرر کردہ ہیں جس نے تفویض کا امر کیا اور تفویض کے حدود مقرر کئے ہیں، اس لئے ان حدود مقررہ کے اندر جو دعا ہوگی وہ تفویض کے خلاف کس طرح نہ ہوگی۔

تصرف بلا واسطہ

اب ایک شبہ اور رہا کہ جب تفویض کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہر تصرف پر راضی رہنا چاہئے تو پھر گناہ پر راضی رہنا چاہئے کیونکہ وہ بھی تصرف حق ہی ہے اس شبہ کو رفع کرتے ہیں

---

[1] اور ایک قوم وہ جو وصال لیلیٰ چاہتی ہے اور اس وصال کو ان کے قریب بھی نہیں ہونے دیتی۔

کہ خبردار گناہ مت کرنا ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا کہ زمین میں فساد نہ کرنا بعد اس کے کہ اس کی درستی کردی گئی ہے۔ مطلب یہ کہ گناہ موجب فساد ہے اور ہم نے فساد کو نبوت اور تشریع احکام کے ذریعہ سے ممنوع قرار دیا ہے پس اب تم اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔ اور گو گناہ بھی خدا کا پیدا کیا ہوا ہے کیونکہ خالق خیر وشر وہی ہے مگر یہ تصرف بلا واسطہ حق تعالیٰ کا تصرف نہیں بلکہ اس کے اندر تم واسطہ ہو کیونکہ بندہ کا سب افعال ہے اور واسطہ مذموم ہے اور گناہ میں بندہ کے واسطہ ہونے پر لا تفسدوا میں خطاب کے صیغہ سے بھی دلالت ہو رہی ہے خلاصہ تعلیم کا یہ ہوا کہ تفویض کے معنی یہ ہیں کہ جو تصرف حق تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ ہو اُس پر راضی رہو، اور جو تصرف ایسا ہو جس میں تمہارے فعل قبیح کا واسطہ ہو اُس پر راضی ہونا بایں معنی کہ گناہوں پر جرأت کرنے لگو اور اُن سے بچنے کا اہتمام نہ کرو۔ تفویض نہیں۔

امن عامہ

اور اوپر جو میں نے کہا ہے کہ بعد اصلاحھا کے معنی یہ ہیں اور امر ونواہی کے نزول اور نبی کے مبعوث ہونے سے زمین کی اصلاح کردی گئی اس میں ایک بڑے مسئلہ کا فیصلہ ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ اوامر شرعیہ پر عمل کرنا اور نواہی شرع سے بچنا یہ جڑ ہے امن کی اور یہی رافع ہے فساد کا اور آج کل یہ مسئلہ ہندوستان میں مختلف فیہ ہو رہا ہے کہ امن کی کیا صورت ہونا چاہئے کوئی کہتا ہے کہ امن کی صورت یہ ہے کہ رافضی کچھ مسائل سنیوں کے لے لیں اور سُنی کچھ مسائل رافضیوں کے مان لیں۔ بدعتی کچھ باتیں اہلِ حق کی لے لیں۔ اہلِ حق کچھ باتیں بدعتیوں کی مان لیں کوئی کہتا ہے کہ گائے کی قربانی بند کردو۔ اس سے امن ہو جائے گا مگر قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ اوامر الٰہیہ کی پابندی کرو نواہی سے بچتے رہو۔ بس یہی صورت اصلاح ہے زمین میں امن اسی سے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو صورت ہے وہ فساد کی صورت ہے مگر افسوس لوگ خدا کی تعلیم کو چھوڑ کر اپنی طرف سے نئی صورتیں امن کی گھڑتے ہیں۔

منشاء تفویض

اب یہ شبہ بھی رفع ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ گناہ پر راضی ہونا تفویض نہیں۔ اب گناہ سے منع کرنے کے بعد طاعات کا امر فرماتے ہیں وادعوہ خوفا و طمعا کہ اللہ کی عبادت کرو۔ خوف و رجاء کے ساتھ یعنی عبادت کر کے نہ تو ناز ہو نہ مایوس ہو۔ ناز تو جب ہوتا ہے کہ اپنی عبادت کو کامل سمجھے

اور مایوسی جب ہوتی ہے کہ اپنی عبادت کو بالکل ہی بے کار سمجھے۔ حاصل تعلیم کا یہ ہوا کہ نہ تو عبادت کو ایسا کامل سمجھو کہ ناز کرنے لگو نہ ایسا ناقص سمجھو کہ بیکار سمجھنے لگو اس میں بتلا دیا گیا کہ تفویض کا مقتضی یہ ہے کہ عبادت میں لگو اور گناہوں سے بچو کیونکہ تفویض کا منشاء ادائے حق الوہیت ہے اور اظہار عبدیت اب تم خود سمجھ لو کہ اس کا مقتضا یہ ہوسکتا ہے کہ خدا کی نافرمانی کرو یا یہ ہوسکتا ہے کہ اُس کی عبادت میں مشغول ہو یقیناً ہر عاقل یہی کہے گا کہ عبدیت کا مقتضا اطاعت ہے نا کہ معصیت آگے اطاعت کی مزید ترغیب ہے۔ ان رحمة الله قریب من المحسنین کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بلاشبہ نیک کاروں سے قریب ہے۔ پس تم کو احسان کی کوشش کرنا چاہئے تا کہ رحمت تم سے قریب ہو۔

شرط احسان

یہاں سے میں بعض لوگوں کی غلطی کا متنبہ کرتا ہوں۔ بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ احسان یعنی اخلاص یہ ہے کہ عبادت وخوف ورجا کے ساتھ نہ ہو بلکہ محض رضا کے لئے ہو اس کے بعد یہ لوگ ڈینگے ہانکتے ہیں کہ ہم کو جنت کی کیا پرواہ ہے دوزخ کی کیا پرواہ ہے یہ سخت بے ادبی ہے اور ان کا یہ دعویٰ خود اس آیت سے رد ہوگیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں خوف وطمع کے ساتھ عبادت کا حکم فرمایا ہے اور اس پر احسان کو متفرع کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ احسان یہی ہے کہ عبادت خوف وطمع کے ساتھ ہو۔ خوف وطمع احسان کے منافی نہیں۔ بس اخلاص کے لئے شرط یہ ہے کہ عمل میں دنیا کی کوئی غرض نہ ہو۔ یہ شرط نہیں کہ خوف وطمع اخروی بھی نہ ہو جب اصل دعویٰ ہی غلط ہے تو اس پر جو باتیں متفرع ہیں کہ جنت سے لاپروائی اور دوزخ سے عدم مبالات ظاہر کی جاتی ہے ان کا گستاخی ہونا ظاہر ہے مگر یہ سب باتیں میں غالین کے بارہ میں کہہ رہا ہوں۔ غالین یعنی حالیین کے بارہ میں نہیں کہہ رہا جو مغلوب الحال ہیں وہ حضرات مستثنےٰ ہیں اگر جنت سے لاپروائی یا دوزخ سے عدم مبالات ان کے کلام میں نظر سے گزرے تو اُن پر اعتراض نہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ حضرات باطن میں سب سے بڑھ کر باادب ہیں گو ظاہر میں بے ادب معلوم ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں اہل سکر کے بارہ میں جن کی زبان سے خلاف ادب باتیں نکل جاتی ہیں کہ ؎

بے ادب ترنیست زوکس در جہاں ۔۔۔ با ادب ترنیست زوکس در نہاں[1]

[1] اس سے زیادہ بے ادب دنیا میں کوئی نہیں۔ اندرونی طور پر اس سے زیادہ باادب کوئی نہیں۔

اور اہل صحو کے بارہ میں ارشاد فرماتے ہیں جو باوجود صحو کے ایسی بے تمیزی کی باتیں بناتے ہیں ؎

از خدا جوئیم توفیق ادب	بے ادب محروم ماند از فضل رب[۱]
بے ادب تنہا نہ خود را ورشت بد	بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد[۲]
ہر کہ گستاخی کند اندر طریق	باشد او درجہ حیرت غریق[۳]
از ادب پر نور گشت ست ایں فلک	وزادب معصوم و پاک آمد ملک[۴]
بدز گستاخی کسوف آفتاب	شد عزاز یلے زجر آت ردباب[۵]

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومے کہ چشمان دوختند	از سخن با عالمے را سوختند[۶]

بھلا جو شخص ایک ادنیٰ مخلوق سے بھی صبر نہ کر سکے۔ بیوی بچوں سے بھی صبر نہ کر سکے اس کا کیا منہ ہے جو جنت سے لاپروائی ظاہر کرے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ایک صبرت نیست از فرزند و زن	صبر چوں داری زرب ذوالمنن[۷]
ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں	صبر چوں داری زنعم الماجد ون[۸]

بحمد اللہ اب سب شبہات مرتفع ہو گئے جس کے بعد مضمون **الا له الخلق والامر** یعنی مضمون تفویض مکمل ہو گیا۔

حاصلِ مضمون

خلاصہ پھر عرض کرتا ہوں کہ **الا له الخلق والامر** میں تفویض کا امر ہے اس پر شبہ ہوا کہ جب تصرف مضر خلاف حکمت ہو تو اس پر کیونکر راضی رہیں۔ **فتبارک الله احسن**

---

۱ خدا سے ادب کی توفیق طلب کرتے ہیں ہم بے ادب محروم رہا خدا کے فضل سے۔
۲ بے ادب اپنے جو سطن بُرا نہیں کرتا۔ بلکہ ساری دنیا میں آگ لگا دیتا ہے۔
۳ جو شخص راستہ میں گستاخی کرتا ہے وہ گہرے دریا میں غرق ہو جاتا ہے۔
۴ ادب سے دنیا روشن ہے اور ادب کی وجہ سے فرشتہ بے گناہ اور پاک ہیں۔
۵ سورج کا گہن ہونا گستاخی کا بدلہ ہے۔ شیطان بے ادبی کی وجہ سے پھٹکارہ گیا۔
۶ اے وہ قوم ظالم ہے جو آنکھیں بند رکھ کر باتوں سے دنیا کو جلاتی ہے۔
۷ اے وہ شخص تو صبر نہیں کر سکتا اپنے متعلقین سے اللہ تعالیٰ سے کس طرح صبر کر سکتا ہے۔
۸ اے شخص تجھ کو کمینی دنیا سے صبر کی طاقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے کس طرح صبر کر سکتا ہے۔

الخالقین (کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے) سے اس کو دفع کیا گیا پھر شبہ ہوا کہ تفویض کے ساتھ دعا نہ کرنا چاہئے۔ دعا اس کے خلاف ہے۔ **ادعوا ربکم تضرعا وخفیة انه لا یحب المعتدین** (تم اپنے پروردگار کو پکارا کرو اور چپکے چپکے پکارو اور بے شک وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا) میں اس کو دفع کیا گیا اور بتلا دیا کہ دعا عین مقتضائے عبدیت ہے اور تفویض کے خلاف وہ دعا ہے جو حدود سے متجاوز ہو اس کے بعد شبہ ہوا کہ پھر گناہ بھی ایک تصرف ہے اس پر بھی تفویض کر کے راضی رہنا چاہئے۔ **ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها** (اور تم زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ پھیلاؤ) میں اس کو رفع کیا گیا اور بتلا دیا گیا کہ یہ خدا کا تصرف بلا واسطہ نہیں۔ بلکہ تم اس کے اندر واسطہ ہو۔ پھر طاعت کی ترغیب دی اور اُس پر ترتب رحمت کی بشارت دی۔ حاصل یہ ہوا کہ جو تصرفات اللہ تعالیٰ کے ایسے ہیں جن میں تمہارے اختیار و ارادہ کو دخل نہیں اُن میں تفویض وفنائے تجویز و رضا سے کام لو۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق دیں اور فہم سلیم عطا ہو۔

وَ صَلَّى اللّٰهُ علٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

اشرف علی
۱۳ ذیقعدہ ۴۷ھ

شکر السوانح

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ للّٰهُ فَلا مُضِلَّ لَهٗ وَ مَنْ يُّضْلِلْهُ فَلا هَادِىَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ. اَمَّا بَعْدُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ .قَالَ اللّٰهُ حِكَايَت عَن دعاء ابراهيم عليه السّلام وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ .

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک دعا کی حکایت ارشاد فرمائی کہ اے اللہ ایک دُعا میں یہ بھی کرتا ہوں کہ میرے نفع کے لیے آئندہ آنے والے لوگوں میں میرا ذکرِ خیر جاری رکھئے۔ (الشعراء آیت نمبر۸۴)

تمہید

قبل بیان آیت اس وقت بیان کا داعی ذکر کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ بعض احباب نے اس احقر کے کچھ حالات کچھ مقالات ملقب بہ اشرف السوانح اس غرض سے جمع کئے ہیں کہ مطالعہ کرنے والوں کو اور بالخصوص اُن میں جو احقر سے دینی تعلق رکھتے ہیں۔ علمی و عملی نفع ہو اور وہ نفع مدت طویلہ تک جس کی حد اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ باقی رہے۔ ہر چند کہ میرے حالات و مقالات قابل نفع کے نہیں۔ نیز پہلے سے ہر قسم کا ذخیرہ علمی و عملی امت کے ہاتھ میں موجود ہے۔ جو جدید ذخیرہ سے مغنی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی بناء برحدیث انا عند ظن عبدی بی (حق سبحانہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں بندہ کے گمان کے زیادہ قریب ہوں جیسا وہ میرے بارے گمان کرتا ہے) سنۃ اللہ یہ ہے کہ

جس شخص کے ساتھ حُسن ظن ہوتا ہے اور اس کے حالات و مقالات سے ظن نفع ہوتا ہے اس سے حصول نفع میں خاص سہولت ہوتی ہے۔ اسی توقع پر احقر نے بھی اُن کے اس فعل میں مزاحمت نہیں کی۔ گو یہ فعل میری وصیت مدونہ نیز میری طبیعت کے خلاف بھی ہے۔ مگر اُسی توقع مذکور پر اُن کی اس مخلصانہ خدمت طالبین کو گوارا کر لیا گیا۔ اس کے داعی اور موانع پھر ارتفاع موانع کا مفصل ذکر رسالہ اشرف السوانح کے خطبہ میں موجود ہے۔ اس وقت میں اس رسالہ کے اختتام کی خبر دے رہا ہوں۔ اور اسی کے متعلق اس آیت کا مختصر مضمون جو اس کے مناسب ہے بیان کر رہا ہوں۔

ذکرِ خیر

وہ مضمون یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک دعا کی حکایت ارشاد فرمائی ہے اور چند دعائیں اس کے آگے پیچھے کی آیات میں بھی مذکور ہیں۔ مگر اس وقت میرا زیادہ مقصود صرف اس آیت کے متعلق بیان کرنا ہے کہ وہ میری غرض کے زیادہ مناسب ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت حق میں عرض کر رہے ہیں کہ اے اللہ! ایک دعا میں یہ بھی کرتا ہوں کہ میرے نفع کے لئے (یہ مدلول ہے لام کا) آئندہ آنے والے لوگوں میں ذکر خیر یا بعنوان دیگر نام نیک جاری (اور باقی) رکھئے اھ یہ ذکر خیر ترجمہ ہے لسان صدق کا اس طرح کہ لسان سے مراد ذکر ہے بطور اطلاق سبب علی المسبب کے اور صدق بمعنی صادق مبالغۃً اور صادق سے مراد حسن یعنی نیک جس کو میں نے اتباعاً للمحاورۃ لفظ خیر سے تعبیر کیا ہے۔ حسن اور خیر لغۃً بھی متقارب ہیں اور یہی حاصل ہے نام نیک کا اور حسب نقل مفردات راغب ہر فعل فاضل کو ظاہری ہو یا باطن صدق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر جس فعل کو اُس سے موصول کرنا ہوتا ہے اس کو صدق کی طرف مضاف کر دیا جاتا ہے۔ جیسے فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ (عمدہ مقام میں) اور اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ (بلاشبہ ان کے لیے ایک اچھا مرتبہ ہے) اور اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ اور لِسَانَ صِدْقٍ (اے اللہ لے جا میرے اندر لے جانا ہے صاف اور نکال مجھے نکالنا صاف) جس کا حاصل یہ ہے کہ اے اللہ! مجھ کو ایسا صالح کر دے کہ اگر بعد والے میری ثنا کریں تو وہ ثنا اور ذکر صادق ہو اھ۔ یہ علاقہ ہے صادق کے معنی لغوی حقیقی اور معنی منقول فاضل و حسن میں اور اس توجیہ کی بناء پر اس میں اشارہ ہے طلب اوصاف جمیلہ کی طرف بھی جس سے حکایت و محکی عنہ میں تطابق ہو جاوے اور لسان صدق میں موصوف کی اضافت ہے صفت کی طرف جیسا ایک دوسری آیت وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا (اور ہم نے ان کا نام نیک اور بلند کیا) میں بعینہٖ یہی ترکیب ہے مگر اس میں ایک دوسری صفت بھی ہے لسان کی یعنی عَلِيًّا کی اور وہ صفت بصورت وصف ہے بصورت اضافت نہیں اور اس دوسری آیت

میں گویا خبر ہے اجابت دعائے ابراہیمی کی جس میں ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جن کا اوپر سے ذکر چلا آ رہا ہے۔ اُن کے ایک فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام اور ایک پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کو بھی شامل فرمالیا گیا۔ باقی اُن کے دوسرے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کا اس جگہ ذکر نہ فرمانا اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ وہ حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے پہلے عطا ہو چکے تھے بعد والوں کے ذکر سے قبل والے کا ذکر بدلالت عادت خود ہی مفہوم ہو جاتا ہے جبکہ بنائے ذکر مشترک ہو۔ دوسرے اُن کا ذکر انفراداً آئندہ قریب آنے والا بھی ہے جو اشتراکاً ذکر کرنے سے مغنی ہے۔

تیسرے ابراہیم علیہ السلام کے ذکر سے جیسا عرب کا استجلاب قلب ہوا اسحٰق علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام کے ذکر سے اہل کتاب کا استجلاب قلب مناسب ہے اور اسی نکتہ کی وجہ سے اس کی متصل موسےٰ علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ پھر اُن کے بعد اسماعیل علیہ السلام کا ذکر آوے گا۔ واللہ اعلم باسرار کلامہٖ۔

اور ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں جو کہ قیامت تک باقی اور متلو ہے کسی کا ذکر خیر ہونا بقاء ذکر فی الآخرین کو مستلزم ہے۔ بہر حال ان سب کو یہ نعمت عطا کی گئی ۔ جو دلیل ہے اجابت دعائے ابراہیمی کی مع زیادت تعدیہ الی اولاد کے۔ غرض ابراہیم علیہ السلام کے اس دعا کے مانگنے سے معلوم ہوا کہ بقاء ذکر خیر فی الاخرین ایک بڑی نعمت ہے جو قابل طلب ہے اور گو اس نعمت کا تعلق بظاہر باعتبار محل وقوع نشاۃ دنیویہ کے ساتھ ہے۔ لیکن اس کا دوسری خالص دینی دعا ن سے محفوف ہونا (چنانچہ اس کے قبل دعا ہے) **رب هب لی حکماء والحقنی بالصالحین** (اے میرے رب مجھ کو حکمت عطا کر اور مجھ کو ساتھ شامل کر)

جس میں حکمت یعنی جامعیت بین العلم والعمل میں اعلیٰ درجہ کا کمال اور مراتب زیادت قرب میں اعلیٰ درجہ کے صالحین یعنی انبیاء عالی شان علیہم السلام کے ساتھ شامل فرمانا طلب کیا گیا ہے تو یہ قبل کی دعائیں ہیں اور اس کے بعد دعا ہے۔

وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ (مجھ کو جنت نعیم کے مستحقین میں سے کر دیجئے)

جس میں جنت نعیم کا وارث یعنی مستحق ہونا طلب کیا گیا ہے اور ان دعاؤں کا خالص دینی ہونا ظاہر ہے بس اس دعائے (بقائے ذکر فی الآخرین کا ایسی دعاؤں سے محفوف ہونا) قرینہ قویہ ہے کہ اس دعا کا تعلق بھی باعتبار محل ظہور ثمرہ حقیقت میں دین ہی کے ساتھ ہے جس کی طرف کلمہ لی کے لام میں اشارہ قریب بصراحت ہے کیونکہ لام نفع کے لئے ہے اور ظاہر ہے کہ بعد والوں میں جو کہ مدلول آخرین کا کسی کا ذکر خیر رہنا اس مذکور کے کسی نفع دنیوی کا سبب نہیں ہوسکتا۔ پس لامحالہ وہ نفع دین ہی کا ہے اور وہ ثواب ہے یعنی وہ لوگ۔ میرے طریقہ پر چلیں جس میں مجھ کو زیادہ ثواب ملے۔

اسی کو ایک آیت یعنی

اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ (بے شک ہم مردوں کو زندہ کریں گے اور ہم لکھتے جاتے ہیں وہ اعمال بھی جن کو آگے بھیجے جاتے ہیں)
میں آثار سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ حدیث۔
من سن سنة حسنة الخ (اور جس نے اچھا طریقہ جاری کیا)
کی تائید میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اس آیت کو تلاوت فرمانا کَمَا فِی الدُّرِّ الْمَنْثُوْر عن ابن ابی حاتم) اس نفع تفسیر بالثواب کی صاف دلیل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ یہ بقاء الذکر فی الآخرین بھی ایک بڑی دینی نعمت ہوئی اور نعمت کے تمام افراد بشرط عدم المانع الشرعی اوالعقلی مطلوب ہیں۔
كَمَا قَالَ تعالیٰ فی محل المن وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً
(اور تم پر ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کیں)
خصوص دینی نعمت اسی شرط مذکور سے اوروں سے زیادہ مطلوب ہوگی اور نعمت بقاء ذکر فی الآخرین کے لئے موانع مذکورہ میں سے کوئی مانع نہیں پس وہ مطلقاً محبوب ہوگی۔ خصوص جب اس کے ضمن میں اُس ذکر کا مطابق واقع کے ہونا بھی ملحوظ ہو۔ كَمَا سَبَقَ عَنْ مُفْرَدَاتِ الرَّاغِبُ۔

تدوین حالات

اور اس مطلوب کی تحصیل کی مختلف صورتیں ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک صورت کسی شخص کے حالات و مقالات کی تدوین و اشاعت بھی ہے جو عادۃً ذریعہ ہے۔ مدت دراز تک اس شخص کے بقاء ذکر کا جو سبب ہوگا اس شخص مذکور کے لئے دعا کا اور افعال قابلہ للا تباع میں اقتدار کا اور مسلمین شہداللہ فی الارض (زمین میں اللہ کے گواہ) کے حسنِ ظن کی برکت سے جس کی دوسری تعبیر
لو اقسم علی اللّٰہ لا برعه اور او الحق معه حیث دار
(یعنی اگر اللہ تعالیٰ پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ پوری کردیں اور اللہ تعالیٰ انکے ساتھ حق کو گھما دیتا ہے اُن کے ساتھ جہاں وہ گھوم سکیں)
ہے شخص مذکور کے جبر نقص اور تکمیل عطا کا اس کی حیات میں توفیق حسنات سے اور بعد حیات تکفیر سیئات رفع درجات سے۔ پس اس بناء پر ساعی فی التدوین و ساعی فی النشر اس مجموعی نعمت باقسامہا کے یقیناً وسائط ہوں گے۔

شکریہ

رسالہ اشرف السوانح میں میرے لئے اسی نعمت کا سامان کیا گیا ہے۔ تو اس کی تدوین و نشر کے ساعی میرے لئے وسائط نعمت ہوئے اور بعد شکر منعم حقیقی کے (کہ وہ بالذات و اولاً

مشکور ہیں) واسطہ نعمت کا شکریہ بھی بالعرض وثانیاً مامور بہ ہے چنانچہ حدیث میں ہے۔

مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهِ

(جو شخص لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا اللہ کے شکریہ سے بھی سبکدوش نہیں ہوسکتا)

اور اس شکر کا ایک طریق ایک حدیث میں دعا وثناء بھی وارد ہے۔

ولفظه من صنع اليه معروف فقال لفاعله جزاک اللّٰهُ خَيْرًا فقد ابلغ فی الثناء رواه الترمذی (مشکوة فی باب بعد باب العطايا)

(جس شخص نے اس کی طرف احسان کیا اور اس نے احسان کرنے والے سے کہا اللہ تعالیٰ مجھے نیک اور اچھا بدلہ دے۔ تو اس نے تعریف میں کوتاہی نہیں کی)

اس لئے میں اس جلسہ میں ایسے صاحبوں کے لئے بھی دعا کرتا ہوں جو ثناء پر بھی دال ہے (**کما فی الحدیث المذکور آنفا**) اور دوسرے حضرات سے بھی اس دعا کی درخواست کرتا ہوں اور چونکہ تدوین خود نشر کی بھی اساس ہے اس لئے صاحب تدوین کے لئے (دعا کے علاوہ جس میں صاحب نشر کا بھی اشتراک ہے) ایک سند دینا بھی جو بشکل کلاہ ہے تجویز کرتا ہوں جس پر ایک مناسب شعر بھی مع سنہ رواں لکھا ہے جیسا اس کے قبل بھی ایک دوست کے لئے مثنوی کے ایک حصہ کی شرح کی یادگار میں ایک ایسا ہی طریقہ اختیار کر چکا ہوں جس کا مفصل تذکرہ وعظ شکر المثنوی میں ہے اور اُسی وعظ کے نام کی مناسبت سے اس تقریر کا نام بھی شکر السوانح تجویز کیا گیا۔

اب تقریر کو ختم کرتا ہوں اور حاضرین و ناظرین سے مکرر دعائے مذکور فی التقریر کی اور اُس کے ساتھ اپنے لئے دعا کی درخواست کرتا ہوں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ علٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

کتب فی مقام تهانه بهون. فی اخر ايام التشريق و قرئ فی خمس و عشرين من ذی الحجه اخر جمعه منه ۱۳۵۴ھ۔

سُبْحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝

وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

اعانۃ النافع

تفویض کی حقیقت کے بارے میں یہ وعظ ۱۲ ذیقعدہ ۱۳۳۵ھ بروز جمعہ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں ہوا۔ جو حضرت والا نے بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً سو تھی۔ مولوی اشفاق الرحمٰن صاحب نے اسے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ .اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ للّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلَّمْ. اَمَّا بَعْدُ فقد قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم فی حدیث طویل فاعنی علیٰ نفسک بکثرۃ السجود[1]

(ایک طویل حدیث میں فرمایا کہ کثرت سجود یعنی کثرت نماز سے تم میری اعانت کرنا)

تمہید

یہ طویل حدیث کا ایک جملہ ہے اس میں کسی صحابی کو خطاب ہے (وہ ربیعہ بن کعب ہیں ۱۲ جامع) مجھے اس وقت یاد نہیں اور یہ مضمون پہلے سے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ ورنہ کتاب دیکھ لیتا کہ حدیث میں یہ خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس کو فرما رہے ہیں اگر کاتب بعد میں مجھے یاد دلا دیں گے تو اس وقت اسے لکھوا دوں گا۔ مگر جتنا جزو مقصود ہے وہ اس وقت بھی مستحضر ہے۔

اور اس جزو کا حاصل یہ ہے کہ ایک صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت کی درخواست کی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شفاعت کا وعدہ فرمایا (حدیث میں مرافقت فی الجنۃ کا سوال ہے اس کا طریقہ بھی سفارش ہی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی کا وعدہ فرمایا تھا ۱۲ جامع) مگر ساتھ میں اُن سے یہ بھی فرمایا کہ تھوڑا سا تم بھی سہارا لگانا کثرت سجود سے یعنی نماز سے۔ مطلب یہ ہے کہ کثرت سے نماز پڑھنا تا کہ اس سے تم میں سفارش کی اہلیت اور

---

[1] عن ربیعۃ بن کعب قال کنت ابیت مع رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتیتہ بوضوئہ وحاجتہ فقال لی سل فقلت اسئلک مرافقتک فی الجنۃ قال او غیر ذالک قلت ھو ذاک قالَ فاعنی علےٰ نفسک بکثرۃ السجود رواہ مسلم باب السجود و فضلہ ۱۲ ۔

قابلیت پیدا ہو جاوے اور میں تمہاری سفارش کر سکوں تو میری اعانت کثرت سجود سے کرنا۔

فضیلت طولِ قیام یا کثرتِ سجود

علماء کا اس مقام پر ایک اختلاف بھی ہے کہ طول قیام افضل ہے یا کثرت سجود یعنی رکعتیں مختصر مختصر کر کے تعداد میں زیادہ پڑھنا افضل ہیں یا یہ افضل ہیں کہ رکعتِ تعداد میں خواہ کم ہوں مگر بہت طویل ہوں۔ غرض یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے مگر مجھے اس اختلاف کی بابت کچھ بیان کرنا نہیں۔ دو وجہ سے اول تو اس وجہ سے کہ میرا یہ مقصود نہیں۔ دوسرے اس وجہ سے بھی کہ مولانا محمد یعقوب صاحب سے اس مسئلہ میں ایسا فیصلہ سُن چکا تھا کہ جس سے مجھ کو دونوں مذہب میں کسی قسم کا اختلاف نہیں معلوم ہوتا اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر ایک دوسری سے من وجہ افضل ہے جس وقت جس کو دل زیادہ چاہئے اور جس سے دلچسپی اور رغبت وشوق ہو اس پر عمل کریں جس وقت طول قیام مرغوب ہو اُسے اختیار کرے اور جس وقت کثرتِ سجود محبوب ہو اس وقت اس پر عمل کرے۔ حاصل فیصلہ یہ ہے کہ ہر ایک میں دوسرے کے اعتبار سے فضیلت ہے۔

خواص کی غلطی

بہر حال ان دونوں وجہ سے اس مسئلہ کی تحقیق اور تنقیح مقصود نہیں بلکہ مقصود نہیں۔ بلکہ مقصود بالبیان یہ ہے کہ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسئلہ ضرور یہ بیان فرمایا ہے اور وہ مسئلہ حدیث سے ادنیٰ توجہ کے ساتھ مستنبط ہوتا ہے کیونکہ یہ حدیث اُس مسئلہ پر بدلالۃ النص دال ہے۔ مگر باوجود اتنی واضح دلالت کے اس مسئلہ کے سمجھنے میں اور اُس پر عمل کرنے میں بہت کوتاہی کی جاتی ہے اور کوتاہی بھی عوام کی نہیں بلکہ خواص کی عوام کی کوتاہی تو اس قدر قابل اہتمام نہیں جس قدر خواص کی کوتاہی قابل اہتمام ہوتی ہے۔ جس کی دو وجہ ہیں اول وجہ تو یہ ہے کہ خواص کی کوتاہی متعدی ہوتی ہے۔ برخلاف عوام کے کہ ان کی کوتاہی لازمی ہوتی ہے تو خواص کی غلطی کا اثر دوسروں پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ مشہور ہے

زَلّ العالِم زلُّ العالَم کہ عالِم کی لغزش اور غلطی عالَم کے لئے لغزش اور غلطی ہے۔

سلف کی خوبی

امام ابوحنیفہ کی حکایت ہے کہ ایک لڑکا تیزی کے ساتھ چلا جا رہا تھا امام صاحبؒ نے فرمایا کہ صاحبزادہ سنبھل کر چلو گر پڑو گے۔ وہ لڑکا بولا کہ آپ سنبھل کر چلیں۔ اس لئے کہ آپ کے سنبھلنے

سے عالم سنبھل جائے گا اور آپ کے بگڑنے سے عالم بگڑ جائے گا۔ اور میرے گرنے تو صرف مجھ ہی پر اثر ہوگا۔ امام صاحبؒ بچہ سے یہ بات سُن کر بہت متاثر ہوئے اُن حضرات میں یہ خوبی تھی کہ

لا تنظر الی من قال وانظر الی ما قالَ پر پورا عمل تھا۔ یعنی وہ حضرات قائل کو نہیں دیکھتے تھے۔ بات کو دیکھتے تھے۔ کہ کس درجہ کی ہے۔

یہاں یہ کیفیت ہے کہ چھوٹوں کی بات پر تو کیا ہی عمل کرتے۔ چھوٹوں کی باتوں کو تو کان لگا کر سنتے بھی نہیں۔ بلکہ بڑوں کی باتوں کو بھی نہیں سنتے اور بڑوں کے ارشاد پر بھی عمل نہیں کرتے۔ ایک مولوی صاحب مفتی تھے۔ فرماتے تھے کہ میرے پاس جب کوئی فتویٰ بغرض تصحیح آتا ہے تو میرا جی دستخط کرنے کو نہیں چاہتا۔ بلکہ حتی الوسع اسی کی سعی رہتی ہے کہ مخالفت کروں۔ ہمارا یہ مذاق ہوگیا ہے اللہ اکبر کہ حق کی موافقت سے بھی عار ہے۔

اب تو مرید بھی پیروں پر ردوقدح کرنے لگے۔ حالانکہ یہ فرقہ سب سے زیادہ فانی اور مؤدب تھا۔ مگر اب تو وہ بھی یوں چاہتے ہیں کہ ہماری ہی بات غالب رہے۔ چنانچہ شیخ اگر کسی بات پر تنبیہ کرے اولاً تو اپنی خطا کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اور اگر تسلیم بھی کر لیتے ہیں تو صاف اقرار غلطی کا نہیں کرتے۔ بلکہ منشا اشتباہ کو ایسے انداز سے بیان کرتے ہیں جس سے غلطی میں بُعد نہ رہے اور سُبکی نہ ہو۔ افسوس آج کل یہ کیسا مادہ پیدا ہوگیا ہے کہ اپنی بات بنانے اور اپنے پہلو کو اونچا رکھنے کا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات میں لکھا ہے۔

وکانَ وَقَّافًا عند کتاب اللّٰہ یعنی کسی ایسی تحقیق کے بعد جس میں آپ کے قول کا نص سے تعارض بھی نہ ہوتا تھا۔ اگر کوئی شخص کتاب اللہ کی آیت پڑھ دیتا تو آپ ادب سے فوراً سکوت فرما لیتے تھے۔ اور عدم تعارض کو ظاہر کر کے بھی جواب نہ دیتے تھے۔ کیونکہ وَقّاف مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنی وہ حق پر بہت زیادہ توقف کرنے والے تھے۔ بہت زیادہ کے یہی معنے ہیں چنانچہ حضرت عمرؓ کے واقعات سے یہ عادت ثابت ہے اور حق کی تو شان یہی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۔ کہ جب الحق آتا ہے تو باطل جاتا رہتا ہے پھر باطل جاتا رہتا ہے۔ پھر باطل کا تو رہنا ہی مناسب نہیں۔ حتی کہ یہ بھی مناسب نہیں کہ باطل صورۃً بھی رہے۔

صاحبو! باطل کی تو ہر صورت سے اماتت کرنی چاہئے کہ نہ وہ حقیقتاً ہی رہے نہ صورۃً

سلف صالحین کی یہ حالت تھی کہ بچہ سے نصیحت سُن کر متاثر ہو جاتے تھے۔ امام ابو حنیفہؒ سے منقول ہے کہ منیٰ میں ایک حجام سے مجھے تین مسئلے معلوم ہوئے جو مجھے پہلے سے معلوم نہ

تھے۔ یہ امام صاحبؒ کی کس درجہ خوبی ہے کہ نائی سے بھی مسائل معلوم کرنے میں عار نہیں فرمایا کیونکہ مقصود احکام کا معلوم کرنا ہے۔ چاہے حجام سے معلوم ہوں یا کسی اور سے۔

اس پر بعض معاند لوگوں نے اعتراض کیا ہے اور اس سے امام صاحب کے نقص علمی پر استدلال کیا ہے افسوس ہے کہ اس کمال کی یہ قدر کی گئی اس سے کسی صورت سے بھی تو امام صاحبؒ کے علم کی کمی نہیں معلوم ہوتی کیونکہ جس نے نائی تک سے بھی علم کے لینے میں عار نہیں کیا۔ اس کی طلب کا حال اس سے معلوم ہوگیا کہ اس نے کسی عالم کو تو کیوں چھوڑا ہوگا۔ یقیناً ہر عالم سے علم لیا ہوگا۔ اسی لئے امام صاحبؒ کے شیوخ چار ہزار کے اوپر ہیں البتہ اس واقعہ سے اس نائی کا بھی عالم ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مگر امام صاحب کے سامنے اس کا علم ایسا تھا کہ تمام فقہاء و محدثین واکابر علماء نے امام صاحب کے مناقب میں کتابیں لکھی ہیں اور اس نائی کی منقبت میں کسی نے بھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔

اہل کمال کا کمال

اصل یہ ہے کہ اَلْمَرْءُ یَقِیْسُ عَلٰی نَفْسِہٖ چونکہ یہ معترضین خود اس نائی سے بھی کم علم ہیں۔ اس لئے امام صاحبؒ کی کمی علم پر استدلال کرتے ہیں حالانکہ یہ دلیل ہے امام صاحب کے کمال کی ایسے جہلاء کی تنقیص سے کیا ہوتا ہے۔ امام صاحبؒ کا حسن خداداد ہے کسی کے عیب لگانے سے کیا ہوتا ہے اور اسی واسطے امام صاحبؒ نے صاف بیان کر دیا کہ مجھے حجام سے نفع ہوا اس سے عار نہیں کیا۔ کیونکہ اہلِ کمال کے کمال پر ان باتوں سے دھبہ نہیں آیا کرتا وہ اس کی کوشش نہیں کرتے کہ ان کو کوئی بڑا سمجھے۔

اس کے مناسب ایک حکایت یاد آگئی کہ حکیم معین الدین صاحب نانوتوی میرٹھ میں حافظ عبدالکریم صاحب رئیس کے یہاں اتفاقاً تشریف لے گئے۔ حافظ صاحب موصوف نہایت ہی بھولے بھالے تھے۔ کسی کو بارہا دیکھ کر بھی دیر میں پہچانتے تھے۔ چنانچہ میں بچپن سے اپنے والد صاحب کے ساتھ میرٹھ انہیں کے یہاں رہا۔ مگر جب اُن کے بڑے بھائی کا انتقال ہوا تو میں تعزیت کے لئے میرٹھ گیا اور حافظ صاحب سے جا کر ملا۔ اس وقت اور لوگ بھی تھے تو وہ دریافت کرتے ہیں کہ آپ کی تعریف کسی نے کہا اشرف علی ہیں تب وہ مجھ سے ملے۔ اسی طرح حکیم معین الدین صاحب حافظ صاحب کے پاس تشریف لے گئے تو حافظ صاحب نے اُن سے بھی دریافت کیا کہ آپ کون ہیں۔ حکیم صاحب نے جواب دیا کہ میں جولاہا ہوں ۔ حافظ صاحب نے اُن سے بھی دریافت کیا کہ آپ کون ہیں حکیم صاحب نے جواب دیا کہ چھوٹے

شہر۔تھوڑی دیر کے بعد مولوی رعایت الحق صاحب جو ان کی ریاست کے مدارالمہام تھے ۔تشریف لائے جو حکیم صاحب کو جانتے تھے ۔ وہ صاحب حکیم صاحب سے تپاک سے ملے ۔اُس وقت حافظ صاحب کو شبہ ہوا کہ یہ کون صاحب ہیں ۔جن سے اس قدر تپاک سے مولوی صاحب نے ملاقات کی ۔ چنانچہ انہوں نے دریافت کیا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ یہ حکیم معین الدین صاحب ہیں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے صاحبزادہ تب حافظ صاحب کو پتہ لگا اور حکیم صاحب سے فرمایا کہ آپ تو یہ فرماتے تھے کہ میں جولاہا ہوں ۔حکیم صاحب نے فرمایا کہ جب جناب نے مجھ سے دریافت کیا کہ تو بھلا میں اپنے مُنہ سے کیا کہتا کہ میں فُلاں ہوں اگر آپ نہ پہچانیں تو کیا کہوں ۔ دیکھئے حکیم صاحب چونکہ خود صاحب کمال تھے تو اُن کو جولاہا کہنے سے عار نہ آیا ورنہ اپنے کو جولاہا کون کہتا ہے ۔الّا ماشآء اللہ۔

اختلاف مذاق

ہمارے حضرات کا تو یہی مذاق ہے کہ بعض کا دوسرا مذاق ہے وہ ایسے مواقع میں تو تواضع کو نامناسب سمجھتے ہیں ۔ چنانچہ مولوی عبدالرب صاحب واعظ دہلوی ایک امیر کے یہاں مہمان ہوئے ۔ مولوی صاحب کو کسی وقت رات میں رفع حاجت کی ضرورت ہوئی ۔ میزبان کے یہاں دو پاخانہ تھے ۔ایک عام دوسرا خاص ۔ چونکہ مولوی صاحب مہمان خاص تھے ۔خاص پاخانہ میں جانے لگے ،محافظ نے ٹوکا کہ کون ۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ اگر میں اُس وقت تواضع کرتا تو نہ معلوم کیسی پریشانی ہوتی ۔اس لئے میں نے ذرا سخت لہجہ میں جواب دیا کہ ہم ہیں مولانا صاحب دہلی والے تو ہمیں جانتا نہیں دیکھ صبح کو تیری کیسی خبر لی جاتی ہے ۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگا کہ معاف کر دیجئے میں نے پہچانا نہیں ۔اس کے بعد مولوی صاحب فرماتے تھے کہ ایسے موقع پر اسی طرح بے باکانہ بات کہنا چاہیئے اور دیوبند کے مولویوں کی طرح تواضع نہ کرنا چاہیئے ۔ ورنہ اس وقت اگر میں کہتا کہ میں ہوں حقیر فقیر ذرہ بے مقدار تو گو بعد میں کچھ ہی ہوتا ۔مگر اس وقت تو پریشانی ضرور ہی ہوتی ۔مگر صاحبو ایسی ہمت مولوی صاحب ہی کی تھی ۔ ہر شخص اپنے منہ سے اس طرح نہیں کہہ سکتا۔

چنانچہ مجھے بھی کانپور میں ایک مرتبہ اتفاق ہوا۔ صاحب جنٹ کے اجلاس پر جانے کا کیونکہ ایک فتویٰ پر میں نے دستخط کر دیئے تھے ۔ وہ مقدمہ اٹھارہ برس سے عدالت میں تھا اور کوئی فیصلہ نہ ہوتا تھا ۔ دستخط کرنے والے علماء میں سے جس عالم پر ایک فریق رضامند ہوتا تو فریق ثانی انکار کر دیتا ۔ مجھ پر فریقین نے رضامندی ظاہر کی چنانچہ میرے نام سمن آیا اور مجھے جانا پڑا ۔ مجھ

سے سوال کیا گیا کہ آپ عالم ہیں اس وقت مجھے بے حد خلجان ہوا۔ اگر انکار کروں تو وکلاء اور حکام تواضع کو کیا جانیں کہ یہ انکار تواضعا ہے۔ چنانچہ ایسے اتفاقات ہوتے ہیں کہ لوگوں نے تواضعاً انکار کیا اور وہ واقعی انکار سمجھے اور اگر یہ کہوں کہ عالم ہوں تو اولاً اپنی وضع کے خلاف ہے اور ثانیاً یہ ہے کہ عالم ہوں کہاں۔ ان دونوں پہلوؤں پر نظر کر کے میں نے جواب دیا کہ مجھے مسلمان ایسا ہی سمجھتے ہیں اور چند سوالات ایسے ہی پیچیدہ کئے گئے۔ میں نے سب کے جواب میں مصلحت وقت کو اور اپنی وضع کو پوری طرح ملحوظ رکھا۔ وکلاء نے باہر آ کر مجھ سے کہا کہ ماشاء اللہ بہت اچھا جواب دیا۔ اس وقت تو ہم بھی چکر میں آ گئے تھے کہ دیکھئے اس کا کیا جواب ہوتا ہے۔ غرض اپنے منہ سے تو مولوی عبدالرب صاحب کی طرح یہ کہنا کہ میں عالم ہوں مجھے بہت مشکل تھا۔ ہاں ایسی بات کہہ دی جس سے دعویٰ علم بھی نہ ہوا اور مصلحت بھی فوت نہ ہوئی۔

گوشہ نشینی کا اثر

اور یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ باوجود قلت تجربہ کے ضروری مصالح کے طریقے ذہن میں آ جاتے ہیں۔ غرض ہماری جماعت کے لوگ سیاح تو نہیں ہیں گوشہ نشین ہیں باوجود گوشہ نشینی کے ضروریات دنیویہ کا علم بھی حق تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اور اُس سے غفلت نہیں ہم لوگوں پر گوشہ نشینی کی وجہ سے عیب لگایا جاتا ہے اور اس گوشہ نشینی پر یہ کہا جاتا ہے کہ بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ کانپور میں مجھے ایک صاحب سے گفتگو کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کو دنیا کی کیا خبر آپ تو بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا کہ تم شیطان کے گنبد میں بیٹھے ہو۔ تہذیب سے گفتگو کرو۔ کیا یہ ان الفاظ سے بسم اللہ کی اہانت نہیں ہوتی۔ توبہ کرو اور بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھنے سے جو یہ مقصود ہے کہ دنیا کی ضرورتوں کی خبر نہیں اول تو یہ مسلم نہیں کہ گوشہ نشینوں کو دنیا کی ضروری خبر بھی نہیں۔ بلکہ گوشہ نشینی میں بھی دنیا کی ضروری خبر ہو سکتی ہے۔ ثانیاً علی تقدیر التسلیم خود دنیا کی خبر ہی کی کیا ضرورت ہے۔ جیسے کسی نے کہا تھا کہ تشدید بضرورت شعر آ گیا۔ دوسرے نے کہا کہ شعر گفتن چہ ضرور اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ

خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت است ۔۔۔ چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجت ست

لیکن باوجود ایسی خبروں کی حاجت نہ ہونے کے واقعہ یہی ہے کہ ان عارفین گوشہ نشینوں کو دنیا کا بھی علم بقدر ضرورت ہوتا ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ خلوت نشینی اور مراقبات سے قلب میں توجہ الی اللہ اور اُس سے نور پیدا ہوتا ہے۔ اور جب قلب میں نور پیدا ہوگا تو قلب کے سامنے

جو شے واقع ہوگی۔ وہ منور اور روشن وظاہر ہو جائے گی۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے آئینہ وآفتاب کے سامنے ہو۔ مگر کوئی شئے آئینہ اور آفتاب کے درمیان حائل ہو تو اس صورت میں آئینہ کی تاریکی لازم ہے۔ لیکن جب وہ حائل مرتفع ہو جائے اور آفتاب کا عکس آئینہ پر پڑے تو آفتاب کے ضیاء سے جو چیزیں آئینہ کے مقابل ہیں وہ بھی سب آئینہ میں منعکس ہو جاویں گی۔ اور ان چیزوں کا منعکس ہونا اختیار سے نہیں اور نہ کسب کو اس میں دخل ہے بلکہ جب قلب منور ہوگا تو بلا اختیار خود حقائق کا انکشاف ہوگا۔

عارف کی نظر

یہاں پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس تقریر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ توجہ الی اللہ سے تمام اشیاء کا علم ہو جاوے گا۔ حالانکہ بظاہر تو یہ ہے کہ جب خدا کی معرفت ہو تو غیر اللہ سے ذہول ہو جاوے اور خدا کی معرفت کے سامنے غیر اللہ کی معرفت فنا ہو جاوے تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حیثیات اور اعتبارات مختلف ہیں۔ ایک حیثیت اور اعتبار سے تو معرفت حق کی وجہ سے مخلوق اور غیر اللہ سے ذہول ہو جاتا ہے اور ایک حیثیت اور ایک اعتبار سے مخلوقات اور غیر اللہ کا بتمامہا علم ہو جاتا ہے۔ استقلال اور تبعیت میں فرق ہے۔ استقلال کی حیثیت سے تو ذہول ہو جاتا ہے۔ درجہ تبعیت کے دوسرے حقائق پر بھی نظر ہو جاتی ہے۔ یعنی عارف کی استقلالاً تو خدا ہی پر نظر ہوتی ہے۔ غیر اللہ پر استقلالاً نظر نہیں ہوتی باقی تبعاً مخلوقات کا علم اور غیر اللہ پر بھی نظر ہو سکتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے عام ناظرین کو کسی مکان کو دیکھ کر صانع کا خیال ہو تو اس صورت میں مکان پر تو نظر استقلالاً ہے اور صانع پر تبعاً ہے۔ اور ہم لوگوں کی یہی حالت ہے کہ کھانے وغیرہ پر مثلاً استقلالاً نظر ہوتی ہے اور باورچی وغیرہ کی طرف تبعاً۔ اگر ان اشیاء پر استقلالاً نظر نہ ہوتی، محض بطور تبعیت ہوتی تو ان اشیاء کے فوت ہونے پر ملال نہ ہوتا۔ حالانکہ ان اشیاء کے فوت ہونے پر ملال متیقن ہے۔ لہذا واضح طور سے ظاہر ہو گیا کہ ان اشیاء پر ہماری نظر استقلالاً ہے۔ مگر عارفین کی نظر بالعکس ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نظر حق تعالیٰ پر استقلالاً تھی۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فرمایا تھا۔

الا ان من کان منکم یعبد محمدًا فانه قد مات و من کانَ یعبد اللّٰه فانه حي لا یموت ط

کہ جو تم لوگوں میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا۔ تو آپ کی تو وفات ہوگئی اور جو خدا کی عبادت کرتا تھا تو وہ زندہ ہیں کبھی نہ مریں گے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وفات نبوی کے بعد یہ ارشاد فرمایا تھا جس سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ کی نظر استقلالاً خدا تعالیٰ کی طرف تھی۔ صوفیہ کرامؒ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک حکایت بھی نقل کی ہے کہ آپ سے کسی نے دریافت کیا کہ

هَلْ عَرفت ربک بمحمد ام عرفت محمدا بربک

کہ آپ نے خدا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے پہچانا۔ یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کے ذریعہ سے پہچانا۔ ارشاد فرمایا کہ بل عرفت محمدا بربی۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کی وجہ سے پہچانا۔ مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت من حیث الاستقلال نہیں بل من حیث انه رسول الله ہے تو توحید کامل یہی ہے۔ جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مرتبہ ہے۔ عارف کسی چیز پر بالاستقلال نظر نہیں کیا کرتا نہ استقلالاً کسی چیز کو سمجھتا ہے۔ بلکہ ہر چیز کو خدا تعالیٰ کے ملک سمجھتا ہے۔ اور ہر چیز میں اول خدا کو دیکھتا ہے۔ پھر اُس شئے کو دیکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر سر میں درد اور ضعف ہو تو اس حیثیت سے خمیرہ گاؤزبان کھانا بھی ثواب اور اجر رکھتا ہے کہ یہ ہمارا سر نہیں۔ بلکہ سرکاری مشین ہے۔ پس اس حیثیت سے تمام لذات وتمعات میں ثواب ہے۔ صرف حیثیت اور جہت کا فرق ہے۔ اسی فرق سے اجر اور عدم اجر کا فرق ہو گیا۔

ملکیت جسم

اسی سے حرمت قتل کا راز معلوم ہو گیا۔ یعنی ہم کو حکم ہے کہ خودکشی نہ کرو اگر کسی نے خودکشی کی اور اپنے کو قتل کیا تو جرم کا مرتکب ہوا کیونکہ یہ ہمارا بدن ہماری چیز نہیں۔ اسی وجہ سے خودکشی حرام جیسا کہ کمیرے کو ہل توڑنے کا اختیار نہیں۔ ہاں ہل چلانے کا اختیار ہے۔ اسی طرح ہمیں صرف اس جسم سے کام لینے کا اختیار ہے۔ مثلاً جو غلام ہماری ملک ہو اُس کو ہماری منشاء کے مطابق چلنے کا اختیار ہے۔ یہ ہرگز اختیار نہیں کہ زہر کی بوٹی کھا کر مر جاوے۔ اگر اُس نے ایسا کیا تو اُس نے ہماری خیانت کی۔ اسی طرح چونکہ ہمارا بدن اور جسم ہماری چیز نہیں سرکاری چیز ہے۔ اس لئے اس حیثیت سے اس کی خدمت وغیرہ میں بھی ثواب ہے۔ اور اسی جہت سے اُن کے ساتھ محبت بھی ہونا چاہئے۔ اسی کو کسی صاحب حال نے فرمایا ہے ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است　　　افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

یعنی اپنے ہاتھ پیروں پر بھی ناز کرتا ہوں اس واسطے کہ اس سے آپ تک وصول ہوا ہے نہ اس وجہ سے کہ میری چیز ہے آگے فرماتے ہیں ؎

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را　　　کودامنت گرفتہ بسوئم کشیدہ است

(اپنے ہاتھوں کو ہزاروں بار بوسہ دیتا ہوں کہ انہوں نے تیرا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے)

اور یہاں سے ان بجسدک علیک حقا (یقیناً تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے) کے راز کا پتہ چلا گیا کہ ہمارے جسم کا ہم پر اس وجہ سے حق ہے کہ وہ سرکاری چیز ہے۔ ہماری ملک نہیں۔ البتہ اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر ہمارا جسم ہماری ملک نہیں تو جسدک میں پھر اضافت کیسی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اضافت پتہ کے واسطے ہے تملیکی نہیں۔ جیسے ہمارا باپ وغیرہ کہ ان چیزوں میں اضافت پتہ کے واسطے ہوتی ہے۔ مِلک کے لئے نہیں۔ اسی طرح جسدک میں بھی اضافت پتہ کے واسطے ہے چونکہ وہ ہمارا جزو ہے۔ اس لئے ہماری طرف اضافت کر دی۔ باقی وہ ملک خدا کی ہے۔ ہم کو صرف تصرف کا اختیار ہے وہ بھی اس قید سے کہ مرضی مالک کے موافق اس سے جو چاہیں کام لیں۔ باقی اُس کے ہلاک اور فنا کرنے کا ہم کو اختیار نہیں اور جسم و روح کا ہماری ملک نہ ہونا۔ ایک عقلی راز سے بھی ثابت ہے کیونکہ محلِ ملک وہ چیزیں ہوتی ہیں جو ہم سے بعید ہوں اور جس چیز کو ہم سے غایت قرب ہے۔ وہ ہماری ملک نہیں اور جتنی زیادہ قریب ہوگی۔ اسی نسبت سے ہماری ملک سے بعید ہوگی۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ سب چیزوں کی نسبت جان سب سے زیادہ قریب ہے۔ اسی لئے وہ ملک سے بہت بعید ہے کہ آدمی اپنا کسی صورت سے مالک نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ذی رحم محرم گو جان سے بعید ہے۔ مگر اجانب سے قریب ہے تو ذی رحم محرم اشتراء سے ملک تو بن جاتا ہے مگر ملک میں باقی نہیں رہتا فوراً آزاد ہو جاتا ہے۔ پس اس بناء پر ہم اپنے مالک نہیں اس لئے ہم کو اپنے اندر ہر تصرف جائز نہیں۔

قرب علمی

یہاں پر ایک شبہ ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہٗ تو بندہ سے بہت زیادہ قریب ہیں تو تقریر بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی بندہ کے مالک نہ ہوں۔ حالانکہ خدا کی مالکیت مسلمات سے ہے اور بدیہی طور پر ثابت ہے تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ جو بندہ کے قریب ہیں۔ اس قرب سے قرب علم یا رضا مراد ہے۔ قرب حِسّی مراد نہیں۔ اس لئے کہ قرب حسی جانبین سے ہوتا ہے کیونکہ ایک شے جب کسی شئے سے حسًا قریب ہوگی تو لامحالہ وہ شئے بھی اس سے قریب ہوگی اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرب جانبین سے نہیں ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ہم اس کی طرف شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) یہاں اَنْتُمْ اَقْرَبُ اِلَيْهِ نہیں فرمایا نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ (تم اس کی طرف زیادہ نزدیک ہو) فرمایا یعنی ہم بہت قریب ہیں تو معلوم ہوا کہ قرب خدا کی طرف سے ہے۔ ہماری طرف سے نہیں پس یہاں اس قرب سے قرب علمی مراد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ

ط (اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں)

اس آیت میں نَعۡلَمُ پر قرب کو مرتب فرمایا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس قرب سے مراد قرب علمی ہے یعنی جیسا خدا کو علم ہے بندہ کا بندہ کو اُس کا ذرہ بھر بھی نہیں۔ باقی حقیقت کے اعتبار سے حق تعالیٰ کو بندہ سے بہت بعد ہے وہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ بندہ کو اُس سے کیا نسبت یہ تو اس کا تصور صحیح بھی نہیں کرسکتا۔

کل ما خطر ببالک فَهُوَ هَالكٌ واللّٰهُ اعزوا علٰی من ذالک

(ہر وہ چیز جو تمہارے دل میں گزرتی ہے وہ فانی ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے برتر واعلیٰ ہے)

اے برادر بے نہایت درگہے است ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

(اے بھائی بے نہایت درگاہ ہے، جس درجہ پر پہنچو اس پر مت ٹھہرو اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو)

حق تعالیٰ بندہ کے علم وادراک سے دور سے بھی دور ہیں۔ بلکہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں۔ غرض خدا کو بندہ سے قرب علمی ہے اور یہ قرب خدا کو بندہ سے ہے۔ بندہ کو ہرگز نہیں۔ یعنی حق تعالیٰ تو بندہ کی کُنہ سے واقف ہیں اور ان کو بندہ کا علم بکنہ ہے۔ اور بندہ خدا کی کنہ سے واقف نہیں اور بندہ کو ایسا علم نہیں کہ خدا کی کنہ سے واقف ہو۔ چنانچہ کسی کو خدا کا علم بکنہ نہیں ہوتا۔ البتہ علم بوجہہ ہوتا ہے۔ اور بوجہہ بھی بدرجہ بعید۔

چنانچہ بندہ کو خدا کا علم بواسطہ وجہ الوجہ بلکہ وجہ وجہ الوجہ کے ہوتا ہے اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا علم بندہ کی قدرت میں نہیں اس لئے بندہ کو علم بکنہ کا مکلف نہیں کیا گیا۔

نقصِ عبادات

اور یہاں سے ہماری عبادات کا ناقص ہونا بھی واضح ہوگیا۔ کیونکہ تمام عبادات عقلاً موقوف ہیں۔ علم بمعبود پر یعنی طاعات اور عبادات اُسی وقت کامل ہوتی ہے۔ جب معبود کا علم پورے طور سے ہو۔ مثلاً ہم نماز پڑھتے ہیں روزہ رکھتے ہیں تو ہمارا نماز روزہ اسی وقت کامل ہوگا۔ کہ جب یہ علم ہو کہ ہم نماز روزہ خدا کے لئے کرتے ہیں تو جب تک خدا کا علم پورے طور سے نہ ہوگا۔ ہمارا نماز روزہ بھی کامل نہ ہوگا کیونکہ۔

اذا فات الشرط فات المشروط (جب شرط نہیں پائی جاتی مشروط بھی نہیں پایا جاتا) اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہمیں خدا کا علم بکنہ نہیں ہوسکتا۔ لہذا روز روشن کی طرح پتہ چل گیا کہ ہماری

نماز واقع میں نماز نہیں ہمارا روزہ واقع میں روزہ نہیں۔ کیونکہ ہماری معرفت واقع میں معرفت نہیں تو بس اب اُن کا فضل محض ہے کہ وہ غیر نماز کو نماز قرار دیتے ہیں۔ اسی کو ارشاد فرماتے ہیں۔ اُولٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ (اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا)

یہ اُن کا فضل محض ہے کہ وہ سیئات یعنی عدم عبادت کو حسنات یعنی عبادات سے بدل دیتے ہیں۔ ہم حق سبحانہٗ کا ادنیٰ درجہ کا بھی حق ادا نہیں کر سکتے۔ بہر حال بندہ کو خدا تعالیٰ کا علم ہونا بھی دشوار ہے۔ اور اس سے آگے تو کیا قرب ہوتا اور خداوند سبحانہ کو جو بندہ سے قرب ہے۔ وہ باعتبار علم اور رضا کے ہے وہ قرب نہیں ہے جو ملک کے منافی ہے اور اگر قرب علمی و رضائی کے علاوہ اور کوئی قرب بھی ثابت ہو جیسا بعض اہل کشف اس طرف گئے ہیں تو یہ کہا جاوے گا کہ مطلق قرب منافی ملک نہیں بلکہ وہ قرب جو غیر من لہ القرب کا عطا کیا ہوا ہو اور یہاں ایسا نہیں البتہ ایسا قرب جو منافی ملک ہو بندہ کو اپنے نفس کے ساتھ ہے۔

حقیقت عبادت

یہی وجہ ہے کہ بندہ اپنا مملوک نہیں بلکہ بالکل حق تعالیٰ کا مملوک ہے اس لئے بندہ کا کوئی کام متعین و مقرر نہیں۔ بلکہ جس وقت جو حکم ہوا کر لیا یہی اس کا کام ہے اور اسی کو عبادت کہتے ہیں۔ چنانچہ ایک وقت یہ حکم ہے کہ اگر ذکر کرتے ہو اور نیند غالب ہو فلیرقد اب وقت اس کا سونا ہی عبادت ہے اور نماز تیار ہو اور تکبیر تحریمہ کا وقت ہو مگر ایک شخص کو استنجے کا تقاضا ہو اور استنجے کی حالت غالب ہو تو ایسے وقت نماز چھوڑ کر استنجا کرنا واجب ہے۔ اور اس وقت وہی عبادت ہے ایسے وقت میں نماز حرام ہے تو چونکہ یہ اپنا مملوک نہیں ہے اس لئے ایک وقت مسجد سے پیشاب خانہ جانے کا حکم ہے اور وہی اس کا فرض منصبی ہے اصل مقصود اطاعت ہے جس وقت جو حکم ہوا کر لیا۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ۔ دل شدہ مبتلائے تو۔ ہر چہ کنی رضائے تو

غلو تقویٰ

اس حقیقت کے نہ جاننے سے بہت لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ انہوں نے اس قسم کے معاملات میں اپنی رائے سے تنگی شروع کر دی۔ چنانچہ باوجود وسعت مخصوصہ اپنے ذمہ عزیمت پر عمل کرنے کو ضروری خیال کر کے رخصت پر عمل کرنا ترک کر دیا، چنانچہ جن صورتوں میں تیمم جائز ہے اور خدا کے یہاں سے تیمم کی اجازت ہے۔ بعضے وہ لوگ جن کو تقویٰ کا ہیضہ ہو گیا۔ وہ

ان صورتوں میں بھی بجائے تیمم کے وضو ہی کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اور اپنے عمل سے تیمم کو طہارت ناقصہ اور وضو کو طہارت کاملہ خیال کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو تقویٰ کا ہیضہ ہو گیا۔ غرض تیمم میں ان لوگوں کو انقباض ہوتا ہے۔ مگر یہ کوئی کمال نہیں۔ بلکہ محض نقص ہے۔ یہی وجہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

ما بال قوم ینزھونَ عن شی ءِ اصنعه (کیا حال ہے ان لوگوں کا جو ایسی چیز سے فخر کرتے ہیں جس کا مانع میں ہوں) میرے ایک دوست تھے جو نہایت متقی تھے فرماتے تھے کہ مجھے اس کا ڈر ہے کہ قیامت کے دن کہیں مجھ سے یہ سوال نہ ہو کہ اتنے متقی کیوں ہو گئے تھے۔ اور اتنا تقویٰ کیوں اختیار کیا تھا۔ یہ ان کی صلاحیت تھی کہ اس حالت میں بھی خائف تھے۔ واقع جو تقویٰ حد غلو تک ہو وہ خوف ہی کا محل ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْافِی دِیْنِکُمْ

کہ دین میں غلومت کرو۔ علو تو بہتر ہے مگر نقطہ مدعین پر ورنہ غین ہو جاوے گا۔

اس عین پر شیخ سعدی کی لونڈی کی حکایت یاد آئی۔ لونڈی کیا شاعرہ ہوگی دروازہ پر کسی نے آواز دی۔ شیخ نے فرمایا کہ دیکھو کون ہے باہر جا کر دیکھا تو ایک شخص یک چشم تھا۔ نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نام عبداللہ ہے۔ لونڈی نے آ کر کہا کہ حضور غبداللہ ہے۔ (غین معجمہ سے) شیخ نے دریافت کیا کہ غبداللہ کیسا لونڈی نے جواب دیا کہ حضور اس کی عین (بالعین المہملہ) آنکھ) پر نقطہ ہے غین ہو گیا ہے تو تم بھی عین پر نکتہ دے کر غلو نہ کرو۔ ورنہ بجائے عبد کے غبد ہو جاؤ گے۔ علو تو دین میں بہتر ہے مگر غلو دین میں اچھا نہیں۔ علو کے معنی رفعت فی الدین ہیں یہ معنی نہیں ہیں کہ خدا کے بندوں کے ساتھ تکبر کیا جاوے۔ اس علو کو ایک آیت میں فساد کے ساتھ مقرون فرمایا ہے۔

تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ نَجْعَلُھَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا

غرض نہ ایسا علو کرو اور نہ غلو کرو مگر ہم لوگوں کے غلو کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ حق تعالیٰ تو تیمم کرنے کی اجازت دیں اور ارشاد فرمائیں۔

فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا۔ اور ہم تیمم نہ کر کے عملاً یہ ظاہر کریں کہ حضور مجھے تو یہ منظور نہیں۔ میں تو وضو ہی کروں گا اور حق تعالیٰ ارشاد فرماویں۔

وَلٰکِنْ یُّرِیْدُلِیُطَھِّرَکُمْ یعنی حق تعالیٰ تیمم کو طہارت کاملہ فرمادیں جیسا کہ تطہیر کے اطلاق کا مدلول ہے۔ مگر ہم تیمم سے اعراض کر کے یہ ظاہر کریں کہ آپ نے میری خاطر سے اس

کو طہارت کاملہ فرما دیا۔ ورنہ واقع میں طہارت ناقصہ ہے تو مطلب یہ ہے کہ جھوٹ موٹ کہہ دیا۔ نعوذ باللہ یہ کیسا تقویٰ ہے اور جن لوگوں کی یہ حالت ہو وہ کس قسم کا تقویٰ بھگار رہے ہیں۔ پس جب مفتی فتویٰ دے۔ بشرطیکہ معتبر ہو یعنی مفتی نہ ہو۔ قیمتی ہو اور وہ فتویٰ دے کہ اس وقت تیمم کرنا جائز ہے تو بلا تکلف تیمم کرلو۔

نعمت رخصت

آگے ارشاد فرماتے ہیں ۔ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ۔ (اور تاکہ وہ حق سبحانہ تعالیٰ تم پر اپنی نعمت پوری کریں) پس رخصت دینا حق تعالیٰ کی نعمت ہے۔ لہذا ہمیں حق تعالیٰ کی نعمت کو قبول کرنا چاہئے۔ اس قسم کے تقویٰ سے بعض اوقات نماز بھی ترک ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک عرب بڑے نیک جہاز میں ہمارے ساتھ سفر میں تھے۔ انہوں نے نماز ترک کردی ۔ اُن سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میاں پاخانہ کے پانی کی شُر شُر سے کوئی اطمینانی حالت نہیں کپڑوں کا اعتبار نہیں اس لئے کامران جا کر پڑھ لیں گے۔ یعنی کامران جا کر کامرانی کریں گے سو اس قسم کے تقویٰ کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ نے جو ہم کو رخصت کی نعمت عطا فرمائی ہے۔ یہ اس لئے تاکہ ہم شکر کریں ۔ چنانچہ صاف ارشاد ہے وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (اور تاکہ تم شکر کرو) تو جب تک ہم نعمت کو قبول نہ کریں اور اس پر عمل کر کے سہولت حاصل نہ کریں۔ اس وقت تک شکر مشکل ہے اگر کوئی شخص کہے کہ ہم بلا نعمت ملے اور بغیر نعمت قبول کئے شکر ادا کرلیں گے تو اصل یہ ہے کہ یہ شکر صرف زبان سے ہوگا۔ اس شکر کے ساتھ دل شریک نہ ہوگا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ٹھنڈا پانی پی کر زبان اور دل دونوں سے الحمد لِلّٰہ نکلتی ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ رمضان میں افطار کے وقت سرد پانی ملنے سے کتنی مسرت ہوتی ہے بلکہ اہتمام سے برف وغیرہ سے سرد کیا جاتا ہے۔ غرض مریض کو جب تیمم کی اجازت ہو تیمم کرلیا جاوے اور جب کھڑے ہونے پر قدرت نہ ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھ لی جاوے ۔ پھر جب کھڑے ہونے پر قدرت ہو ۔ کھڑے ہو کر پڑھ لی جاوے۔ اصل یہ ہے کہ ہماری کوئی عبادت متعین نہیں ۔ جس وقت جو حکم ہو اس وقت وہ کرلیا۔ اگر سونے کا حکم ہو تو سوؤ۔ ہم تو اپنے خلاف مرضی مالک اپنے نفس میں کوئی تصرف جائز نہیں کیونکہ وہ نفس ہماری چیز نہیں سرکاری چیز ہے۔

توحید کے معنی

اور جب یہ نفس اپنی چیز نہیں تو جب اس لحاظ سے نفس کی طرف نظر کرے گا کہ میں خدا کے ملک ہوں تو اس سے خدا کو بھی پہچان لے گا۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا) کی یہ بھی ایک توجیہ ہے۔ مثلاً جب زید کو اس حیثیت سے پہچانا کہ عمرو کا غلام ہے تو آقا کو یعنی عمرو کو بھی ضرور پہچانے گا۔ اسی طرح جب اپنے نفس کو اس حیثیت سے جانا کہ میں غلام اور مملوک اور سرکاری چیز ہوں تو اس سے خدا کی معرفت یقیناً ہوگی۔ اور اسی کا اثر ہوگا۔ غلبہ فناء اور اُس وقت یہ کہنے لگے۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَا یَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَاشَرِیْکَ لَهٗ

(بے شک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو تمام عالم کے بانی ہیں)

اسی کو توحید کہتے ہیں کہ اپنی ہستی پر استقلالاً نظر نہ رہے۔ فقط خدا پر نظر ہو۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اسی وجہ سے عَرَفْتُ مُحَمَّدًا بِرَبِّیْ (میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے رب سے پہچانا) فرمایا اور اسی وجہ سے وہ بعد وفات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا

فان اللّٰه حي لا يموت حق تعالیٰ زندہ ہیں نہیں مریں گے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ کی نظر استقلالاً خدا پر تھی۔ پس اس درجہ میں تو عارف کو غیر اللہ سے ذہول ہو جاتا ہے۔ مگر درجہ تبعیت میں سب کا علم ہوتا ہے۔ اب وہ اشکال نہ رہا کہ جب معرفت حق کو جملہ اشیاء کی معرفت کے لئے مستلزم کہتے ہو تو وہ فنا کے ساتھ کیونکر جمع ہو سکتا ہے۔ تو اب وہ اشکال نہ رہا اور میرا وہ دعویٰ بے غبار ہو گیا کہ اہل خلوت کو ضروریات دنیا کا بھی علم ہوتا ہے۔

علمی رنگ میں غلطی

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ ہماری جماعت کو اپنی وضع پر رہنے کے ساتھ مصالح دینیہ کی رعایت کا بھی خیال رہتا ہے وہ ایسا جواب نہیں دیتے جس سے تکبر ظاہر ہو اور نہ ایسی بات کہتے ہیں جس سے مصلحت دینیہ فوت ہو۔ اس جامعیت کی بناء پر امام صاحب نے اس بات کے اظہار سے عار نہ کیا کہ مجھے حجام سے مسائل معلوم ہوئے اور اسی واسطے انہوں نے ایک بچہ کی بات سے عبرت حاصل کی کہ آپ سنبھل کر چلیں کیونکہ عالم کا بگڑنا عالَم کے فساد کو مستلزم ہے۔ غرض خواص کی غلطی عوام کی غلطی سے سخت ہوتی ہے کیونکہ خواص کی غلطی برنگ علم ہوتی ہے اور عوام کی غلطی برنگ جہل ہوتی ہے۔ اور جو غلطی برنگ علم ہو۔ اور اس کا ازالہ دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے خواص کی غلطی عوام کی غلطی سے اشد اور سخت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب غلطی میں علم کا رنگ ہوگا تو اس کی اصلاح کی سعی اور کوشش نہ ہوگی۔ اس لئے وہ غلطی مرتفع نہ ہوگی۔ الحاصل خواص کی غلطی دو وجہ سے زیادہ مذموم ہے ایک وجہ یہ ہے کہ اُس کا عوام پر اثر ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خود اُس پر اثر ہوتا ہے۔

اخص الخواص کی غلطی

غرض ایک غلطی تو عوام کی ہوتی ہے اور ایک خواص کی اور ایک اخص الخواص کی۔ عوام کی تو یہی غلطی ہوتی ہے کہ کام نہیں کرتے۔ عمل نہیں کرتے۔ اسکی اصلاح آسان ہے کہ جب تنبہ ہوا کام کرنا شروع کر دیا۔ اصلاح ہوگئی اور ایک غلطی خواص کی ہے کہ ظاہری اعمال کی تو کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اعمال میں روح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور ایک اخص الخواص ہیں جو کہ اپنے باطن کی بھی اصلاح کرتے ہیں اور اس کی سعی بھی کرتے ہیں۔ اس وقت مجھے خصوصیت کے ساتھ اُن کی غلطی کا بیان کرنا مقصود ہے اور عوام یا خواص کی غلطیوں کا بیان کرنا مقصود نہیں اور نہ ایک جلسہ اس کے استیعاب کو کافی ہے اس لئے اس وقت مجھے صرف اخص الخواص کی ایک خاص غلطی بیان کرنا مقصود ہے اور اس غلطی کا سمجھنا بعض مقدمات کے سمجھنے پر موقوف ہے اور اُن سب مقدمات کا حاصل تفویض کی حقیقت سمجھ لینا ہے گو جو لوگ اس طریق میں قدم رکھتے ہیں وہ ضرور اپنے زعم میں اس پر عمل کرتے ہیں۔ اس لئے کہ سنا تھا کہ تفویض اس طریق کے شرائط سے ہے مگر سچ یہ ہے کہ واقع میں حقیقت تفویض میسر نہیں ہے پس ایسی حالت ہے۔ جیسا حدیث میں بعض خاص حالات کے متعلق آیا ہے۔

و ان اعمر انه مؤمن اور واقع میں مؤمن نہیں اسی طرح یہاں بھی دعویٰ اور زعم تو تفویض کا ہے۔ مگر واقع میں تفویض نہیں۔

چنانچہ ان لوگوں سے مزاحمت کا مادہ زائل نہیں ہوا اپنی غلطیوں کی توجیہات کرنا ان کا طرز عمل ہے یہ امارات ظاہری طور پر اس امر پر دال ہیں کہ یہ تفویض میسر نہیں۔ یہ تو ان لوگوں کی حالت ہے جو تفویض کا نام ہی نام لیتے ہیں اور یہ واقعہ میں تفویض کی حقیقت اُن کو میسر نہیں۔

اب رہے وہ لوگ جو خواص سمجھے جاتے ہیں اور وہ واقع میں تفویض سے کام بھی لیتے ہیں۔ مگر اُن کو بھی ایک غلطی اس میں واقع ہوتی ہے چونکہ اس وقت یہ غلطی ایسے ہی خاص لوگوں کی بیان کرنی ہے۔ اس لئے خاص مجمع کے مناسب ہے اور یہ مجمع خاص ہی لوگوں کا ہے کیونکہ اولاً تو یہاں عوام کا زیادہ مجمع ہوتا بھی نہیں۔ دوسرے آج اتفاق سے اور بھی کم ہوگیا ہے اب جو کچھ مجمع ہے۔ یہ بیان اس مجموعہ مخاطبین کے مناسب اور لائق ہے اب کسی شخص کو کسی قسم کی دقت نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ بیان سب مخاطبین کے مناسب ہے اور اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ یہ بیان اُس کے مناسب نہ ہو تو اس کا لحاظ اس وجہ سے نہیں ہوسکتا کہ

اَلنَّادِرُ كَالْمَعْدُوْمِ پھر ایسے شخص کو مناسب ہے کہ کسی خوش فہم سے سمجھ لے۔

حقیقتِ تفویض

اب میں بتلاتا ہوں کہ تفویض کی حقیقت سمجھنے میں وہ کیا غلطی ہوئی ہے تفویض کی حقیقت ہے اپنے آپ کو سونپ دینا مگر آج کل تفویض کے معنی تعطل کے سمجھتے ہیں۔ سو خوب سمجھ لو کہ تفویض کے معنی تعطل کے نہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ عمل خوب کرے۔ مگر دوسرے کی رائے سے کرے اپنی رائے کو دخل نہ دے۔ تو جیسے تمام ضروری کاموں کے واسطے پہلے سے مستعد ہو جاتا ہے اور تفویض بھی ایک ضروری عمل ہے تو اس کے لئے بھی مستعد رہے۔ یعنی اپنے کو کسی کے سپرد کردے کہ وہ اس پر مشق کرے اور یہ اس کے سامنے حیات اور زندگی میں

كَالْمَيِّتِ فِيْ يَدِ الْغَسَّالِ ہو جاوے تو اس بناء پر تو تفویض مقابل تعطل کے ہے۔ نہ کہ عین تعطل کیونکہ تعطل میں ترک ارادہ ہے اور یہاں اہتمام ارادہ ہے۔ مگر ہم اگر اپنی حالت کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ واقع میں ہم میں نہ تفویض ہے نہ توکل۔ بلکہ ہم نے ان کے بجائے تعطل اختیار کرلیا ہے۔

اقسام تفویض

اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ تفویض کی حقیقت نہیں معلوم۔ تو خوب سمجھ لو کہ تفویض کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تفویض الی اللہ اور دوسری تفویض الی الشیخ۔ میں تفویض الی اللہ کی حقیقت پہلے بتا دوں پھر تفویض الی الشیخ کی حقیقت بتلاؤں گا کیونکہ تفویض الی اللہ کا درجہ بڑا ہے۔ پھر اس کے بعد مرتبہ تفویض الی الشیخ کا اس لئے پہلے تفویض الی اللہ کی حقیقت بیان کرنا ضروری ہے اور نیز تفویض الی اللہ ایسی چیز ہے کہ اُس سے طبیعت کو مناسبت بھی زیادہ ہے۔ اس لئے اُس کی حقیقت جلدی سمجھ میں آ جاوے گی پھر اس کی حقیقت کا سمجھنا معین ہوگا۔ تفویض الی الشیخ کی حقیقت سمجھنے کا نیز یہ کہ ایک کی حقیقت معلوم کرنے سے دوسرے مسئلوں کی حقیقت بھی بالمقائسہ معلوم ہو جائے گی۔ گو یہ دلیل عام ہے کہ شامل ہے تفویض الی اللہ اور تفویض الی الشیخ دونوں کو یعنی ہر ایک سے دوسرے کے سمجھنے میں اعانت ہو سکتی ہے مگر ظاہر ہے کہ تفویض الی اللہ طبعاً مانوس ہے اور تفویض الی الشیخ اس باب میں اس سے کم ہے اور معروف بھی کم ہے ان وجوہ سے تفویض الی اللہ کا بیان کرنا پہلے ضروری ہوا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہم لوگوں نے اپنی اصلاح کی سعی قریب قریب ترک کردی اس

کی فکر ہی نہیں کرتے اور کام کرنا بھی ترک کر دیا۔ اور اس کو تفویض اور توکل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ واقع میں یہ توکل وتفویض نہیں۔ آپ نے کسی متوکل کو نہ دیکھا ہوگا کہ اُس نے نماز چھوڑ دی ہو۔ روزہ، زکوٰۃ حج ترک کر دیا ہو۔ کیا توکل کے یہ معنی ہیں۔ ظاہر ہے کہ توکل کے یہ معنی ہرگز نہیں اور نہ یہ معنی ہیں کہ طریق معاش کو چھوڑ دے کیونکہ جن[1] اسباب پر مامور بہ مسببات کا ترتب عادۃً قطعی اور یقینی ہو۔ اُن اسباب کا ترک کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ ترک غذا جائز نہیں۔ ترک کسب جائز ہے کیونکہ آمدنی کسب پر یقینی طور پر موقوف نہیں اور حیات عادۃً غذا پر ضرور موقوف ہے۔ آمدنی کسب پر اس لئے موقوف نہیں کہ بہت لوگ ایسے ہیں کہ ایک پیسہ نہیں کماتے۔ مگر پھر بھی ان کو رزق ملتا ہے۔ مگر ایسا شخص کوئی نہ دیکھا ہوگا۔

جس نے عمر بھر نہ کھایا اور زندہ رہا ہو۔ یہ ہوسکتا ہے کہ نہ کھا کر ایک دو دن زندہ رہے مگر عادۃً یہ نہیں ہوسکتا کہ نہ کھانے سے 100 برس، 200 برس زندہ رہے غرض ترک غذا جائز نہیں کیونکہ اُس پر یقیناً اور قطعاً آسودگی کا ترتب ضروری ہے اور ترک اسباب معاش ظنیہ جائز ہے کیونکہ اس پر یقیناً اور قطعاً ترتب مسبب کا نہیں ہوتا بلکہ کبھی ترتب ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ غرض جن اسباب پر قطعی اور یقینی طور پر ترتب مسبب کا ہو اور وہ مسبب ضروری ہو ان کا ترک جائز نہیں اور جن اسباب پر یقینی طور پر ترتب مسبب کا نہیں ہوتا ان کا ترک جائز ہے بالخصوص وہ اسباب معاش جن پر محض درجہ وہم میں ہی

---

[1] توضیح اس کی یہ ہے کہ توکل کی دو قسمیں ہیں علماً و عملاً۔ علماً تو یہ کہ ہر امر میں مدبر حقیقی حق جل شانہٗ کو سمجھے اور اپنے کو ہر امر میں ان کا محتاج اعتقاد کرے۔ یہ توکل تو ہر امر میں عموماً فرض اور جزو عقائد اسلامیہ ہے۔ قسم دوم توکل عملاً اُس کی حقیقت ترک اسباب ہے۔ پھر اسباب کی قسمیں ہیں۔ اسباب دینیہ اور اسباب دنیویہ۔ اسباب دینیہ جن کے اختیار کرنے سے کوئی دینی نفع حاصل ہے۔ ان کا ترک کرنا محمود نہیں بلکہ کہیں گناہ اور کہیں خسران و حرمان ہے۔ اور شرعاً یہ توکل نہیں مگر لغۃً کہا جاوے تو یہ توکل مذموم ہے اور اسباب دنیویہ جن سے دنیا کا نفع حاصل ہو۔ اس نفع کی دو قسمیں ہیں۔ حلال یا حرام اگر حرام ہو تو اس کے اسباب کا ترک کرنا ضروری ہے اور یہ توکل فرض ہے اور اگر حلال ہو اس کی تین قسمیں ہیں یقینی اور ظنی اور وہمی۔ اسباب وہمیہ جن کو اہل حرص وطمع اختیار کرتے ہیں، جس کو طول امل کہتے ہیں۔ ان کا ترک کرنا ضروری ہے اور یہ توکل فرض وواجب ہے اور اسباب یقینیہ جن پر وہ نفع عادۃً ضرور مرتب ہو جاوے۔ جیسا کہ کھانے کے بعد آسودگی ہو جانا یا پانی کے بعد پیاس کم ہو جانا۔ اس کا ترک کرنا جائز نہیں اور نہ شرعاً یہ توکل ہے اور لغۃً توکل کہا جاوے تو یہ توکل ناجائز ہے۔ اور اسباب ظنیہ جن پر غالباً نفع مرتب ہو جاوے مگر بارہا تخلف بھی ہو جاتا ہو۔ جیسے علاج کے بعد صحت ہو جانا۔ یا نوکری و مزدوری کے بعد رزق ملنا۔ ان اسباب کا ترک کرنا وہ ہے جس کو عرف اہل طریقت میں اکثر توکل کہتے ہیں۔ اس کے حکم میں تفصیل یہ ہے کہ ضعیف النفس کے لئے تو جائز نہیں اور قوی النفس کیلئے جائز ہے۔ بالخصوص جو شخص قوی النفس ہو اور خدمت دین میں مشغول ہو۔ اس کے لئے مستحب، بلکہ کسی قدر اس سے بھی مؤکد ہے۔ ۱۲ من کلید المثنوی۔

ترتب مسبب کا ہوتا ہے۔ ان کا ترک تو ضرور لوازم توکل سے ہے پس توکل صرف اعمال و اسباب دنیا میں محمود ہے وہ بھی جب کہ مسبب کا ترتب اس پر عادۃً ضروری نہ ہو۔ باقی اسباب و اعمال معاد میں ترک اسباب توکل نہیں ہے۔ پس یہ کوئی دین کی بات نہیں ہے کہ اسباب معاد کو ترک کردے۔

بلکہ یہ جائز بھی نہیں اور نیک کاموں کا ارادہ کرنا بھی اسباب معاد میں سے ہے۔ تو توکل کے واسطے ترک ارادہ ضروری نہ ہوا بلکہ اس میں بھی ارادہ کیا جاتا ہے پس تفویض جو کہ مرادف توکل کا ہے ترک الاسباب و ترک الارادہ نہیں۔ بلکہ بمعنی ترک الرائے ہے اور رائے بھی وہ جو مقابل ہوا ارادہ مرضی حق کے۔ مطلب یہ ہے کہ ارادہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ارادہ جو مرضی حق کے موافق اور پسندیدہ ہے اور ایک وہ جو مرضی حق کے خلاف اور ناپسندیدہ ہے۔ اہل سلوک اکثر اول کو ارادہ کہتے ہیں اور دوسری قسم کو رائے سے تعبیر کرتے ہیں گو رائے بھی لغۃً ارادہ کے ہم معنی ہے مگر ان کی اصطلاح خاص میں یہ ارادہ کا مقابل ہے پس جو ارادہ مرضی حق کے مطابق ہے اس کا رہنا تو ضروری ہے اور جو ارادہ مرضی حق کے مطابق نہیں بلکہ ناپسندیدہ اور مبغوض ہے اس کا ترک کرنا ضروری ہے یعنی اس کو فنا کر دینا چاہئے۔ یہ حاصل ٹھہرا تفویض اور توکل کا اور اس کے ضمن میں جو درجہ ترک ارادہ مذمومہ کا ہے اسے فنا کہتے ہیں۔

اس تقریر سے ایک سخت اشکال اجتماع نقیضین کا ایک بزرگ کے مقولہ سے بھی رفع ہو گیا۔ مقولہ یہ ہے کہ اريد ان لا اريد واختار ان لااختار جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تفویض یہ ہے کہ ارادہ کوئی چیز نہیں اگر ارادہ بھی کرے تو یہ کرے کہ ارادہ کچھ نہ کروں گا۔ اس پر اشکال یہ ہے کہ یہ بھی تو ارادہ ہو گیا کہ ارادہ نہ کروں گا کیونکہ عدم ارادہ کا ارادہ بھی تو ارادہ ہی ہے پھر عدم ارادہ کا تحقق کہاں ہوا مگر یہ باتیں عارفین کی تو چٹکیوں میں ہیں گو معقولیوں کے نزدیک سخت ہیں۔ اس لئے کہ عارف کی نظر حقیقت پر ہوتی ہے۔ اس لئے جو شبہ ہوتا ہے اس کے سامنے کافور ہو جاتا ہے۔ بقول ۔

اے لقائے تو جواب ہر سوال مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

(آپ کی ملاقات پر سوال کا جواب ہے آپ سے ہر مشکل حل ہو جاتی ہے)

بات یہ ہے کہ یہ اشکال حقیقت نہ جاننے سے پیدا ہوا ہے ۔

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

(جب حقیقت کا پتہ نہ چلا ڈھکوسلوں کی راہ اختیار کی)

حقیقت واضح ہونے کے بعد اشکال کچھ نہیں ہے۔ مگر معقولی تو باوجود دعویٰ معنی شناسی کے

محض الفاظ کے چکر میں پڑے رہتے ہیں سو معقولیوں نے محض الفاظ پر نظر کی اس لئے اشکال واقع ہوا اور عارفین نے اس جگہ عدم ارادہ کی حقیقت سمجھی کہ لفظ گو مطلق ہے مگر مراد خاص ہے۔ یعنی مراد وہ ارادہ ہے جو غیر مرضی حق ہو تو ان بزرگ کے کلام کا مطلب یہ ہے کہ میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ غیر مرضی حق کا ارادہ نہ کروں گا۔ یعنی جو ارادہ خدا کے نزدیک پسندیدہ اور مقبول ہے وہ ارادہ تو کروں گا۔ اور جو خدا کے نزدیک پسندیدہ اور مقبول نہیں وہ ارادہ نہ کروں گا لہذا اب کوئی منافات نہیں اور کوئی اشکال نہیں رہا۔ اور ترک ارادہ مطلقاً توکل کیسے ہوسکتا ہے جب کہ ارادہ شرط اعمال ہے اور اعمال کا امر نصوص میں وارد ہے جب اعمال فرض ہیں تو اُن کا ارادہ بھی فرض ہے۔ مثلاً دیکھو حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَقِیْمُوْ االصَّلٰوۃَ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلے وضو کرو پھر نماز پڑھو کیونکہ امر بالشئی مقتضی ہے امر بشرط الشئی کو۔ اسی طرح ارادۂ صلوٰۃ بھی اس سے لازم ہوگیا۔ کیونکہ جس طرح وضو شرط صلوٰۃ ہے۔ ارادہ اور نیت بھی اُس کی شرط ہے معلوم ہوا کہ ترک ارادہ مطلقاً تفویض نہیں ہے۔ غرض ایک تو وہ ارادہ ہے جس کا خدا تعالیٰ نے بھی حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

مَنْ[1] اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا وَ ھُوَ مُؤْ مِنٌ

تو اس آیت میں سعی سے پہلے اَرَادَ فرمایا تو معلوم ہوا کہ ارادہ کرنے کا بھی خدا ہی کا حکم ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ اس ارادہ کے نہ کرنے پر بطور وعید فرماتے ہیں۔

فَاَعْرِضْ[2] عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا

غرض غور و تدبر سے سینکڑوں آیات سے ارادہ کی دو قسمیں معلوم ہوتی ہیں ارادہ محمودہ و ارادہ مذمومہ۔ پس توکل کی یہ حقیقت ہے کہ اپنے کو خدا کے سپرد کردو۔ اپنی رائے کو دخل مت دو اور اپنے کو سپرد کرنا ایک عمل ہے۔ اور ہر عمل موقوف ہے ارادہ پر تو جب توکل موقوف ہے ارادہ پر تو جب ارادہ نہ ہوگا تو توکل ہی نہ ہوگا اور جب توکل ہوگا ارادہ بھی ہوگا۔ لہٰذا ارادہ محمودہ منافی توکل کے نہیں بلکہ توکل کے لوازم یا ذاتیات سے ہے پس تفویض کے معنی ترک ارادہ علی الاطلاق نہیں بلکہ اعمال خیر کا ارادہ تفویض میں داخل ہے۔ ہاں اعمال شر کا ارادہ اس کے منافی ہے تو اس ارادہ کا ترک البتہ تفویض میں لازم ہوگا۔

---

[1] اور جو شخص آخرت کی نیت رکھے گا اور اُس کے لئے جیسی سعی کرنا ویسی ہی سعی بھی کریگا۔ ۱۲ جامع۔

[2] تو آپ ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا لیجئے جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے اور بجز دنیوی زندگی کے اس کو کوئی مقصود نہ ہو۔ ۱۲ جامع۔

اب اس کے ساتھ ایک دوسرا مقدمہ ملایئے کہ تفویض الی الشیخ اکمل نہیں۔ تفویض الی اللہ سے۔ جب تفویض الی اللہ میں مطلق ترک ارادہ جائز نہیں تو تفویض الی الشیخ میں یہ ترک کیسے جائز ہوگا بلکہ جس طرح ارادہ محمودہ کا وہاں اختیار کرنا ضروری ہے اسی طرح یہاں بھی ضروری ہوگا۔ لہٰذا ارادہ محمودہ کا ترک کر کے بیٹھ جانا۔ اور یہ سمجھنا کہ تمام امور شیخ کے قبضہ میں ہیں۔ یقیناً منافی ہے۔ تفویض اور توکل کے شیخ کے قبضہ میں ہرگز ہرگز کچھ نہیں۔ مگر اب یہ حال ہے کہ مُرید صاحب شیخ ہی کے ذمہ سمجھتے ہیں حتی کہ اگر مرید سے کچھ غلطی ہو جائے اور شیخ متنبہ نہ کرے تو اُسے غلطی ہی نہیں سمجھتے۔ اور نہ اُس کے سمجھنے کی اور اس کے اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ بس یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ شیخ کے ذمہ ضروری تھا۔ جب اُس نے متنبہ نہیں کیا تو معلوم ہوتا ہے وہ غلطی ہی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں بلکہ تم خود ہی ان امور کی فکر کرو۔ اور خود ہی اپنے اعمال کو دیکھا کرو اور اُن کی اصلاح کی سعی کیا کرو۔

فکر خاص کا درجہ

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص مریض ہو اور طبیب کے پاس جا کر نبض دکھا کر خاموش بیٹھ جائے اور احوال نہ بیان کرے اور یہ کہے کہ ہمارا کام نبض دکھانا ہے۔ ہم نے نبض دکھا دی۔ آگے غور کرنا۔ اور احوال دریافت کرنا آثار و نبض سے۔ یہ طبیب کا کام ہے ہم ہرگز نہ بیان کریں گے۔ کہ کیا حال ہے تو واقع میں یہ شخص غلطی پر ہے اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو طبیب کو یہ حق حاصل ہے کہ مریض سے یہ کہہ دے کہ میری جوتی کو غرض پڑی ہے جو میں غور کروں اور اپنے کو بے ضرورت مشقت اور تکلیف مالا یطاق میں ڈالوں تجھے جو حالات معلوم ہیں وہ تو تو بیان بھی نہیں کرتا۔ اوّل اُن کو تو بیان کرتا کہ میں اُن چیزوں میں غور کروں جہاں تیری رسائی نہیں۔ اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو کام لینے کا طریقہ یہ ہے کہ جتنا درجہ اپنے اختیار میں ہے اس سے معالج کی امداد کرنی چاہئے۔ ورنہ ایسی صورت کے متعلق کہ مریض تو احوال نہ بیان کرے اور اپنی اصلاح کی سعی نہ کرے۔ اور طبیب شفقت کی وجہ سے اس کا کام بھی اپنے ذمہ لے لے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

فَلَعَلَّكَ[۱] بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ

اور فرماتے ہیں لَسْتَ[۲] عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ

اور ارشاد ہے: فَمَنِ[۳] اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ

---

[۱] سو شاید آپ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے تو غم سے جان دے دیں گے۔۱۲ [۲] آپ ان پر مسلط نہیں ہیں۔
[۳] سو جو شخص راہ پر آوے گا۔ وہ اپنے ہی فائدہ کے لئے راہ پر آوے گا۔

اور اِنَّآ[1] اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا

اور وَقُلِ[2] الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ

اور یٰٓاَیُّھَا[3] الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ

اور وَمَا[4] کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ۔

اس قسم کی آیات کو اگر جمع کیا جاوے تو تقریباً ایک پارہ کی مقدار پر جمع ہو جاویں جن کا حاصل یہ ہے کہ آپ ان کے پیچھے کیوں پڑھتے ہیں۔ آپ کا کام تبلیغ محض ہے اس سے زیادہ اس بوجھ کو اپنے اوپر نہ اٹھایا جاوے کہ جو کام مریض کا ہے وہ بھی آپ ہی کریں کہ اس میں مشقت اور اور تکلیف زیادہ ہے۔ جس پر دوام مشکل ہے ہر شخص اپنے عواقب اور انجام کو اچھے طور سے اور سہولت سے سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اس میں سخت دشواری ہے کہ دوسرا شخص اس کے بار کو برداشت کرے اور یہ بے فکر اور مطمئن ہو کر بیٹھ جاوے۔ البتہ اس درجہ شفقت کرنے کی بھی حق تعالیٰ نے ممانعت نہیں فرمائی یہ صرف مشورہ ہے مطلب یہ ہے کہ مصلح کے لئے مشورہ یہی ہے کہ وہ اس قسم کی فکر خاص میں نہ پڑے کیونکہ اس پر دوام ہو نہیں سکتا اور جب دوام نہیں ہوتا۔ تو لامحالہ اس قسم کی فکر خاص کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ تو اس مشقت سے فائدہ ہی کیا ہوا۔ اور اگر اس وقت بھی ترک نہ کیا تو عمر بھر کی مصیبت خریدی۔ اسی لئے عارفین کا قول ہے کہ

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ   برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

(آرزو کرو لیکن اندازے کے موافق خواہش کرو کیونکہ ایک گھاس کا پتہ پہاڑ کو نہیں اٹھا سکتا)

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اِنَّکَ[5] لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوطالب کے درپے تھے۔ آیت نازل ہوئی کہ آپ درپے نہ ہو جائیے۔ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ الآیۃ یہ وعظ مضمون وعظ التصدی بالغیر میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بہت درپے ہونا چاہئے گو ناجائز بھی نہیں۔ مگر حق تعالیٰ اور عارفین اس کا مشورہ نہیں دیتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو جگہ جگہ ممانعت ہے وہ ناجائز ہونے کی بناء پر نہیں بلکہ محض شفقۃً ہے کیونکہ آپ فہمائش میں بہت زیادہ سعی فرماتے تھے اور پھر بھی کفار عمل

---

[1] ہم نے آپ کو ایک سچا دین دے کر بھیجا ہے کہ خوشخبری سناتے رہئے اور ڈراتے رہئے۔ [2] اور آپ کہہ دیجئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے سو جس کا جی چاہے ایمان لے آوے اور جس کا جی چاہے کافر رہے ۱۲۔ [3] اے ایمان والو! اپنی فکرو۔ [4] اور کسی شخص کو ایمان لانا ممکن نہیں بدوں حکم خدا کے۔
[5] آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے۔ بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کر دیتا ہے۔ ۱۲ جامع

نہ کرتے تو اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حزن وملال ہوتا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَا[1] تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ.

اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلَا[2] يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ

مطلب یہ ہے کہ آپ حزن نہ کریں آپ ہنسی خوشی رہیں۔

نظر وفکر

سو یہ سب نہی شفقۃً ہے مگر باوجود اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام مراتب حزن کو برداشت کر کے ہمدردی سے نصیحت فرماتے تھے۔ اسی طرح اگر کوئی مصلح ہمدردی سے نصیحت کرے اور حزن وغم کو وہ خود برداشت کرے تو وہ ان کی تو شایان شان ہے۔ مگر بوجھ ڈالنے والے کو تو یہ مناسب نہیں۔ بلکہ جائز بھی نہیں کہ اپنے مصلح پر ایسا بوجھ ڈالیں اور آپ بے فکر اور بے کار محض ہو کر بیٹھ جاویں۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

اَيَحْسَبُ[3] الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى

اور دوسری جگہ ارشاد ہے

اَفَحَسِبْتُمْ[4] اَنَّمَا خَلَقْنَا كُمْ عَبَثاً وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ.

اپنے قویٰ سے کام نہ لینا، اور اُن کو بیکار کر دینا جائز نہیں۔ چنانچہ صاف طور پر ارشاد فرماتے ہیں۔

كِتٰبٌ[5] اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيَاتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوْا الْاَلْبَابِ

اور فرماتے ہیں۔ اِنَّ[6] فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ

اور جگہ جگہ اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۔ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا موجود ہے جا بجا انفس میں آفاق میں نظر وفکر کرنے کا حکم ہے تو معلوم ہوا کہ نظر اور فکر بھی ایک مامور بہ ہے اس میں ارادہ کو متعلق کرنا

---

[1] اور اُن پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اُن سے تنگ دل نہ ہو جائیے۔۱۲ [2] اور آپ کے لئے وہ لوگ موجب غم نہ ہونا چاہئیں جو جلدی سے کفر میں جا پڑتے ہیں۔۱۲۔ [3] کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ یوں ہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔۱۲ جامع۔ [4] ہاں تم کیا تم نے یہ خیال کیا ہے کہ ہم نے تم کو یوں ہی مہمل پیدا کر دیا ہے اور یہ کہ تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے۔۱۲ [5] یہ ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس لئے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل علم وفہم نصیحت حاصل کریں۔
[6] اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔۱۲ جامع

واجب ہے۔ دوسرے کے ذمہ ڈال کر بیکار محض ہو جانا اور آفاق اور انفس میں نظر و فکر اور غور و تدبر سے کام نہ لینا جائز نہیں اور اپنے قویٰ کو بیکار کر دینا مناسب نہیں۔

یہ ہے وہ چیز جس کو ہم نے چھوڑ رکھا ہے۔ اور جس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ آج کل اہلِ علم تک اس میں غلطی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حاجی عبدالرحیم میرے بھائی کے کارندہ مدرسہ میں آئے اور ایک طالب علم کے حجرہ میں گئے اتفاق سے حجرہ میں چوہے نے سوراخ کر کے مٹی نکال رکھی تھی۔ حاجی جی نے اس مٹی کو سوراخ میں ڈال کر اوپر سے منہ بند کر دیا۔ اتفاق سے پھر چوہوں نے مٹی نکال دی اور سوراخ کر دیا۔ تو کسی نے ان طالب علم سے کہا کہ میاں یہ سوراخ بند کر دیا ہوتا تو وہ صاحب فرماتے ہیں کہ حاجی جی بند کر دیں گے۔ گویا ایک دفعہ بند کر دینے کے بعد یہ کام عمر بھر کے لئے انہی کے ذمہ ہو گیا۔

تو ہم لوگوں کی بے فکری کی یہ کیفیت ہے کہ نفس پر کسی قسم کے بھی غور اور فکر کا بوجھ نہیں ڈالتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نماز پڑھنا سہل مرید ہو جانا ذکر و شغل کر لینا آسان۔ چنانچہ ہر شخص ان کاموں کو بخوشی کر لیتا ہے۔ مگر نظر و فکر دشوار ہے۔ لوگ نفس کے اندر غور کر کے فکر نہیں کرتے۔ کہ ہمارے اندر کیا کیا عیوب ہیں۔ اس لئے ضرورت شدید ہے کہ اپنے عیوب کو سوچنا چاہئے اور اپنے عیوب کی فکر کرنی چاہئے کہ میرے اندر کیا کیا عیب ہیں یہ خیال نہ کرو کہ شیخ ہی سوچ لیں گے۔

صاحبو! تم کو یہ خبر نہیں کہ اپنا کام دوسرے کے ذمہ ڈالنا کیسا ہے کیونکہ یہ تمہارا کام ہے اور اس میں ترک ارادہ کی تمہیں اجازت نہیں کیونکہ تقریر سابق سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ ارادہ ماموربہ ہے اور ماموربہ کا ارادہ کرنا خلاف تفویض نہیں۔ اور جب ماموربہ کا ارادہ تفویض الی اللہ کے خلاف نہیں باوجود یہ کہ تفویض الی اللہ اکمل ہے تو ماموربہ کا ارادہ تفویض الی الشیخ کے خلاف کیونکر ہوگا تو غور و فکر کو اپنا کام اپنے ذمہ سمجھو۔ شیخ کے ذمہ نہ سمجھو اگر کسی درجہ میں ہو تمہارے کام کو انجام دے تو اُس کا احسان سمجھو اور اگر وہ یہ کام اپنے ذمہ سے ہلکا کرنا چاہے تو اس سے دلگیر نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ خود فکر شروع کر دینی چاہئے۔ چنانچہ یہی مضمون اس حدیث میں ہے کہ ان صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرافقت جنت میں چاہتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اعنی علی نفسک بکثرة السُّجُوْدِ

کہ کثرت سجود سے میری اعانت کرنا۔ اس پر اُن صحابی یعنی ربیعہ بن کعب نے یہ عرض نہیں کیا کہ آپ ہی سب کچھ کر لیجئے جب اتنے بزرگ دربار میں اعانت کا حکم ہے اور صحابی میں دوبارہ کچھ عرض نہیں کرتے تو اب کس کو مجاز ہے باقی ہے کہ یہ کہہ سکے کہ میں کسی قسم کا غور و فکر نہیں کرتا۔

مذاق طالب

آپ ہی غور وفکر کریں عاشق اور طالب کا تو یہ مذاق ہونا چاہئے کہ اپنے عیوب پر ہر وقت خودنظر رکھے اور ہر وقت اپنے عیوب کو سوچا کرے اور دوسرے شخص کو اولاً تو اس درجہ فرصت دشوار ہے کہ وہ تمام آدمیوں کے عیوب سوچا کرے۔ اور اگر وہ فرصت نکالے بھی تو دوسرے شخص کے حالات باطنہ کا وہ استیعاب نہیں کرسکتا۔ شیخ تو کسی کو اس وقت ٹوکتا اور روکتا ہے جب آفتاب کی طرح عیب روشن ہوجاویں۔ ظن محض سے وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ اس لئے کہ

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا

(اور یقیناً بے دلیل خیالات امر حق میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے۔۱۲ جامع)

یا آنکھ سے دیکھ لیتا ہے جب روک ٹوک کرتا ہے اگر صاحب الہام ہوتا ہے تب بھی یہ دریافت کرکے اصلاح کرتا ہے کہ کیا تم میں یہ عیب ہے اگر وہ شخص انکار کرتا ہے تو شیخ اُس کے بیان پر قناعت کرتا ہے اور مسلمان کو سچا سمجھتا ہے اور اس کے خلاف کو سوء ظن سمجھ کر گرفت نہیں کرتا۔ اور یہ تفتیش وتحقیق کو شیخ کے ذمہ سمجھتے ہیں تو اب اصلاح کیونکر ہو اگر شیخ کسی غلطی پر بوجہ سوءِ ظن سے بچنے کے متنبہ نہیں کرتا تو یہ مُرید خیال کرتا ہے کہ مجھ میں کچھ عیب نہیں۔ تو چونکہ اس طرز میں یہ مضرت ہے کہ شیخ کے نہ کہنے کی وجہ سے یہ اپنے کو بالکل پاک وصاف سمجھے گا۔ اس وجہ سے اس طرز کا ترک کرنا ضروری ہے اور اپنی اصلاح کی خود سعی اور فکر مناسب ہے جب اپنے عیوب کی فکر کرے گا تو اس وقت اپنے عیوب نظر آویں گے اور روز روشن کی طرح دکھلائی دیں گے۔

اور نیز اس کا اپنے عیوب پر نظر کرنا مصلح کے واسطے بھی آسانی کا موجب ہوگا پس اس میں دونوں کی مصلحت ہے اور فکر نہ کرنے میں دونوں کو کلفت ہوگی۔ یہ تو سمجھے گا کہ مجھ میں کوئی عیب نہیں اور وہ سوء ظن کی وجہ سے سکوت کرے گا۔ تو خود فکر نہ کرنے سے اس کو تو یہ مضرت ہوئی کہ اس کو اپنے عیوب نہ معلوم ہوئے اور عیوب کو ہنر سمجھا۔ اور شیخ کو یہ کلفت ہوئی کہ اس کو فراست سے تو اجمالاً اس کے عیوب پر کھٹک ہوگی۔ اور تفصیل اس وقت معلوم ہوگی جب وہ خواہ مخواہ وہ اس سے پوچھے یا بے پوچھے خود اس کے عیوب کا تجسس کرے اور بدظنی سے کام لے جو شیخ کے مذاق کے خلاف ہے۔ غرض کہ اس کی خود فکر کرنے میں دونوں کی مصلحت ہے۔ لہذا ہر شخص کو خود اپنی فکر کرنی چاہئے۔ اور جہاں شبہ ہو تفصیل پیش کرکے شیخ سے پوچھ لے۔

اصولِ مشائخ

خلاصہ یہ ہے کہ مصلح پر بار نہ رکھنا چاہئے۔ اُس کی سہولت کے صورتیں نکالنی چاہئیں۔

جن میں سے ایک جُزو یہ بھی ہے کہ جس قدر تحقیقات شیخ سے سُنو سب کو اپنے احوال پر منطبق کرتے رہو۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

بشنوید اے دوستاں ایں داستاں   خود حقیقت نقد حال ماست آں
نقد حال خویش را گرپے بریم   ہم زدنیا ہم زعقبٰی برخوریم

(دوستو اس داستان کو سنو جو ہماری موجودہ حالت کے مؤافق ہے اگر اپنی موجودہ حالت میں غور وفکر کرتے رہا کروتو دونوں جہان کا ہم کوفکر حاصل کرو)

پس ہر مضمون کو ہمیں اپنا نقد حال سمجھنا چاہئے۔ مولانا نے بھی یہ حکایت جس کے یہ ابتدائی اشعار ہیں۔ ہماری ہی حالت کے موافق لکھی ہے۔ جیسا شراح نے تطبیق کی تقریر فرمائی ہے صاحبو! مشائخ کی یہ عادت نہیں ہوتی کہ وہ ازخود کسی کا عیب نام لے کر بیان کیا کریں۔ ہاں عام خطاب میں سب کچھ کہہ دیا کرتے ہیں۔ سو طالبین کو اپنے اوپر منطبق کر کے اصولِ عامہ سے کام لینا چاہئے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شرم وحجاب کی وجہ سے خطاب خاص نہیں فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ کیا حال ہے لوگوں کا ایسا کرتے ہیں تو صحابہ ان مجمل الفاظ کو اپنے اوپر منطبق کر لیتے تھے۔ ؎

خوشتر آں باشد کہ سرد لبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

(ایسے اسراروں کا دوسروں کی حکایات اور تمثیلات میں بیان ہونا مناسب ہے)

فی الحقیقت اور واقع میں بات یہی ہے کہ ؎

نقد حال خویش راگر پئے بریم   ہم زدنیا ہم زعقبےٰ برخوریم

(اگر موجودہ حالت مں ی غور وفکر کرتے رہا کریں تو دونوں جہان کا ہم کو نفع حاصل ہو)

طریق بزرگاں

بزرگوں کی تو یہاں تک حالت ہوئی ہے کہ جو افادات افادہ ہی کے لئے موضوع ہیں۔ ان سے تو استفادہ ضروری خیال کرتے ہی تھے۔ وہ تو ان الفاظ سے بھی جو کہ افادہ کے لئے موضع نہیں استفادہ کرتے تھے۔ چنانچہ شیخ شبلیؒ کی حکایت ہے کہ ایک سبزی فروش سبزی فروخت کرتا پھر رہا تھا اور یہ صدا اور آواز لگا رہا تھا۔ کہ الخیار العشرۃ بدانق جس کا ترجمہ یہ ہے کہ دس ککڑی ایک دانگ میں۔ اور ایک لغت پر یہ ترجمہ بعید جو کہ مراد نہ تھا۔ نہ اس کا کوئی قرینہ تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ دس نیک لوگ ایک دانگ میں۔ شیخ کے کان میں یہ آواز پڑی۔ شیخ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے کہ جب خیار (یعنی نیکوں) کی یہ حالت ہے تو ہم اشرار کو کون پوچھے گا۔ کیا اچھے لوگ تھے ؎

نگو یند از سر بازیچہ حرفے   کزاں پندے نگیرد صاحب ہوش

(قصہ کھیل سے بھی لوگ جو بات کہتے ہیں اس سے بھی عقل مند نصیحت حاصل کرتے ہیں)

ظاہر میں تو کھیل کی بات تھی مگر واللہ ثم واللہ ہر شئے میں اپنا سبق ہے۔ ہر چیز میں اپنا نفع ہے۔ چنانچہ حضرت جنیدؒ مریدوں کی معیت میں تشریف لے جارہے تھے ایک چور نے چوری کی تھی۔ خلیفہ نے ہاتھ کاٹا۔ اس کے بعد چوری کی۔ خلیفہ نے پیر کٹوایا اس کے بعد پھر چوری کی۔ خلیفہ نے سولی پر چڑھوادیا۔ تو شیخ جنیدؒ کا اس طرف گزر ہوا تو لوگوں نے اس کی سولی کا سبب پوچھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ بار بار چوری کرنے سے سولی دیا گیا ہے تو دوڑ کر اُس کے پاؤں چوم لئے مریدوں کو حیرت ہوئی۔ شیخ سے سبب پابوسی کا دریافت کیا۔ شیخ نے جواب دیا کہ میں نے اس کے استقلال سے پاؤں چومے ہیں کہ کس درجہ مستقل ہے اور استقلال فی نفسہٖ ایک صفت حمیدہ ہے۔ گو اس نے بے موقع اس کو صرف کیا۔ ہر رذیلہ میں ایک جزو کمال کا بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں استقلال کی ایک کمال ہے۔

امالۂ رذائل

صاحبو! اخلاق رذیلہ فی نفسہٖ رذیلہ نہیں مگر باعتبار مصرف کے مذموم ہیں۔ مولاناؒ خوب فرماتے ہیں ؎

اے بسا امساک کز انفاق بہ   مال حق را جز بامر حق مدہ

(اے طالب بہت مرتبہ خرچ نہ کرنا جس خرچ سے حق تعالیٰ کے مال کو بجز امر حق کے خرچ مت کرو)

اسی وجہ سے ہمارے حضرت حاجیؒ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ صفاتِ رذیلہ کا امالہ کردینا چاہئے یعنی مصرف شر سے مصرف خیر کی طرف ازالہ کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ صفات رذیلہ کی بعض وقت ضرورت ہوجاتی ہے۔ جن امور میں ذاتاً قبح ہے بعض اوقات اُن میں بھی عوارض کے اعتبار سے حُسن آجاتا ہے۔ مثلاً بخل ہے کہ جیسے کسی موقعہ پر سخاوت کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی بعض مواقع میں بخل کی بھی ضرورت ہے۔ مثلاً معاصی میں خرچ کرنے سے دل تنگ ہو اور مثلاً غصہ ہے کہ یہ محمودہ نہیں کہ بالکل غصہ نہ رہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۤئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ[1]

تو آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موجب مدح یہ ہے کہ غصہ ہو اور پھر غصہ جاری نہ کرے۔ معاف کردے یہ ہے موجب مدح تو سرے سے غصہ نہ ہونا کوئی کمال کی بات نہیں بلکہ نقص کی بات ہے کہ اس صورت میں مجاہدہ ہی نہ ہوگا۔ بلکہ کمال یہ ہے کہ غصہ بھی ہو اور تحمل بھی ہو۔ جہاں غصہ کی جگہ ہو وہاں غصہ کرے۔ ورنہ تحمل کو کام میں لاوے۔ مولاناؒ اسی مضمون کو ارشاد فرماتے ہیں کہ ؎

شہوتِ دنیا مثال گلخن است   کہ ازو حمام تقویٰ روشن است

(دنیا کی طلب اور خواہش مثل انگیٹھی کے ہے کیونکہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے)

یعنی گوبر بری چیز مانی جاتی ہے مگر حمام کے اندر اور دیگچے کے نیچے جلنے کا وہی کام دیتا ہے

---

[1] اور جو کہ کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں اور جب اُن کو غصہ آتا ہے تو معاف کردیتے ہیں۔ ۱۲ جامع۔

اور اس موقع پر وہی بہت اچھی چیز ہے۔ غرض جب شہوت ہو اور اُس کو روکے۔

اور اُس کے مقتضاء پر نہ چلے تو اس وقت شہوت کے روکنے سے نورانیت اور حظ روحانی میسر ہوتا ہے۔ کسی عورت کی طرف نگاہ نہ کرنے سے اور نگاہ کے روکنے سے اُس شخص کی نورانیت معلوم ہوگی جس کو خواہش بھی ہو اور جس کو سرے سے خواہش ہی نہ ہو۔ مثلاً عنین ہو تو اس کو تو نظر بد کی رغبت ہی نہ ہوگی اور جب رغبت نہ ہوگی۔ اس لئے مجاہدہ بھی نہ ہوگا۔ نرا معاہدہ ہی رہ جائے گا۔ اس واسطے شہوتِ دنیا مثل گلخن کے اور ایک درجہ میں یہ بھی مطلوب ہے اسی طرح حضرت جنیدؒ کا مطلب یہ تھا کہ استقلال حقیقت میں اچھی چیز ہے اس لئے مناسب ہے کہ استقلال تو اُس چور کا سا لیا جاوے اور اعمال اپنے لئے جاویں۔ اور اس استقلال کو اعمالِ صالحہ پر صرف کیا جاوے۔ پھر دیکھئے کیا مزہ آتا ہے۔ صاحبو! تم انجن کی بھاپ کیوں بجھاتے ہو۔ بھاپ رہنے دو۔ اور آگ بھی روشن رہنے دو۔ البتہ یہ انجن گاڑیوں کو اُلٹا لے جارہا ہے اس لئے اس کا رُخ بدل دو۔

طلب اشرف

اسی بناء پر شیخ جنیدؒ نے فرمایا کہ میں اس کے استقلال کے پاؤں چومتا ہوں کہ جب اس نے ایک بیہودہ مطلوب کے لئے جان دینا گوارا کیا اور اس سے باز نہ آیا تو ہمارا مذاق مطلوب خیر کے لئے یہ ہونا چاہئے۔ کہ ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید　　　یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

(جب تک میرا مقصد پورا نہ ہو جائے طلب سے باز نہ آؤں گا یا جسم محبوب حقیقی کی طرف پہنچے یا جان جسم سے نکل جائے)

اس کے سرقہ میں تو اس قدر استقلال تھا۔ اور ہمارے اعمال میں اُس کا عُشرِ عشیر بھی نہیں۔ یہ ہماری حالت ہے۔ صاحبو! بہت سے لوگ کیمیا کے طالب ہیں اور کیمیا گر ہیں۔ اور اس ادنیٰ درجہ کے کام کے لئے تمام عمر برباد کر لیتے ہیں۔ اور ذرا بھی دل برداشتہ نہیں ہوتے اور تمام عمر اسی دُھن اور طلب میں مبتلا رہتے ہیں اور افسوس ہے کہ ہم مطلوب اعلیٰ اشرف کی طلب میں چند ہی روز میں گھبرا جاتے ہیں۔ غرض ضرورت طلب کی ہے۔ اگر طلب پیدا کرلو گے تو کفار کے اقوال میں سے بھی استفادہ ہونے لگے گا۔ اور ان الفاظ سے فائدہ حاصل کرنے لگو گے جو اس غرض کے لئے موضوع نہیں اور اگر اتنا درجہ نہ ہو تو جن سے عقیدت ہو ان کے ہی افادات میں سے اپنے باطن کے متعلق اقوال کو اپنے باطن پر منطبق کیا کرو۔ اور اپنی اصلاح کی کوشش کیا کرو اسی لئے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اعنی بکثرۃ السجود ارشاد فرمایا۔

اعانتِ شیخ

ہر چند کہ وہ مورد عام نہیں خاص ہے مگر علت یعنی عمل نافع تو امر مشترک ہے اس لئے اس پر قیاس سے حکم کا یعنی وجود اعانت کا تعدیہ ہوسکتا ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے ہادی و مصلح پر بار نہ ڈالے بلکہ اُس کی اعانت کرے۔ جو کچھ اپنے قبضہ میں ہے اس کو خود کرے جیسے نبض دکھا کر احوال بیان کر کے طبیب کو سہارا لگایا جاتا ہے کیونکہ طبیب کو بتمامہ ادراک احوال کا دشوار ہے اور مریض کو سہل ہے اس لئے طبیب کی اعانت کرنا چاہئے۔ غرض جو اپنا کام ہے اس کا بار دوسرے پر نہ ڈالے اور جو اُس کا کام نہیں جیسا مقیس علیہ میں سوال مرافقت فی الجنۃ ہے اور مقیس میں حصول اصلاح ہے جو محض اس کی سعی سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ صرف اس کا بار شیخ پر رکھے۔ باقی اپنی درستی کی سعی خود کرے۔ مثلاً شیخ کے افادات پر اپنے احوال کی تطبیق خود کرے کہ میرے اندر کون کون امراض ہیں جب منطبق کرلے تب مصلح سے ظاہر کر کے طریقہ اصلاح دریافت کرلے۔ یہ طریقہ ہے مصلح کی اعانت کا جس کی فروگذاشت میں اخص الخواص تک مبتلا ہیں۔ اور ماموربہ کا ترک کر رہے ہیں۔

سو یاد رکھو کہ اس ترک سے تفویض نہ رہے گا بلکہ تعطل ہو جاوے گا۔ یہ مضمون تھا ضروری جس کے بیان کرنے کا خیال تھا۔ اور بیان کی حاجت بھی مگر قبل بیان اس درجہ ضروری نہ معلوم ہوتا تھا جیسا کہ اب عندالبیان ضروری معلوم ہوا۔ اب ختم کرتا ہوں اور اس وعظ کا نام اعانۃ النافع رکھتا ہوں۔ جس کا ترجمہ یہ ہے "نفع رساں کی اعانت، کیونکہ حدیث میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کہ اکمل النافعین بعد از خدا ہیں صحابی کو اپنی اعانت کا حکم فرمایا ہے۔ اسی طرح جو نفع رساں کہ وارث رسول ہو اس کے متعلقین کو بھی اس کی اعانت اصلاح اعمال اور اطلاع احوال واتباع اقوال سے کرنا چاہئے۔ بہرحال اپنے نافع کی اعانت ضروری ہوئی اور طالب اصلاح کو ہمت اور فکر کی حاجت ہوئی۔

نفیٔ جبر

ایک بات مناسب مقام لطیفہ کے طور پر یاد آتی ہے وہ یہ ہے کہ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ میں مشہور یہ ہے کہ یشآء کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے کہ اللہ میاں جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور یہ عقیدہ بالکل حق ہے مگر بعضے کج فہم اس سے جبر پر اور ترک سعی پر استدلال کرنے لگے گو جواب ظاہر ہے کہ اس مشیت سے مشیت عبد کی نفی۔ لازم نہیں آئی کہ جبر پر استدلال ہو سکے۔ لیکن ایک دوسرا جواب بھی جو ایسے اغبیاء کے لئے زیادہ سہل ہے میرے خیال میں آیا ہے کہ یشآء کی ضمیر من کی طرف راجع ہو یعنی جو خود اپنی ہدایت چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت کر دیتے ہیں اور یہ امر مشاہد ہے کہ جو شخص ہدایت چاہتا ہے اس کو ہدایت فرما ہی دیتے ہیں۔

اگر چہ یہ تفسیر کسی سے منقول نہ ہو۔ مگر تائیداس کی دوسری آیت سے ہوتی ہے۔

اَنُلۡزِمُكُمُوۡهَا وَاَنۡتُمۡ لَهَا كٰرِهُوۡنَ

کیا ہم اُس کوتمہارے گلے منڈھیں اور تم اس سے نفرت کئے چلے جاؤ۔۱۲ جامع۔

یعنی عادات خداوندی یہی ہے کہ جب آدمی ارادہ کرتا ہے اُس وقت حق تعالیٰ کی مشیت بھی متعلق ہو جاتی ہے۔

مسئلہ تقدیر

پھر اگر کوئی اس پر اشکال وارد کرے کہ خود ارادہ اس کا بھی تو مشیت حق پر موقوف ہے یعنی ہم نے یہ مانا کہ جب یہ ارادہ کرتا ہے۔ اس وقت خدا تعالیٰ چاہتے ہیں بلا اس کے ارادہ کئے ہوئے خدا تعالیٰ کسی پر اپنی ہدایت کو نہیں چمٹاتے۔ مگر خود اس کا ارادہ بھی تو خدا تعالیٰ ہی کی مشیت پر موقوف ہے یعنی بدوں خدا کی مشیت کے تو یہ ارادہ بھی نہیں کرسکتا۔ بلکہ پہلے خدا کی مشیت ہوگی۔ پھر بندہ کا ارادہ ہوگا۔ چنانچہ صاف ارشاد ہے۔

وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّآ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ اور تم بدوں خدا کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔۱۲ جامع۔

تو اصل یہ ہے کہ بے شک بندہ ارادہ اُسی وقت کرتا ہے جب خدا کی مشیت ہو اور بدوں خدا کی مشیت کے بندہ ارادہ نہیں کرسکتا۔ مگر تم کو تو پہلے سے معلوم نہیں کہ خدا تعالیٰ کی مشیت نہ ہوگی بس تم مشیت کر کے تو دیکھو اور چاہ کر دیکھو جب تم اپنی مشیت پوری کرلو اور اس وقت بھی اگر خدا کی مشیت نہ ہو تب بے شک تم مجبور سمجھے جاؤ گے بس تمہاری مشیت خدا تعالیٰ کی مشیت کی دلیل انی ہوگی یعنی قبل سے تمہیں کیا معلوم کہ خدا کی مشیت نہیں ہوگی یہ تو بعد میں معلوم ہوگا اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں اس وقت تمہاری طرف تمہارا نہ کرنا یہ دلیل لمی ہے تمہاری بدمعاشی اور شیطنت کی کیونکہ اس وقت تمہیں خدا کی عدم مشیت کی کیا خبر، غرض اگر مشیت کے وجوہ یا عدم کی ایسی ہی تحقیق مطلوب ہے تو تم مشیت کر کے دیکھو کہ خدا کی مشیت ہوئی یا نہیں۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ مشیت ہوئی اور بدوں اپنی مشیت کے تم نے مشیت حق کی نفی کا کیسے حکم لگا دیا۔ یہ تو تحقیقی جواب ہے۔

اور الزامی جواب یہ ہے کہ مشیت الٰہی عام ہے دینوی اور اُخروی تمام افعال کو تو جیسا اُخروی افعال میں یہ عذر ہے کہ اگر حکم خداوندی ہوگا اور خُدا کی مشیت ہوگی تو کارِ خیر کرلیں گے تو دنیاوی افعال میں بھی ایسا ہی کیا کرو۔ مگر دنیاوی افعال میں تو ایسا نہیں کرتے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق مقصود نہیں ہے۔ محض شرارت ہے۔

اور اگر کوئی شخص سب افعال میں ایک ہی معاملہ کرے اور مقصود اُس کا کُنہ معلوم کرنا ہو مسئلہ تقدیر کی تو سمجھ لو کہ اس مسئلہ کُنہ کی تحقیق کرنا گناہ ہے ممانعت کی وجہ سے اور ممانعت ہے عدم تحمل کی

وجہ سے۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنا بتلا دیا ہے۔ اجمالاً اُسی پر عمل و عقیدہ رکھیں اور کامیاب رہیں اور حقیقت خدا تعالیٰ کے سپرد کریں۔ بعضوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ حقیقت مسئلہ تقدیر کی جنت میں بھی معلوم نہ ہوگی۔ کیونکہ اس کی کنہ جب معلوم ہو جبکہ صفات کی کنہ معلوم ہو اور صفات کی کنہ کے لئے ذات کی کنہ معلوم ہونا شرط ہے اور یہ ثابت ہو چکا کہ خدا کا علم بکنہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مسئلہ تقدیر کا بھی پورے طور سے انکشاف نہیں ہو سکتا۔ اسی مضمون کو عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چین　　　کایں جا ہمیشہ بادبدست دام را

(جس طرح عنقا کو کوئی شکار نہیں کر سکتا جال پھیلانا اور کوشش کرنا لا حاصل ہے)

عنقا سے مراد مرتبہ ذات ہے کہ وہ کسی کے قبضہ میں علماً بھی نہیں آتا اور اس کی ذات کا پوری طور سے کوئی ادراک نہیں کر سکتا۔

کل ما خطر ببالکَ فهو هالک واللّٰه اعزوا علٰی من ذٰلک

اے براور بے نہایت در گہے است　　　ہر چہ بروے میرسی بروے مالیت

(اے بھائی لامتناہی دربار ہے جس درجہ پر بھی پہنچو اس پر مت ٹھہرو اس سے آگے ترقی کرو)

اندریں رہ انچہ مے آید بدست　　　حیرت اندر حیرت اندر حیرت است

(اس طریق سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ حیرت ہی حیرت ہے)

امام فخر الدین رازیؒ فرماتے ہیں ؎

نهایت اقدام العقول عقل　　　وَ غایت سعی العالمین ضلال

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا　　　سوی ان جمعنا فیه قیل یقال

(تمام عقلوں کے قدموں کی انتہا عقال کی طرف ہوتی ہے تمام دنیا والوں کی کوشش کا خلاصہ ضلال ثابت ہوا ساری عمر بجز بک بک اور قیل و قال کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ عمر یونہی ضائع کی)

اور یہ تو اہل ظاہر کے اقوال ہیں کہ واجب کی کنہ کسی کو معلوم نہیں۔

ادراک محسوسات

باقی محققین تو اس سے بھی آگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسئلہ تقدیر کا تو صفات کے ساتھ تعلق ہے اور صفات کا ذات کے ساتھ۔ سو تم صفات و ذات کا علم حاصل کرنے کی تو پیچھے کوشش کرنا۔ پہلے تم اُنہی چیزوں کا علم حاصل کر لو جو مشاہدہ محسوس ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم کو محسوسات کی حقیقت کا بھی علم نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے اب تک حکماء یہ کہتے تھے کہ کواکب سیارہ بسیط

ہیں اُن میں ترکیب نہیں۔ مگر آج کل کی تحقیقات یہ ہیں کہ مریخ میں بھی دنیا کی طرح آبادی ہے اور بہت لوگ کوشش کررہے ہیں مریخ کی طرف اُڑ کر پہنچیں اور وہاں کی مخلوقات سے بات چیت کریں اور آئے دن یہی رہتا ہے کہ فلاسفہ حال بہت سی تحقیقات میں حکماء سابقین کا خلاف ظاہر کررہے ہیں اور کچھ پتہ نہیں کون صحیح کہتا ہے کون غلط۔ غرض سب تحقیقات مخدوش ہوگئیں جس سے معلوم ہوا کہ انسان کو خدا تعالیٰ کی صفات وغیرہ کا تو کیا ہی علم ہوگا۔ اس کو محسوسات کی حقیقت کا بھی پورا علم نہیں ہوسکتا۔ پھر تقدیر کے مسئلہ میں جس کا تعلق صفات واجب سے ہے الجھنا محض حماقت ہے بس اجمالاً اتنا سمجھ لو کہ تم مختار محض ہو نہ مجبور محض ہو۔ تم کو کچھ اختیار بھی دیا گیا ہے اور کسی قدر مجبور بھی ہو۔ پس جس طرح امور دُنیا میں تم اپنے اختیار سے کام لیتے ہو اور وہاں تقدیر پر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھتے۔ اسی طرح دین کے کاموں میں بھی اختیار سے کام لو۔

طریق انبیاء علیہم السلام

غرض اپنی اصلاح کی فکر کرو اور سوچا کرو اگر ہم ارادہ کریں گے اپنی اصلاح کا اور فکر کریں گے حسب عادۂ الٰہیہ خدا تعالیٰ کی مشیت بھی ہوگی تو ہماری سُستی چُستی سے بدل جائے گی۔

انبیاء در کارِ دنیا جبر یند　　　کافراں درکارِ عقبےٰ جبر یند

انبیاء دُنیا کے کاموں میں جبریت برتتے ہیں اور آخرت کے کاموں میں احتیاط اور قدرت سے کام لیتے ہیں۔

برخلاف کفار کے کہ وہ اس کا عکس کرتے ہیں۔

انبیاء را کار عقبیٰ اختیار　　　کافراں را کار دنیا اختیار

(حضرات انبیاء علیہم السلام امور آخرت اختیار فرماتے ہیں اور کافر دنیا کے کام کاج اختیار کرتے ہیں)

پس انبیاء علیہم السلام کی طرح ہم کو بھی آخرت کے کاموں میں اختیار سے اور دنیا کے فضول کاموں میں جبر سے کام لینا چاہئے۔ جب آخرت کا کوئی کام سامنے آئے۔ تو اپنے کو مختار سمجھ کر ہمت کرو اور دنیا کے فضول کاموں سے مجبور سمجھ کر بچو تم کافروں کا اقتداء نہ کرو۔ انبیاء کا اقتداء کرو۔ فقط۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ـ

(اشرف علی) محرم الحرام ۱۳۵۹ ہجری

افنا المحبوب

افناء المحبوب سے موسوم وعظ ۲۸ شوال ۱۳۴۶ھ کو حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کے مکان پر ہوا۔ آپ کرسی پر جلوہ افروز تھے۔ حاجی دلاور خان صاحب سوداگر کانپور نے وعظ کی درخواست کی تھی۔ مستورات کے علاوہ مجمع کا اندازہ چار سو کے قریب تھا۔ تین گھنٹے تک بیان جاری رہا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب قدس سرہٗ نے اِسے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ. اَمَّا بَعْدُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ . لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ[1] حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۔ (آل عمران:۹۴)

طلب خیر

یہ دوآیتیں ہیں جن کا مضمون واحد ہے ایک میں اصل مضمون مذکور ہے دوسری میں اس کا تابع مذکور ہے حاصل آیات کا یہ ہے کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات بتلائی ہے کہ خیر کامل کرنے کا طریق کیا ہے۔

اور یہ ایسی بات ہے جس کو سب چاہتے ہیں کیونکہ جس کو ذرا بھی عقل ہو۔ بلکہ عقل بھی نہ ہو ذرا سا شعور ہو اور کچھ انسان ہی کی تخصیص نہیں ۔ بلکہ حیوانات بھی خیر کامل کے طالب ہیں۔ کیونکہ جانوروں کو بھی بعض امور سے رغبت ہے۔ اور بعض سے نفرت ہے۔ خواہ اعیان ہوں یا اعراض۔ پس جہاں ان کو مرغوب کے ملنے کی توقع ہو وہاں بھاگ کر جاتے ہیں۔ اور جہاں ضرب وقتل کا اندیشہ ہو وہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔ ہاں جو مخلوق بے شعور بے حس ہے جیسے جمادات و نباتات ان کو خیر کی طلب نہیں۔ اگر واقع میں وہ بے شعور ہیں۔ اور اگر واقع میں ان کو شعور ہے مگر قلیل جیسا کہ بعض حکماء نباتات میں شعور کے قائل ہوئے ہیں۔ مگر یوں کہتے ہیں کہ ان کو حیوانات سے کم شعور ہے تو اس قول پر ان کو خیر کی طلب تو ہوگی مگر قلیل ہوگی۔ بعض حکماء کہتے ہیں کہ نباتات

---

[1] تم خیر کامل کو کبھی حاصل نہ کر سکو گے۔ یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے اور جو کچھ بھی خرچ کرو گے۔ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں۔ (پارہ نمبر ۴ رکوع ۱)

میں شعور ہے کیونکہ بیلدار درخت کی بیل کو کسی رسی یا سیڑھی پر لگا دے تو وہ سیدھی چلی جائے گی۔ اسی طرح کوئی درخت سیدھا جا رہا ہو اور اوپر کوئی آڑ ہو تو درخت اس تک پہنچنے سے پہلے ہی رستہ میں سے مڑ جاتا ہے ان آثار کو دیکھ کر وہ نباتات میں شعور کے قائل ہوئے ہیں اور صوفیہ کے نزدیک تو جمادات بھی ذی شعور ہیں اب ڈھیلا جو نیچے آتا ہے حکماء تو اس کو حرکت قسر یہ کہتے ہیں اور صوفیہ اس کو اپنے اصول پر حرکت ارادیہ کہہ سکتے ہیں گو اس کے معنی کر ان کے نزدیک بھی حرکت قسر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ پیدا کیا ہے۔ غرض جس مخلوق میں شعور ہے وہ خیر کا طالب ہے۔

اب اگر تمام مخلوق ذی شعور ہے جیسا کہ صوفیہ قائل ہیں تو یوں کہنا چاہئے کہ ساری مخلوق خیر کی طالب ہے اور اگر بعض ذی شعور ہیں اور بعض غیر ذی شعور تو اکثر مخلوق خیر کی طالب ہے اور تمام مخلوق سے ہم کو کیا مطلب؟

اختلاف فی الخیر

اس تقریر سے یہ تو بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گیا کہ انسان میں تو ہر شخص خیر کا طالب ہے یہ اور بات ہے کہ خیر میں اختلاف ہو کہ ایک شخص ایک چیز کو خیر سمجھتا ہے دوسرا اس کو خیر نہ سمجھے۔ چنانچہ بعض لوگ جو کنوئیں میں ڈوب کر مر جاتے ہیں وہ بھی خیر کے طالب ہیں۔ کیونکہ وہ کسی سخت مصیبت یا پریشانی میں اس فعل کا ارتکاب کرتے ہیں ان کے نزدیک اس مصیبت کے ساتھ زندہ رہنے سے حیات کو منقطع کر دینا سہل اور بہتر ہوتا ہے۔ وہ اس کو خیر سمجھ کر ہی اختیار کرتے ہیں گو واقع میں شر ہی ہو خواہ حالاً یا مآلاً حالاً تو اس لئے کہ ممکن ہے خودکشی اور غرق میں تکلیف زیادہ ہوتی ہو۔ ممکن ہے پانی کے اندر ڈوبتے ہوئے جان ایسی گھٹتی ہو کہ اس کی تکلیف اس مصیبت سے بھی زیادہ ہو جس سے وہ بھاگنا چاہتا تھا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ڈوبنے میں جان بہت دیر میں اور بڑی تکلیف سے نکلتی ہے۔

آج کل متمدن اقوام نے قصاص بالسیف کی جگہ پھانسی تجویز کی ہے یہ بھی سخت موذی ہے کیونکہ اس میں زہوق روح کے لئے کوئی راستہ نہیں ہوتا اور قتل میں جان نکلنے کا راستہ ہو جاتا ہے۔ پھانسی میں تڑپنے کی وجہ سے زبان باہر نکل آتی ہے اور صورت بگڑ جاتی ہے۔

اور ان سے زیادہ متمدن اقوام نے ایک برقی کرسی تجویز کی ہے جس پر بیٹھتے ہی ایک سیکنڈ میں جان نکل جاتی ہے نہ معلوم اس میں کیسی کشش ہوگی اور روح پر کیا گزرتی ہوگی۔ مگر چونکہ دیکھنے والے کو اس تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں تکلیف نہیں اور قتل میں

لاش کے تڑپنے اور سر کے کٹنے، خون بہنے کا منظر سامنے ہوتا ہے اس کو وحشی سزا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ہاں یوں کہو کہ تم نے اپنی رعایت کرلی کہ تمہارے سامنے بھیانک منظر نہ ہو اور اس سے قیاس کرلیا کہ جب ہمارے سامنے بھیانک منظر نہیں تو واقع میں بھی کچھ زیادہ تکلیف نہیں۔

مگر یہ قیاس الغائب علی الشاہد ہے اور یہی اصل ہے تمام معادیات کے انکار کی کہ جو چیز نظر سے غائب ہے وہ ان کے نزدیک معدوم محض ہے انہوں نے عدمِ مشاہدہ کو عدم اصلی کی دلیل بنالیا ہے۔ حالانکہ امریکہ کا مشاہدہ پہلے ایک عرصہ تک نہ ہوا تھا تو کیا اس وقت وہ بھی معدوم اصلی تھا۔ اور اس کا بطلان ظاہر ہے تو اب اس سوال کے کیا معنی کہ جنت و دوزخ اگر کوئی چیز ہے تو وہ ہم کو نظر کیوں نہیں آتی۔ تم کو نظر نہ آنے سے یہ کیونکر لازم آیا کہ وہ معدوم ہیں۔ اسی طرح تم کو اگر پھانسی یا برقی کرسی کی سزا میں تکلیف کا منظر نہیں آتا تو اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ مرنے والے کو بھی تکلیف زیادہ نہیں ہوئی۔ دلیل عقلی کا مقتضاء یہ ہے کہ قتل میں مرنے والے کو کم تکلیف ہوتی ہے اور ان مہذب سزاؤں میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے کیونکہ موت نام ہے زہوق روح یعنی جان نکلنے کا اور جس طریق میں جان نکلنے کا راستہ پیدا کیا جائے یقیناً اس میں سہولت سے جان نکلے گی اور جن صورتوں میں گھونٹ کر یا دبا کر جان نکالی جائے گی اس میں سخت تکلیف سے جان نکلے گی۔ گو دیر کم لگے۔

یہاں سے شریعت کی قدر ہوتی ہے کہ اس نے مجرم کے ساتھ بھی احسان کیا ہے اور اس کی آسانی کی رعایت کی ہے کہ تلوار سے قصاص کا امر کیا ہے۔ رہا یہ کہ اس سے دیکھنے والوں کو وحشت ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جس غرض کے لئے قصاص شروع ہوا ہے۔ یہ وحشت اس غرض کی تحصیل میں معین ہے۔ یعنی زجر و تنبیہ کہ اس منظر کو دیکھ کر ہر شخص خائف ہو جائے اور جرائم پر اقدام کرنے سے رُک جائے اور جو صورتیں اہل تمدن نے تجویز کی ہیں ان میں سے دوسروں کو تو زجر و تنبیہ زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ وحشت ناک منظر سامنے نہیں آتا۔ البتہ مجرم کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اور یہ سخت بے رحمی ہے جب ایک شخص کو جان ہی سے مارنا ہے تو اس کو راحت دے کر مارنا چاہئے۔ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمِ عام فرمایا ہے۔

اِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوْا الْقِتْلَةَ وَ اِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوْا الذِّبْحَةَ

''یعنی جب تم قتل کرو تو عمدگی کے ساتھ کرو اور جب ذبح کرو تو خوبی سے ذبح کرو''

جس میں قصاص کی بھی تخصیص نہیں بلکہ قتل کفار کو اور ذبح حیوانات کو بھی عام ہے۔ پس شریعت نے ظالموں کو بھی رعایت کی ہے کہ ان کو بے رحمی اور بے دردی سے نہ مارا جائے اور

دوسروں کی بھی رعایت کی ہے۔ دوسروں کی رعایت قصاص میں یہ ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

ترجمہ: اے فہیم لوگو! قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ تم لوگ پرہیزگار رکھو گے کہ قصاص میں لوگوں کو جرائم سے زجر کامل ہوتا ہے۔ میرا رسالہ ارشاد الہائم فی حقوق البہائم مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شریعت نے حیوانات کے حقوق کی کس درجہ رعایت کی تو جس شریعت نے تمام مخلوق کے ساتھ سہولت کی رعایت کی ہو اس کو گاؤ بتیا کا الزام دینا اور بے رحمی سے متہم کرنا کتنا صریح ظلم ہے واللہ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ سے زیادہ رحم کسی مذہب میں بھی نہیں ہے۔ اور ذبح حیوان رحم کے خلاف نہیں بلکہ ان کے حق میں اپنی موت مرنے سے مذبوح ہو کر مرنا بہتر ہے۔ کیونکہ خود مرنے میں قتل و ذبح کی موت سے زیادہ تکلیف ہے۔

رہا یہ سوال کہ پھر انسان کو بھی ذبح کر دیا جایا کرے تا کہ آسانی سے مر جایا کرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حالت یاس سے پہلے ذبح کرنا تو دیدہ و دانستہ قتل کرنا ہے اور حالت یاس کا پتہ نہیں چل سکتا کیونکہ بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے کہ مرنے کے قریب ہو گئے تھے پھر اچھے ہو گئے اور یہ شبہ اگر حیوانات میں کیا جاوے کہ ان کی یاس کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا جواب یہ ہے کہ انسان اور بہائم میں فرق ہے وہ یہ کہ انسان کا تو ابقاء مقصود ہے کیونکہ خلق عالم سے مقصود وہی ہے اسی لئے ملائکہ کے موجود ہوتے ہوئے اس کو پیدا کیا گیا بلکہ تمام مخلوق کے موجود ہونے کے بعد اس کو پیدا کیا گیا کیونکہ نتیجہ اور مقصود تمام مقدمات کے بعد موجود ہوتا کرتا ہے۔ اس لئے انسان کے قتل کی اجازت نہیں دی گئی ۔ ورنہ بہت لوگ ایسی حالت میں ذبح کر دیئے جائیں گے۔ جس کے بعد ان کے تندرست ہو جانے کی امید تھی اور ذبح کرنے والوں کے نزدیک یاس کی حالت تھی اور جانور کا ابقاء مقصود نہیں اس لئے ان کے ذبح کی اجازت اس بناء پر دیدی گئی کہ ذبح ہو جانے میں[1] ان کو راحت ہے اور ذبح کے بعد ان کا گوشت وغیرہ بقاء انسان میں مفید ہے جس کا ابقاء مطلوب ہے۔ اگر اس کو ذبح نہ کیا جائے اور یوں ہی مرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے تو

---

[1] رہا یہ سوال کہ اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ چونکہ انسان کا بقاء مقصود ہے اس لئے اس کے حق میں راحت موت کی رعایت نہیں کی گئی اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت مقدسہ نے انسان کی راحت موت کا دوسرا سامان بتلایا، (۱) شہادت جہاد جس میں زہوق روح کی شہید کو تکلیف نہیں ہوتی (۲) موت کے وقت لا الہ الا اللہ کی تلقین اور اور سورۂ یاسین کی تلاوت فان لہما تاثیرا فی تسہیل النزع (۳) تعلق مع اللہ کا غالب کر لینا اس حالت میں شدت نزع کی بھی کلفت نہیں ہوتی۔ (اشرف)

مردہ ہو کر اس کے گوشت وغیرہ میں سمیت کا اثر پھیل جائے گا اور اس کا استعمال انسان کی صحت کے لئے مضر ہوگا تو بقاء انسان کا وسیلہ نہ بنے گا اور قصاص و جہاد میں چونکہ افناء بعض افراد بغرض ابقاء جمع الناس متعین ہے اس لئے وہاں قتل انسان کی اجازت دیدی گئی۔ مگر ساتھ ہی اس کی رعایت کی گئی کہ حتی الامکان سہولت کی صورت سے مارا جائے یعنی قصاص میں جو کہ قتل اختیاری ہے تلوار سے اور جہاد میں مُثلہ وغیرہ کی ممانعت ہے۔ غرض خودکشی میں گو سخت تکلیف ہوتی ہو۔ حالاً تو احتمالاً۔ اور مآلاً باقتضاء وعید مگر جو شخص اس پر اقدام کرتا ہے وہ خیر ہی سمجھ کر کرتا ہے اور وہ تکلیف مآلاً عذاب ہے جہنم کا جو کہ بہت ہی سخت ہے۔

مگر جو لوگ کہ بے فکر ہیں اور خودکشی پر اقدام کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عذاب جہنم سے غافل ہیں اس کو سوچتے نہیں (اس وقت ایک صاحب حضرت مولانا کے چہرہ کو برابر تک رہے تھے اس پر ان کو تنبیہ فرمائی کہ یہ خلاف ادب وتہذیب ہے اس سے دوسرے شخص کا دل تنگ ہوتا ہے بس کبھی کبھی دیکھو اور کبھی کبھی نگاہ نیچی رکھو یہ کیا کہ باؤلوں کی طرح منہ تک رہے ہو معلوم ہوتا ہے کہ بیان بھی نہیں سمجھتے ورنہ یا تو حرکت اہتزاز یہ ہوتی اور یا استغراق ہوتا پھر طرفہ یہ کہ جو علماء نے لکھا ہے کہ عالم کے چہرے کی طرف دیکھنا بھی عبادت ہے اس کا مطلب گھورنا اور تکنا نہیں ہے بلکہ یہی مراد ہے کہ کبھی کبھی اس کے چہرے کی طرف دیکھ لیا جائے اور اس طرح دیکھا جائے اس کو خبر بھی نہ ہو کہ کوئی مجھے تک رہا ہے کیونکہ اس سے اس کو تکلیف ہوگی۔ دل پر گرانی ہوگی مگر لوگوں کو اس کا احساس ہی نہیں کہ دوسرے کو اس فعل سے گرانی کیونکر ہوتی ہو۔ پھر ارشاد فرمایا (۱۲) عذاب جہنم کا تحمل کوئی نہیں کرسکتا۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ جہنم میں مکثِ طویل کا ادنیٰ درجہ سات ہزار برس ہیں۔ حضرت جہنم کے اندر تو سات دن بھی کوئی عذاب کا تحمل نہیں کرسکتا۔ مگر میں مسلمانوں کو بشارت دیتا ہوں کہ ان کو عذابِ جہنم کا احساس کفار سے بہت کم ہوگا۔ جس کی حقیقت مسلم کی ایک حدیث میں ان لفظوں سے بیان کی گئی ہے۔ اَمَاتَهُ اللّٰهُ فِيهَا اَمَاتَةً کہ حق تعالیٰ ان کو جہنم میں ایک قسم کی موت دیدیں گے۔ حدیث میں تو اتنا ہی ہے۔ شیخ ابن عربیؒ نے اس کی تفسیر یوں کی ہے کہ مومنین کو جہنم میں ایک مدت کے لئے ہلکی سی نیند آ جائے گی۔ حدیث النوم اخو الموت سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ نیز اس سے بھی کہ اَمَاتَهُ اللّٰهُ فِيهَا اَمَاتَةً کا سیاق کلام بتلا رہا ہے کہ حقیقی موت تو مراد نہیں۔ ورنہ اماتةً بڑھانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ صرف اَمَاتَهُمْ کافی تھا یہ طرز کلام بتلا رہا ہے

کہ خاص قسم کی مراد ہے جو موت کے مشابہ ہے حقیقی موت مراد نہیں وَاللّٰہُ اَعْلَمُ[1]

شیخ عربیؒ نے اس کے بعد یہ بھی فرمایا ہے کہ اس نیند کی حالت میں وہ یوں خواب دیکھے گا کہ میں جنت میں ہوں اور خود ان کے پاس ہوں۔ یہ بات کہنے کی تو نہ تھی کہیں مسلمان بے فکر نہ ہو جائیں۔ کہ بس جہنم میں جا کر مزے سے سوئیں گے! جی ہاں کبھی جا گو گے تو ہو ہی نہیں سکتا اگر تھوڑی دیر کو بھی جاگ گئے تو نانی یاد آ جائے گی۔ غرض کہ یہ مآل ہے خودکشی کا۔ مگر اس کو انسان سوچتا نہیں ہے۔ اس لئے خودکشی کو حالت موجودہ سے بہتر سمجھ کر اختیار کرتا ہے۔ پس ہر شخص اپنے نزدیک خیر ہی کا طالب ہے۔

خیر حقیقی

اب اس میں اختلاف رہا کہ صحیح طریقہ اس خیر کے حاصل کرنے کا کیا ہے اور حقیقی خیر کیا ہے اور جو صحیح طریقہ ہوگا وہی یقیناً خیر حقیقی کی طرف موصل ہوگا ورنہ وہ طریق صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ غلط ہوگا۔ سو حق تعالیٰ اس آیت میں طریق صحیح تحصیل خیر کا بتلاتے ہیں۔

اور اس کا ربط اوپر کی آیات سے یہ ہے کہ اوپر کفار کا ذکر ہے کہ وہ قیامت میں زمین کے برابر سونا دے کر عذاب سے چھوٹنا چاہیں تو نہیں چھوٹ سکیں گے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَا تُوْا وَ ھُمْ کُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِھِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَھَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰی بِہٖ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّ مَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ۔

بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور وہ مر بھی گئے حالت کفر ہی میں۔ سو ان میں سے کسی کا زمین بھر سونا نہیں لیا جائے گا۔ اگرچہ وہ معاوضہ میں اسکا دینا بھی چاہے ان کے لئے دردناک سزا ہوگی اور ان کا کوئی حامی بھی نہ ہوگا۔ (پارہ ۳ رکوع ۱۷)

اس میں تو یہ بتلایا گیا ہے کہ کفار کو اس مال سے کچھ نفع نہ ہوگا۔ اب اس کے مقابل مسلمانوں کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کو اپنے اموال سے نفع حاصل ہوگا وہ یہ کہ مسلمانوں کو انفاق مال سے[2] خیر کامل حاصل ہوگی۔ مگر اس کے لئے کچھ شرائط ہیں جن کا ذکر اس آیت میں ہے مگر میں ان کو بعد میں بیان کروں گا۔

غرض حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ کفار کے ذکر کے ساتھ مسلمانوں کا ذکر فرماتے ہیں اور بالعکس اور اسی معاملہ کے متعلق ذکر ہوتا ہے جس کے متعلق کفار کا ذکر تھا اور ایک کے ساتھ قہر کا

---

[1] اللہ بہتر جاننے والا ہے۔ [2] وہ شرط اس شئے کی ہے جو بعد میں مذکور ہے۔

خطاب اور عین اسی موقع پر دوسرے کے ساتھ لطف کا خطاب فرماتے ہیں۔

اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ کلام حق تعالیٰ کا ہے کیونکہ عدم تغیر وعدم تاثر خاصہ واجب کا ہے۔ واجب تعالیٰ کسی سے متاثر نہیں ہوتا۔ باقی سب مخلوق متاثر ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص دشمن پر غصہ ہو رہا ہو تو اس حالت غضب میں اگر دوست آجائے تو اس کے ساتھ بھی گفتگو میں غصہ کا اثر باقی رہتا ہے۔ گو طرز ہی میں ہو۔ اور حق تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ قرآن میں کفار پر لتاڑ ڈال رہے ہیں اور نہایت شدت کے ساتھ اُن پر غضب کا اظہار فرما رہے ہیں پھر اس کے ساتھ ہی مومنین کا ذکر ہے تو غایت لطف وعنایت کے ساتھ ان کو خطاب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ میں تغیر و تاثر اصلاً نہیں ہے۔ اسی لئے محققین نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ پر غضب و رحمت کا اطلاق باعتبار مبادی کے نہیں ہے۔ بلکہ غایات کے اعتبار سے ہے۔ چنانچہ غضب کی غایت ہے نافرمان کو اپنے مقام قرب سے دور کر دینا۔ اس پر لعنت ونفریں کرنا اس کو سزا دینا اور رحمت کی غایت ہے مطیع کو مقرب بنا لینا اس کی مدح وثناء کرنا۔ اعلیٰ خطابات سے مشرف وممتاز کرنا اور اس پر انعام وفضل کرنا وغیرہ وغیرہ تو ان غایات کے اعتبار سے حق تعالیٰ پر غضب ورحمت کا اطلاق کیا جاتا ہے نہ اس معنیٰ کر کہ حق تعالیٰ کو غصہ میں جوش ہوتا ہے یا رحمت کے وقت ان پر رقت طاری ہوتی ہے۔ ہر گز نہیں بلکہ حق تعالیٰ کا غضب و رحم سب ارادی ہے اضطراری نہیں (یعنی تعلق فعل غضب ورحم اختیاری ہے یہ مطلب نہیں کہ غضب ورحم بمرتبہ صفت بھی اختیاری ہے کیونکہ ہر صفت واجب درجہ صفت میں غیر اختیاری ہے ۱۲)

اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ شعراء نے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کا محبوب بایں معنیٰ بنایا ہے اور حق تعالیٰ کو عاشق بنایا ہے کہ نعوذ باللہ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دلہن وغیرہ کی طرح معشوق بنایا ہے اور حق تعالیٰ کو عاشق قرار دیا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کو جوش محبت ہے۔ یہ سخت غلطی اور گستاخی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو جوش محبت نہیں ہوتا نہ جوش غضب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے جوش ہونا نقص ہے۔ ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ کمال ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا جوش ہو۔ غرض اللہ تعالیٰ کفار کے ذکر کے ساتھ ہی مسلمانوں کو تسلی دیتے ہیں کہ تم اس وعید سے بے فکر رہو تمہارا انفاق مال بے کار نہیں بلکہ بہت کار آمد ہے۔

اور اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ بعض دفعہ دشمن اور مجرم پر عتاب ہوتا دیکھ کر دوستوں کو بھی خطرہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہم پر بھی عتاب نہ ہونے لگے۔ اور اس کا زیادہ احساس حضرات صحابہ کو ہوتا تھا اور ان سے بڑھ کر حضرات انبیاء علیہم السلام کو اور ہم کو اس کا احساس اس لئے کم ہوتا ہے کہ اول تو ہم کو اپنے اعمال پر ناز ہے کہ ہم تو مسلمان ہیں نماز پڑھتے ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں۔ تلاوت قرآن کرتے رہتے ہیں۔ ذکر وشغل کرتے ہیں، ہم پر عتاب کیوں ہونے لگا۔ دوسرے ہم لوگ اللہ تعالیٰ کی شان استغناء سے غافل ہیں۔

طلب اسرار

اور حضرات انبیاء علیہم السلام باوجود معصوم ہونے کے لرزتے کانپتے رہتے تھے۔

اور شان استغناء کے یہ معنی نہیں کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کو رحم نہیں جیسا جوان موت کے موقع پر لوگ جمع ہو کر کہا کرتے ہیں کہ ہائے! کیسا جوان تھا۔ ابھی دنیا کو کچھ بھی نہ دیکھا تھا۔ ابھی چار دن ہوئے شادی ہوئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے ہیں۔ یہ سب باتیں سُن کر ایک بوج بجکو کہتے ہیں کہ میاں خدا کی شان بڑی بے پرواہ ہے اس موقع پر یہ کلمہ سخت گستاخی کا ہے جس کے صاف یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو نعوذ باللہ کسی کی مصلحت کی ذرا پرواہ نہیں۔ نہ کسی پر رحم ہے حالانکہ بخدا حق تعالیٰ سے زیادہ بندہ کی مصالح کی رعایت کوئی نہیں کرسکتا۔ خود بندہ بھی اپنی مصالح کی اتنی رعایت نہیں کرسکتا۔ جتنی اللہ تعالیٰ اس کی مصالح کی رعایت فرماتے ہیں۔ مگر یہ کہ وہ تم کو بھی بتلا دیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ اور اجمالاً بتلا بھی دیا ہے۔

عَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْئًا وَّ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَ عَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ

یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو۔ اور ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خرابی ہو۔ (پارہ ۲ رکوع)

یعنی ممکن ہے کہ تم کسی چیز سے کراہت کرو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز سے رغبت کرو اور وہ تمہارے لئے مضر ہو۔ یہ حقیقت میں منع ہے جس میں احتمال کلی کافی ہے۔ ہر ہر جزئی کے متعلق تعین کے ساتھ مصالح و مضار کا بتلانا بائع کے ذمہ نہیں اور نہ اس کی اللہ تعالیٰ کو ضرورت ہے۔ کیونکہ وہاں شخصی حکومت ہے جمہوری حکومت نہیں ہے کہ بادشاہ کو دو رائے سے زیادہ کا اختیار نہیں ہوتا۔ اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شخصی حکومت میں تخلق باخلاق اللہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حکومت بھی شخصی ہے۔

صاحبو! باپ بیٹے کو نصیحت کرتا ہے اگر وہ باپ کی نصیحت میں شبہ کرنے لگے تو وہ ایک دھول لگاتا ہے جواب میں دلائل سے اپنے قول کو مدلل نہیں کرتا تو کیا خدا کو اتنا بھی حق نہ ہو ہاں کبھی خود چاہیں تو اپنے افعال کی حکمتیں کسی موقع پر بیان بھی فرما دیتے ہیں۔ اور کبھی خواص کو ان اسرار کا الہام ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کب ہوتا ہے جب کہ اسرار کی طلب نہ ہو کیونکہ طالب اسرار کو کشف اسرار میسر نہیں ہوتا۔ جنت و نماز روزہ کا طلبکرنا تو مطلوب ہے۔ مگر اسرار و حکم کا طلب کرنا ممنوع ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

حدیث مطرب و مے گو دراز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

(حدیث و مے یعنی عشق و محبت کی باتیں کرو زمانہ کے بھید اور اسرار کی ٹوہ میں مت لگو

کیونکہ یہ عقیدہ حکمت سے نہ کسی نے حل کیا اور نہ حل کر سکے گا)

ہاں مجذوبین کچھ اسرار بیان کردیتے ہیں مگر وہ اسرار ہی کیا ہیں صرف کونیہ ہوتے ہیں۔ جو تکوین کے متعلق ہوتے ہیں کہ فلاں دن بارش ہوگی۔ فلاں سن میں جنگ ہوگی۔ ایک بادشاہ معزول ہوگا، فلاں شخص مقدمہ میں کامیاب ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ باقی اسرار الٰہیہ کی ان کو کیا خبر کچھ نہیں لوگ خواہ مخواہ ان کے پیچھے پھرتے ہیں۔ یہ بھی ایک مطلب ہوسکتا ہے۔ عارف کے اس شعر کا ؎

راز دروں پردہ ز رنداں مست پرس　　　　کیں حال نیست صوفی عالی مقام را

کہ اسرار کونیہ کو مجذوبوں سے پوچھو صوفیان عالی مقام کو اس کی خبر نہیں اس میں یہ بھی بتلا دیا کہ یہ اسرار کچھ قیمتی نہیں ورنہ بڑے لوگوں کے پاس ضرور ہوتے۔

غرض طلب اسرار ممنوع ہے اور بلا طلب بھی مقصود نہیں اسی لئے حق تعالیٰ نے بیان نہیں فرمائے ہاں اجمالاً اتنا فرما دیا ہے کہ عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّ هُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ (یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو) تو اللہ تعالیٰ سے زیادہ بندہ کے مصالح کی رعایت کوئی نہیں کرسکتا۔ مگر ان کو بتلانے کی ضرورت نہیں پس حق تعالیٰ کے استغناء کے یہ معنی نہیں کہ ان میں رحم نہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج اور کسی سے عاجز نہیں۔

تجلی جلال

اسی قدرت وعدم احتیاج پر نظر کر کے انبیاء علیہم السلام ہر وقت لرزاں وترساں رہتے ہیں۔ خصوصاً جس وقت کسی پر عتاب ہوتا ہے۔ خواہ کفار پر ہی ہو اس وقت تجلی جلال کا مشاہدہ کر کے وہ بہت لرزنے لگتے ہیں کہ خدا خیر کرے کہیں ہم پر بھی عتاب نہ ہونے لگے۔ کیونکہ اول تو اس وقت تجلی جلال کا مشاہدہ اُن پر ایسا غالب ہوتا ہے کہ اپنی معصومیت ومقبولیت پر نظر نہیں رہتی۔ ؎

چو سلطان عزت علم برکشد　　　　جہاں سر بجیب عدم درکشد

(جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر زارد ہوتی ہے تو سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں)

اور نظر بھی ہو تو اس وقت شانِ استغناء ان کے پیش نظر ہوتی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو منسوخ کردیں اور اس پر یقیناً وہ قادر ہیں تو ان کو روکنے والا کون ہے۔ دوسرے ان کو یہ احتمال بعید بھی ہوسکتا ہے کہ شاید یہ وعدۂ رحمت کسی خاص شرط کے ساتھ مشروط ہو جس کی ہم کو خبر نہ ہو اگر اس سے بھی نہ سمجھے ہو تو یوں سمجھو کہ عظمت وہیبت ذات کا اثر کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں بلکہ وہ بلا شرط ہوتی ہے۔ جیسے شیر کی ہیبت طبائع میں فطری ہے پس اگرچہ شیر کٹہرے میں بند ہو اور عقلاً ہم جانتے ہوں کہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن اگر وہ اس حالت میں بھی گھور کر ہماری

طرف دیکھ لے اور غرائے تو یقیناً ہیبت کا غلبہ ایسا ہوگا کہ تمام مقدمات، عقلیہ نظر سے غائب ہو جائیں گے ۔ جب ایک شیر کی ہیبت کی یہ حالت ہے تو خدا تعالیٰ کی ہیبت کی کیا شان ہونا چاہئے ۔ یہی حال امام غزالیؒ پر ایک مدت طویلہ تک غالب رہا اور خوف بھی خالق کا یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب احیاء العلوم کی کتاب الخوف دیکھنے کا کسی کو تحمل نہیں بعض لوگ اس کو دیکھ کر مایوس ہوگئے اس لئے میں اس کے مطالعہ سے اکثر کو منع کر دیتا ہوں اس کا تحمل اہل اللہ ہی کو ہوتا ہے حق تعالیٰ اولیاء کراموں کو قوت دیتے ہیں پھر خوف دیتے ہیں اس لئے وہ اس کا تحمل کر لیتے ہیں اور دوسروں کو اس حالت کا تو کیا تحمل ہوگا ۔ اگر اولیاء ان کے سامنے اپنی حالت ظاہر کر دیں تو سننے والے کا جگر پھٹ جائے باقی اہل اللہ کو ہر دم موت ہی رہتی ہے ۔

کشتگان خنجر تسلیم را — ہر زمان از غیب جان دیگر است

(تسلیم ورضا کے خنجر لگے ہوؤں کو ہر آن غیب سے نئی زندگی ملتی ہے)

یہی ہیں جو اس موت وحیات کا تحمل کرتے ہیں دوسروں کو ان کے حال کی کیا خبر ۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست — حال شیرانی کہ شمشیر بلا برسر خورند

(ارے تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہیں لگا تم ان لوگوں کی حالت کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا ومصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

اسی کے متعلق عارف فرماتے ہیں ۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید — قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

(بارِ امانت (اقتدار کا بوجھ) آسمان نہ اٹھا سکا اس کا قرعہ فال، مجھ دیوانہ کے نام نکلا)

عوام کو اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا مگر جن پر گزرتی ہے وہ جانتے ہیں کہ واقعی اس کا بار تحمل نہ آسمان کرسکتا ہے ۔ نہ زمین ۔ یہ مضمون طویل ہوگیا میں یہ کہہ رہا تھا کہ کفار کے ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی تسلی اس لئے فرماتے ہیں تاکہ عتاب کو سُن کر اہل اللہ لرزنے نہ لگیں ۔ یہ تو ربط کا بیان تھا ۔ اس آیت میں اور آیات سابقہ میں ۔

خیر کامل

اب مقصود کو عرض کرتا ہوں اور جو مضمون میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ بظاہر اس نص کے تحت میں داخل نہیں ۔ لیکن میں قیاس سے نص میں تعمیم کرنا چاہتا ہوں اور اس کے بعد وہ حکم نص ہی سے ثابت ہوگا ۔ کیونکہ اصول میں یہ طے ہو چکا ہے ۔

اَلْقِیَاسُ مُظْهِرٌ لَا مُثْبِتٌ کہ قیاس سے نص کی مراد ظاہر ہوتی ہے کوئی نیا حکم ابتداء ثابت نہیں ہوتا۔
اب سمجھو کہ کہ نص کا منطوق ظاہری کیا ہے اور مفہوم باطنی کیا ہے۔ سو اس کے لئے اول ترجمہ سننا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم خیر (کامل) کو ہرگز نہیں پا سکتے۔ جب تک وہ چیز خرچ نہ کرو جو تم کو محبوب ہے۔ البر سے مراد یہاں پر خیر کامل ہے اولاً اس لئے المطلق کو اِذَا اُطْلِقَ یُرَادُ بِهِ الْفَرْدُ الْکَامِلُ

مسئلہ عقلیہ ہے دوسرے دیگر نصوص و قواعد شرعیہ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں خیر کامل مراد ہے۔ حَتّٰی تُنْفِقُوْا یہ غایت ہے اور عربی میں غایات افعال کو صیغہ اثبات سے تعبیر کیا کرتے ہیں اور اُردو میں صیغہ نفی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پس ترجمہ یہ ہوگا کہ جب تک خرچ نہ کرو الخ یہ تو ترجمہ ہے اور بظاہر لفظ انفاق خاص ہے انفاق مال کے ساتھ مگر میرے دل میں ایک بار یہ آیا تھا کہ یہ عام ہے انفاق مال و بذل نفس و بذل جاہ و بذل علم وغیرہ سب کو اور شاید میں نے ایک بار یہ بیان بھی کیا تھا کہ اگر لغت مساعدت کرے تو اس کو عام لینا چاہئے۔

(جامع وعظ نے کہا کہ اسی آیت کا بیان ایک دفعہ ہو چکا ہے اور اس میں یہ مضمون ارشاد فرمایا گیا ہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ مجھے اس وقت یہ بات یاد نہ تھی کہ اس آیت کا بیان پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اچھا اب اس کو پہلے وعظ کا حصہ دوم سمجھنا چاہئے۔)

پھر میں نے علامہ قسطلانیؒ کا ایک قول دیکھا جس سے میرے خیال کی تائید ہوئی اور قسطلانی کا قول اس طرح نظر سے گزرا کہ میں اس آیت کی تفسیر حدیث میں دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ حدیث میں اس کے متعلق حضرت ابوطلحہ کا قصہ مذکور ہے کہ وہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

سبحان اللہ! حضرات صحابہؓ کا بھی کیا حال تھا کہ ہر آیت کے نزول کے بعد یہ مستعد تھے کہ ہم سے اس پر عمل ہوا ہے یا نہیں۔ دوسرا کمال یہ تھا کہ عمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کرتے تھے چنانچہ اس مشورہ کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی تو کسی صحابی کی رائے کی تصویب فرماتے اور کبھی اس میں ترمیم فرما دیتے۔ حضرت کعب بن مالک نے اپنی توبہ قبول ہونے پر اپنا تمام مال صدقہ کرنا چاہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ لیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مال کے صدقہ کرنے سے منع فرمایا یہ قاعدہ ہے کاملین سے مشورہ لیتے ہیں۔ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ طبعاً متبع سنت واقع ہوئے تھے۔ حاجی صاحب نے بھی

ایک شخص کو تمام جائیداد کے وقف کرنے سے منع فرمایا تھا۔ جس میں ایک سنت نبویہ سے بلا قصد موافقت ہوگئی۔ غرض حضرت ابوطلحہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ !

اِنِّیْ اَرَی اللّٰہُ تَعَالٰی یَقُوْلُ لَنْ تَنَالُو االْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْامِمَّا تُحِبُّوْنَ وَ اَنَّ اَحَبُّ اَمْوَالِیْ اِلَیَّ بِیْرُ حَاءٍ فَھِیَ صَدَقَۃٌ لِلّٰہِ تَعَالٰی فضَحْہُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ حَیْثُ اَرَاکَ اللّٰہُ فَقَالَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَخٍ بَخٍ مَالٌ رَابِحٌ اَوْ رَائِحٌ وَ اَرَایَ اَنْ تَضَعْہُ فِیْ عَشِیْرَتِکَ الْاَقْرَبِیْنَ ۔(اوکما قال)

یعنی یا رسول اللہ میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالٰی نے نیلِ برّ کو انفاق محبوب پر موقوف فرمایا ہے اور میرے اموال میں سب سے زیادہ محبوب مجھے بیر حا ہے (جو ایک باغ کا نام ہے) تو میں اس کو اللہ کے نام پر صدقہ کرتا ہوں۔ آپ جہاں مناسب سمجھیں اس کو صرف کر دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاباش! یہ مال نفع دینے والا ہے یا ختم ہونے والا ہے۔ (اس لئے کسی مصرف خیر میں صرف کر دینا اچھا ہے) مگر میری رائے یہ ہے کہ تم اس کو اپنے غریب قرابت داروں میں تقسیم کردو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ ؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق اس باغ کو حضرت حسان ابی بن کعب کے درمیان تقسیم کر دیا کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ ان کے قریب تھے اور ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں ان دونوں سے زیادہ قریب تھا مگر مجھے اس میں سے کچھ نہیں دیا۔ ان روایتوں میں بظاہر تعارض ہے مگر محدثین نے دونوں میں تطبیق یوں دی ہے کہ حضرت انس ؓ باعتبار خدمت و اختلاط کے قریب تھے۔ کیونکہ ہر وقت ایک ہی گھر میں ان کے پاس رہتے تھے۔ اور حضرت حسان وابی بن کعب باعتبار نسب کے قریب تھے۔ سبحان اللہ خوب تطبیق ہے اور یہ بھی ایک عظیم الشان فن ہے جو اللہ تعالٰی نے محدثین وفقہاء کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ جس کی بنیاد محض تخلیل وتاویل ہی پر نہیں جیسا بعض نادانوں کا خیال ہے بلکہ وہ واقعی طور پر تطبیق دیتے ہیں اور اس کی ضرورت ہے۔ بدوں اس کے چارہ نہیں کیونکہ یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ صادقین میں تعارض نہیں ہوسکتا۔ تو جب دو حدیثیں سند صحیح کے ساتھ مروی ہوں اور دونوں میں تعارض ہو تو رفع تعارض لازم ہے۔

غرض میں حدیث میں حضرت ابوطلحہؓ کا یہ قصہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہی علامہ قسطلانیؒ کا یہ قول نظر سے گزرا۔ انفاقِ محبوب میں بذل جاہ و بذل نفس و بذل علم بھی داخل ہے۔ اس سے

یرا دل بہت خوش ہوا۔ لیکن اگر لغت سے اس کی تائید نہ ہو اور انفاق ان سب کو عام نہ ہو تو علامہ
سطلانی" پر پھر بھی اعتراض نہیں ہوسکتا کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے عموم لفظ کی وجہ سے
بذل نفس و بذل جاہ و بذل علم کو اس آیت میں نہیں داخل کیا۔ بلکہ دلالۃ النص کی وجہ سے داخل کیا
ہے کیونکہ مال بمقابلہ جاہ و نفس و علم کے ادون ہے تو جب انفاق مال سے بِرّ کامل حاصل ہوتی
ہے جو ادنیٰ ہے تو بذلِ اعلیٰ سے بدرجہ اولیٰ برِّ کامل حاصل ہوگی۔ غالباً اسی بناء پر بیضاویؒ نے

وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ اور جو ہم نے ان کو روزی دی ہے اس میں سے خرچ
کرتے ہیں اللہ کی راہ میں۔ (پ ۱ ع ۱)

کی تفسیر میں بعض صوفیہ کا قول نقل فرمایا ہے وَ مِنْ اَنْوَارِ الْمَعْرِفَةِ يُفِيْضُوْنَ کہ انہوں
نے افاضۂ انوار معرفت کو بھی انفاق میں داخل کیا ہے کیونکہ یہ انفاق مال سے اعلیٰ ہے تو جب ادنی
کا انفاق محمود ہے۔ اعلیٰ کا انفاق کیوں محمود نہ ہوگا۔ اور بیضاوی کی نقل اس بات کی کافی حجت ہے
کہ یہ قول محتمل صحت ہے۔ اب چاہے انفاق کو لغۃً عام کہا جائے یا دلالۃ النص کی وجہ سے عام
کہا جائے۔ بہرحال تعمیم غلط نہیں بلکہ اگلی آیت کے ربط کے لئے تعمیم ضروری ہے۔ بغیر اس کے
چارہ نہیں کیونکہ اس کے بعد یہ آیت ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ
قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰةُ ۔

سب کھانے کی چیزیں نزولِ توراہ سے پہلے باستثناء اس چیز کے جس کو یعقوبؑ نے
اپنے نفس پر حرام کر لیا تھا بنی اسرائیل پر حلال تھیں۔ (پ ۴ ع ۱)
جس میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے۔

ترکِ مرغوب

اور وہ قصہ جیسا مفسرین نے عام طور پر بیان کیا ہے یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو ایک
دفعہ مرض عرق النساء ہوا تھا جس کے علاج میں آپ کو اونٹ کے گوشت سے بہت نفع ہوا تھا۔ تو
آپ نے نذر کی تھی کہ اگر مجھے اس مرض سے شفا ہوگئی تو اونٹ کا گوشت کھانا چھوڑ دوں گا۔
حالانکہ وہ آپ کو محبوب تھا کیونکہ مرض میں نافع ہوا تھا۔ مگر آپ نے ترک مرغوب کی اس لئے نذر
کی ترک مرغوب خدا کو محبوب ہے تو اس قصہ کا ربط سابق سے جب ہی ہوگا کہ انفاق کو عام کیا
جائے اور ترک مرغوب کو بھی انفاق میں داخل کیا جائے اور اگر انفاق کو مال کے ساتھ خاص کیا گیا

تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس قصہ کو لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ سے ربط نہ ہوگا۔ (یعنی[1] ربط ظاہر نہ ہوگا ورنہ ربط خفی ممکن ہے۱۲ظ) غرض بیضاوی اور قسطلانی کا قول دیکھ کر مجھے تعمیم انفاق کی ہمت ہوئی ورنہ اس سے پہلے اس خیال کے اظہار کی جرأت نہ ہوتی تھی اور یہی میں علماء وطلبہ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تفسیر قرآن کے متعلق جب کوئی بات ان کی سمجھ میں آیا کرے تو جب تک سلف کے کلام میں اس کی تائید نہ مل جائے اس وقت تک اس پر اعتماد نہ کیا کریں کیونکہ تفسیر بالرائے بہت سخت ہے۔ اب میں مقصود عرض کرتا ہوں جب یہ معلوم ہوگیا کہ یہاں انفاق عام ہے بذل نفس وبذل جاہ وبذل علم وترک مرغوب وغیرہ سب کو خواہ اس میں تعمیم کا منشاء کچھ ہی ہو دلالۃ النص ہو یا قیاس ہو تو اب سمجھئے کہ ترک مرغوب میں یہی داخل ہے کہ احوال وکیفیات کے درپے نہ ہو۔ شوق و ذوق و جوش وخروش کا طالب نہ ہو۔ یہ چیزیں سالکین کو مرغوب ہیں مگر ان مرغوبات کی طلب کو ترک کردینا چاہئے۔ کیونکہ یہ بھی انفاق محبوب میں داخل ہے اور بدوں اس کے برکامل حاصل نہ ہوگی۔

مطلوب محبت

سالکین کو یاد رکھنا چاہئے کہ محبت کی دو قسمیں ہیں (۱) محبت عقلیہ (۲) محبت طبعیہ۔ اور ان دونوں کے فرق کو اہل فن ہی سمجھتے ہیں جس کو معلوم نہ ہو اہل فن سے سمجھ لے ان دونوں میں مقصود محبت عقلیہ ہے باقی طبعیہ سو وہ محمود تو ہے مگر مقصود نہیں گو ظاہر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت طبعیہ افضل ہے عقلیہ سے۔ کیونکہ طبعی محبت میں ایک خاص جذب وکشش ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں احتمال زوال یا انقلاب کم ہے اور عقلیہ میں جذب وکشش نہیں ہے۔ تو اس میں احتمال ہے کہ کسی وقت زائل ہو جائے۔ مگر یہ محض خیال ہے جو محقق نہیں۔ صحیح فیصلہ اس باب میں یہ ہے۔ کہ محبت عقلیہ ہی افضل ہے۔ کیونکہ اس کا مدار اعتقاد پر ہے اور عادۃً اعتقاد بہت کم بدلتا ہے۔ اِلَّا نَادِرًا وَالنَّادِرُ کالمعدوم۔

اور محبت طبعیہ کا منشاء ہیجان نفس ہے اور جوش وخروش میں ہمیشہ تبدل ہوتا رہتا ہے تو اس میں خطرہ زیادہ ہے کیونکہ یہ شخص جوش ہی سے کام کرنے کا عادی ہوجائے گا جب جوش نہ رہے گا تو کام چھوڑ بیٹھے گا۔

چنانچہ ہم نے ایسے لوگ بہت دیکھے ہیں جو طریق میں حالات وکیفیات ہی کے سہارے پر چلتے ہیں اور جہاں احوال بند ہوئے کام بھی بند کردیا۔ کل ہی ایک صاحب کا خط آیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ذکر میں جی نہیں لگتا۔ بعض دفعہ خیال ہوتا ہے کہ چھوڑ دو یہ شخص اسی کا منتظر ہے کہ ذکر میں

---

[1] انما قلت ذلک لما رایت الشیخ قد ربط الآیات فی تفسیرہ بیان القرآن بغیر ھذا الربط الذی ذکرہ مھتاً فافھم ۱۲ظ

جی لگے تو کروں تو یہ شخص لذت کو مطلوب بنائے ہوئے ہے خدا کو مطلوب نہیں سمجھتا ورنہ کسی حال میں اس کی یاد کو ترک کرنے کا ارادہ نہ کرتا۔

اس غلطی میں عام طور پر سالکین مبتلا ہیں تو ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ لذت وشوق مطلوب نہیں بلکہ مطلوب عمل ہے۔ اگر لذت مطلوب ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسباغ و ضوء علی المکارہ کی فضیلت بیان نہ فرماتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسی حالت میں عمل کرنا زیادہ افضل ہے کہ عمل کو جی نہ چاہتا ہو۔ دل پر گرانی ہو۔ مگر بعض سالکین کی غلطی دیکھو کہ ایسی حالت میں عمل کو خیر باد ہی کہہ دیتے ہیں۔

افضلیت قبض

اس سے یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ عمل میں اگر جوش نہ ہو تو ایک حیثیت سے زیادہ افضل ہے تا کہ وہ عمل زیادہ خالص اللہ کے واسطے ہوگا۔ لذت کے واسطے نہ ہوگا۔ اسی لئے صوفیہ نے فرمایا ہے کہ قبض بسط سے افضل ہے۔

ایک تو وہی وجہ جو میں نے ابھی بتلائی ہے دوسرے یہ وجہ ہے کہ قبض میں اپنی ذلت و عجز کا مشاہدہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس وقت سالک اپنے کو کافر سے بھی بدتر سمجھتا ہے۔ فرعون سے بھی کمتر جانتا ہے۔ حالانکہ اس کے ساتھ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کافر ہے۔ میں مومن ہوں اور اس علم کا مقتضاء یہ تھا کہ اپنے کو کافر سے افضل سمجھتا۔ مگر اس طریق میں ہجے اور ہیں روان اور جیسے کسی نے کہا تھا تے بے زبرتب بے تے زیر بت بطخ تو ہجے تھے تبت کے اور روان پڑھی بطخ۔ یہی حال اس طریق میں ہے کہ ظاہراً نہ کہ حقیقۃً مقدمات اور دلائل کا مقتضاء کچھ اور ہے اور جو حالت دوسری ہے اس کو اہل حال ہی سمجھتے ہیں کہ قبض میں سالک اپنے کو باوجود مومن سمجھنے کے فرعون سے بھی بدتر کیونکر سمجھتا ہے۔ غرض قبض میں ذات و عجز کا مشاہدہ زیادہ ہے جو بسط میں نہیں۔ بلکہ بسط میں بعض اوقات عجب وغیرہ کا اندیشہ بھی ہو جاتا ہے۔ اس لئے صوفیہ نے قبض کو بسط سے افضل کہا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ۔

چونکہ قبض آید تو در دے بسط بیں   تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو   آں صلاح تست آئیس دل مشو

(جب تجھے حالت قبض پیش آئے تو اس میں حالت بسط تلاش کر۔ کیونکہ جب کسی سالک کو حالت قبض پیش آتی ہے تو وہ تیری اصلاح کی خاطر ہوتی ہے پس تو ایسی حالت میں مایوس نہ ہو)

بندگی کا مقتضٰی

پس احوال و کیفیات اور شوق و ذوق کے سہارے پر عمل نہ کرنا چاہئے بلکہ عمل ہی کو مقصود سمجھنا چاہئے عارف فرماتے ہیں ۔

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن   کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تو عبادت گداگروں کی طرح مزدوری کی شرط پر کر کیونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ بندہ پروری خوب جانتے ہیں ہو)

یہ تو مزدوروں کی خصلت ہے کہ کام کرنے سے پہلے پوچھتے ہیں کہ کیا ملے گا اور جب تک مزدوری کا ملنا معلوم نہ ہو اس وقت تک کام ہی نہیں کرتے۔ غلام کی یہ شان نہیں ہوتی غلام کو تو یہ سمجھنا چاہئے کہ میں تو سر سے پیر تک آقا کا ہوں۔ میری ہر چیز اسی کی ہے پھر مزدوری کیسی؟ ایک بے نماز تھانہ دار کا قصہ ہے کہ اس کی بیوی نماز پڑھتی تھی۔ اور وہ اس سے پوچھتا تھا کہ نماز پڑھنے سے تجھ کو کیا ملا۔ افسوس خدا کی عبادت کے متعلق یہ سوال کہ تجھ کو کیا ملا۔ کیا کوئی بیٹے سے بھی یہ سوال کر سکتا ہے۔ کہ تجھ کو باپ کی خدمت سے کیا ملا؟۔ ہر گز نہیں یہ تھانہ دار مجھ سے پوچھتا تو میں جواب دیتا کہ ہم کو نماز ملی۔ ارے نماز خود مقصود ہے بندگی اور عبادت خود مطلوب ہے کسی عمل کے متعلق یہ سوال کہ اس سے کیا ملا اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ عمل خود مقصود نہ ہو۔

باقی مقاصد میں یہ سوال نہیں ہو سکتا۔ ہمارے حاجی صاحب امام وقت تھے آپ سے جب کوئی کہتا کہ ذکر سے نفع نہیں ہوتا۔ فرماتے یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم ذکر کر رہے ہو۔ یعنی بندگی کا مقتضاء یہ ہے کہ ذکر ہی کو خود مقصود سمجھے یہ کیا بندگی ہے کہ مزا آیا تو کر لیا ورنہ چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ ہاں ذکر پر جس ثمرہ کے مرتب ہونے کا وعدہ ہے وہ ضرور ملے گا۔ دُنیا میں تو صرف یہ وعدہ عامہ ہے کہ فَاذْكُرُوْنِیْ اَذْكُرْكُمْ[1] تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ احکم الحاکمین آپ کو یاد کریں اور آخرت میں مغفرت و جنت کا وعدہ ہے باقی ان احوال و کیفیات کا تو کہیں وعدہ بھی نہیں۔

مثال احوال و کیفیات

صاحبو! ان احوال و کیفیات کی مثال ایسی ہے جیسے کھانے کے ساتھ سرکہ چٹنی۔ اب اگر کسی وقت دستر خوان پر سرکہ چٹنی نہ ہو تو کیا آپ کو یہ کہنے کا حق ہے کہ میں تو کھانا بھی نہیں کھاتا۔ اگر چٹنی سرکہ ہی کھایا کرو گے تو دماغ چٹنی ہو جائے گا کہ نہ سر کے رہو گے نہ پیر کے۔

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش   کہ ہر چہ ساقی کا ریخت عین الطافت

(اے بدا و صاف تجھے دم مارنے کا حکم نہیں ہے جو کچھ ہمارا ساقی ہمارے پیالے میں ڈالا وہ اس کے عین الطاف ہے)

وہ طبیب بڑا کریم ہے جو ہر مریض کو اس کے مزاج کے موافق دوا و غذا دے۔ پس حق تعالیٰ جس کو جس مزاج کا دیکھتے ہیں وہی عطا فرماتے ہیں تمہارے لئے ممکن ہے کہ یہی مناسب ہو کہ احوال و کیفیات نہ ہوں، شوق و ذوق کا غلبہ نہ ہو پس تم کو جو عطا ہوا ہے لے لو۔ تم کو اگر احوال عطا ہو جاتے تو تمہارے لئے شاید یہ خطرہ ہوتا کہ اگر یہ انفعالات نہ رہے تو تم افعال ہی سے رہ جاؤ گے۔

---

[1] (ان نعمتوں پر) تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد رکھوں گا۔ (پارہ ۲۔ رکوع نمبر ۲)

اور یہاں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ بیان پہلے بیان کا تتمہ ہے اس میں یہ بیان تھا کہ انفعالات مطلوب نہیں بلکہ افعال مطلوب ہیں آج اس کا بیان ہے کہ ترک طلب انفعالات بھی انفاق محبوب میں داخل ہے اور انفاق محبوب پر حصول بر کامل موقوف ہے تو بدوں ترک طلب انفعالات کے برّ کامل حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ طلب انفعالات میں ایک تو وہی خطرہ ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ اگر انفعالات نہ رہے تو تم افعال ہی سے رہ جاؤ گے۔ دوسرے یہ کہ شیخ سے بدظن ہو جاؤ گے۔ اول اس سے شکایت کرو گے کہ مجھے ذکر وغیرہ سے تاثر نہیں ہوتا۔ حالات طاری نہیں ہوتے اور یہ بات شیخ کے اختیار سے باہر ہے۔ شیخ کے قبضہ میں تو خود اپنے احوال بھی نہیں وہ تم کو حالات کہاں سے دیدے۔ پھر جب تم کو حالات حاصل نہ ہوں گے تو پھر شیخ کی شکایت کرو گے اور اپنے دل میں کہو گے کہ شیخ پھس پھسا ہے صاحب تصرف نہیں۔

صاحب تعرف شیخ

ارے عقلمند! شیخ کو صاحب تعرف ہونا چاہئے کہ اس کی صحبت سے تم کو معرفت حاصل ہو جائے تصرف کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو جوگی بھی کر لیتے ہیں۔ انگریز بھی کرتے ہیں ایک انگریز نے کلکتہ میں ایک بچہ کو توجہ دی تو وہ اقلیدس کی شکلیں بیان کرنے لگا۔ اور اکثر تصرفات ایسی توجہ سے ہوتے ہیں جس میں خدا کی طرف بھی توجہ نہیں رہتی کیونکہ اس میں کامل یکسوئی شرط ہے۔ اسی لئے خواجہ عبیداللہ احرار کا مقولہ ہے کہ عارف راہمت نباشد یعنی عارف توجہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کو غیر حق کی طرف اس قدر یکسوئی نہیں ہو سکتی کہ خدا کو بھی بھول جائے۔ اس کو غیر حق پر ایسی توجہ کرتے ہوئے غیرت آتی ہے۔ پس سالکین میں یہ بڑا مرض ہے۔ کہ وہ احوال وانفعالات کے درپے ہو کر شیخ سے بدظن ہونے لگتے ہیں۔

ایک مرض کی فرع یہ ہے کہ مشائخ کے پاس جاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ہمارا بچہ مر گیا ہے اس کی یاد دل سے نہیں جاتی۔ ایسی توجہ کرو کہ اس کا خیال جاتا رہے یہ تو بڑے سے بڑے شیخ من حیث الشیخ کے قبضہ میں بھی نہیں۔ ہاں کرامت سے ہو جائے۔ تو ممکن ہے مگر کرامت خود غیر اختیاری ہے۔

عمل تسخیر

کرامت پر ایک قصہ یاد آیا۔ ہمارے حضرت استاد علیہ الرحمۃ کو ایک شخص نے تسخیر کا عمل

بتلایا تھا اور مولانا کو کمالات کا ایسا شوق تھا کہ ہر قسم کی چیز کو سیکھ لیا کرتے تھے۔ اسی طرح یہ عمل بھی سیکھ لیا جس سے مقصود محض علم تھا، عمل مقصود نہ تھا۔ کیونکہ اہل اللہ مخلوق کو مسخر کرنے کی تدبیریں نہیں کیا کرتے۔ جیسا بعض لوگوں کو بزرگوں پر شبہ ہو جاتا ہے کہ ان کو تسخیر کا عمل آتا ہے اور انہوں نے کوئی عمل ایسا کیا ہے جس کی وجہ سے لوگ ان کی طرف جھکے چلے آتے ہیں۔ میں اس کی نفی نہیں کرتا۔ بلکہ آپ کو اس کی حقیقت بتلاتا ہوں۔ غور سے سنو کہ واقعی انہوں نے تسخیر کا عمل کیا ہے۔ وہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ہے۔ جس کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے بندہ خدا کا محبوب ہو جاتا ہے۔ پھر مخلوق کے دلوں میں بھی اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا

بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت پیدا کر دے گا۔ (پارہ نمبر۱۶، رکوع نمبر۹)

اور حدیث میں **اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا نَادٰى جِبْرَئِيْلُ اِنِّىْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ ثُمَّ يُنَادِىْ جِبْرَئِيْلُ فِى السَّمٰوٰتِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِى الْاَرْضِ** (اوکما قال)

یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام کو ندا ہوتی ہے کہ میں فلاں کو چاہتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو۔ پھر جبرئیل آسمانوں میں ندا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتے ہیں تم بھی اس سے محبت کرو۔ پھر زمین میں بھی اس کے لئے قبول رکھ دیا جاتا ہے۔ یعنی اہل قلب کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔ اہل کلب کے دلوں میں نہیں، اس میں اعتبار ان لوگوں کا ہے جن کو کوئی غرض اس شخص سے وابستہ نہ ہو۔ نہ نفع کی نہ ضرر کی یعنی کسی دنیوی غرض سے نہ دوست ہوں نہ دشمن ہوں۔ بلکہ خالی الذہن ہوں کیونکہ جن لوگوں کو اس شخص سے کچھ دنیوی ضرر پہنچتا ہے۔ مثلاً اس کی وجہ سے ان کی شہرت میں کمی آگئی ہو وہ تو خواہ مخواہ اس کے دشمن ہوں گے اور جن کو اس سے کچھ نفع پہنچ رہا ہے وہ خود بخود دوست ہوں گے۔ ان دونوں کا اعتبار نہیں بلکہ اعتبار ان کا ہے جن کو نہ اس سے کچھ ضرر پہنچا ہے۔ نہ نفع۔ کوئی غرض دنیوی اس کے ساتھ متعلق نہ ہو تو ایسے لوگوں کے دلوں میں خلق کی محبت ضرور ہو گی۔ بشرطیکہ وہ اہل قلب ہو اہل کلب نہ ہو۔ کیونکہ بعض قلب کلب ہوتا ہے۔

اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ایک شخص نماز پڑھتے ہوئے اپنے آگے کتا باندھ لیا کرتا تھا۔

کسی نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے کہا حدیث میں آیا ہے۔

لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِحَضُوْرِ الْکَلْبِ (حضور کلب کے بغیر نماز نہیں) ظالم نے قلب کو کلب بنا دیا اور یہ مطلب سمجھا کہ بدوں کتے کے سامنے ہوئے نماز ہی نہیں ہوتی۔ اس نے قاف کو کاف سے بدلا۔ جیسے بعض طلبہ نے جو قاف کو غلطی سے کاف پڑھتا تھا اور قال قال کو کال کال کہتا تھا بخاری ختم کر کے استاد سے پوچھا تھا کہ بخاری تو سمجھ میں آ گئی۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ لکھا تو ہے قال قال اور پڑھا جاتا ہے کالا کالا۔ اصل اس کی یہ ہے کہ بعضے قلمی نسخوں میں قالَ قالَ کو امتیاز کے لئے عربی میں لکھ دیتے ہیں۔ اس کو ان عقلمندوں نے کالا کالا پڑھا اور یہ استعمال کیا کہ لکھا تو جاتا ہے۔ قال قال اور پڑھا جاتا ہے کالا کالا۔ اسی طرح ان امام صاحب نے قلب کو کلب پڑھا اور کتے کو سُترہ بنا لیا۔ یہ تو لطیفہ تھا میں کہہ رہا تھا کہ بعض مریدوں کو اپنے مشائخ پر شبہ ہو جاتا ہے۔ کہ ان کو تسخیر و حُب کا عمل آتا ہے اور انہوں نے کوئی عمل کیا ہے۔ جس سے لوگ ان کے مسخر ہو گئے۔

نسبت پر عملیات کا اثر

چنانچہ حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب پر بھی بعض لوگوں کو ایسا گمان تھا۔ مولانا صاحب کشف تھے ان کو اس خطرہ پر اطلاع ہوگئی فرمایا استغفراللہ، بعض لوگوں کا ایسا خیال ہے کہ اہل اللہ عملیات سے لوگوں کو مسخر کرتے ہیں۔ ارے یہ بھی خبر ہے کہ عمل سے نسبت باطنی سلب ہو جاتی ہے وہ ایسا کبھی نہیں کرتے تو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے تسخیر وحُبّ کا عمل محض اس لئے سکھ لیا تھا کہ مولانا کو ہر چیز کے جاننے کا شوق تھا۔ عمل کرنے کے واسطے نہیں سیکھا تھا۔ چنانچہ جس شخص نے آپ کو یہ عمل بتلایا تھا اس نے اخفاء کے اہتمام کے جنگل میں لے جا کر تعلیم کیا تھا۔ جب مولانا نے اس عمل کو محفوظ کر لیا تو اس شخص نے مولانا کو زیادہ معتقد بنانے کے لئے یہ کہا کہ حضرت یہ عمل بہت تیز ہے۔ میں نے ایک ایسی امیر زادی پر اس عمل کا امتحان کیا تھا۔ جس کی ہوا بھی پردہ سے باہر نہ نکلی تھی مگر اس عمل سے وہ فوراً میرے پاس حاضر ہوگئی۔ یہ سُن کر مولانا اس عمل سے گھبرا گئے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ نفس کا کیا اعتبار ہے نہ معلوم کس وقت وہ بدل جائے اس لئے میں نے اس عمل کو ذہن سے بھلانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ اب اس کا ایک لفظ بھی یاد نہیں۔

کمالِ واقعی

واقعی یہ بڑا کمال ہے کہ یاد کی ہوئی چیز کو اس طرح بُھلا دیا جائے۔ اس کو کرامت کے سوا

کیا کہا جا سکتا ہے۔

ایک حالت مولانا کی اس سے بڑھ کر یاد آئی مجھ سے خود فرمایا کہ ایک بار خط لکھ کر دستخط کرنا چاہا تو اپنا نام یاد نہیں آیا۔ یہ واقعہ اگر میں خود حضرت سے نہ سنتا تو راوی کو کاذب سمجھتا۔ تو ایسے حالات اور کرامات تو مستبعد نہیں لیکن عادۃً یہ امور اختیار سے باہر تھے۔ پس شیخ سے یہ درخواست کرنا کہ ہم بچہ کو بھول جائیں واقعہ ہی یاد نہ رہے۔ فضول ہے کیونکہ یہ بات اختیار سے باہر ہے اور اگر کسی نے ایسا کیا بھی ہے تو وہ محض کرامت ہے اور کرامت بھی اختیار میں نہیں۔ دوسرے اگر ایسا ہو جائے تو صبر ہی کہاں رہا اور صبر کا ثواب کیونکر ملے گا کمال تو یہی ہے کہ واقعہ غم یاد ہو پھر صبر کرے یعنی اجر کو یاد کر کے دل کو سمجھائے اور ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے اس پر وعدہ ہے اطمینان کے مرتب ہونے کا۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (سمجھ لو) کہ اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو چین حاصل ہوتا ہے۔ (پارہ نمبر۱۳۔ رکوع نمبر۱۰)

اور جس مرتبہ کا ذکر ہوگا اسی مرتبہ کا اطمینان ہوگا۔ اور اس اطمینان کا حاصل یہ نہ ہوگا کہ غم بالکل زائل ہو جائے گا۔ بلکہ حاصل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض نہ ہوگا۔ عقلاً اس پر راضی ہو جائے گا یا یہ سمجھے گا کہ جو ہوا عین حکمت ہوا۔ اسی ذکر کے تکرار سے غم کا غلبہ کم ہو جائے گا۔ جس سے تکلیف کا درجہ جاتا رہے گا۔ تو کیا ٹھکانہ ہے رحمت کا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا طریقہ بتلایا کہ عذابِ غم سے بھی بچ جاؤ اور ثواب سے بھی محروم نہ ہو۔ مگر تم یہ چاہتے ہو کہ غم ہی نہ رہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ صبر کا ثواب نہ ملے۔

موجب فضیلت انفاق

بعض لوگ اس کے طالب ہوتے ہیں کہ مال کی محبت دل میں نہ رہے۔ ارے اگر محبت مال نہ رہے گی، تو انفاق میں کمال ہی کیا ہوا۔ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ میں محبت کی قید صاف بتلا رہی ہے۔ کہ محبت مال ہی موجب فضیلت انفاق ہے۔ صوفیہ نے اس کو خوب سمجھا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن ست　　　　کہ ازو حمام تقویٰ روشن است

(دنیا کی طلب اور خواہش مثل انگیٹھی کے ہے کیونکہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے)

فرماتے ہیں کہ تقویٰ کی گرم بازاری تو شہوت دنیا ہی سے ہے۔ اگر شہوت دنیا نہ ہو تو پھر تقویٰ میں کمال ہی کیا رہا۔ پھر اس کو کیسی اچھی مثال سے بیان کیا ہے کہ شہوت دنیا کی مثال ایسی ہے کہ جیسے حمام کا ایندھن۔ تو جس طرح حمام، ایندھن سے روشن ہوتا ہے۔ اسی طرح تقویٰ کا حمام دنیا کی شہوت

سے روشن ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتو حمامِ تقویٰ سرد پڑ جائے گا۔ اس مثال میں اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ شہوت دنیا کو دل میں جمع نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ حمام میں جھونک کر پھونک دینا چاہئے کیونکہ یہ خس و خاشاک گھر میں جمع کرنے کی چیز نہیں بلکہ پھونکنے اور جلانے ہی کے کام کی ہے۔

جرمانہ مالی

پس محبت مال مطلقاً مذموم نہیں بلکہ اگر اس کو دین کے کام میں معین بنایا جائے تو مفید ہے۔ چنانچہ حضرات صوفیہ نے اصلاح اعمال میں اس سے بہت کام لیا ہے۔ انہوں نے اصلاح اعمال کا طریق جرمانہ مالی مقرر کیا ہے کہ جب غیبت ہو جائے یا تہجد ناغہ ہو جائے تو کچھ صدقہ مالیہ بطور جُرمانہ کے ادا کیا جائے۔ یہ طریقہ میں بھی تجویز کیا کرتا ہوں۔ مگر جرمانہ اتنا ہو کہ نہ تو بہت گراں ہو جس کا دینا دشوار ہو۔ نہ اتنا کم ہو کہ بالکل گراں نہ ہو۔ ورنہ اثر ہی نہ ہوگا۔ تو اس طریقہ سے جلد اصلاح اعمال ہو جاتی ہے کیونکہ مال کا خرچ کرنا نفس پر گراں ہے اور ظاہر ہے کہ اس گرانی کا منشاء محبت مال ہی ہے تو دیکھئے صوفیہ نے اس محبت مال سے کتنا بڑا کام لیا۔

اور یہی طریقہ بخل کے علاج میں مفید ہے کہ نفس کو تھوڑا تھوڑا خرچ کرنے کا عادی کیا جائے۔ جس سے پہلے پہل تو دل پر گرانی ہوگی۔ لیکن اسی طرح عمل کرتے کرتے ایک دن دل کھل جائے گا اور بخل کا مادہ ضعیف ہو جائے گا۔

ارادہ و مجاہدہ

اس پر شاید یہ سوال ہو کہ کیا اب ثواب نہ ملے گا۔ کیونکہ اب تو مزاحمت نفس باقی نہیں۔ نہ گرانی باقی ہے، جواب یہ ہے کہ ثواب ضرور ملے گا۔ کیونکہ اس حالت پر پہنچا تو ہے مصیبت ہی جھیل کر اور گو اس وقت بلا مجاہدہ بلکہ بعض اوقات بلا ارادہ کے عمل کا صدور ہونے لگا مگر وہ پہلا مجاہدہ اور ارادہ اب بھی اس کے ساتھ متعلق ہے اس لئے شرط ثواب بھی پائی گئی۔

عادات کی طرح عبادات میں بھی یہی بات ہے کہ پہلا ارادہ اور مجاہدہ اخیر تک متعلق رہتا ہے۔ جیسا مشی میں ارادہ تو دو چار قدم کے ساتھ متعلق ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ قدم خود بخود اٹھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی مشی کو فعل اختیاری کہا جاتا ہے کیونکہ ابتداء میں اس کے ساتھ ارادہ اسی حیثیت سے متعلق ہوا تھا کہ اتنی دور چلوں گا۔ یہی حال عبادات کا ہے کہ جس عمل کے ساتھ ابتداء میں ارادہ اور مجاہدہ متعلق ہوتا ہے وہ اسی حیثیت تکمیل

سے متعلق ہوتا ہے۔اس لئے اخیر تک ان دونوں کا تعلق باقی رہتا ہے۔گو عامل کو احساس نہ ہو اور وہ یہی سمجھتا ہو کہ میں بدوں ارادہ کے عمل کررہا ہوں۔اس سے وہ اشکال رفع ہو گیا۔

حکمت حب مال

غرض تم یہ تمنا نہ کرو کہ مال کی محبت باقی نہ رہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عجیب ارشاد ہے آپ کے زمانہ میں کسی غزوہ میں بے شمار مال و دولت آپ کے پاس لایا گیا تو آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ آپ کا ارشاد ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ ۔

خوش نما معلوم ہوتی ہے لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی عورتیں ہوئیں بیٹے ہوئے سونے اور چاندی کے۔(پارہ ۳۔رکوع ۱۰)

کہ لوگوں کے لئے شہوتوں کی محبت مستحسن کردی گئی۔یعنی عورتوں اور اولاد اور سونے چاندی کے ڈھیروں کی محبت لوگوں کے قلوب میں آراستہ کردی گئی ہے اور اے پروردگار جب آپ نے کسی مصلحت سے اس کی محبت کو مزین کیا ہے تو یہ درخواست کرنا کہ ہمارے دل میں اس کی محبت نہ رہے۔خلاف ادب ہے۔اس لئے ہم یہ درخواست نہیں کرتے بلکہ یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس محبت کو اپنی مرضیات کا ذریعہ بنادیجئے تو دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر آج کون عارف ہوگا۔آپ نے زوال حُبّ مال کی دُعا نہیں کی۔کیونکہ حُبّ مال میں بھی حکمتیں ہیں۔ایک حکمت تو یہی ہے کہ اس سے بقدر ضرورت مال جمع کرنا ضروری ہوتا ہے۔ان کا تقوی مال ہی تک رہتا ہے۔اگر مال ہے تو نماز روزہ بھی ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔

حرام ملازمت

اسی لئے ہمارے حضرات بعض لوگوں کو ترک ملازمت سے منع فرماتے تھے بلکہ بعض کو ناجائز ملازمت کے ترک سے بھی منع فرمایا کہ جب تک حلال ملازمت ملے اس وقت تک اسی کو کئے جاؤ اور استغفار اور توبہ کرتے رہو۔کیونکہ گو یہ ملازمت حرام ہے۔مگر ایمان کا وقایہ ہے ایسا نہ ہو کہ افلاس کی پریشانی سے ایمان ہی جاتا رہے۔ہم نے مسرف مفلس کو تو مُرتد ہوتے ہوئے بکثرت دیکھا ہے۔کسی نے بخیل جمعدار کو مرتد ہوا دیکھا ہوا،تو بتلایئے وَالنادر کالمعدوم بخیل کو کبھی مرتد

ہوتا ہوانہیں سنا گیا وجہ یہ ہے کہ بخیل کے ہاتھ سے جب مال نہیں نکلتا تو ایمان کیوں کر نکلے گا۔ ایمان تو احب الاشیاء ہے خیر یہ تو لطیفہ ہے باقی حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان سے پھرتے ہیں وہ دنیوی تنگی سے پریشان ہو کر مُرتد ہوتے ہیں۔ غیر اسلام کو حق سمجھ کر کوئی مرتد نہیں ہوا اور بخیل آدمی کو تنگی سے تکلیف نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ تصور مال سے مست ہو جاتا ہے کہ میرے پاس اتنا روپیہ ہے۔ غرض دین کی حفاظت کے لئے آج کل یہ ضرور ہے کہ مسلمان اپنے پاس کچھ رقم جمع رکھے۔

امام سفیان ثوری (جو امام ابو حنیفہ کے معاصر ہیں) فرماتے ہیں کہ آج کل کسی کے پاس کچھ دراہم ہوں تو ان کی حفاظت کرے کیونکہ ایک زمانہ میں تو مال کا جمع کرنا ہلاکت دین کا سبب تھا مگر آج کل مال کا نہ ہونا ہلاکت دین کا سبب ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر ہمارے پاس چند دینار نہ ہوتے تو یہ امراء و حکام تو ہم کو اپنے ہاتھ پونچھنے کا رومال بنا لیتے۔ واقعی آج کل جو امراء نے علماء کو حقیر سمجھ رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ علماء اپنے پاس مال نہیں رکھتے۔ اگر ان کے پاس مال جمع رہا کرے تو امراء بھی ان کی عزت کریں اور یہ خود بھی اپنی عزت کریں۔ یعنی امراء کی خوشامد کر کے اپنے کو ذلیل نہ کریں۔

مجھے ایک سفر میں خود یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ ایک بار میں نے علماء کے ایک وفد کے ساتھ ان کے اصرار سے ڈھاکہ کے ارادہ سے سفر کیا گو کلکتہ پہنچ کر میری رائے بدل گئی تھی اور میں کلکتہ ہی سے واپس آ گیا تھا۔

واقعہ یہ ہوا کہ کلکتہ میں نواب صاحب کے ایک دولت مند مصاحب جو وفد کے استقبال پر مامور ہوئے تھے مجھ سے کہنے لگے کہ آپ کے آنے کی اس لئے بھی زیادہ مسرت ہوئی۔ کہ نواب صاحب سے معلوم ہوا تھا کہ آپ نے آنے کی ایسی سخت شرط لگائی ہے کہ جو ہو نہیں سکتی۔ میں نے پوچھا آپ نے کیا شرط سُنی ہے۔ کہنے لگے یہ سُنا تھا کہ آپ نے یہ شرط لگائی ہے کہ ہم کو کچھ نہ دیا جائے۔ میں نے کہا یہ تو بہت آسان شرط ہے۔ نہ دینا تو دینے سے آسان بھی ہے۔ کہنے لگے کہ آسان کہاں ہے۔ اپنے محبوب کی خدمت کو تو دل چاہتا ہی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کیا ضرور ہے کہ محبوب کو بلا کر خدمت کی جائے۔ محبوب کے پاس خود جا کر بھی تو خدمت ممکن ہے۔ اس پر آپ کہتے ہیں کہ حضرت گستاخی معاف۔ پیاسا کنویں کے پاس جایا کرتا ہے کہ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جایا کرتا۔ مجھے اس بے تمیزی کے جواب پر بہت غصہ آیا اور میں نے کہا۔ اگر آپ لوگ اس خیال میں ہیں اور ہمارے دماغ میں تو یہ خناس سمایا ہوا ہے کہ ہم اپنے کو کنواں اور آپ لوگوں کو پیاسا سمجھتے ہیں۔ مگر اتنا فرق ہے کہ ہمارے پاس تو اس خیال کی دلیل

بھی ہے اور آپ کے پاس اپنے کو کنواں اور ہم کو پیاسا سمجھنے کی کوئی دلیل نہیں اور وہ ہماری دلیل یہ ہے کہ مسلمان کو دنیا میں دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک دین کی ایک مال کی۔ اور آپ لوگوں کے پاس مال ہے اور ہمارے پاس دین ہے۔ مگر اتنا فرق ہے کہ جو چیز آپ کے پاس ہے وہ بقدر ضرورت ہمارے پاس بھی اتنی موجود ہے کہ اگر ہم عمر بھر آپ کے دروازہ پر نہ جائیں ہمارا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں رہ سکتا۔ مگر جو چیز ہمارے پاس ہے یعنی وہ دین آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں ہے۔ آپ اگر دین کو ضروری سمجھتے ہوں تو علماء سے ایک منٹ کے لئے بھی مستغنی نہیں ہو سکتے۔ بتلائیے کنواں کون ہے اور پیاسا کون ہے۔ اس پر وہ خاموش تھے اور اُن کے چہرہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اپنی بدتمیزی پر نادم تھے۔ اس وقت میں سوچتا تھا کہ میرے اس استغناء اور اینٹھ مروڑ کی کیا وجہ تھی۔ تو معلوم ہوا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے پاس چار سو پانچ سو روپے جمع رکھتا ہوں۔

اظہار عبدیت

حضرت حاجی صاحب کا یہ بھی ارشاد تھا کہ اپنے پاس کچھ جمع رکھنا چاہئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہم جیسے ضعفاء کی رعایت سے سال بھر کا نفقہ اپنی ازواج کو ایک دم سے دیا ہے۔ تا کہ ہم کو جواب کے ساتھ اتباع سنت کا بھی ثواب ملے۔ یہ تو علماء کے مذاق پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کی توجیہ تھی۔ ایک توجیہ صوفیا کے مذاق پر بھی بتلا دوں کہ اس میں اظہار عبدیت تھا۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی غلہ اناج کی احتیاج تھی۔ ورنہ بعض اولیاء نے تو ایک دن کا خرچ بھی نہیں رکھا اور وہ یقیناً وہ حضور سے زیادہ متوکل نہ تھے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار عبدیت کے لئے سال بھر کا نفقہ جمع کیا تھا۔ اور اسی اظہار عبدیت کے لئے دعا کرنا ترک دعاء سے افضل ہے کیونکہ شکستگی اور اظہار عجز اسی میں ہے اور یہ حق تعالیٰ کو محبوب ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ہر کجا پستی ست آب انجا رود   ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے دوا آنجا رد   ہر کجار کنجے شفا آنجا رود

اور فرماتے ہیں ۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ   جز شکستہ می نیا بد فضل شاہ

ہمارے حضرت حاجی صاحب کے پاس جو کوئی کچھ لاتا انار، امرود وغیرہ تو ہر چیز میں سے کچھ کچھ کھا لیا کرتے تھے کہ اس میں اظہار ہے افتقار کا۔ یہ طریقہ نہیں تھا جیسا ایک صوفی نے کیا کہ ان کے پاس خربوزہ لایا گیا تو کہا کہ میں نے سترہ برس میں آج خربوزہ کھایا ہے۔ ہمارے

حضرات کو یہ طریقہ پسند نہ تھا۔ کیونکہ اس میں شہرت بھی ہے اور عبدیت کے بھی خلاف ہے۔ اسی طرح ایک پیر صاحب کی نسبت مشہور تھا کہ وہ اناج نہیں کھاتے۔ میرے ایک دوست نے ان کے مرید سے پوچھا کہ پھر کیا کھاتے ہیں تو اس نے جو بادام اور پھل اور بالائی اور چائے وغیرہ کا لازمہ بیان کیا تو وہ تین پاؤ آدھ سیر سے زیادہ تھا۔ اس عزیز نے کہا کہ تم مجھے اس کی آدھی غذا مجھے دیدیا کرو تو کون کمبخت ہے جو عمر بھر بھی اناج کا نام لے۔ غرض اظہار عبدیت اسی میں ہے کہ بقدر ضرورت مال جمع رکھے۔ اسی لئے امام سفیان ثوری نے زمانہ سابق میں اور اخیر میں ہمارے حضرت حاجی صاحب نے بقدر ضرورت مال جمع رکھنے کی ہدایت کی ہے۔

مقصودیت اعمال

اور میں نے حضرت حاجی صاحب کا عطف امام سفیان ثوریؒ پر اس لئے کیا کہ ہمارے حضرت بھی بزرگان سلف سے ہیں گو ظہور اس زمانہ میں ہوا ہے۔ یہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول ہے جو میں نے قاری علی محمد صاحب جلال آبادی سے سنا ہے اور قاری صاحب ہمارے حضرت کے مُرید بھی نہ تھے اور بہت ثقہ معتبر شخص تھے اور ظاہر ہے کہ جمع ہونا بدوں کسی قدر محبت کے ہو نہیں سکتا۔ پس اتنی محبت میں بھی حکمت ہے پس تم اس کی طلب نہ کرو۔ مال کی محبت دل سے زائل ہو جائے کہ یہ تو ایک حال ہے اور حال مطلوب نہیں بلکہ اس کی طلب کرو کہ محبت مال اعمال صالحہ کا ذریعہ بن جائے کہ اصل مقصود اعمال ہیں ظاہری بھی باطنی بھی۔ مگر اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جن چیزوں کو خدا تعالیٰ نے مقصود نہیں بنایا۔ یعنی احوال ان کو تو مطلوب بنا رکھا ہے اور جن کو مقصود بنایا ہے یعنی اعمال ان کی طلب نہیں۔ مثلاً شکر و تواضع و اخلاص و محبت عقلیہ وغیرہ کی طلب نہیں ہاں طلب ہے تو حُب طبعی کی ہے کہ دل میں عشق کی آگ سی لگ جائے۔ حالانکہ مطلوب حب عقلی ہے نہ کہ طبعی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اسی طرح خوف میں بھی مطلوب خوف عقلی ہے یعنی اعتقاداً یوں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے اور ممکن ہے کہ مجھ پر مواخذہ ہونے لگے۔ اور یہ درجہ خوف کا ہر مسلمان کو حاصل ہے گو استحضار و ذہول کا فرق ہے اس کے آگے دوسرا درجہ ہے کہ وہ بھی درجہ اختیاری ہے یعنی استحضار عقوبت کا کہ عذاب کا ہر وقت تصور ہے یہ ہر دم فرض نہیں بلکہ میلان معصیت کے وقت فرض ہے۔ سو خوف کے یہ معنی نہیں کہ گناہ کی طرف میلان ہی نہ ہو بلکہ یہ معنی ہیں کہ جب میلان ہو تو فوراً عذاب کا تصور کر

کے گناہ سے رُک جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا

یقیناً جو لوگ خدا ترسی میں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آ جاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں۔ (پارہ نمبر ۹ رکوع ۱۴)

فرمایا ہے ان الذین اتقوا اذا مسّھُمْ طائفٌ من الشیطان نہیں فرمایا سو یہ تو خوف عقلی تھا اور ایک خوف ہے دل دھڑکنے کے سو یہ غیر اختیاری ہے یہ کسی وقت بھی مطلوب نہیں گو محمود اور مفید ہے اور نہ بندہ اس کا مکلّف ہے مگر لوگ آج ایسی کو مطلوب سمجھتے ہیں اور یہ ساری خرابی واعظوں کی ہے انہوں نے عوام کا ناس کیا ہے چنانچہ وعظ میں کہا کرتے ہیں کہ تم لوگ تھانیدار سے تو ڈرتے ہو خدا تعالیٰ نہیں ڈرتے حالانکہ تھانہ دار سے جو خوف ہے وہ طبعی ہے جیسا سانپ بچھو سے خوف ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے عقلی خوف ہے کیونکہ وہ نظر نہیں آتے۔ بلکہ ان کی صفات کو یاد کر کے ان سے ڈرا جاتا ہے اور غائب سے خوف عقلی ہی ہو سکتا ہے۔

توکل مطلوب

اسی طرح توکل کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد ہو کہ جو وہ چاہیں گے وہی ہوگا۔ اور عمل یہ ہو کہ خلاف شرع تدبیر سے رک جائے اور یہ عقلی ہے اور یہ وہ توکل ہے جس کا بندہ مکلّف ہے اس سے زیادہ کا مکلّف نہیں اور ایک توکل کا حال ہے کہ کسی وقت یہ خطرہ بھی نہ آئے کہ آج روٹی ملے گی یا نہیں۔ یہ حال مطلوب و مامور بہ نہیں اگر عطا ہو جائے تو ملنا محمود ہے نہ عطاء ہو تو نہ ملنا محمود ہے یہ تو محققین کا فیصلہ ہے باقی مغلوبین سوادنی میں سے بعض نے جن کے نام میں من اور صور ہے (من وزن میں بڑی مقدار ہے اور صور مساحت میں بڑی چیز ہے) یہ کہا ہے کہ مقام توکل کی اصلاح بھی پیٹ کا دھندا ہے۔ حضرت منصور نے ایک سالک سے پوچھا تھا کہ آجکل کیا شغل ہے کہا کہ مقام توکل کی تصحیح کر رہا ہوں فرمایا ساری عمر پیٹ ہی کے دھندے میں رہو گے محبوب کے ساتھ دل لگانے کا وقت کب آئے گا۔ سو یہ آثار مغلوبیت کے ہیں علوم نہیں ہیں۔ غرض توکل مطلوب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر اعتقاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اور تدبیر خلاف شرع نہ کرو۔ پس واللہ تم متوکل ہو۔ واللہ تم متوکل ہو۔ واللہ تم متوکل ہو۔ مگر واعظوں نے اس میں بھی عوام کا ناس کیا ہے کہتے ہیں کہ تم کو خدا پر اتنا بھی بھروسہ نہیں جتنا ایک مخلوق پر ہے کوئی

شخص تمہاری دعوت کر جائے تو چولہا ٹھنڈا کر دیتے ہو اور خدا تعالیٰ نے تمہاری دعوت کی ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔

زمین پر جو بھی جاندار ہیں ان کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ (پارہ۱۲ع۱)

اس کو سن کر تم چولہا ٹھنڈا نہیں کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قیاس کے لئے مماثلت وعدہ شرط ہے اور یہاں مماثلت نہیں کیونکہ ما من دابۃ الخ میں شام کا وعدہ نہیں کہ تم کو شام کے وقت ضرور کھانا ملے گا نہ طریق کی تعیین ہے کہ سوال کر کے ملے گا یا نوکری وغیرہ سے یا بطور دعوت کے ملے گا۔ غرض وقت بھی مبہم اور طریق بھی مبہم۔ اور داعی جو دعوت کرتا ہے وہ وقت بھی معین کر رہا ہے۔ اور طریق کو بھی معین کر رہا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا وعدہ اس تعین کے ساتھ ہوتا تو کون مسلمان تھا۔ جو چولہا گرم کرتا۔ پھر یہ قیاس اور اس پر ملامت کی بناء کب صحیح ہے اور یہ ساری باتیں واعظوں کو دوسروں ہی کے واسطے سوجھتی ہیں۔ اپنے واسطے نہیں سوجھتی۔ ہم تو جب جانیں کہ وہ روزانہ اپنے گھر کا چولہا بھی ٹھنڈا رکھیں۔ ذرا کر کے دیکھیں نانی یاد آ جائے گی۔ مگر خود کون کرتا ہے۔ یہ تو دوسروں ہی کی گردن مارنے کو ہیں۔

پیشہ ور واعظ

چنانچہ قصہ مشہور ہے کہ ایک واعظ نے وعظ میں صدقہ کے فضائل بیان کئے ان کی بیوی بھی موجود تھیں۔ اس پر وعظ کا اثر ہوا اس نے سارا زیور خیرات کر دیا۔ واعظ صاحب جو گھر پر آئے اور بیوی کو ننگا دیکھا پوچھا زیور کیا ہوا کہا خیرات کر دیا کہا کیوں کہا تم نے صدقہ کے فضائل بھی بیان کئے تھے تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے کیا اس واسطے فضائل بیان کئے تھے کہ تم خیرات کر دو بلکہ اس واسطے بیان کئے تھے کہ دوسرے ہم کو دیں۔ اسی طرح ایک مسافر واعظ نے سود خواروں کی ایک بستی میں آ کر وعظ کہا۔ اور سود خواروں کی خوب مذمت بیان کی۔ کسی نے واعظ صاحب کو روٹی بھی نہ دی اب تو بڑی فکر ہوئی بعد نماز کے اعلان کیا کہ عالم حقانی بھوکا پڑا ہے کسی نے کھانے کو بھی نہ پوچھا۔ لوگوں نے کہا صاحب! ہم لوگ سود خوار ہیں تو آپ کو ایسی ناپاک چیز کیونکر کھلاتے۔ کہنے لگے کہ میں نے مجملاً سنا تھا کہ سود لیتے ہو ذرا تفصیل تو بتاؤ کس کس طرح لیتے ہو۔ انہوں نے بیان کیا کہنے لگے۔ یہ تو سود نہیں ناحق لوگوں نے بدنام کیا ہے لاؤ روٹی لاؤ پھر تو خوب دعوتیں ہونے لگیں۔ غرض پیشہ ور واعظین نے ناس مار رکھا ہے۔ چنانچہ ایک جہالت یہ کر رکھی ہے کہ مقصود کو غیر مقصود اور غیر مقصود کو مقصود بنا رکھا ہے۔ اسی لئے عوام نے یہ سمجھ لیا کہ بس توکل اور اکل حلال محال ہے حالانکہ بالکل غلط

ہے۔جس درجہ کا انسان کو مکلف کیا گیا ہے وہ ہر شخص کے لئے آسان ہے۔

حقیقت منہیات

یہ تو مامورات میں لوگوں کی کوتاہی تھی اب منہیات میں سنئے کہ شریعت میں مثلاً ریا سے ممانعت ہے تو لوگ اس کی حقیقت یہ سمجھے کہ وسوسۂ غیر کا بالکل خطرہ بھی نہ آئے اور اگر اتفاقاً نماز یا ذکر میں غیر حق کا وسوسہ آ گیا تو شیخ کے پاس پیٹ پکڑے ہوئے آتے ہیں۔ پیٹ پکڑنے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ہمارے مدرسہ میں ایک طالب علم عید وشاہ تھا جو بہت بھولا تھا۔ ایک دن میں نے اس سے کہا کہ صُراحی اٹھا لاؤ۔ مگر پیٹ پکڑ کر لانا تا کہ ٹوٹ نہ جائے تو آپ ایک ہاتھ سے تو صراحی کا گلا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا پیٹ پکڑے آ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ میاں اپنا پیٹ کیوں پکڑا کہا تم ہی نے تو کہا تھا کہ پیٹ پکڑ کر لانا۔

غرض وسوسۂ ریا اور خطرہ ریا بھی آ گیا تو یہ لوگ شیخ کے پاس گھبرائے ہوئے آتے ہیں اب اگر شیخ غیر محقق ہوا تو اس نے ایک وظیفہ اور بتلا دیا۔ پھر اس وظیفہ میں وسوسہ ریاء ہوا تو ایک مراقبہ اور تعلیم کر دیا۔ اور اگر محقق ہے تو وہ پوچھے گا کہ بتلا ریا اختیاری ہے یا غیر اختیاری۔ بس آدھے سلوک کے اشکالات کے جواب تو اسی سوال سے حل ہو جائیںگے۔ پہلے بیان کا بھی اسی پر مدار تھا کہ اختیارات کے درپے ہونا چاہئے غیر اختیارات کے درپے نہ ہونا چاہئے۔ اس بیان میں بھی یہ مسئلہ آ گیا کیونکہ تمام اشکالات کا جواب دراصل یہی مسئلہ ہے کہ شریعت نے اختیارات کا مکلف کیا ہے اس لئے ہر اشکال کے جواب میں یہ مسئلہ آ جاتا ہے۔ اب اگر اس سوال کے جواب میں یہ کہا گیا کہ ریا اختیاری ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ اپنے اختیار سے کام لو اور قصداً خیال غیر کو نہ لاؤ۔ اور اگر یہ کہا گیا کہ غیر اختیاری ہے تو شیخ کہے گا کہ نہ یہ ریا مضر ہے نہ ریاح مُضر ہے۔ بس بے فکر رہو اور اس ریا کو مثل ریاح کے سمجھو وہ ریا نہیں بلکہ وسوسہ ریا ہے جو اصلاً مضر نہیں۔ ریائے مذموم یہ ہے کہ قصداً مخلوق کے لئے عمل کیا جائے اگر قصداً مخلوق کے لئے نہ کیا گیا بلکہ بلا قصداً مخلوق کا خیال آ گیا تو یہ ریا نہیں بلکہ اخلاص ہی ہے اور یہ بات سہولت سے حاصل ہو سکتی ہے کہ اپنے قصد و اختیار سے دوسرے کا خیال و ارادہ نہ لاؤ۔

رہا یہ کہ پھر مجاہدہ کی ضرورت کیوں ہو اس کا جواب یہ ہے مجاہدہ اس واسطے کیا جاتا ہے تا کہ ریا اختیاری کی مدافعت سہل ہو جائے کیونکہ اس کا بار بار دفع کرنا قدرے دشوار ضرور ہے مجاہدہ سے یہ مشقت دفع ہو جاتی ہے نیز وسوسۂ ریا جو کہ مضر نہیں بعض دفعہ اعمال کے ساتھ

۱؎ یعنی وعظ الفصل والانفصال ۱۲۔

مزاحمت کرتا ہے اور اس کے ساتھ عمل دشوار ہو جاتا ہے۔ مجاہدہ سے وسوسۂ ریا بھی ضعیف ہو جاتا ہے۔ بہر حال تم جن احوال غیر اختیاریہ کے طالب ہو ان کو چھوڑ وان کی طلب کو قطع کرو یہ بھی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کر سکو) میں داخل ہے کہ ان ہوسوں کو قطع کرو لیکن مِمَّا تُحِبُّوْنَ کی ما اس قدر عام نہیں کہ سارے بچے اس کے اندر آ جائیں کہیں تم یہ کہنے لگو کہ ہم کو جنت کی بھی ہوس ہے۔ ہم کو رضائے حق بھی مطلوب ہے تو کیا اس کو بھی قطع کر دیں۔ اس کا جواب میں قرآن ہی سے دیتا ہوں وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے مِمَّا تُحِبُّوْنَ فرمایا ہے۔ مِمَّا اَحَبُّ نہیں فرمایا اور جنت و رضائے حق تو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اس کا قطع کرنا مقصود نہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ جو حالت تم کو محبوب ہو اور اللہ تعالیٰ کو من حیث المطلوبیت محبوب نہ ہو۔ اس کی طلب قطع کرو اب اشکال نہ رہا۔ دوسری قید یہ بھی ضروری ہے کہ یہ انفاق فی سبیل اللہ ہو۔ مطلق انفاق کافی نہیں یعنی احوال و کیفیات و ہوسات کی ترک طلب رضائے الٰہی کے واسطے ہو۔ راحت نفس کے واسطے نہ ہو۔ یعنی اپنے محبوب کو خدا کے محبوب پر فدا کرنا یہ ہے اِنْفَاقْ مِمَّا تُحِبُّوْنَ ایک بات یہ بھی سمجھو کہ آیت سے کس قدر مفہوم ہوتا ہے جو چیز خرچ کرو اس کا محبوب ہونا تو ضروری ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ سب اشیاء میں احب ہو مگر حدیث ابوطلحہؓ سے ظاہراً شرط احبیت بھی مفہوم ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا تھا۔

انی اری اللّٰہ تعالٰی یقول لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَاَنَّ اَحَبُّ الْاَمْوَالَ اِلَیَّ بِیْرُحَآءِ الخ

(بے شک میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم خیر کامل کو کبھی حاصل نہیں کر سکو گے جب تک کہ پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے اور مجھے سب سے زیادہ محبوب مال باغ بیرحا ہے)

اس میں انہوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تک محبوب چیز خرچ نہ کرو گے اس وقت تک بر کامل حاصل نہ کر سکوں گے۔ اور مجھے سب سے زیادہ محبوب مال باغ بیرحا ہے تو گویا ان کے فہم میں بر کامل کا حصول احب الاشیاء کے انفاق پر موقوف تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی فہم کی تقریر فرمائی اس سے احب الاشیاء کے انفاق پر حصول بر کا توقف پختہ ہو گیا۔ اس غلطی میں بہت روز تک میں بھی رہا ہوں۔ مگر پھر خدا نے ہدایت کی اور یہ سمجھ میں آیا کہ احبُّ الاشیاء کے انفاق پر حصول بر موقوف نہیں کیونکہ نص مطلق ہے نص میں تو مما تحبون ہے۔ احبیت کی قید نہیں اور حدیث میں حضرت ابوطلحہ کا قول وَاَنَّ اَحَبُّ الْاَمْوَالَ اِلَیَّ بِیْرُحَآءِ وارد ہے تو کیسی دلیل ہے اس مِمَّا تُحِبُّوْنَ کی تفسیر ہونا ثابت

نہیں بلکہ حضرت ابوطلحہؓ نے از خود یہ ظاہر کرنا چاہا کہ گوحصول برنفس محبوبیۃ شئے سے بھی حاصل ہوسکتی ہے مگر میں احب الاشیاء کا انفاق کرنا چاہتا ہوں۔ غرض تم مطلق محبوب کے انفاق سے بھی برّ حاصل کرلو گے خواہ احبّ ہو یا نہ ہو۔ ہاں ردل غدل نہ ہو کہ موٹی بھیڑ خواجہ خضر کے نام۔ جیسے ایک بنئے کا قصہ ہے کہ وہ اتفاقاً درخت پر چڑھ گیا تھا۔ وہاں سے اترتے ہوئے ڈرنے لگا تو کہنے لگا ارے رام! اگر میں سلامتی سے نیچے اتر گیا تو ایک گائے پن کروں گا۔ پھر کچھ نیچے اترا اور بچنے کی امید ہوگئی تو کہا کہ ایک بکری دوں گا پھر کچھ نیچے آیا تو کہا ایک مرغی دوں گا پھر بالکل نیچے اتر آیا تو ایک جوں سر میں سے پکڑ کر ماردی کہ جان کا بدلہ جان بس یہی کافی ہے۔

مالِ نذر

اس نذر ماننے پر ایک تحقیق نذر کے متعلق ذہن میں آگئی وہ یہ کہ نذر کے بارے میں حدیث میں آیا ہے لَا یَرُدُّ مِنَ الْقَدَرِ شَیْئًا وَ اِنَّمَا یُسْتَخْرَجُ بِهٖ مِنَ الْبَخِیْلِ کہ منت سے تقدیر تو ٹلتی نہیں ہوتا وہی ہے جو مقدر ہے منت سے اس کے خلاف تو نہیں ہوسکتا۔ ہاں اللہ تعالیٰ اس طریقہ سے بخیل کا کچھ مال نکال دیتے ہیں کیونکہ بخیل مصیبت کے ہی موقع پر کچھ نذر وغیرہ کی صورت میں مال خرچ کرتا ہے۔ ویسے اس کے ہاتھ سے مال نہیں نکلتا۔ اس پر ایک شبہ شاید سامعین میں سے کسی کو ہوا ہوگا کہ اس حدیث سے نذر کی مذمت مفہوم ہوتی ہے حالانکہ نص میں

وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ (چاہئے کہ وہ اپنی نذروں کو پورا کریں۔(پارہ ۱۷۔ رکوع ۱۱)

وارد ہے جس سے نذر کا عبادت ہونا معلوم ہوتا ہے نیز علماء کا قول بھی ہے کہ نذر عبادت ہے جو حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اسی لئے نذر لغیر اللہ حرام ہے اور عبادت کے لئے حسن لازم ہے پھر نص میں وفاء نذر کا امر ہے اور مامور بہ قبیح نہیں ہوسکتا اس کا جواب بعض محققین نے یہ دیا ہے کہ عبادات لذاتھا نذر مطلق ہے جیسے یوں کہے۔

نَذَرْتُ لِلّٰهِ صَوْمًا وَ نَذَرْتُ لَهٗ صَلٰوةً وَصَدَقَةً

کہ میں اللہ کے لئے روزہ کی نذر کرتا ہوں یا نماز وصدقہ کی نذر کرتا ہوں اور نذر مذموم نذر مقید ہے گو عبادت لغیرہا ہو جیسے یوں کہے کہ میرا بیمار اچھا ہوجائے تو اتنا صدقہ کروں گا۔ میرا مقدر فتح ہوجائے تو اتنے مساکین کو کھانا کھلاؤں گا۔ وغیرہ وغیرہ سبحان اللہ! عجیب جواب ہے واقعی شریعت کو انہی حضرات نے خوب سمجھا ہے اور خود حدیث اس فرق کو بتلا رہی ہے کیونکہ کراہت کی علت آپ نے استخراج کو فرمایا ہے اور یہ نذر مطلق میں نہیں ہے بلکہ نذر معلق میں

ہے۔ یہ تحقیق درمیان میں ایک حکایت پر بیان ہوگئی ہے۔

ردی مال

میں یہ کہہ رہا تھا کہ ردّی چیز اللہ کے نام پر صدقہ نہ کرنا چاہئے اس سے بِرّ حاصل نہ ہوگا جیسے آج کل عادت ہے کہ خدا کے نام کی وہی چیز نکالی جاتی ہے جو سب سے ردی ہو۔ جیسا ہمارے ماموں صاحب نے ایک حکایت بیان کی تھی کہ ایک شخص کے یہاں کھیر پکی تھی کھیر کی ایک رکابی میں کتے نے منہ ڈال دیا تو اس کی بیوی نے ایک مٹی کی رکابی میں اس کو لوٹ دیا اور بچہ سے کہا کہ مسجد کے مُلّا کو دے آوہ میاں جی کے پاس لایا۔ میاں جی نے مہینوں میں کھیر کی صورت دیکھی تھی فوراً ہاتھ مارنے لگے اور اسی طرف سے کھانا شروع کیا جدھر کتے نے منہ ڈالا تھا۔ لڑکے نے کہا میاں جی ادھر سے مت کھاؤ ادھر کتے نے منہ ڈال دیا تھا۔ میاں جی کو غصہ آیا اور رکابی دور پھینک کر ماری۔ لڑکا رونے لگا اب روتا کیوں ہے ایک تو مجھے کتے کے مُنہ میں ڈالی ہوئی کھیر کھلائی اوپر سے روتا ہے۔ بچہ نے کہا کہ تم نے رکابی توڑ دی۔ میری ماں مجھے مارے گی۔ کہا مٹی ہی کی تو رکابی تھی کہنے لگا کہ میری ماں میرے بھائی کا گوہ اس میں اٹھاتی تھی اب وہ مجھے مارے گی۔ اب تو ملا جی کو قے ہونے لگی کہ ظرف ومظروف دونوں ہی نور بھرے تھے تو ایسا انفاق تو حرام ہے اس سے بِرّ کامل ہرگز حاصل نہ ہوگا بلکہ اللہ کے نام پر اچھی چیز کو خرچ کرو جو پیاری ہو۔

ہاں یہ ضروری نہیں کہ سب سے زیادہ پیاری ہو سو پیارا تو ایک پیسہ بھی ہے مجھے خود اپنی حالت معلوم ہے کہ ایک پیسہ ضائع ہو جاتا ہے تو دو چار منٹ تک مجھے تردّد ہوتا ہے اور اس کے ضائع ہونے کا قلق بھی ہوتا ہے تو ایک پیسہ کا خرچ کرنا بھی اِنْفَاقِ مِمَّا تُحِبُّوْنَ میں داخل ہے بس اس کا لحاظ انفاق میں ضروری ہے کہ جو چیز خرچ کرو وہ تم کو محبوب ہو گو کسی دوسرے دولت مند کے نزدیک وہ غیر محبوب ہو کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

> **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ.** (اے ایمان والو خرچ کیا کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیا ہے اور ردی چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو۔ (پارہ ۳۔ رکوع نمبر ۵)

کہ اپنی کمائی میں سے پاکیزہ کو خرچ کرو اور اس میں سے خبیث کا قصد نہ کرو۔ بس ہر شخص اپنی کمائی میں سے پاکیزہ کو خرچ کرے۔ گو وہ کسی نواب اور بادشاہ کے نزدیک خبیث ہی ہو مگر تمہارے نزدیک خبیث نہ ہونا چاہئے۔

رعایت غرباء

اس میں غرباء کی رعایت کی گئی ہے اگر طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ نہ فرماتے بلکہ اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مطلقاً فرماتے تو غرباء کو فکر ہوتی کہ ہمارے پاس تو جتنا کچھ ہے امیروں کی نظروں میں سب ہیچ ہے تو طیبات کاملہ ہم کہاں سے لائیں اس لئے حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ طیبٰت کاملہ کی ضرورت نہیں بلکہ تمہارے پاس جو کچھ ہے اس میں سے پاکیزہ مال خرچ کرو اور اس میں سے چھانٹ کر ردّی مال اللہ کے واسطے نہ نکالو۔

اب یہاں ایک اشکال واقع ہوتا ہے وہ یہ کہ حدیث[1] میں ہے کہ جب نیا کپڑا پہنے تو پرانے کپڑے کو خیرات کردے اور نیا جوتا پہنے تو پرانے کو اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ ردّی مال صدقہ کیا جائے گا تو میں اس حدیث کا مطلب یہ سمجھا ہوں کہ پرانے کپڑے اور جوتا کو اللہ کے نام پر ثواب کی نیت سے نہ دیا جائے۔ بلکہ اعانت غریب کی نیت سے صدقہ کیا جائے تم اعانت غریب کے سوا کچھ قصد نہ کرو۔ چاہے اللہ تعالیٰ تم کو ثواب بھی دیدیں خوب سمجھ لو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مراد اس سے وہ پرانا ہو جو ردی کے درجہ تک نہ پہنچا ہو۔ بہرحال تحصیل بر کے لئے احب الاشیاء کا انفاق ضروری نہیں اور حضرت ابوطلحہؓ کا احب الاشیاء کا خرچ کرنا یہ اس غرض سے تھا کہ وہ خیر کامل کے قصد سے انفاق اعلیٰ کرنا چاہتے تھے کیونکہ حضرات صحابہؓ کی یہی شان تھی کہ وہ ہر کام میں اعلیٰ درجہ کا قصد کرتے تھے۔ دوسرے خود نص میں ایک قرینہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حصول بر کے لئے انفاق احب الاشیاء ضروری نہیں۔ اور وہ قرینہ وَمَا[2] تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ اور یہ وقت ہے وفا کے[3] وعدہ سابق کا کہ میں نے اوپر کہا تھا کہ دونوں آیتوں کا حاصل ایک ہی ہے اور دونوں میں مضمون مقصود کا ایک جزو مذکور ہے۔ اس لئے میں نے دونوں کو ساتھ تلاوت کیا تھا۔

اس دوسری آیت کی مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ آیت سابقہ کی علت ہے کہ تم کو انفاق پر ثواب کیونکر نہ ملے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے انفاق کو خوب جانتے ہیں اس تفسیر پر تو اس کا حاصل آیت سابقہ سے متحد ہے مگر میری سمجھ میں خود بخود یہ بات آئی تھی کہ یہ آیت پہلی آیت کے مقابل ہے کہ پہلی آیت میں انفاق محبوب پر بر کامل کے حصول کو موقوف کیا گیا تھا اور اس آیت میں مَا تُنْفِقُوْا عام ہے محبوب وغیر محبوب دونوں کا مطلب یہ ہے کہ بر کامل تو انفاق محبوب ہی سے حاصل ہوگی اور ویسے جو کچھ بھی تم خرچ کرو خواہ محبوب ہو یا غیر محبوب بشرطیکہ ردّی نہ ہو۔ اللہ

---

[1] كذا في الترغيب عن الترمذى بلفظه عمد الى الثوب الذى اخلق فتدق به الخ. في الترغيب في كلمات يقولهن من لبس ثوبا جديدا ۱۲ [2] اور جو چیز بھی خرچ کرو گے بیشک حق تعالیٰ کو اس کی خوب اطلاع ہے۔ (پارہ ۴ رکوع ۱) [3] یہ وعدہ بالکل خطبہ کے متصل ہے۔

تعالیٰ اس کو جانتے ہیں یعنی ثواب کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔ گو بر کامل حاصل نہ ہو۔ یہ تفسیر میرے ذہن میں آئی تھی مگر میں اس پر مطمئن نہ ہوا بلکہ تفاسیر میں تلاش کیا تو بیضاوی نے یہی لکھا ہے جو میں سمجھا تھا۔ اس سے میرا جی بہت خوش ہوا اور اطمینان ہو گیا کہ یہ تفسیر بالرائے نہیں۔

یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ ذوقی تفسیر پر بدوں تائید سلف کے ہرگز اعتماد نہ کیا جائے شاید اس پر کسی کو شبہ ہو کہ اس سے تو انفاق ردّی پر بھی ثواب معلوم ہوتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس سے انفاق ردی کا جواز یا اس پر ثواب کیسے معلوم ہوا۔ ہاں اس میں محبوب و غیر محبوب کی تعمیم ضرور ہوگئی۔ کہ اگر غیر محبوب بھی خرچ کرو بشرطیکہ ردّی قابل نفرت نہ ہو تو اس پر بھی ثواب مل جائے گا۔

پس اب تین درجے ہوئے۔ ایک محبوب ایک غیر محبوب۔ ایک ردّی مبغوض۔ پہلے دونوں درجوں پر تو ثواب ملے گا۔ اول پر زیادہ اور دوسرے پر کم اور تیسرے درجہ کی ممانعت ہے۔ اس پر ثواب نہ ملے گا۔

ترتیب سلوک

اس آیت کی تفسیر تو پوری ہوئی۔ اب بطور تتمہ کے یہ بتلاتا ہوں کہ اس آیت میں سلوک کی ترتیب بھی بتلائی گئی ہے کہ جو شخص انفاق محبوب نہ کر سکے۔ وہ غیر محبوب ہی سے شروع کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ سب لوگ ایک درجہ کے نہیں اس لئے سب کو انفاق محبوب دفعتہً سہل نہیں تو وہ اول انفاق غیر محبوب سے عمل شروع کریں اور میں نے اس آیت کا تتمہ آیت سابقہ اس لئے کہا حالانکہ اس کا مضمون مقابل ہے۔ پہلی آیت کا۔ مگر پہلی آیت کا مضمون اس سے مل کر ہی پورا ہوتا ہے اسلئے اس کو تتمہ کہا گیا۔

اب ایک بات یہ رہی کہ مِمّا کے مِنْ میں اختلاف ہے کہ من بیانیہ ہے یا تبعیضیہ کا۔ سو دونوں کا حاصل ایک ہی ہے کیونکہ بیانیہ کا حاصل یہ ہوگا کہ محبوب کو خرچ کرو اور تبعیضیہ کا حاصل یہ ہوگا کہ بعض محبوب کو خرچ کرو اور قواعد سے معلوم ہو چکا ہے کہ کل کا انفاق مطلوب نہیں بلکہ بعض لوگوں کی ایک انفاق کل ممنوع ہے۔ پس من بیانیہ کا مرجع بھی تبعیضیہ ہی کی طرف ہے اب میں ختم کرتا ہوں۔ خلاصہ بیان کا یہ ہوا کہ آیت کا جو مدلول خفی ہے خواہ قیاسی ہو یا منصوص ہو یعنی ترک کیفیات غیر اختیاریہ اس پر عمل کرنا چاہئے کہ ہوسات وثمرات کی طلب کو قطع کرو اور اعمال کا اہتمام کرو۔ اب دعاء کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں، (آمین)۔

وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

اشرف علی

۳ ذیقعدہ ۱۳۴۷ھ

قطع التمنی

قطع التمنی سے موسوم وعظ مولوی محمد اسماعیل صاحب کے مکان واقع کاندھلہ میں ۱۰ جمادی الاول ۱۳۳۰ھ کو کھڑے ہو کر تین گھنٹے تک ارشاد فرمایا۔ مولوی سعید احمد صاحب مرحوم تھانوی نے اسے قلمبند فرمایا۔ مستورات کے علاوہ سامعین کی تعداد تقریباً ۶۰ تھی۔

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ لِلّٰهُ فَلا مُضِلَّ لَهٗ وَ مَنْ يُّضْلِلْهُ فَلا هَادِىَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ۔

اَمَّا بَعْدُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔

فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى عَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ هُوَّ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں (باعث) خرابی ہو اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم پورا پورا نہیں جانتے۔ (البقرة آیت نمبر ۲۱۶)

تمہید: یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔ اس میں حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے ایک مضمون جس کے حاضر رکھنے کی ہم کو ہر وقت ضرورت ہے۔ ارشاد فرمایا ہے اور ایک بڑی غلطی کو جس میں ہم سخت مبتلا ہیں رفع فرمایا ہے۔ اور اُس غلطی میں اکثر اہل علم اور عوام بڑوں اور چھوٹوں سبھی کو ابتلاء ہے بلکہ اس کے غلطی ہونے کی طرف بھی التفات نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم لوگوں کی فہرست اعمال میں بڑی بڑی باتیں تو شمار ہوتی ہیں۔ مگر جن میں ذرا بھی غموض ہوتا ہے۔ ان کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ قرآن مجید میں تدبر نہ کرنا ہے۔ اور مسلمانوں میں ایک یہ بھی کمی ہے کہ وہ قرآن مجید کے اندر تدبر نہیں کرتے۔ چنانچہ ہم میں دو قسم کے لوگ ہیں عوام الناس اور خواص۔ سو عوام الناس تو ظاہر ہے کہ قرآن کے الفاظ ہی کو پڑھتے ہیں اور گو یہ بھی بیکار نہیں۔ بلکہ ایک درجہ میں یہ بھی مطلوب ہے۔

وقعت ثواب

اور جو لوگ بدوں فہم معانی تلاوت کرنے کے بیکار اور بے فائدہ قرار دیتے ہیں یہ اُن کی غلطی ہے۔ ہم اُن سے فائدہ کی شرح پوچھیں گے۔ اگر وہ کہیں کہ فائدہ اس کا فہم معانی ہے تو اُن

سے کہا جائے گا کہ تمہارے پاس اس امر کی کیا دلیل ہے کہ فائدہ اسی میں منحصر ہے کہ قرآن شریف کو سمجھیں بلکہ جس طرح یہ ایک فائدہ ہے ایسا ہی ثواب بھی ایک فائدہ ہے۔ مگر ثواب کو آج کل لوگ بہت ہی بے وقعتی سے زبان پر لاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اگر کسی کی ہزار روپے کی تنخواہ ہو یا اس کی توقع ہو جو ثواب کے مقابلے میں محض ہیچ ہے تو اُس پر کیسا فخر کیا جاتا ہے اور ثواب کو جو کہ ہزار درجہ افضل ہے اس بے وقعتی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ خبر بھی ہے کہ تنخواہ کی کیا حقیقت ہے۔ تنخواہ کی حقیقت ہے کام کا عوض۔ بس یہی حقیقت ثواب کی ہے۔ پھر افسوس ہے کہ دنیا کا فانی عوض جو صدہا کدورت کے ساتھ ہے اور جس میں ترقی کے بعد تنزل بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پنشن میں ظاہر ہے اور پھر انقطاع ہو جاتا ہے چنانچہ موت میں ظاہر ہے اُس کو تو مایۂ فخر سمجھا جائے اور خدا کے گھر کی تنخواہ جس میں صد اتزائد اور پھر خلود اس کو حقیر سمجھا جائے۔

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر نہ کی جیسا قدر کرنے کا حق ہے) کہ خدا کے نام کی لگی ہوئی چیز کو ایسا حقیر سمجھا جائے۔ غرض خدا تعالیٰ کے ہاں کی تنخواہ کو ثواب کہا جاتا ہے۔ مگر اس وقت ایسی حالت بگڑ گئی ہے۔ کہ لوگ اس معاوضہ آخرت کو ذلیل سمجھتے ہیں۔

میں بریلی ایک مرتبہ گیا تو صاحب جنٹ نے ملاقات کی رغبت ظاہر کی۔ میں اُن سے ملا۔ اول سوال اُنہوں نے یہ کیا کہ میں نے سُنا ہے کہ آپ نے کوئی تفسیر لکھی ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں لکھی ہے پوچھا کہ آپ کو اس میں کتنا روپیہ ملا۔ میں نے کہا کہ ایک بھی نہیں کہا کہ پھر آپ نے اتنا محنت کیوں کیا۔ میں نے کہا کہ ثواب آخرت کی نیت سے کہنے لگا کیا ابھی مسلمانوں میں ایسے خیال کے لوگ موجود ہیں۔ میں نے کہا کہ بہت کثرت سے۔

اس حکایت کے نقل کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ اس متاع دنیا کے مقصود سمجھنے کی جڑ بتلا دوں۔ کہ یہ خیال مسلمانوں میں غیر مسلم قوموں سے آیا ہے۔ اور یہ لوگ اہل یورپ کی شاگردی کرتے ہیں۔ لیکن شاگردی بھی ناتمام ہے کیونکہ وہ لوگ تو مادہ پرست ہیں۔ صانع عالم کے قائل نہیں تو جو شخص نہ مبداء کا قائل ہو نہ معاد کا وہ تو اس خیال میں معذور ہے۔ اگرچہ اس میں وہ بھی معذور نہیں کہ مبداء و معاد کا باوجود قیام دلائل کے انکار کیا۔ مگر بعد انکار کے اس انکار کی فرع کا قائل ہونا۔ یعنی دنیا کو مقصود بالذات سمجھنا زیادہ عجیب نہیں۔ مگر مسلمان پر کیا آفت نازل ہوئی کہ باوجود قیامت کے قائل ہونے کے پھر بھی اگر کسی کام میں دنیا کا فائدہ یا دُنیا میں فائدہ نہ ہو تو اس کو بے کار سمجھے اس لئے شاگردی بھی ناتمام شاگردی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ (نہ ادھر اور نہ ادھر)

افتقار و احتیاج

اب سمجھئے کہ فائدہ صرف نفع عاجل ہی میں منحصر نہیں ہے۔ بلکہ نفع عاجل کے ساتھ ہی ایک نفع آجل بھی ہے یعنی اجر وثواب اور حقیقت اس کی رضا و جنت ہے۔ مگر اس وقت لوگ جنت کو بھی بہت ذلت سے ذکر کرتے ہیں اور دُنیا پرستوں سے تو یہ امر زیادہ عجیب نہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ بعضے صوفی مشرب بھی اس کی تحقیر کرتے ہیں۔ چنانچہ کانپور میں ایک شخص میرے پاس آئے کہنے لگے کہ مجھے دس روپے کی ضرورت ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کسی تذکرہ میں کہنے لگے کہ ہمیں کیا ضرورت ہے جنت کی اور کیا پرواہ ہے دوزخ کی۔ میں نے کہا کہ ہوش کی دارُو کرو۔ تم کو دس روپے سے تو استغناء ہوا نہیں جنت سے تو تم ضرور ہی مستغنی ہو گے۔ وجہ اس تمام تر بکواس کی یہ ہے کہ جنت کو ابھی دیکھا نہیں ہے۔ جب دیکھو گے تو ہائے ہائے کر کے مر جاؤ گے۔ سمجھ لو کہ جنت تو بڑی چیز ہے انسان اپنی معمولی ضرورتوں سے تو مستغنی ہو ہی نہیں سکتا۔

یہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت شناسی میں غور کرنا چاہئے کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانا کھا کر یہ دُعا فرماتے تھے کہ

الحمد اللّٰہ الذی اطعمنا و سقانا۔ (سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جس نے ہمیں کھلایا اور جس نے ہمیں پلایا) **الٰی قولہ غیر مودع وَلَا مستغنی عنه ربنا**۔

یعنی اس کھانے کو نہ ہم رخصت کرتے ہیں اور نہ ہم اس سے مستغنی ہیں۔ حضرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی شخص افضل تو کیا کوئی برابر بھی نہیں ہے۔ آپ خدا تعالیٰ کے سب سے زیادہ مقبول اور کھانا پینا بظاہر بہت ہی سرسری چیز۔ مگر باوجود اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہمیں اس سے استغناء نہیں کیونکہ جب تک زندہ ہیں دونوں اس کے محتاج ہیں تو اس حدیث سے پتہ چلا کہ بندہ کسی وقت بھی مستغنی نہیں ہے۔ تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مجھے صحت کی ضرورت نہیں یا بیوی کی ضرورت نہیں ہے۔ یا کھانے کی ضرورت نہیں اور عجب نہیں کہ اسی وجہ سے دوا کو مسنون کیا گیا ہو۔ یعنی اگر دوا نہ بھی کی جائے تب بھی مرض کی مدافعت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایسے بہت لوگ دیکھنے میں آئے ہیں کہ وہ دوا بالکل نہیں کرتے اور اُن کو بھی شفا ہوتی ہے۔ مگر باوجود اس کے پھر بھی جو دوا کو مسنون کیا گیا۔ تو شاید اس میں یہی مصلحت ہو کہ اس سے افتقار کا اظہار رہوا۔

اور اسی کی بناء پر بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ وہ بھوک میں رونے لگے کسی نے کہا کہ کیا بچے ہو۔؟ کہ بھوک میں روتے ہو۔ فرمایا تم کیا جانو مجھ کو بھوکا اسی لئے کیا ہے کہ میرا رونا دیکھیں۔ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیمار تھے۔ ایک شخص نے کہا کہ کیسی طبیعت ہے۔ فرمایا کہ اچھی نہیں۔

اُس نے کہا کہ آپ ایسا فرماتے ہیں فرمایا کہ سُبحان اللہ! خدا تعالیٰ تو مجھے بیمار کریں کہ میرا عجز ظاہر ہو اور میں اپنی بہادری ظاہر کروں۔ جب خدا نے بیمار کیا ہے تو کیوں نہ ظاہر کروں۔ ظاہر بیں تو بہت تعجب کریں گے۔ مگر جو حقیقت سمجھتے ہیں اُن کو معلوم ہے کہ رُوح ان قصوں کی اظہارِ افتقار ہے۔

صحبت اہلِ نور

اور[1] یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ علماء کی جب ان حقائق پر نظر ہے اور وہ ہر چیز کو ضروری محتاج الیہ سمجھتے ہیں تو اس کا اُن پر کب احتمال ہے کہ وہ معاش کو ترک کرنے کی رائے دیں۔ جیسا کہ اُن کو بدنام کیا جاتا ہے۔ اصل سبب اس بدنام کرنے کا یہ ہے کہ معترضین کو اُن سے اختلاط کا اتفاق نہیں ہوا۔ اُدھوری بات دور سے سن کر بدگمان ہو جاتے ہیں۔ اس[2] لئے ایسے لوگوں کی تشفی کا ایک سہل طریق تھوڑے دنوں سے سمجھ میں آیا ہے وہ یہ کہ جس شخص کو مقتدایانِ اسلام پر اعتراض ہوں۔ وہ چالیس دن کسی مقتداء کے پاس صرف رہ لیں۔ خصوصیت کے ساتھ کسی شبہ کے پیش کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ خود اختلاط ہی سے انشاء اللہ تعالیٰ اس مدت میں سب شبہات حل ہو جائیں گے اور اگر[3] کوئی کہے کہ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تو لیجئے میں سمجھائے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ جب پاس رہے گا تو وقتاً فوقتاً اُن کے معاملات دیکھے گا۔ اُن سے قواعد دینیہ سُنے گا، اسی سے وہ شبہات خود بخود جاتے رہیں گے۔ یہ تو ظاہر بینوں کے سمجھانے کی بات ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ لوگ اہل نور ہیں اُن کے قرب سے نورانیت آتی ہے۔ اُس نور سے حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ پس اس انعکاس کی وہ حالت ہوتی ہے کہ **نور القمر مستفاد من نور الشّمس** (چاند کا نور سورج کے نور سے استفادہ کرتا ہے) تو صاحب نور کے پاس ظلمت نہیں رہتی۔ یعنی جب نور آتا ہے تو ظلمت بھاگ جاتی ہے۔ غرض اہلِ نور کی صحبت میں یہ خاصہ ہے گو وجہ بھی کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ بلکہ[4] اس سے بڑھ کر کہتا ہوں کہ اگر طبیعت میں سلامتی ہو تو بدوں اختلاط کے صرف ان کا دیکھ لینا ہی کشفِ حق کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

اے لقائے تو جوابِ ہر سوال ‍ ‍ ‍ ‍ مشکل از حل تو حل شود بے قیل وقال

(اے وہ ذات کہ تیری ملاقات ہی ہر شئ جواب ہے تیرے سامنے بغیر محبت اور بحث ومباحثہ ہر مشکل حل ہو جاتی ہے)

---

[1] علماء پر ترک معاش کا مشورہ دینے کا الزام غلط ہے۔ [2] جن لوگوں کو مقتدایانِ اسلام پر اعتراض ہو ان کی تشفی کا سہل طریق اُن کے پاس رہنا ہے۔ [3] جن لوگوں کو مقتدایانِ اسلام پر اعتراض ہو ان کی تشفی کا سہل طریق اُن کے پاس رہنا ہے۔ [4] اگر طبیعت میں سلامتی ہو تو اہل اللہ کے دیکھنے ہی سے شبہات زائل ہو جاتے ہیں۔

ہے۔ قیل وقال کے معنی یہ ہیں کہ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اگر اس درجہ کی سلامتی نہ ہو تو البتہ پھر چند روز کی صحبت کی بھی ضرورت ہے۔ بشرطیکہ جب کہ خَتَمَ اللّٰہُ کی نوبت نہ آ گئی ہو اور بحمد اللہ کسی مسلمان کی یہ حالت ہوتی بھی نہیں ۔ ورنہ وہ مسلمان ہی کیوں ہوتا۔ غرض میں نے معترضین کے ایسے شبہات کا یہ عملی جواب تجویز کیا ہے۔ یعنی اختلاط مع العلماء کیوں کہ محض لسانی جواب سے اگر سکوت ہو جائے مگر شفاء نہیں ہوتی۔ لیکن اس عملی جواب میں اتنی شرط ضرور ہے کہ نظر انکار کے ساتھ وہاں نہ رہے۔ مگر گو اعتقاد بھی نہ ہو۔ بلکہ صرف یہ احتمال کافی ہے کہ شاید صحیح ہو۔ اس کے بعد انصاف کے ساتھ غور سے کام لے۔ میں وعدہ بلکہ خدا کے فضل پر بھروسہ کر کے دعویٰ کرتا ہوں۔ کہ کوئی مرض بھی اس قسم کا نہ رہے گا۔

بے جا الزام

مگر آج کل لوگوں نے ہر چیز کا ست نکالنا شروع کر دیا ہے۔ تو علماء کی تعلیم کا بھی جو کہ ترک معاصی کے متعلق ہے ست نکالا کہ یہ دُنیا کو چھڑاتے ہیں اور محض غلط ست نکالا۔ ظاہر ہے کہ حاجت ایک ایسی چیز ہے کہ کسی وقت بھی اس سے استغنیٰ کا دعویٰ نہیں ہوسکتا۔ پس علماء جو کہ اس بات کا احساس کرتے ہیں کیا بچے ہیں کہ وہ حاجت کی چیزوں کے چھوڑنے کو کہیں گے۔ البتہ اتنا اور کہتے ہیں کہ جب دُنیا سے استغناء نہیں تو آخرت سے استغناء کیونکر کیا جاتا ہے۔ غرض علماء پر یہ الزام کسی طرح صحیح نہیں۔ لیکن اہلِ دنیا پر یہ الزام صحیح ہے کہ وہ جنت اور ثواب آخرت سے چھڑاتے ہیں ۔ جیسا ان کے حال اور قال سے ظاہر ہے کہ اس کی وقعت ان کے قلب میں نہ خود ہے اور نہ اوروں کے دل میں پیدا ہونے دیتے ہیں۔ چنانچہ جس عمل میں کوئی عاجل نفع نہ ہو محض ثواب ہی ہو کہتے ہیں کہ اس میں کیا فائدہ ہے۔ جس کے جواب میں تنخواہ کی مثال لایا ہوں کہ جس عمل پر تنخواہ ملے۔ اس کو تو مفید سمجھتے ہیں تو بس ثواب بھی ایسی تنخواہ کا نام ہے جو ابد سے الآباد تک بڑھے گی اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ الفاظ قرآن کی تعلیم میں کوئی فائدہ نہیں اور قرآن کی تعلیم میں گو اور بھی منافع ہیں۔ مگر اس وقت ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک فائدہ یعنی ثواب بیان کر دیا ہے۔ اگر چہ یہ وہ دوسرے فوائد بھی واجب الرعایت ہیں لیکن ایک بتلا دینا بھی کافی ہے۔

ترغیب تدبر

غرض ثواب کے مطلوب ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن صرف اس پر اکتفا بھی نہ کرنا چاہئے جیسا عوام نے اختیار کیا ہے۔ بلکہ تدبر کا بھی اہتمام چاہئے۔ کیونکہ اس ثواب کی تکمیل بھی جبھی ہوتی ہے کہ

اس پر عمل ہو اور عمل موقوف ہے۔ سمجھنے پر بواسطہ یا بلاواسطہ اس لئے میں شکایت کرتا ہوں کہ اس وقت عوام الناس اور علماء سب میں اس بات میں تفریط ہے کہ عوام نے تو محض حرف پڑھ لینا کافی سمجھا اور اہل علم نے محض لغت کی تحقیق کرلی۔ چنانچہ تحصیل تفسیر کے وقت محض الفاظ قرآن شریف کا حل ہوتا ہے۔

باقی قرآن شریف کی جو اصل غرض تھی جو اس آیت شریف میں مذکور ہے۔

کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡکَ مُبٰرَکٌ لِّيَدَّبَّرُوۡۤا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَکَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ

(بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اسکی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں)

یعنی سمجھنا اور تدبر کرنا کہ اصلی مقصود تنزیل سے یہی ہے جس کو لام سے ذکر کیا ہے۔ کسی کو اُس پر نظر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں کھلی کھلی باتیں ہیں۔ لیکن بعض اہلِ علم کو بھی نظر نہیں آتیں۔ چنانچہ اس آیت میں بھی ایک ضروری مسئلہ ہے۔ جس کی طرف التفات نہیں ہوتا اس وقت اُسی کو مختصراً بیان کرنا چاہتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔

عَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ۚ وَعَسٰۤى اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّـكُمۡ ۔

یعنی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بُرا سمجھو اور وہ تمہارے واسطے بہتر ہو۔ اسی طرح ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھا سمجھو اور وہ تمہارے لئے مُضر ہو۔ اور ممکن ہمارے اعتبار سے فرمایا یعنی تم اس بات کا احتمال رکھو۔ آگے فرماتے ہیں۔

وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۔ (اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم نہیں)

کہ اللہ تعالیٰ کو (ہر خیر و شر کا) علم ہے اور تم نہیں جانتے۔

عمومی مرض

اس ترجمے کے سننے سے معلوم ہوا ہوگا کہ یہ آیت ہماری ایک مرض کی اصلاح کر رہی ہے۔ جس کو ہم بہت ہی ہلکا سمجھتے ہیں۔ یعنی تمنی۔ ہماری نظر تو اس طرف جاتی۔ لیکن آیت بتلا رہی ہے کہ ہم جو یہ کہا کرتے ہیں کہ یوں نہ ہوتا تو اچھا ہوتا اور یوں ہوتا تو اچھا ہوتا۔ یہ سب ناپسندیدہ بات ہے اور یہاں سے غلطی کو ظاہر فرمارہے ہیں کہ تم کو کیا خبر ممکن ہے کہ جس کو تم نے مضر سمجھا ہے وہ واقع میں تمہارے لئے نافع ہو اور جس کو تم نے نافع سمجھا ہے وہ واقع میں مضر ہو تو یہ محض احتمال عقلی کے طور پر فرمایا تھا۔ آگے فرماتے ہیں۔

وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۔ یعنی شاید کسی کو یہ احتمال ہوتا کہ ممکن ہے۔ وہی نافع ہو، اس

لئے فرماتے ہیں کہ اللہ جانتا ہے یعنی جو شخص خدا کا قائل ہوگا۔ وہ صفت علم کا بھی قائل ہوگا۔ اور کمال اسکا یہ ہے کہ کوئی اس کے برابر علم میں نہ ہوتو اپنے علم کے اثبات سے استدلال کرتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ نے جو کہ واقعی نفع وضرر کو جانتے ہیں اس کو واقع فرمایا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ وہ حکیم بھی ہیں۔ تو ان کا واقع کرنا دلیل اس کی ہے کہ یہی بہتر تھا۔ تو دوسرا احتمال بالکل قطع ہوگیا۔ اور معلوم ہوا کہ تمہاری رائے غلط ہے۔ اگر اُس میں مصلحت ہوتی تو خدا تعالیٰ اُسی کو واقع فرماتے۔ غرض اس آیت شریف کے ترجمے سے یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو ہماری ایک غلطی پر تنبیہ فرمایا ہے۔

رائے زنی احکام میں

اب دو باتیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک یہ کہ آیا ہم میں یہ غلطی ہے یا نہیں۔ سو اس کا ہم میں ہونا تو اس قدر ظاہر ہے کہ شاید کوئی قلب اس سے خالی ہو اور یہ اس قدر بڑھا ہے کہ تکوینیات سے گزر کر تشریعیات تک اس کی نوبت پہنچی ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ احکام دو قسم کے ہیں، ایک احکام تشریعیہ جیسے نماز روزہ کا فرض ہونا۔ چوری غضب جھوٹ تفاخر ریا بخل کا حرام ہونا۔ دوسرے احکام تکوینیہ جس کو حوادث کہتے ہیں جیسے مرنا جینا قحط طاعون یا اور کوئی وباء۔ مال کا ضائع ہو جانا۔ آگ لگ جانا اور ان دونوں قسم کے امور کا صدور خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ تو ہم کو یہاں تک تمنی کا ہیضہ ہوا ہے کہ دونوں قسموں کے متعلق تمنائیں کرتے ہیں یعنی جس طرح یہ کہتے ہیں کہ فلانا اور جیتا تو اچھا ہوتا۔ اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ روزہ فرض نہ ہوتا۔ سود حرام نہ ہوتا تو خوب ہوتا۔ فرق اتنا ہے کہ جو علم دین پڑھے لکھے ہیں وہ احکام تشریعیہ میں ایسی بے باکی نہیں کرتے۔ اور جو آزاد و بے باک ہیں۔ وہ دونوں میں ایسی تجویزیں کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک نوجوان نے تو یہاں تک نوبت پہنچائی کہ نماز کے متعلق یہ رائے ظاہر کی اسلام میں اگر نماز نہ ہوتی تو اسلام کو خوب ترقی ہوتی۔ کیونکہ نماز سے اکثر لوگ گھبراتے ہیں۔ نعوذ باللہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو بھی رائے دیتے ہیں لیکن اول تو آپ چیز ہی کیا ہیں۔ دوسرے وہاں کثرت رائے پر کب عمل ہے کیا وہاں بھی سلطنت جمہوری ہے۔

سیاسی غلطی

میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ خود دنیا میں بھی سلطنت جمہوری کی شریعت میں کچھ اصل نہیں۔ جیسا آج کل اس سیاسی غلطی میں مبتلا ہیں کہ شریعت سے حکومت جمہوری کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اور علماء سے بھی اپنے خیال کی تائید کی درخواست کرتے ہیں کہ یہ بھی ہر نئی بات کو قرآن شریف سے ثابت کر دیں اور ایسے اہلِ علم کو روشن خیال سمجھا جاتا ہے۔

دیوبند کے ایک تعلیم یافتہ ندوہ میں گئے تو وہاں کے لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ روشن خیال معلوم ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ جس اصطلاح کے موافق آپ فرماتے ہیں۔ میں دُعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ مجھ کو اس روشن خیالی سے بچائے۔ آج کل تو روشن خیال کے یہ معنی ہیں کہ اس کو کفر اور اسلام دونوں مطابق نظر آئیں۔ غرض علماء سے یہ فرمائش ہوتی ہے کہ جو ہمارے منہ سے نکلتا جائے تم اُس کو شریعت سے ثابت کرتے چلے جاؤ۔ تو شریعت کو اپنی ہوائے نفسانی کے تابع کرنا چاہتے ہیں۔

اس پر ایک مثال یاد آئی ہے کہ ایک شخص تھا۔ اُس کی عادت تھی کہ جس مجلس میں بیٹھتا تھا۔ لغو باتیں دوراز قیاس کیا کرتا تھا۔ لوگ اس کو بناتے۔ آخر اس نے محض اس کام کے لئے ایک نوکر رکھا کہ جو کچھ ہماری زبان سے نکلا کرے تم اس کو صحیح بنادیا کرو۔ ایک مرتبہ کہنے لگا کہ آج ہم جنگل گئے تو ایک ہرن ملا۔ ہم نے جو گولی ماری تو وہ سم کو توڑ کر سر پھوڑ کر نکل گئی۔ لوگ سُن کر ہنسنے لگے۔ خادم نے عرض کیا کہ حضور بجا ارشاد ہے۔ وہ ہرن اس وقت کھر سے سر کھجلا رہا تھا۔ سو ہمارے روشن دماغ احباب علماء سے ایسا ہی کام لینا چاہتے ہیں۔ تو وہ یاد رکھیں کہ علماء کو اس نوکری کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی لغویات کو کون بناتا پھرے۔

اُن ہی میں سے ایک بحث یہ بھی ہے۔ سلطنت کے جمہوری و شخصی ہونے کی ابھی ہم کو اس میں کلام نہیں کہ یہ مسئلہ واقع میں صحیح ہے یا غلط۔ لیکن گفتگو یہ ہے کہ جو خیال ہے کہ جمہوری سلطنت شریعت ہی کی تعلیم ہے۔ اور صحابہ کرامؓ کی سلطنت بھی جمہوری ہی تھی یہ کہاں تک صحیح ہے۔ سو میں کہتا ہوں کہ بالکل غلط ہے۔ یہ لوگ دلیل میں۔

اَمْرُ هُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (تو نے ایک چیز کو یاد رکھا اور دوسری چیزیں غائب کردیں) کو پیش کرتے ہیں کہ دیکھئے مشورہ کا حکم ہے اور جمہوری سلطنت کی یہی حقیقت ہے کہ وہ مشورے سے ہوتی ہے لیکن ان متدلین کی وہ حالت ہے کہ

حافظت شیئًا و غابت عنک اَشْيَاءٌ

کہتے تو یہ ہیں کہ ہم بڑے فلسفی ہیں مگر حقیقت میں کچھ نہیں سمجھتے۔

شخصی حکومت

صاحبو! جمہوری سلطنت محض مشورہ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ جمہوری سلطنت میں مشورے کے خاص اصول بھی ہیں۔ اُن میں سے یہ بھی ہے کہ اگر اختلاف ہو تو کثرتِ رائے پر فیصلہ ہو اور بادشاہ اس کے خلاف ہرگز نہ کر سکے اور اگر بادشاہ سب کو جمع کر کے رائے لے۔ مگر سب کے خلاف اپنی رائے پر عمل کرے تو وہ سلطنت شخصی ہوگی۔ پس معلوم ہوا کہ محض مشورے سے سلطنت کا جمہوری ہونا لازم نہیں آتا۔ اب اس کو ثابت کیا جائے کہ صحابہ کرام کی سلطنت میں کبھی یہ بات ہوئی ہو کوئی

ایک ہی واقعہ بتلا دے کہ خلیفہ مشورہ دینے کے بعد مجبور کیا گیا ہو۔ واقع میں شریعت میں سلطنتِ شخصی ہی ثابت ہے۔ چنانچہ میں اسی آیت شریف وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (اور اُن سے (اہم) امور میں مشورہ کریں) سے سلطنت شخصی کو ثابت کرتا ہوں۔ اگر بظاہر یہ آیت شریف دونوں سے ساکت معلوم ہوتی ہے۔ تقریر اثبات یہ ہے کہ اسی سے آگے فرماتے ہیں۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ یہ جملہ صاف بتلا رہا ہے کہ شریعت میں سلطنت شخصی ہے کیونکہ مشورے کے بعد اِذَا عَزَمَ اَكْثَرُهُمْ یَا اِذَا عَزَمُوْا۔ نہیں فرمایا۔ بلکہ مدار کار محض آپ کے عزم پر رکھا کہ بعد مشورہ لینے کے جب آپ تنِ واحد کسی بات کا عزم فرمالیں خواہ وہ سب کے مشورے کے موافق ہو یا مخالف تو خدا پر توکل کر کے اس کو کر لیجئے۔ اب بتلائیے کہ اس آیت شریف سے سلطنتِ شخصی ثابت ہوئی یا جمہوری اور اس سے بھی واضح یہ مسئلہ ایک دوسری آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰى یَسْتَاْذِنُوْهُ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ۔

(بے شک مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کئی ایسے کام پر ہوتے ہیں جو بہت اہم اور جامع ہو اور اتفاقاً وہاں سے جانے کی ضرورت پڑتی ہے تو جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت نہ لیں نہیں جاتے جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لیتے ہیں وہی اللہ تعالیٰ پر اور اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں اور جب یہ لوگ ایسے موقع پر اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے آپ سے اجازت چاہیں تو ان میں سے جس کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت دے دیا کریں اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرے)

اس میں اول تو یہ حکم ہے کہ پوچھ کر جایا کریں پھر آگے فرماتے ہیں کہ جب وہ پوچھیں تو جس کو آپ چاہیں اجازت دیدیں۔ سو غور کیجئے کہ اِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ کے بعد فَاْذَنْ میں لِمَنْ شِئْتَ (جن کو چاہیں اجازت دیں) بھی فرماتے ہیں اور اِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ (جب اجازت مانگیں) سب کے اذن چاہنے کو بھی مشتمل ہے تو فرض کیجئے اگر سب کے سب اذن چاہنے لگیں تو ظاہر ہے کہ اس وقت سب کا اتفاق اعطائے اذن پر متحقق ہوگا۔ مگر اس وقت بھی یہی حکم ہے کہ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ کہ جس کو چاہو اجازت دو اور چاہو نہ دو۔ دیکھئے باوجود اتفاق کے مدار کار تنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ہی پر رکھا تو بتلائیے اس سے سلطنت جمہوری ثابت ہوئی یا شخصی۔

جوش اجتہاد

صاحبو! انسان کو چاہئے کہ وہ جس کام کا نہ ہو۔ اس میں دخل نہ دے۔ نصوص کا سمجھنا ہر ترجمہ دیکھنے والے کا کام نہیں ؎ نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(ہر وہ شخص جو آئینہ رکھتا ہے ضروری نہیں کہ وہ سکندری بھی جانتا ہو)

ایسے لوگوں کی بالکل وہ مثال ہے کہ کسی ہندو کے ہاتھ سونٹھ کی گرہ آگئی۔ وہ پنساری بن بیٹھا۔ ذخیرہ توکل یہ ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ دیکھ لیا۔ تو بس اس پر جوش اجتہاد۔ پھر ترجمہ بھی ایسا نور بھرا کہ جو ترجمہ سب سے زیادہ مقبول و مشہور ہے۔ اس کی یہ حالت ہے کہ لفظ نَسْتَبِقُ کا ترجمہ کیا ہے کہ کبڈی کھیلنے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے یا تو کبھی کبڈی کھیلی نہیں یا بھول گئے ہوں گے۔ استباق کبڈی کو کہتے ہی نہیں۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے دوڑنے لگے۔ سو اوّل تو یہ ترجمہ لغت کے خلاف دوسرے عقل کے بھی خلاف کیونکہ کبڈی کا میدان بہت کم ہوتا ہے۔ اُس میں کپڑوں کا محافظ پیش نظر رہتا ہے۔ تو اُس میں بھیڑیئے کے کھانے کا عذر کہاں چل سکتا ہے۔ بخلاف استباق کے صحیح معنے کے کہ اُس میں محافظ نظر سے غائب ہو جائے گا۔ غرض اس قسم کے تو تراجم پیش نظر رکھیں اور اس پر اجتہاد کریں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اجتہاد اب منقطع ہوگیا ہے۔ اِسی کو فقہاء نے بھی لکھ دیا ہے کہ بعد چوتھی صدی کے اجتہاد ختم ہوگیا اور جب علماء سے بھی اجتہاد منقطع ہوگیا۔ تو عوام الناس میں تو کہاں محتمل ہے۔

شریعت کی بیخ کنی

اصلی مضمون[1] یہ تھا کہ خدا کے ہاں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ تو اب آپ کو کیا منصب ہے کہ نماز میں رائے دیں۔ یہ تو نماز میں تھا۔ ایک صاحب[2] نے روزہ میں یہ رائے دی کہ روزہ اگر فروری میں ہوتا تو اچھا ہوتا کہ آسانی ہوتی۔ حالانکہ اس عقلمند نے یہ نہ سوچا کہ روزہ صرف اس کے لئے تو نہیں کہ اس کی آسانی دیکھ لیتے وہ تمام روئے زمین کے لئے ہے۔ کیا ساری دنیا میں فروری کے مہینے میں یہی حالت رہتی ہے جو کہ یہاں رہتی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مولوی رسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے رہتے ہیں ان کو واقعات کی خبر نہیں۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ یہ خود کون سے گنبد میں بیٹھے رہتے ہیں۔ کہ ان کو اتنا واقعہ معلوم نہیں کہ فروری میں مختلف اقالیم میں کیا حالت ہوتی ہے۔ اور اگر معلوم ہے تو اور بھی زیادہ افسوس کی بات ہے کہ باوجود اطلاع کے پھر ایسی بے ہودہ رائے دیتے ہیں۔

---

[1] احکام میں رائے دینے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

[2] روزے میں قمری مہینے کے معتبر ہونے کی حکمت اور شمسی مہینہ ہونے کی خرابی۔

فان کنت لا تدری فتلک مصیبة   وان کنت تدری فا لمصیبة اعظم
(اگر تو نہیں جانتا تو یہ خود ایک مصیبت ہے اور اگر جانتا ہے تو یہ مصیبت اس سے بڑھ کر ہے)

کیا خوبصورت تجویز ہے کہ صرف آپ اور آپ کے چند بھائی تو آرام میں رہیں اور ساری دنیا مصیبت میں رہے۔ بخلاف اس حالت موجودہ کے کہ رمضان المبارک کا قمری مہینہ ہو کہ ہر مقام پر اس میں کبھی سردی کبھی گرمی کبھی بڑا دن کبھی چھوٹا دن تو اس میں کبھی کسی اقلیم کی رعایت ہے اور کبھی کسی دوسری کی ہے۔ جس سے سب مساوی ہو گئے تو حکمت کی بات یہ ہے یا وہ ہے۔

علیٰ ہذا قربانی کے متعلق یہ رائے دی جاتی ہے کہ اس زمانے میں چونکہ روپیہ پیسہ نہیں تھا اور مواشی ان لوگوں کے پاس بکثرت ہوتے تھے۔ اس لئے صدقہ کا یہ طریقہ مقرر کیا گیا تھا کہ ذبح کرو اور تقسیم کرو اور اب چونکہ روپیہ بکثرت موجود ہے۔ اور نقد سے صدقہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے اب اس وحشی طاعت کو چھوڑ دینا چاہئے (نعوذ باللہ منہ) ایک صاحب لندن سے بیٹھے ہوئے اپنے دستِ مبارک سے یہ رائے خط میں لکھ رہے ہیں۔ ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ آپ کے پاس اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو یاد رکھیں کہ

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (خیالی باتیں کسی درجہ میں بھی حق کے مقابلہ میں نہیں ہو سکتیں) آگے ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اس رائے کے خلاف پر خود دلیل قائم ہے۔ یہ دیکھئے کہ قربانی میں طاعت مقصودہ اِراقت دم ہے یا مساکین کو کھلانا۔ سو یہ امر ثابت ہے کہ اگر کوئی شخص ذبح کر کے سارا گوشت خود کھا جائے اور ایک بوٹی بھی کسی کو نہ دے تب بھی اس کو پورا ثواب قربانی کا ملے گا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ مقصود اراقتِ دم ہے نہ کہ کھلانا جیسے اس ذی رائے نے دعویٰ کیا۔

رہی یہ بات کہ اراقتِ دم کیوں مقصود ہوا۔ سو اس کی لم کی اطلاع ہم کو ہونا ضروری نہیں نہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم جانتے ہیں پھر یہ کہ اگر نفع ہی پہنچانا ہوتا تو زندہ بھی تو دیا جا سکتا تھا تو جس زمانے میں یہ حکم ہوا تھا۔ اس وقت مسلم دینے کی کیوں اجازت نہ ہوئی بلکہ مسلم کی قیمت تو زیادہ اٹھتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ محض اراقتِ دم ہی مقصود ہے۔ غرض اسی طرح ہر چیز کے درمیان میں کم و بیش تمنی کا استعمال کیا جاتا ہے۔

چنانچہ سود میں بھی اول تو یہی تمنا ہوئی کہ کاش سود حلال ہوتا۔ مگر اب اس پر تو قدرت نہیں رہی۔ اس لئے دوسری تمنی یہ ہوئی کہ کاش علماء کچھ تاویل وغیرہ کر دیں۔ چنانچہ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو خود ہی اس میں اصلاح شروع کر دی۔ میں نے ایک مطبوعہ رسالے میں خود دیکھا ہے ایک صاحب نے فرمایا ہے کہ سود حلال ہے اور یہ جو قرآن شریف میں ربوا کا حرام ہونا آیا ہے یہ لفظ ورباء بضمِ الرائے ہے جو ربودن سے مشتق ہے یعنی غصب اور لوٹ یہ حرام ہے نہ

کہ سود اور مولویوں نے اپنی رائے سے اعراب لگا دیئے۔ خدائے تعالیٰ جزائے خیر دے۔ صحابہ کرام اور علماء سلف کو کہ انہوں نے رسمِ خط کو باقی و محفوظ رکھنے کو واجب فرمایا پس اگر یہ لفظ ربودن سے ہوتا تو رسم خط میں کیوں ہوتا۔ فارسی لفظ ہے اور فارسی میں بھی رُبا اس معنی مصدری میں آتا ہی نہیں تو دیکھئے کہاں تک ان لوگوں کی نوبت پہنچ گئی اور اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں کہ احکام فرعیہ بلکہ اصولیہ میں اوّل ایک تمنا تغیر و تبدیل کی تجویزیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں رُڑکی میں تھا کہ میں نے سُنا کہ آج یہاں چند عقلاء میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ نکاح کی رسم کو اٹھا دینا چاہئے مثل دیگر متاع بازاری کے یا مثل جانوروں کے جس سے جس کی موافقت ہو جائے اُس میں اجتماع رہے۔ پھر رضامندی نہ رہے۔ جُدا ہو کر دوسرے سے رضامند ہو جائے۔

بلکہ ایک صاحب کا تو یہاں تک مضمون اخبار میں لکھا دیکھا ہے کہ خود اسلام کی بھی ضرورت نہیں۔ اس اسلام وغیرہ اسلام کے اختلاف سے باہم جنگ وجدل ہوتا ہے اور یہ تجویز کیا کہ ساری دنیا مل کر ایک نئے مذہب کو اختیار کرے۔ جس کا نام مذہب توحید ہو، باقی رسالت وغیرہ۔ سو جس کا جی چاہے مانے۔ جس کا جی چاہے نہ مانے اور ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں متحد المذہب سمجھے جائیں۔ اللہ اکبر کہاں تک یہ لوگ پہنچے ہیں۔ اور اس قسم کی رائیں بوجہ خبث کے اس قابل بھی نہیں ہیں کہ اُن کو نقل کیا جائے۔ ان میں ایک قسم کی ظلمت ہے۔ اسی واسطے میں اس میں تطویل کلام نہیں کرنا چاہتا۔ مگر یہ بتلاتا ہوں۔ کہ احکام شرعیہ میں یہ گڑ بڑ لوگوں نے مچا رکھی ہے۔ گویا در پردہ شریعت کی بیخ کنی کے درپے ہیں۔

امور تکوینیہ کی لب کشائی

اب دوسرے احکام تکوینیہ رہ گئے اور اس وقت انہیں کا بیان کرنا زیادہ مقصود بھی تھا۔ سو ان کے متعلق تمنی و تجویزیں کرنے میں دیندار اور دُنیا دار سبھی مبتلا ہیں۔ چنانچہ میں واقعات یاد دلاتا ہوں جس سے میرے اس دعوے کی تصدیق ہو جائے گی۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص مر جائے اس وقت عموماً خدا تعالیٰ کو رائے دی جاتی ہے جس کی تعیین ابھی بتلاؤں گا۔ لیکن چونکہ مقصود رائے دینا نہیں ہوتا۔ اس لئے میں اس کو کفر تو نہ کہوں گا تاہم بہت سخت ہونے کو یہ آیت بتلا رہی ہے۔

اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ (یا کیا تم اسے اطلاع اور خبر دینے والے ہو کہ وہ زمین میں سے یہ بات نہیں جانتا) اور وہ رائے دینا یہ ہے کہ جب کوئی مر جاتا ہے تو ایک صاحب کہتے ہیں کہ اگر دس برس اور زندہ رہ جاتا تو بچوں کی پال ہو جاتی۔ کوئی کہتا ہے ابھی کیا مرنے کی عمر تھی ایک کہتا ہے پس ماندوں کا کیا حال ہوگا۔ اللہ اکبر واللہ العظیم۔

اگر کبھی مخلا بالطبع ہو کر غور کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ان کلمات کا کس کو سُنانا مقصود ہے۔ اگر مخلوق کو سُنانا ہے تو محض بے کار ہے کیونکہ اُن کے سُنانے سے کیا کام چلے گا جو بات ان کے اختیار میں ہو وہ اُن کو سُناؤ۔ باقی مارنا جلانا یہ تو خدا تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ اس لئے مخلوق تو مخاطب نہیں۔ پھر سوائے خالق کے اور کون مخاطب ہے۔ کیونکہ یہ سب اُن کی ہی قدرت میں ہے تو گویا یہ شخص خدا تعالیٰ کو رائے دیتا ہے کہ اس کا مرنا تو کچھ نامناسب سی بات ہوئی۔ اب غور کیجئے کہ اس گستاخی کا کیا درجہ ہے۔

علیٰ ہذا بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ابھی تو اس کی عمر مرنے کو نہ تھی۔ صاحبو! اگر اس کی تاویل نہ کی جائے تو دیکھئے کہ آیت قرآنی کے کس قدر خلاف ہے۔ فرماتے ہیں۔

اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۔

(جب ان کی موت کا وقت آتا ہے تو وہ ایک گھڑی کی دیر کر سکتے ہیں نہ جلدی کر سکتے ہیں)

اور اگر تاویل کی جائے تو وہ تاویل یہی ہو سکتی ہے۔ کہ اس عمر میں مرنا بے محل ہوا تو گویا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے نامناسب کام کیا۔ نعوذ باللہ۔ یہ وہی اعتراض ہے جو کہ شیطان نے کیا تھا۔ اور اس کی بدولت کافر ہوا۔

کیونکہ شیطان صرف سجدہ نہ کرنے سے کافر نہیں ہوا۔ بلکہ اُس سجدہ کو خلاف حکمت بتلانے سے جیسا اُس کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے۔

ءَ اَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا (کیا میں اس کو سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا) جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں ان سے افضل ہوں اور افضل کو مفضول کی اطاعت خلاف حکمت ہے۔ تو یہی حاصل ہوا اس شخص کے قول کا پس اگر یہی معنیٰ ہیں تو یہ بعینہ وہی ہوا جو شیطان نے کہا تھا۔

غلط اعتقاد

اور بعض لوگ اس سب سے بڑھ کر یہ غضب کرتے ہیں۔ ایک نے تو بعنوان بالا افسوس کا اظہار کیا۔ دوسرے صاحب اس کی تائید میں گلفشانی کرتے ہیں کہ بھائی اللہ کی ذات بڑی بے پرواہ ہے ذرا سمجھ سے کام لیا جائے تو اس موقع پر بے پرواہ کہنے کے معنی بجز اس کے کیا ہو سکتے ہیں کہ وہ موقع بے موقع کو نہیں دیکھتے۔ غایت بے پروائی کے سبب جو چاہتے ہیں کر ڈالتے ہیں۔ تو اس حساب سے تو خدا تعالیٰ نعوذ باللہ! گویا اَن نیاؤ نگر کا راجہ ہے۔ اَن نیاؤ کے معنے بے انصافی کے ہیں۔ اَن حرف نفی ہے۔ اور نیاؤ انصاف کو کہتے ہیں یعنی شہر نا انصافی کا حاکم۔

ایک مرتبہ ایک گرو اور ایک چیلہ کا وہاں سے گزر ہوا۔ نیا شہر تھا۔ حالات دریافت کیا بھاؤ بھی

مختلف اجناس کا پوچھا تو سب سولہ سیر۔ گرو نے کہا یہاں ادنیٰ اعلیٰ سب برابر ہیں۔ یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ چیلہ نے کہا خوب گھی شکر کھائیں گے۔ موٹے ہوں گے۔ غرض وہاں رہ پڑے۔ ایک روز بطریق سیر پھرتے پھرتے راجہ کی کچہری کی طرف جا نکلے۔ دیکھا ایک مجمع ہے اور ایک مقدمہ پیش ہے۔ مقدمہ یہ ہے کہ ایک چور ایک مہاجن پر دعویٰ کرتا ہے کہ مَیں اور میرا رفیق جس کی لاش سامنے پڑی تھی۔ اس کے گھر چوری کرنے گئے نقب دیا۔ نقب کے اندر میرا رفیق گھستا تھا کہ دیوار اوپر سے آرہی۔ اب مجھ کو خون کا بدلہ ملنا چاہئے۔ راجہ صاحب نے فرمایا کیوں کہا ایسی دیوار کیوں بنائی تھی ان سے کہا کہ یہ تو معمار کی خطا ہے۔ معمار بُلایا گیا اُس نے مزدور کا نام لے دیا۔ جس نے ایسا خراب گارا دیا۔ مزدور بلایا گیا۔ اس نے کہا سقہ نے زیادہ پانی چھوڑ دیا تھا وہ بلایا گیا۔ اُس نے کہا سرکاری ہاتھی بھاگا ہوا آتا تھا۔ ڈر کر مشک کا منہ زیادہ کھل گیا۔ فیلبان کو بُلایا۔ اس نے کہا ایک عورت پازیب پہنے سامنے سے گزری، ہاتھی بھڑک گیا۔ عورت حاضر کی گئی۔ اُس نے کہا یہ سُنار کی خطا ہے۔ اُس نے باجا ڈال دیا۔ سُنار بُلایا گیا۔ وہ کوئی بات نہ بنا سکا۔ آخر اُس کے لئے پھانسی کا حکم ہے۔ جب پھانسی پر چڑھانے لگے۔ اطلاع کی گئی کہ سُنار دبلا ہے اور پھانسی کا حلقہ فراخ ہے۔ حکم ہوا کہ اچھا کسی موٹے کو پکڑ کر پھانسی دیدو۔ اتنے میں موٹے میاں چیلے ملے۔ جنہوں نے خوب گھی شکر کھایا تھا۔ یہ پکڑے گئے۔ اب تو بڑے گھبرائے اور گرو سے کہا کسی طرح بچاؤ تو یہاں سے بھاگیں۔ گرو کو رحم آیا اور یہ ترکیب کی کہ افسران فوجداری سے التجا کرنا شروع کی کہ مجھ کو پھانسی دیدو۔ اس پر سب کو تعجب ہوا۔ راجہ کو خبر پہنچائی۔ اُن سے وجہ پوچھی تو گرو نے کہا کہ یہ ساعت ایسی ہے کہ اس میں جس کو پھانسی ہو وہ سیدھا بیکنٹھ میں جاوے۔ راجہ نے کہا تو بس مجھ کو پھانسی دیدو۔ آخر اس راجہ سے اس طرح زمین پاک ہوئی۔ یہ ایک قصہ ہے ان نیاؤ نگر کا کیا ہمارے بھائی بند خدا تعالیٰ کے ساتھ بھی نعوذ باللہ ایسا ہی اعتقاد رکھتے ہیں۔ کہ اُن کے کام نعوذ باللہ بے محل ہوتے ہیں۔ مثلاً ابھی موقع نہ تھا اور مار دیا۔ غرض یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی عظمت قلوب میں نہیں جو منہ میں آیا بک دیا۔

صاحبو! وہ بے پرواہ ہے مگر اس کے بے پرواہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی اس کی عبادت نہ کرے تو اس کا کوئی ضرر نہیں اور اگر کرے تو اس کا کوئی نفع نہیں تو حاصل اس کا یہ ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور یہ معنی ہر گز نہیں کہ نعوذ باللہ وہ بے رحم ہے۔ اور مصلحت نہیں دیکھتا۔ بے سمجھے کر بیٹھتا ہے۔ (نعوذ باللہ منہ)

صاحبو! یہ عقیدہ نہایت گمراہی کا ہے۔ اور دلیل اس معنی کی یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے۔
مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (جو شخص کوششیں کرتا

ہے وہ اپنے لئے ہی سعی وکوششیں کرتا ہے اس لئے کہ اللہ عالی دنیا والوں کا محتاج نہیں)

دوسری جگہ فرماتے ہیں ۔ اِنْ تَکْفُرُوْ افَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنْکُمْ (اگر ناشکری کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے بے پرواہ ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ غنی ہے اور تم سب فقیر ہو)

تو خدا تعالیٰ نے اپنے غنی ہونے کو طاعت اور معصیت کے ساتھ ذکر فرمایا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کو نہ کسی کی طاعت کی ضرورت ہے اور نہ معصیت سے اس کو ضرر ہے کیونکہ اس کی سلطنت کسی کی اطاعت پر موقوف نہیں ۔ ؎

کہ مُلکش قدیمست و ذاتش غنی

(اس کی سلطنت ہمیشہ سے ہے اور اس کی ذات کسی کی محتاج نہیں)

اور ارشاد ہے ۔ وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ (اور اللہ تعالیٰ غنی ہیں اور تم سب فقیر ہو)

یعنی خدا تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں ہے اور تم اُس کے محتاج ہو ۔ تو بے پرواہ کے معنی بے انتظام کے بھی ہیں اور غیر محتاج کے بھی ۔ لوگوں نے ظلم کیا کہ خدا تعالیٰ کو معنیٔ اول کے اعتبار سے بے پرواہ کہنے لگے ۔ جیسا کہ قرینہ مقام استعمال سے معلوم ہوتا ہے ۔ غرض ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعات تکوینیہ میں بھی تجویزیں لگاتے ہیں اور یہ مرض سخت عام ہو گیا ہے ۔ اس سے توبہ کرنا چاہئے ۔

تعلیم ادب

اور ہم بے وقوفوں کے ساتھ تو ان حماقتوں پر حلم کا برتاؤ کیا جاتا ہے ۔ باقی جن کو بڑی شان ہے ۔ ان کے کلام میں تو اگر ذرا سا شبہ بھی ہو جائے تو اُن کی گوشمالی کر دی جاتی ہے ۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک بزرگ نے کہا کہ آج کیا موقع پر بارش ہوئی ہے ۔ فوراً عتاب ہوا کہ او بے ادب بے موقع کب ہوئی تھی جو موقع کے ہونے میں آج کی تخصیص کرتا ہے ۔ سُن کر تھرّا گئے ۔ تو دیکھئے حالانکہ یہ مدح تھی مگر عتاب ہو گیا ۔ اگر چہ بالتزام بعید سہی ۔

صاحبو! وہ خدا ہے کوئی برابر کا دوست نہیں وہ سلطان السلاطین ہے مگر خدا جانے کس نے مشہور کر دیا ہے کہ با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار اگر اس کے یہی معنی ہیں جو کہ متبادر ہیں ۔ تب تو محض مہمل بات ہے اور اگر اس میں کوئی مناسب تاویل کی جائے تو خیر اور وہ تاویل یہ ہے کہ غلبۂ حال میں کچھ کلمات خدا کے معاملے میں نکل جائیں تو وہ معاف ہیں ۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہرگز ایسا نہ ہونا چاہئے اور اگر تاویل نہ کی جائے تو سمجھ لیا جائے کہ ؎

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد بلکہ آتش درہمہ آفاق زد

(بے ادب آدمی کی برائی سے تنہا خود اس کو نقصان نہیں ہوتا بلکہ اسکی آگ ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے)

بعض لوگ کہ ہم کو تو کہیں بھی آگ لگی نظر نہیں آتی تو اس کے جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ ۔

آتشے گرتا مدت ایں دور چیست   جاں سیہ گشت و رواں مردود چیست

(آگ تجھ تک نہیں پہنچتی ہے تو یہ دھواں کہاں سے آ گیا بدن تک سیاہ ہو گیا بال تک جل گئے یہ سب آ فر کیوں ہے)

پس مقامِ ادب ہے احتیاط سخت لازم ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو اس قسم کے کلمات کہتے ہیں واقعہ میں رائے لگاتے ہیں۔ تو خدا تعالیٰ نے اس آیت میں ان سب کی جڑ کاٹ دی۔

اور لفظ شیئًا اس آیت میں عام ہے امور تشریعیہ اور امور تکوینیہ سب کو کیونکہ اس سے اُوپر ارشاد ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ (تم پر جہاد فرض کیا گیا اور تم اسے ناپسند کرتے ہو)

هُوَ کی ضمیر یا تو قتال کی طرف سے راجع ہے جو کہ امرِ تکوین ہے یا کتابتِ قتال کی طرف جو کہ امر تشریعی ہے اور یا ترجیح بلا مرجح سے بچنے کے لئے عام کہا جائے۔ دونوں کو اس طرح کہ مرجع قتال ہو۔ باعتبار وجود تشریعی اور تکوینی کے اور بہتر یہی ہے کہ عام کہا جائے اور معنی عام کی تعلیل میں اس جملہ وَعَسٰی الخ کو کہا جائے۔

مصلحت عام

اب اس کی اور کثیر الوقوع مثالیں عرض کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ مثلاً جب تک پھل نہ آ جائے بہار کا بیچنا حرام ہے۔ بہت لوگ اس کی تمنا کرتے ہیں کہ یہ جائز ہوتا تو اچھا ہوتا تا کہ مصلحت حاصل ہوتی۔ لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ یہ ممنوع ہو۔ چنانچہ بعض اوقات جو پھل نہیں آتا تو خریداروں کو کس قدر خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔

باقی اگر شبہ ہو کہ اس میں خریدار کی مصلحت محفوظ رہی۔ مگر بائع کی مصلحت تو جاتی رہی تو اُس کا جواب یہ ہے کہ منفعتِ عام مقدم ہوتی ہے۔ منفعتِ خاص پر اور اسی طرح مضرتِ عام کا بمقابلہ مضرتِ خاص کے زیادہ لحاظ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر سلطنت میں اس پر نظر کی جاتی ہے۔ دیکھئے بعض مرتبہ حکام کی طرف سے اَمرود وغیرہ فوا کہ کھانے کی ممانعت ہو جاتی ہے اور اُس کی فروخت سے بھی روک دیا جاتا ہے۔ حالانکہ فروخت کرنے میں بائع کی مصلحت ہے۔ مگر چونکہ پچاس کا نقصان ہے اور فروخت نہ کرنے میں ان پچاس کی مصلحت تھی۔ اس لئے یہاں مصلحت خاص کی

کچھ پرواہ نہیں کی گئی۔ اور پھر اس تجویز کو کوئی خلافِ عقل نہیں کہتا۔ پس اسی طرح یہ جو حکم ہوا کہ بہار قبل پھلنے کے نہ بیچو اگر فرضاً اس میں کسی ایک کا نقصان بھی ہو تو ہو عام مضرت کا تو انسداد ہو گیا۔

اور اول تو مضرت خاص بھی یقینی نہیں بلکہ پھل آنے کے بعد زیادہ دام ملنے کی اُمید ہے۔ اور اگر کوئی کہے کہ دس برس سے تو مجھ کو نقصان کا تجربہ ہو رہا ہے تو خیر اخیر بات یہی ہے کہ بہت سے بہت ایک ہی کا تو نقصان ہوا لیکن اور خریداروں کو تو بچا لیا کہ اگر پھل کم آتا تو اُن کا کتنا نقصان ہوتا تو اب ایک کی مصلحت کو دیکھا جائے یا پچاس کی مصلحت کو۔

اور اگر اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو خود صورتِ بیع اُس کو ناجائز بتلا رہی ہے کیونکہ معدوم کی بیع خود عقلاً ناجائز ہے۔ خدا جانے ان مواقع پر عقل کہاں چلی جاتی ہے اور اگر بیع کو بدوں وجود مبیع کے جائز رکھتے ہیں تو پھل آنے کی مدت تک اکل کو بھی بلا وجود ماکول کے جائز رکھیں اور یوں ہی بیٹھے ہوئے مُنہ چلایا کریں۔ اور نُور سے پیٹ بھر لیا کریں۔ جو شخص بغیر ماکول کے فعلِ اکل واقع کر کے دکھلا دے گا۔ میں اس کو بیع بلا مبیع کی اجازت دے دوں گا۔ غرض عقل بھی اس کو حرام ہی کہتی ہے تو اگر کوئی مصلحت بھی نہ ہو تب بھی یہ واجب الاحتراز ہے کیونکہ محرماتِ عقلیہ سے ہے۔

اب ایک عذر بارد یہ ہے کہ صاحب اس مدت تک کون انتظار کرے کیونکہ اگر بڑھنے تک انتظار کریں تو پھر باغوں کی خرید ہی ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ خریدار اس قدر نہیں ٹھہرتے۔ اس کا جواب میں صرف یہ دیتا ہوں کہ اگر گورنمنٹ کا یہی قانون ہو جائے جواب شریعت کا ہے تو اس وقت کیا کرو گے۔ اور اگر اس پر بھی سمجھ میں نہ آئے تو میں یہ پڑھوں گا۔

فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ (اس کے بعد کونسی بات پر ایمان لاؤ گے) تو گویا خدا کے حکم کی وہ وقعت بھی نہیں جو گورنمنٹ کے حکم کی ہے۔ صاحبو! صرف دنیا ہی کمانا تو مقصود نہیں۔ دنیا کماؤ۔ مگر خدا کو راضی رکھ کر اور اس کی فکر نہیں ہے تو پھر حکام کو راضی رکھنے کی بھی فکر چھوڑ دو۔ اور ڈکیتی بھی شروع کر دو۔ افسوس حکام کی ناراضی کی تو اتنی فکر اور خدا کی ناراضی کی پرواہ بھی نہ ہو کیا خدا تعالیٰ حاکم نہیں ہے۔

ان مضامین کو سُن کر بعض لوگ کہتے ہیں کہ شریعت نے آمدنی کے بہت سے صیغے بند کر دیئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ گورنمنٹ کے قوانین بھی معقول ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ اُن کو تو معقول ہی کہو گے۔ تو اُن ہی قوانین میں ایک قانون یہ بھی ہے کہ ڈکیتی ناجائز ہے۔ دیکھئے کتنا بڑا صیغہ تھا۔ آمدنی کا اور اس کو حرام کر دیا اگر کہیئے کہ اس سے مصلحت عام میں خلل ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو جُرم قرار دیدیا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ اسی طرح ممنوعات شرعیہ کے ارتکاب سے بھی مصلحت عام میں خلل ہوتا ہے۔ جس کا کسی قدر اوپر بیان بھی کیا گیا ہے۔

مثالِ حکم تشریعی

صاحبو! اصل بات یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی قلب میں وُقعت نہیں ورنہ اگر وقعت ہوتو خود بخود مصلحتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ پس مصالح احکام واسرارِ الٰہیہ کو اگر دریافت کرنا چاہتے ہو تو اُن کی وقعت دل میں رکھو اور ساتھ ساتھ عمل بھی شروع کرو اور عمل میں خلوص پیدا کرو اس کا اثر یہ ہوگا کہ حسب استعداد خود بخود اسرار منکشف ہوں گے اور اگر نہ بھی منکشف ہوں تو یہ تو معلوم ہے کہ خدا کا حکم ہے وجوب عمل کے لئے یہی کافی ہے۔ دیکھئے اگر ہم نوکر سے کہیں کہ یہ چارپائی فلاں جگہ سے اُٹھا کر فلاں جگہ رکھ دو تو اُس کو مصلحت دریافت کرنے کی اجازت نہیں اور اگر وہ پوچھے بھی کہ حضور وہاں آدمی ہی کہاں سے ہے جس کے لئے چارپائی بھیجی جاتی ہے تو کہیں گے کہ احمق اول تو تو مصلحت پوچھنے والا کون ہوتا ہے۔ پھر کیا مصلحت اس میں منحصر ہے کیا چارپائی بھیجنا اسی لئے ہوتا ہے کہ وہاں آدمی ہوں بلکہ کبھی یہاں کی جگہ کا خالی کرنا بھی مقصود ہوتا ہے تو کیا خدا تعالیٰ کو اتنے جواب کا بھی استحقاق نہیں اور سمجھو کہ خدا کے علم کے ساتھ آپ کے علم کو اتنی بھی نسبت نہیں جو بچے کے علم کو آپ کے علم کے ساتھ ہے۔ کیونکہ ایک نسبت متناہی کی متناہی کے ساتھ ہے دوسرے متناہی کی غیر متناہی کے ساتھ اور اس پر بھی باوجود یہ کہ بچہ نشتر سے ڈرتا ہے اور نشتر کو اپنے لئے تجویز نہیں کرتا۔ لیکن آپ اُس کی اِس تجویز کی ذرا پرواہ نہیں کرتے اور ضرورت کے وقت اس کے نشتر لگا دیتے ہیں صرف اسی لئے کہ اُس کے علم کو آپ کے علم سے کوئی نسبت نہیں۔ پس اسی طرح تمہارا علم خدا تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تو پھر وہ تمہاری تجویزوں کی کیوں پرواہ کریں اسی کو فرماتے ہیں۔ عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (ممکن ہے کہ تم کسی بات کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہے) یہ مثال تو ہے حکم تشریعی کی۔

مثالِ حکم تکوینی

اب احکامِ تکوینیہ کی مثال لیجئے کہ بعض لوگ ہمیشہ بیمار رہتے ہیں اور اس کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں کبھی تو اجر ملتا ہے دوسرے یہ کہ بیماری سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ بیماری سے اکثر اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ عجز وانکساری و پستی نیستی یہ سب بیماری کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح امنگیں قطع ہو جاتی ہیں تو ایسی حالت کا رہنا جس میں یہ مصالح ہوں۔ واقع میں بہت بہت بڑی رحمت ہے۔ امنگوں کے قطع کرنے کا مطلوب ہونا ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے۔

كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْل

(دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو گویا تم مسافر ہو بلکہ اس طرح کہ راستہ طے کر رہے ہو)

دوسرے ممکن ہے کہ تندرستی میں کچھ گناہ ہو جائے۔ بیماری میں اس سے بچ گیا۔ جیسے حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچے کو قتل کر دیا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت غصہ آیا تھا آخر حضرت خضر علیہ السلام نے اُس میں یہی حکمت بیان فرمائی کہ

اَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَا اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا

(وہ لڑکا جو تھا اس کے ماں باپ مسلمان تھے تو ہم اسی بات سے ڈرتے کہ کہیں یہ لڑکا اپنے ماں باپ کو کفر اور سرکشی میں مبتلا نہ کر دے)

تو سب کے حق میں یہی رحمت ہوا کہ وہ مر گیا اُس کے لئے تو اس واسطے کہ بچپن میں مرا بقول اکثر علماء ناجی ہوا اور ماں باپ کے لئے اس واسطے کہ اگر وہ زندہ رہتا اور کُفر کرتا تو اُن پر بھی اثر پڑتا وہ بھی بچے۔ مولاناؒ نے اسی کو فرمایا ہے ؎

آں پسر را کش خضرؑ ببرید خلق | سر آنرا درنیابد ہیچ خلق

(اس لڑکے کو حضرت خضر علیہ السلام نے مار ڈالا اور اسکا گلا کاٹ دیا۔ اسکے بھید کو مخلوق نہیں پہنچ سکتی)

اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی بہرا اپنے بہرے پن پر افسوس کرے اور یہ تمنا کرے کہ مجھ میں سننے کی قوت ہوتی تو کیا اچھا ہوتا۔ لیکن اُس کو کیا خبر ہے کہ اس وقت کیا حالت ہوتی۔ ممکن ہے کہ وہ گانا بجانا سُننے میں مشغول ہو جاتا۔ غیبت سُنا کرتا۔ تو اُس کے لئے کانوں کا نہ ہونا ہی خیر ہو گیا۔ علیٰ ہذا آنکھوں کی بیماری کہ اُس میں بھی ممکن ہے کہ آنکھیں ہونے کی صورت میں یہ بہت زیادہ گناہوں میں مبتلا ہو جاتا۔ شیخؒ نے خوب فرمایا ؎

آنکس کہ تونگرت نمی گرداند | او مصلحت تو بہتر داند

(جس ذات نے تجھ کو مالدار نہیں بنایا وہ تیری مصلحت کو بہتر جانتا ہے)

علیٰ ہذا ہر چیز میں اسی قسم کی مصالح ہیں پس ضرور ہے کہ یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ حکیم ہیں اور بڑے رحیم بھی ہیں۔ اس لئے وہ جو کچھ مناسب ہوگا وہی کریں گے۔ حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کا ایک مُرید تھا۔ اُس کو یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک روز جو سویا تو اُس کو احتلام ہو گیا۔ فوراً اُٹھ کر غسل کیا۔ اور سویا تو پھر احتلام ہوا۔ غرض ایک شب میں ستر ۷۰ بار احتلام ہوا اور ہر بار ایک نئی اجنبیہ عورت کو دیکھتا تھا۔ اُس کو خیال ہوا کہ شیطان کے اِس قدر تسلط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید میں مردود ہو گیا۔ حضرت سیدنا عبدالقادر کی خدمت میں نہایت مغموم حاضر ہوا۔ آپ نے تبسم فرما کر ارشاد فرمایا کہ خُدا کا شکر کرو کہ مجھ کو یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ تمہاری قسمت میں ۷۰ اجنبیہ عورتوں سے زنا کرنا لکھا ہے۔ میں نے خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ اُس کو اس سے بچائیے۔ خدا تعالیٰ نے میری دعا کو قبول فرمایا۔ اور اُس کو بیداری سے خواب میں منتقل فرمایا کہ تقدیر ہی پوری ہوگئی۔ اور تم گناہ سے محفوظ رہے اور یہاں تقلید کے اس طرح

بدلنے کے متعلق ایک مسئلہ بھی ہے مگر مجلسِ عام میں اُس کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں کہ شاید سمجھ[1] میں نہ آئے تو دیکھئے واقع میں تو یہ حالت رحمت تھی جو حضرت پر منکشف ہوگئی اور اس کے نزدیک عذاب تھا۔

خودرائی

ہمارے حضرتؒ کے پاس ایک شخص آیا اور آ کر یہ عرض کیا کہ میں بیمار ہوگیا تھا۔ اتنی مدت تک مجھ کو حرم کی نماز نصیب نہیں ہوئی۔ حضرتؒ نے اپنے خواص سے فرمایا کہ عارف ان باتوں سے مغموم نہیں ہوتا۔ کیونکہ مقصود تو حق تعالیٰ کا قرب ہے۔ اور جس طرح حالت اختیار میں حرم کی نماز قرب کا ایک طریق ہے اسی طرح قُرب کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ بیمار ہو جائیں اور بیماری کا اجر ملے اور بحسب حدیث اس کے ساتھ ہی نماز کا بھی وہی اجر ملے جو تندرستی کی حالت میں حاضری حرم سے ملتا۔ اس کے بعد فرمایا کہ بندہ کو مولیٰ پر فرمائش کرنے کا حق نہیں کہ مجھ کو فلاں طریق سے قرب عنایت ہو۔ دونوں راستے خدا تک پہنچنے کے ہیں جس طریق سے چاہے پہنچائے۔ بندے کو کیا حق ہے کہ ایک طریق کو تجویز کرے۔ خوب کہا ہے ؎

دُردو صاف ترا حکم نیست دم درکش — کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطافست

(تجھے یہ نہ سوچنا چاہئے کہ شراب میلی ہے یا صاف چاہیے ہمارے ساقی نے جو کچھ ہم کو دیا ہے وہی عین مصلحت ہے) اور ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مُزد مکن — کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تو فقیروں کی طرح مزدی کی شرط لگا کر عبادت مت کر۔ جو آقا ہے وہ خود اپنے غلاموں کی پرورش کے طریقے جانتے ہیں)

فکر خود و رائی خود در عالم رندی نیست — کفر ست دریں مذہب خود بینی و خودرائی

(عاشقی کے معاملہ میں اپنی فکر کرنا یا اپنی رائے پر چلنا درست نہیں۔ عشق کے مذہب میں خود کو کچھ سمجھنا اور اپنی رائے پر چلنا کفر کے برابر ہے) پس جس طرف سرکار لے جائیں بالکل خیر ہے ؎

درطریقت ہر چہ پیش سالک آید خیراوست — برصراطِ مستقیم ایدل کسی گمراہ نیست

(درویشی کے راستہ میں درویش کے سامنے جو مصیبت بھی آ جائے اس کو بہتر ہی سمجھے۔ اے دل صراط مستقیم میں کوئی شخص بھی گمراہ نہیں ،دا)

غیر اختیاری میں امور رحمت

لیکن آید کہا ہے آرد نہیں کہا یعنی ایک تو آید ہوتا ہے اور وہ غیر اختیاری امور میں وہ سب محمود ہیں اور ایک آرد اور وہ امور اختیاریہ ہیں اُن میں سے بعضے مذموم بھی ہیں۔ اس شعر میں اُس کا ذکر نہیں اور اس سے ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہوگیا۔ یعنی مثلاً اگر کوئی شخص کہنے لگتا کہ ہم سُود لیتے ہیں اور یہ بھی ہر چہ پیش آید میں داخل ہے تو اس میں بھی خدا تعالیٰ کی مصلحت ہوگی۔ تو اس قاعدے سے اس شبہ کا

---

[1] مختصراً حاصل اس کا یہ ہے کہ بعض واقعات کی بعض قیود لوحِ محفوظ میں نہیں ہوتیں علم الٰہی میں ہوتی ہیں پس جس کو لوح محفوظ منکشف ہوتی ہے اُس کو وہ قید معلوم نہیں ہوتی وقوع کے وقت وہ اُس کو تبدیل سمجھتا ہے۔ ۱۲ منہ

جواب ہوگیا۔ یعنی یہ حکم خدائی افعال میں ہے تمہارے افعال میں نہیں۔ پس ہمارے اختیاری افعال میں تو اچھے بُرے دونوں ہوں گے۔ اور خدائے تعالیٰ کے جتنے افعال ہیں وہ سب رحمت محض ہیں۔ مثلاً کسی عزیز کا مرجانا یا قحط ہونا یا طاعون ہونا۔ اور اگر کوئی کہے کہ قحط تو گناہوں سے آتا ہے۔ علیٰ ہٰذا طاعون بھی۔ سو رحمت کیسے ہوا تو صاحبو! یہ بھی تو رحمت ہے کہ تم گناہوں سے صاف ہو گئے۔

اسی واسطے حدیث شریف میں ہے کہ طاعون مومن کے لئے رحمت ہے کیونکہ اُس سے تطہیر ہوگی۔ حدیث شریف میں ہے کہ ہر بیماری سے گناہ پاک ہوتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک آیا ہے کہ اگر کوئی چیز رکھ کر بھول جائے تو اتنی پریشانی سے بھی گناہ معاف ہوتے ہیں۔ غرض ہر چیز جو ہمارے اختیار سے خارج ہو وہ ہمارے لئے رحمت ہے۔

پھر ایک بات یہ سمجھو کہ ہم خدا کے ہیں۔ یا اپنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم خدا کے ہیں۔ اسی واسطے ارشاد ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ اگر ہم اپنے ہوتے تو ہم کو ہر تصرف اپنے نفس میں جائز ہوتا تو کیا خدا تعالیٰ کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی چیز میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔ عقل کا فتویٰ تو یہی ہے اور اسی واسطے اِنَّا لِلّٰہِ (ہم سب اللہ کے لیے ہیں) کی تعلیم فرمائی۔ جس میں لام تملیک ہے جس کا مقتضاء یہ ہے اگر بالفرض ان احکام میں کوئی مصلحت بھی نہ ہوتی تب بھی ہم کو اس پر اعتراض نہ ہونا چاہئے تھا۔ چہ جائیکہ ہر مصیبت میں نفع اور مصلحت بھی ہے۔

مصلحت قبض

اور یہاں تک مصائب ظاہرہ کا ذکر تھا۔ ان کے علاوہ ایک اور باطنی مصیبت ہے جو بعض اُن خاص لوگوں کو پیش آتی ہیں جو ذکر و شغل کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ مجاہدہ کرتے ہیں۔ مگر کوئی نفع ان کے خیال میں محسوس نہیں ہوتا۔ مثلاً میلان الی الطاعۃ نہیں ہوتا ذوق و شوق نہیں ہوتا۔ علیٰ ہٰذا جس سے وہ اس قدر تنگ آتے ہیں کہ اگر بے اختیاری کی حالت غالب ہوتی ہے تو اس قسم کے الفاظ زبان سے نکل جاتے ہیں ؎

خستگاں را چو طلب باشد و قوت نہ بود　　　گو تو بیداد کنی شرطِ مروت نہ بود

(کمزور لوگوں میں جب کسی چیز کا شوق ہوتا ہے مگر قوت نہ ہو تو ان زیادہ کام لینا شرط مروت خلاف ہے)

لیکن اختیار سے ایسا کہنا جائز نہیں۔ اس آیت شریف سے اس کا بھی علاج سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اُس وقت یہ سمجھنا چاہئے کہ ممکن ہے جس حالت کو تم مفید سمجھے وہ مفید نہ ہو حالاً یا مآلاً اور بالعکس اسی کو فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبضی آیدت اے راہ رَو　　　آں صلاح تست آئیس دل مشو

چونکہ قبض آمد تو دروی بسط بیں　　　تازہ باش وچیں میفگن برجبین

(اے راہ سلوک میں چلنے والے جب تجھ پر قبض طاری ہو تو اس میں تیرے لئے بہتری ہے ناامید

نہ ہو جب تجھے قبض پیش آئے تو اسی میں بسط تلاش کرٗ خوش رہ اور پیشانی پر بل نہ آنے دے)

خلاصہ یہ کہ اُس میں مصلحت ہوگی۔ چنانچہ نمونے کے لئے ایک مصلحت تو میں بتلاتا ہوں۔ نیز بعض اوقات جو بسط میں حیرانی ہو جاتی ہے اُس کو بھی بتلاتا ہوں۔ وہ نفع تو قبض میں یہ ہے کہ اُس وقت اپنا ناکارہ ہونا بالکل پیش نظر ہو جاتا ہے اور باسط میں وہ ضرر یہ ہے کہ بعض اوقات عُجب پیدا ہو جاتا ہے کہ اب تو ولی ہو گئے تو اس صورت میں قبض منجی ہے اور بسط مہلک ہے۔ تو قبض کا عطا ہونا گویا ایک ایسی کیفیت کا عطا ہونا ہے جو سبب نجات ہے۔ پس اس پر راضی ہونا چاہئے۔ اسی کو فرماتے ہیں۔ ؎

باغباں گر پنج روزے صحبتِ گل بایدش　　بر جفائے خارِ ہجراں صبر بلبل بایدش

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال　　مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافریست　　رَاہ رَوگر صد ہنر دارد توکل بایدش

(اے باغبان اگر تو چند روز کے لئے پھول کے پاس رہنا چاہتا ہے تو بلبل کی طرح جدائی کے کانٹوں پر صبر کرتے رہو۔ اے دل اس کی ذلف کی قید میں رہ کر پریشانی سے مت رو۔ سمجھدار پرندہ جب پھندہ میں پھنس جاتا ہے تو اس کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے۔ درویشی کے راستہ میں اپنی پرہیز گاری اور سمجھ پر بھروسہ کرنا کفر ہے۔ اور راستہ کے چلنے والے اگر چہ تو سو کمال بھی رکھتا ہو پھر بھی اپنے کمال پر بھروسہ نہ کرنا صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا)

باقی یہ کہ قبض کی حالت میں لذت نہیں رہتی۔ سو لذت خود مطلوب نہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضاءِ دوست طلب　　کہ حیف باشد از وغیرِ او تمنائے

(جدائی اور ملاقات کا کچھ خیال مت کر۔ محبوب کی خوشنودی تلاش کر محبوب جس حالت میں بھی راضی ہو اسی کو پسند کر افسوس کا مقام ہے اگر اس کی ذات کے سوا دوسری چیز ظاہر کی جائے)

توبۂ خالصہ

بعض کہتے ہیں کہ ذکر و مجاہدہ سے ہمارا میلانِ معصیت بھی دفع نہیں ہوتا اور اس کو مصیبت سمجھتے ہیں۔ تو خوب سمجھ لو کہ اگر میلان کے ساتھ ہمت بھی گناہ سے بچنے کی ہو تو یہ بڑا بھاری مجاہدہ ہے اور مجاہدہ جتنا زیادہ ہوتا ہے۔ اُس میں ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے۔ تو گویا خدا تعالیٰ کو ثواب زیادہ دینا منظور ہوتا ہے۔ سو یہ خدا کی رحمت ہے کہ اجر بڑھانے کے واسطے یہ داعیہ پیدا کر دیا۔ غرض کام کئے جاؤ اور معصیت سے بچو اور اگر اتفاقاً معصیت بھی ہو جائے تو اُس کے بھی زیادہ پیچھے نہ پڑو بلکہ اس کا علاج کر کے آئندہ کو بچو۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا علاج استغفار کو فرمایا ہے۔ بعض اوقات

شیطان سالک پر بڑا قبضہ کرلیتا ہے کہ شرم کے مارے توبہ نہیں کرتا اور محروم رہ جاتا ہے۔

سو صاحبو! گناہ سے محض مغموم ہونا کافی نہیں بلکہ استغفار کرنا چاہئے اور توبۂ خالصہ کے پھر اُس کو قصداً یاد نہ کرے کہ بعض اوقات اس سے کیفیت مایوسی کی پیدا ہوکر آدمی معطل ہو جاتا ہے اور اگر بلا قصد یاد آئے تو پھر توبہ کرلے اور توبہ میں ہر ہر گناہ کو سوچنے اور فہرست گننے کی بھی ضرورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صیغۂ استغفار میں خود ارشاد فرمایا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ مَا قدمت وما اخرت وما اسررت وَما انت اعلم بہ منّی

(اے اللہ میری مغفرت فرما دیجئے جو میں نے اب تک ایسا یا آئندہ کروں اور جو کچھ میں نے کرلیا اور جو کچھ آپ میرے شعور جانئے میں)

اس میں مجمل و مبہم عنوان کو کافی قرار دیا۔ قربان جایئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے: کہ ہم کو کس قدر مضائق سے بچالیا ہے اور کیسی آسان راہیں بتلائی ہیں لیکن اگر کوئی کام ہی نہ کرے تو کچھ علاج ہی نہیں ۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ‌ ‌ چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

(چمگاڈر اگر دن میں نہیں دیکھ سکتا تو اس میں آفتاب کا کیا قصور ہے)

یہ استغفار کا ذکر استطراداً تھا۔ اصل مضمون یہ تھا کہ جو امر اپنے اختیار سے خارج پیش آئے اُس کو مصلحت سمجھے۔ اور اس پر خدا کا شکر کرے۔ خواہ بلائے ظاہری ہو خواہ بلائے باطنی ہو۔ یہ تھا بیان مرضِ تمنّی کا جس میں اہلِ سلوک بھی کم وبیش مبتلا ہیں۔ اسی کی ممانعت اس حدیث میں ہے کہ

ایاکم وَاللو فان لو یفتح عمل الشیطن ہم نے ہزاروں مرتبہ یہ آیت شریف پڑھی ہوگی۔ لیکن آج جو بات اس سے سمجھ میں آئی وہ آج تک سمجھ میں نہ آئی تھی۔

تعدیل طبیعت

الحمد للہ اور ایک بڑی رحمت اس کے ساتھ یہ فرمائی ہے کہ طبیعت انسانی کا بھی لحاظ فرمایا یعنی تمنا خود بخود طبیعت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی تعدیل فرمادی ہے وہ یہ کہ دعا کو مشروع فرمادیا کہ اگر کسی چیز کی تمنا پیدا ہو تو بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ کو رائے دو وہ ارمان اس طرح نکالو کہ دعا کرلیا کرو کہ تمنا سے وہ بہتر ہے کیونکہ تمنا کے معنی تو خدا کو رائے دینا ہے۔ کہ اس طرح کرنا مناسب تھا۔ بخلاف دعا کے کہ وہ عرض ہے۔ جناب باری میں اور ساتھ ہی اس پر رضا ہے کہ اگر یہ اس طرح نہ ہوگا تو میں اسی کو مصلحت سمجھوں گا۔ جو حاصل ہے مضمون عَسٰی اَنْ تکرَھُوْا الآیۃ کا۔

لذت ہمکلامی کی رعایت

پس دعا غبار نکالنے میں تو تمنی کے ہم پلہ ہیں اور عرض میں اس کے خلاف مثلاً جب بیمار

ہوتو صحت کی دُعا کرو۔ اسی طرح صبر کی دُعا کروتو اس سے غبار تو نکل جائے گا جو بات پسند آئے کہہ لے اور حسرت نہیں ہوگی۔ جیسے تمنی میں ہوتی ہے کیونکہ حسرت مافات پر ہوتی ہے۔ اور مافات کی دعا جائز نہیں جیسے کوئی کہے کہ مجھے نبی کردے کہ اس کا انتفاء اور فوت یقینی ہے تو اثر میں دعا تمنّی سے اچھی ہوئی اور حقیقت کے اعتبار سے اُس سے یوں متغائر ہے کہ وہاں مشیت میں دخل دینا ہے اور یہاں چونکہ مشیت کا علم نہیں لہذا اس کے ساتھ مقابلہ نہیں ہے۔ بلکہ استدعا ہے اور ساتھ ہی مشیت پر رضا اور اس سے دونوں کا فرق بھی معلوم ہوگیا اور اگر حسرت کے مضمون مذکور پر یہ شبہ ہو کہ ہم فائت پر تمنا نہ کریں گے۔ بلکہ مستقبل پر تمنا کریں گے تو اس میں حسرت کیا ہوگی تو میں کہتا ہوں کہ پھر دُعا ہی کیوں نہ کرو کہ ایہام رائی سے محفوظ رہو اور دعا کے مفید و مشروع ہونے سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ واقعات کا مخفی رہنا اور کشف نہ ہونا بہتر ہے۔ کیونکہ پھر کچھ کہہ نہیں سکتے۔ کیونکہ خلافِ کشف سوال کرنے سے ضرور اندر سے جی کھٹکتا ہے۔ سبحان اللہ کیا رحمت ہے کہ اپنی ہمکلامی میں لذت بخشنے کے لئے واقعات کو مخفی رکھا پھر چاہے ہو یا نہ ہو لیکن برکاتِ دعا تو حاصل ہوئے۔

دعاء و رضاء

رہی یہ بات کہ اگر دعا کی اور مقصود حاصل نہ ہوا تو پھر کیا کرے یا جب تک حاصل نہ ہو اُس وقت تک کیا ہی کرے تو اس کی تحقیق یہ ہے کہ دُعا تو نہ چھوڑے۔ لیکن جب تک وقوع نہ ہو صبر کرے بس صبر اور دُعا دونوں رکھے۔

اور یہ دعا بعد ظہور عدمِ اجابت رضا بقضا کے بھی منافی نہیں۔ کیونکہ وہ عدمِ اجابت جس وقت تک ظاہر ہوا ہے۔ اس وقت تک کے لئے اسی عدمِ استجابت پر راضی رہے اور جن اوقات کے متعلق عدمِ استجابت ثابت نہیں ہوا اُن کے لئے پھر دُعا کرتا رہے تو دونوں سلسلے برابر جاری رہیں۔ غرض دعا کو بھی مشروع فرمایا۔ جیسا دوسرے نصوص میں ہے اور تمنّی کو منع فرمایا۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے۔

عَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ

(ممکن ہے تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے حق میں مضر ہو)

خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے جتنے احکام ہیں تکوینی یا تشریعی اُن کے خلاف تمنا نہ کرے۔ بلکہ ان پر صبر کرے اور جو دل میں کوئی تمنا پیدا ہو۔ بجائے اُس کے دُعا کرتا رہے۔

سببِ بیان

میں نے اس وقت اس مضمون کو اس لئے زیادہ بیان کیا کہ یہاں ایک واقعہ[1] ہوگیا ہے جس سے اکثر کے قلب پر برا اثر ہوگا۔ اور اثر ہونا تو بعید نہیں واقعہ میں بھی مثل نشتر کے اثر ہوتا

---

[1] منشی خلیل الرحمٰن صاحب کاندھلوی تحصیلدار بھوپال کی وفات ہوئی تھی۔ ۱۲ منہ۔

ہے۔ دیکھو اگر نشتر لگاتے ہیں تو کھال میں کتنا اثر ہوتا ہے۔ لیکن ہم کو اعتراض کا کوئی حق نہیں کیونکہ ہم کوئی رشتہ دار یا سر رشتہ دار نہیں ہیں کہ حکمت کی تفتیش کریں۔ باقی حکمتیں ہیں ضرور۔

اہتمام حقوق

لیکن مصیبت ختم ہونے کا طریقہ یہ نہیں کہ ان حکمتوں کی تفتیش کی جائے بلکہ مصیبت کے ختم ہونے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اس کو سوچے نہیں اور تذکرہ نہ کرے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کئی کئی مہینے کے بعد بھی مصیبت زدہ کے پاس آ کر برابر رنج وصدمہ کا تذکرہ کر کے اس کو تازہ کیا کرتے ہیں فقہاء نے لکھا ہے کہ تین دن کے بعد تعزیت نہ کرے کیونکہ واقعہ میں تعزیت ہی نہیں کیونکہ تعزیت کی حقیقت ہے تسلی دینا اور اس میں بجائے تسلی کے دونی آگ بھڑکتی ہے۔ پس اس کا طریقہ تو یہی ہے کہ پھر ایسے قصوں کو یعنی ان واقعات کو قصداً یاد نہ کرے البتہ مُردے کو نفع پہنچانے کے لئے یاد کرے اور جو حقوق اس کے ذمہ ہیں وہ ادا کرے۔ اس سے اس کو نفع ہوگا اور اپنے سکون کے لئے ذکر اللہ میں مشغول رہے کہ ذکر اللہ سے سکون ہوگا۔

نیز متممات راحت رسانی اموات سے یہ ہے کہ اس کے اموال میں گڑ بڑ نہ کرو کیونکہ علامہ سیوطیؒ نے نقل کیا ہے۔ کہ

اعمال الاحیاء تعرض علی الاموات

تو اس کے متعلق خلاف شرع کام کرنے سے اس کو اذیت ہوگی۔ اگر کوئی کہے کہ اس کی اذیت سے مجھ کو کیا تو میں کہوں گا کہ عذاب کی تم کو بھی تو تکلیف ہوگی۔ نیز اگر عذاب بھی نہ ہوتا تب بھی خدا کی مرضی کی تو پرواہ کرنا ضرور تھا۔ غرض اس کا نفع اس میں ہے کہ اس طور سے اس کو یاد کرو اور اپنے سکون کے لئے ایک تدبیر یہ ہے کہ کسی کام میں لگے رہو۔ کیونکہ بیکاری میں یہ سب قصے یاد آتے ہیں۔ اگر دین کا کام نہ ہو تو دنیا ہی کے کام میں لگ جاؤ۔ مگر مباح کام ہو۔ غرض غم کو ہلکا کرنا چاہئے ورنہ حد قضائے خداوندی سے تنگی ہوتی ہے۔ پس اسی کے علاج کے لئے ارشاد ہے۔

عَسٰٓی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ عَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ.

(یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں باعث شر ہو اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم پورا پورا نہیں جانتے)

اب میں ختم کرتا ہوں اپنے لئے بھی دعا توفیق کیجئے اور اموات کے لئے بھی دُعا کیجئے کہ خدا مغفرت کرے۔ (آمین)

تمت بالخیر وَبِکَ نَستَعِینَ

النفحات فی الاوقات

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے وقف کردہ مکان واقع تھانہ بھون میں بتاریخ ۴ شوال المکرم ۱۳۴۴ھ بروز سوموار کو بوقت صبح کرسی پر بیٹھ کر تین گھنٹے تک النفحات فی الاوقات کے موضوع پر یہ وعظ ہوا۔ سامعین کی تعداد تقریباً 50 تھی۔ مستورات اس کے علاوہ تھیں۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے اِسے قلمبند فرمایا۔ تفصیلی تسوید ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۴۴ء کو شروع ہو کر ۲ محرم الحرام ۱۳۴۵ء کو ختم ہوئی۔

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ لِلّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلَّمْ.

اَمَّا بَعْدُ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

فقد قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اِنَّ لِرَبِّکُمْ فِیْ دَھْرِکُمْ نَفَحَاتٌ اَلَا فَتَعَرَّضُوْا لَہٗ و فی نسخہ لھا رواہ الطبرانی -

(تمہارے رب کیلئے ساعات دہر میں نعمات ہیں)

تمہید: اس وقت ضرورت وعظ صرف یہ ہے کہ بعض مہمانوں کی درخواست ہے جو اتفاقاً آ گئی ہیں اور اب ان کے جانے کا وقت قریب ہے اور مطلق ضرورت ہوتو ہر قسم کے بیان سے پوری ہوسکتی تھی۔ مگر جی یہ چاہا کہ بیان وقت ضرورت کا ہو یا دائمی ضرورت کا ہو۔ اور اس قسم کا کوئی خاص مضمون ذہن میں نہ تھا۔ کل اتفاق سے مثنوی پاس رکھی تھی جی چاہا کہ اسی سے کوئی مضمون بیان کردوں یا کم از کم اُسی کے اشعار پڑھ کر ان کی شرح کردوں۔ کیونکہ وہ معتبر کتاب ہے جس کے مضامین شرع کے موافق ہیں۔ اکثر تو صراحۃً منقول کے مطابق ہیں یا کم از کم سکوت عنہا ہیں۔ یہ خیال کر کے جو مثنوی کو کھولا تو اُس میں اس کا بیان نکلا جو دائمی ضرورت کا مضمون ہے۔ جیسا کہ عنقریب واضح ہو جائے گا۔

تجلّی کا معنیٰ

یہ طبرانی کی روایت ہے۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ تمہارے رب کے لئے ساعات دہر میں

نفحات ہیں جس سے مراد تجلیات و فیوض و برکات ہیں۔ جن کو تشبیہاً نفحات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کے اصل معنی لغت میں خوشبو کی مہک کے ہیں وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح خوشبو کی مہک منتشر و متفرق ہوتی ہے اسی طرح حق تعالیٰ کی تجلی و فیوض کے آثار بھی منبسط و متفرق ہوتے ہیں۔ مگر تجلی کا لفظ مبہم ہے۔ اس کا مفہوم ایسا نہیں جس کو عام طور پر لوگ سمجھ لیں۔ بلکہ بعض دفعہ خلاف مقصود کی طرف ذہن پہنچ جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی نظر لغت پر بھی کم ہے اور اصطلاحات پر بھی بلکہ اصطلاح پر تو بہت ہی کم نظر ہے۔

عام طور پر تجلی کے لفظ سے معنی عُرفی اور وہ بھی عُرف عام کی طرح نظر پہنچتی ہے جس سے غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ تجلی کے معنی لغتہً ظہور ہیں۔ جو ایک اعتبار سے صفت ہے اور ایک اعتبار سے فعل ہے۔ اور افعال کا ظہور فاعل کا ظہور ہے۔ اس معنی کو ظہور سے تعبیر کرنا موہم خلاف مقصود نہیں۔

اور یہی معنی فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ (پس جب اس کے رب نے تجلی فرمائی) میں مراد ہیں۔ مگر عرف عام میں تجلی کے معنی نظر آنے کے مشہور ہیں۔ جس سے آیت میں اشکال واقع ہوتا ہے کہ تَجَلّٰی رَبُّهٗ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ کی تجلی ہوئی اور اس سے پہلے لَنْ تَرَانِی میں رویت کی نفی ہو چکی ہے۔ مگر تجلی بمعنی ظہور سے یہ اشکال وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ لَنْ تَرَانِیْ سے تجلی بمعنی رویت کی نفی تھی نہ کہ تجلی بمعنی ظہور کی۔

البتہ ایک اشکال باقی رہے گا وہ یہ کہ لَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ شرط ہے وَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا (اور حضرت موسیٰ علیہ السلام گر کر بیہوش ہو گئے) مع اپنے معطوف علیہ کے جزا ہے اور شرط و جزا میں تقدم و تاخر لازم ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ظہور کے بعد موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوئے اور بے ہوش ہی مانع روایت تھی تو لازم ہے کہ بے ہوشی کے قبل رویت ہو گئی اور اشکال عود کر آیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شرط و جزا میں تقدم و تاخر تو ضروری ہے مگر وہ عام ہے کہ ذاتی ہو یا زمانی صحت مجازاۃ کے لئے احدھُما کافی ہے زمانی ہی ضروری نہیں اور نہ یہاں اس پر کوئی دلیل قائم ہے پس ہم کہتے ہیں کہ یہاں تقدم و تاخر محض ذاتی ہے اور وقوع دونوں کا ایک زمانہ میں ساتھ ساتھ ہوا۔ تجلی کا بھی اور صعق کا بھی۔ پس اب تقدم و تاخر سے وقوع رویت لازم نہیں آتا۔ البتہ اگر تجلی کے بعد کچھ زمانہ صعق میں فاصل ہوتا تو اشکال ہوتا لیکن اس پر کوئی دلیل نہیں اس لئے اشکال رفع ہو گیا۔

بہرحال تجلّی کے معنیٰ یہ نہیں کہ کوئی چیز نظر آئے بلکہ اس کے معنی مطلق انکشاف و ظہور کے

ہیں خواہ ایک طرف سے ہو یا دونوں طرف سے۔ مگر چونکہ تجلّی کے لفظ میں رویت کا ابہام ہوسکتا ہے اس لئے میں نفحات کے ترجمہ میں اس کو ترک کرتا ہوں اور گوظہور وانکشاف میں اس درجہ کا ایہام نہیں مگر کسی قدر ایہام کا احتمال اس میں بھی ہے کیونکہ عرفاً انکشاف وظہور سے بھی متبادر وہی ظہور وانکشاف شئے کا ہے۔ جو بلا واسطہ ہو اور ظہور بواسطہ افعال وصفات کو عام لوگ ظہور کم سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں اس کو بھی ترک کرتا ہوں اور نفحات کے ترجمہ میں توجہ کا لفظ اختیار کرتا ہوں۔

اِصطلاحاتِ فن تصوف

اس فن کے اخلاق کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی اصطلاحات پر لوگوں کی نظر نہیں اور ایک لطیفہ یہ ہے کہ بدوں باقاعدہ حاصل کئے اس فن کی اصطلاحات پر نظر دشوار بھی ہے کیونکہ اس فن میں جو اصطلاحات ہیں وہ مختلف فنون کی اصطلاحات سے مخلوط ہیں کہیں لغت کو لے لیا ہے کہیں اصطلاح اہل منطق کو کہیں اصطلاح فلاسفہ کو کہیں اصطلاحات اہل کلام کو اور بعض جگہ عرفِ عام کو۔ اور اس کی وجہ عجب نہیں کہ یہ ہو کہ یہ حضرات اپنے علوم کا اخفاء چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے لئے خاص خاص اصطلاحات کا ہونا تو مولانا کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ ؎

اصطلاحاتیست مر ابدال را۔

اور قصداً اخفا حافظ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی　　بگذار تا بمیرد ر رنج خود پرستی

(عشق اور مستی کا راز مدعی سے نہ کہیے اسے چھوڑیے تاکہ وہ اپنے خود پرستی کے رنج میں مر جائے)

اس پر یہ سوال ہوگا کہ جب اخفاء کا قصد کیوں کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے تاکہ نااہلوں کا جو کہ ان اسرار کے متحمل نہیں۔ ایمان محفوظ رہے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں ؎

پیش ایں الماس بے اسپر میا　　کز بریدن تیغ رانبود حیا

(اس ہتھیار کے سامنے بلا ڈھال کے نہ آ اس لئے کہ تلوار کو کاٹنے میں لحاظ وشرم نہیں ہے۔)

اب یہ سوال ہوگا کہ جب اخفاء مقصود ہے تو ان علوم کی تدوین کیوں کی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے تاکہ اہل ان کو دیکھ کر اپنے احوال کو ان پر منطبق کرلے کیونکہ حالات وکیفیات اور ذوقیات کی مقبولیت کی علامت توافق مع السلف ہے جو ذوقیات وکیفیات سلف کے موافق نہ ہوں۔ اُن کے قبول میں شبہ رہتا ہے۔ یہ وجہ ہے اس فن کے اخلاق کی۔ اس لئے عام لوگ اس کو نہیں سمجھتے اور وہ حضرات خود بھی اس کا قصد کرتے ہیں۔ اسی لئے میں نے تجلّی کے لفظ کی جگہ توجہ اختیار کیا ہے۔ کیونکہ تجلّی

اصطلاحی لفظ ہے جس کے معنی عوام صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ ورنہ اصل معنے اس کے ظہور ہیں، خواہ بواسطہ ہی ہو تو اس معنی پر کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ یہ معنی اصطلاح اور لغت دونوں کے موافق ہیں۔

اسی طرح لفظ صورت بھی اصطلاح میں بمعنی ظہور مستعمل ہے۔ اور اس کے بعد حدیث

اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ (بے شک اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا)

پر کچھ اشکال نہیں رہتا۔ مگر اصطلاح کے نہ جاننے سے نہ معلوم لوگ اس کو کہاں سے کہاں لے گئے ہیں۔ صاف مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس طرح پیدا کیا کہ ان سے کمالات حق کا ظہور ہوتا ہے۔ پس صورت حق سے مراد ظہور حق ہے اور اس میں انسان ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ اس معنی کر تمام عالم صورت حق ہے یعنی مظہر حق۔ کیونکہ مخلوق سے خالق کا ظہور ہوتا ہے۔ افعال سے فاعل کا ظہور ہوتا ہے لیکن آدم کی تخصیص حدیث میں اس وجہ سے ہے کہ انسان سے بہ نسبت دوسری مخلوقات کے حق تعالیٰ کا ظہور اتم و اکمل ہوتا ہے۔ اب سب اشکالات رفع ہو گئے۔

توجہ حق تعالیٰ

خلاصہ یہ ہے کہ اگر صحیح اصطلاحات فن تصوف کی معلوم ہوں تو پھر اس میں کثرت سے اشکال نہیں ہوتا۔ مگر لوگ صحیح اصطلاحات کو نہ تو جانتے ہیں نہ حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے اشکال واقع ہوتا ہے۔ میں نے اسی واسطے توجہ کا عام فہم لفظ لے لیا ہے اور موہم لفظ چھوڑ دیا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ساعات دہر میں بعض ساعات ایسی ہیں جن میں حق تعالیٰ کی توجہ خاص ہوتی ہے۔ الا فتعرضوا الیہ خبردار ہو جاؤ کہ اس وقت تم بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو جاؤ۔۔ دوسری روایت میں تعرضوالھا سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تم بھی ان نفحات یعنی توجہات کے لئے مستعد رہا کرو۔ یعنی اپنے کو اس قابل بناؤ کہ وہ توجہات تم پر واقع ہوں۔ اور ان کی برکتیں تم کو حاصل ہوں۔ اس مضمون کا ضروری ہونا تو ظاہر ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی توجہ کا طالب کون نہیں؟ ہر شخص اس کا طالب ہے۔ خواہ دین کے لئے یا دنیا کے لئے۔ کیونکہ جملہ خیر و کمال حق تعالیٰ ہی کی توجہ کا ثمرہ ہے۔ کوئی نفع یا بھلائی خواہ دین کی ہو یا دنیا کی بدوں توجہ حق کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہر شخص خواہ دیندار ہو یا دُنیا دار۔ حق تعالیٰ کی توجہ کا طالب ضرور ہے۔ اسی سے مضمون کی ضرورت ظاہر ہے

طرز شارع علیہ السلام

اب یہاں ایک مسئلہ اور سمجھنا چاہئے وہ یہ کہ شارع علیہ السلام کو چونکہ کسی فن کا مدوّن کرنا

مقصود نہیں۔ بلکہ اصل مقصود اصلاح ہے۔ اس لئے جن چیزوں کے بتلانے کی ضرورت نہ تھی ان کی تعلیم نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ حرمت خمر کی تو تعلیم فرمائی اور شرب خمر پر وعید بھی ہے۔ مگر حرمت بول و غائط کا کہیں ذکر نہیں نہ اکل و بول براز پر کہیں وعید حالانکہ نجاست میں بول و براز خمر سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ خمر تو تخلیل سے منقلب الماہیۃ ہو کر طہارت کی طرف عود کر آتی ہے اور بول میں ایسا انقلاب بھی نہیں ہوتا۔ تو اگر شارع کو تدوین فن مقصود ہوتا تو نجاست خمر کے ساتھ نجاست بول و براز کا بھی اہتمام کے ساتھ بیان ہوتا مگر چونکہ اس سے عام طور پر سب کو کراہت ہے اور کوئی ان کے کھانے پینے کو گوارا نہیں کرتا۔ نہ اپنے بدن پر ان کا لگا رہنا گوارا کرتا ہے۔ اس لئے شارع نے ان کی نجاست و حرمت کا زیادہ اہتمام نہیں کیا۔

اسی طرح اگر کسی چیز کی ضرورت بدیہی ہو تو اس کے بیان کا بھی اہتمام نہیں فرمایا۔ چنانچہ والدین کی حرمت تافیف کا تو ذکر فرمایا مگر ان کے ضرب و شتم کی حرمت کا ذکر نہیں فرمایا کہ بدیہی تھی۔

اسی طرح اگر اس کا معلوم کرنا ضروری نہ ہو تو اُس کو بھی نہیں بتلایا۔ چنانچہ اسی بناء پر درجہ تفصیل میں تقدیر کے مسئلہ کو بیان نہیں فرمایا یعنی اس مسئلہ میں دو درجہ تھے ایک اجمال کا ایک تفصیل کا اور تفصیل غیر ضروری تھی تو شارع نے اس کی تفصیل نہیں کی اور کاوش سے منع فرمایا کیونکہ تقدیر تجویز حق کا نام ہے جس کا تعلق ذات و صفات حق سے ہے۔ اس میں کاوش کرنے سے بجز حیرت و پریشانی کے کچھ حاصل نہ ہوگا اور درجہ جمال میں چونکہ اس کا ضروری تھا اس وجہ سے اجمالاً بیان فرما دیا ہے۔ اور اسی ضرورت کی بناء پر اُسی مسئلہ کی ایک ایسی غایت بھی بتلا دی جس کی ضرورت عاجلہ تھی۔ یعنی اعتقاد تقدیر کی ایک غایت تو عاجلہ یعنی اجر آخرت کیونکہ اس کا اعتقاد موجب نجات ہے۔ یہ خاصیت ہے عقائد حقہ میں کہ بدوں عمل کے وہ خود بھی موجب نجات ہیں۔ گو نجات اولیٰ نہ ہو۔ سو شارع نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک غایت عاجلہ بھی بتلا دی۔ چنانچہ ارشاد ہے

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِلٰی قوله تعالیٰ لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ ۔ یہاں محذوف ہے ای اخبرنا بذٰلک لِكَيْلَا تَاْسَوْا۔

یعنی حق تعالیٰ مسئلہ تقدیر کو بیان کر کے فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اس لئے خبر کی ہے تا کہ جو چیز تم سے فوت ہو جائے اور اس پر تم کو رنج نہ ہو اور جو کچھ تم کو دیا ہے۔ اس پر اتراؤ نہیں۔ اس تعلیم کی قدر و

عظمت ظہور نتائج کے وقت ہوگی۔ اور یہی کیا شریعت کی قدر موقع پر معلوم ہوتی ورنہ ظاہر میں تو وہ بہت سرسری و معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی سمجھ لیتا ہے۔ تعلیم شرعی کوئی پیچیدہ اور دشوار چیز نہیں جس کے سمجھنے کے لئے معقول و فلسفہ کی اصطلاحات جاننا ضروری ہو مگر ظہور نتائج کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ یہ سہل سہل باتیں کتنی قیمتی ہیں اور ظہور بھی وہ معتبر ہے جو واقعات میں ہوتا ہے۔

چنانچہ یہی مسئلہ تقدیر ظاہر تو ایک معمولی بات ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے سب پہلے سے تجویز ہو چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے پہلے سے سب لکھ دیا ہے اب واقعات میں اس کا اثر دیکھنا چاہئے۔ مثلاً دو ایسے شخص لئے جائیں جن کے لائق فائق بیٹوں کا علاج کی غلطی سے انتقال ہو گیا ہو اور اُن میں سے ایک تو تقدیر کا قائل ہے۔ دوسرا منکر ہے منکرِ تقدیر کی تو یہ حالت ہوگی کہ وہ بار بار حسرت کرے گا کہ طبیب یا ڈاکٹر سے تشخیص میں غلطی ہوگئی۔ اور علاج میں کوتاہی ہوگئی۔ اگر فلاں شخص سے علاج کرایا جاتا تو ضرور بچ جاتا یا فلاں دوا دی جاتی تو یہ ہلاک نہ ہوتا اور دوسرا شخص جو قائل تقدیر ہے۔ ممکن ہے کہ طبعی طور پر کبھی اُس کو بھی طبیب یا طریقہ علاج کی غلطی کا خیال ہو مگر وہ پھر وہ یہ سمجھے گا کہ یہ غلطی تو لازم تھی۔ خدا تعالیٰ نے اس کے لئے اتنی ہی عمر لکھی تھی۔ یہی وقت اس کی موت کے لئے مقدر تھا۔ اس واسطے اُس کے سامان پیدا ہونا ضروری تھے۔

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود (جب موت آتی ہے تو طبیب نادان بن جاتا ہے)

اور اس وقت جو بھی دوا دی جاتی وہ نفع کے بجائے نقصان ہی کرتی۔ تو اس شخص کو طبیب وغیرہ کی غلطی سے حسرت نہ ہوگی۔ کہ ہائے یوں ہوتا تو ضرور اچھا ہو جاتا۔ بلکہ تقدیر کے اعتقاد سے بہت جلد سکون ہو جائے گا کہ یوں ہونا تو ضروری ہی تھا۔ اور دوسرے کی حسرت کبھی ختم نہ ہوگی۔ وہ ہمیشہ اسی خیال میں رہے گا کہ ہائے اگر یوں ہوتا تو ضرور نفع ہوتا۔ تبدیلی آب و ہوا کی جاتی تو ضرور مریض بچ جاتا۔ اسی اگر مگر میں اس کا دل ہمیشہ کڑھتا ہی رہے گا۔ اسی کے متعلق حدیث میں ہے۔

اِیَّاکُمْ وَاللَّوْ فَاِنَّھَا مَطِیَّۃُ الشَّیْطَان (بچو! تم اگر مگر سے کیونکہ وہ شیطان کی سواری ہے)

اس میں مطلق لَوْ کی ممانعت نہیں بلکہ اُسی لو کی ممانعت ہے جو واقعات ماضیہ میں بطور حسرت کے استعمال کیا جاتا ہے۔ لو کان کذالکان کذا۔ کہ اگر یوں کیا جاتا تو یہ نتیجہ ہوتا۔ ارے احمق! جب وہ قصہ رفت و گزشت ہوا۔ تو اب اسکے متعلق اس اگر مگر سے فائدہ کیا کیا۔ تمہاری اگر مگر سے مُردہ زندہ ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں بس سوائے اس کے کہ شیطان اس طریقہ سے پریشان کرنا چاہتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔

طبعی رنج تو واقعات سے قائل تقدیر کو بھی ہوتا ہے اور ہونا چاہئے اس میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ مثلاً اخلاق کے درست کرنے میں رنج وغم کو بہت دخل ہے اس سے نفس کی اصلاح ایک بڑے درجہ میں بخوبی ہوتی ہے۔ نیز آخرت کی طرف توجہ بڑھ جاتی ہے اور دُنیا سے دل مکدر ہو جاتا ہے۔ انہی حکمتوں کی وجہ سے کاملین کو بھی ایسے واقعات سے رنج ہوتا ہے۔ مگر عقلی رنج نہیں ہوتا۔

اور رنج کی اس طبعی وعقلی تقسیم سے ایک بڑا اشکاف رفع ہو گیا وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ان کی والدہ کو خطاب فرمایا ہے۔ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ۔ (اور تو خوف نہ کر اور نہ غم کر) اشکال یہ ہے کہ خوف وحزن اختیاری ہے یا غیر اختیاری۔ شق اوّل تو مشاہدہ کے خلاف ہے۔ مشاہدہ یہ بتلاتا ہے کہ رنج دہ واقعات سے طبعی طور پر رنج ضرور ہوتا ہے۔ وہ بندہ کے اختیار سے باہر ہے پس شق ثانی متعین ہو گئی یعنی خوف وحزن غیر اختیاری ہے پس اب اشکال یہ ہے کہ جب یہ غیر اختیاری امر ہے تو پھر اس سے نہی کیوں ہے کیونکہ امر ونہی کا تعلق امور اختیاریہ سے ہوتا ہے نہ کہ غیر اختیاریہ سے۔

اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ خوف وحزن کے دو درجے ہیں۔ ایک غیر اختیاری یہ خوف وحزن طبعی ہے اور ایک اختیاری یہ خوف وحزن عقلی ہے۔ مثلاً طبعی حُزن تو یہ ہے کہ ایک واقعہ رنج دہ ہوا اور دل پر اُس سے چوٹ لگی بے قراری ہوئی اور عقلی درجہ یہ ہے کہ اس غم کو لے کر بیٹھ جائے اس میں غور وفکر کرتا رہے۔ قصداً اُس کو یاد کرتا رہے۔ زبان سے تذکرہ کرتا رہے اس طرح جو شخص غم کو لے کر بیٹھے گا تو غم پہلے سے زیادہ ہوگا۔ تو لا تخافی وَلَا تَحْزَنِیْ (اور تو خوف نہ کر اور نہ غم کر) میں طبعی حزن کی ممانعت نہیں جو غیر اختیاری ہے بلکہ عقلی حزن کی ممانعت ہے جو اختیار سے پیدا ہوتا ہے اور گو حزن طبعی کا حدوث غیر اختیاری ہے مگر تدبیر وعلاج سے اس میں تقلیل ہو سکتی ہے اور علاج یہ ہے کہ طبیعت کو دوسری چیز کی طرف متوجہ کرے یہ عام قاعدہ ہے کہ دوسری چیز کی طرف متوجہ ہونے سے پہلی چیز کمزور ہو جاتی ہے اور بعض امور کو تو بعض کے ازالہ یا تضعیف میں خاص دخل ہوتا ہے مثلاً غم کی حالت میں بشارت کو یاد کرنا ازالۂ غم میں بہت مفید ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اوّل تو عقلی حُزن وخوف سے منع فرمایا پھر طبعی حُزن وخوف کے ازالہ کی یہ تدبیر فرمائی۔ کہ

اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْکِ وَجَاعِلُوْہُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ

(بے شک ہم اسے تجھے واپس کر دیں گے اور اسے اپنے وقت پر رسول بنا دیں گے)

کی بشارت سُنائی۔ اس میں مصیبت فراق کی غایت وحد بھی بتلا دی کہ یہ ایک دن ختم ہونیوالی ہے۔ اور اُسکے ساتھ ایک بشارت عظمیٰ بھی سُنا دی کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کو رسول بنانے والے ہیں تو یہ

مصیبت مرتفع ہو کر ایک نفع زائد حاصل ہوگا بہرحال تقدیر کا اجمالی درجہ تو نہایت ضروری تھا دین کے اعتبار سے بھی اور دنیا کے اعتبار سے بھی۔ واقعی بدوں اعتقاد تقدیر کے مصائب وحوادث میں سکون قلب ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے شارع نے اجمالاً اس کو بیان فرمایا اور اس کے منافع سے بھی مطلع فرمایا۔

لیکن درجۂ تفصیل میں اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی تو اس سے شارع نے تعرض فرمایا۔ بلکہ اس سے منع فرمادیا چنانچہ ایک بار صحابہؓ اس مسئلہ میں گفتگو کر رہے تھے کیونکہ اُس وقت تک اُن کو اس کی حد معلوم نہیں تھی کہ کس حد تک اس کے علم کی ضرورت ہے اور اس کے آگے ضرورت نہیں کیونکہ حدود تو اُن کو بتلانے ہی سے معلوم ہوئے اور یہ یقینی ہے کہ صحابہؓ کی غرض اس گفتگو سے تعنت یا ارتکاب معاصی کے لئے عذر تراشنا نہ تھی۔ محض تحقیق مقصود تھی کہ اسی درمیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور آپ ؐ نے سختی کے ساتھ اس مسئلہ میں گفتگو کرنے سے ممانعت فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ اس میں جو گفتگو کرے گا۔ اُس سے آخرت میں پوچھ ہوگی۔

اور اس پر ایک سوال ہے وہ یہ کہ پوچھ تو ہر چیز سے ہوگی۔ چنانچہ نص ہے

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهُ

(جو شخص دنیا میں ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ وہاں دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر برائی کرے گا وہ وہاں دیکھ لے گا)

پھر اس ارشاد سے کہ آخرت میں کلام فی التقدیر کی پوچھ ہوگی۔ کوئی خاص وعید ثابت نہ ہوئی۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بطور وعید کے تھا۔ اس کے جواب میں ہمارے اساتذہ نے یہ فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں کلام فی التقدیر کے متعلق یہ پوچھ ہوگی کہ ہاں صاحب تم مسئلہ تقدیر کے بڑے محقق تھے۔ ذرا ہمارے سامنے تو بیان کرو یہ بہت ہی لطیف معنیٰ ہیں۔ اور اب اس کا خاص وعید ہونا معلوم ہوگیا۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا کہ جو کوئی مسئلہ تقدیر میں زیادہ گفتگو کرنا چاہتا ہے وہ اس کے لئے تیار رہے کہ حق تعالیٰ کے سامنے بھی اس کو بیان کر سکے اور یقیناً اس مسئلہ میں ہم کچھ بھی تحقیقات بیان کریں گے وہ اس قابل نہ ہوں گی کہ حق تعالیٰ کے سامنے بیان کر سکیں کیونکہ وہ محض تخمینیات وظنیات ہوں گے یقینیات نہ ہوں گی اور حق تعالیٰ کے سامنے یقینیات ہی کو بیان کر سکتے ہیں۔ نہ کہ تخمینیات کو۔ غرض شارع نے اس مسئلہ میں تفصیل سے اسی واسطے منع کر دیا ہے کہ اس کی تفصیل سے کوئی ضرورت متعلق نہ تھی۔ نہ دنیوی نہ دینی۔ دونوں ضرورتیں اعتقاد اجمالی سے رفع ہو سکتی ہیں۔ غرض شارع کا

طرز یہ ہے کہ ضروری امور کا اہتمام فرماتے ہیں۔ غیر ضروری امور کا اہتمام نہیں فرماتے۔

جب یہ مسئلہ معلوم ہوگیا۔ اس کی بناء پر اس حدیث کے متعلق یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی توجہ ہر شخص کو مطلوب ہونے کے سبب مضمون حدیث کا ضروری ہے۔ جیسا بیان بھی ہو چکا۔ لیکن یہ ضرورت ہر شخص کو معلوم بھی ہے پھر قاعدہ مذکورہ کی بناء پر اس کے بیان کی کیا ضرورت رہی۔ پھر شارع نے اس کو کیوں بیان فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری غفلت کی وجہ سے اس کو بیان فرمایا کہ یہ مضمون ضروری تو اس درجہ اور ہم کو اس کی طرف توجہ نہ تھی۔ اب سوال نہ رہا۔

حصولِ توجہ

اب حدیث کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ بعض اوقات ہماری طرف ایک خاص طور سے متوجہ ہوتے ہیں جس کو نفحات سے تعبیر فرمایا ہے۔ تو ضرورت اس کی ہے کہ ہم بھی ان کی طرف متوجہ ہوں جس کا حاصل یہ ہے کہ تنہا اُدھر کی اس طرز کی توجہ پر کفایت مت کرو بلکہ کامیابی کے لئے تم بھی توجہ کرو۔ وہ توجہ اس طرز کی ہے جیسے ایک کریم سائل کی طرف دیکھ رہا ہو کہ یہ میری طرف نظر کرے تو میں اس کو روپیہ دیدوں۔ اب اگر کوئی سائل ایسا بد دماغ ہو کہ باوجود کریم کی نظر کے بھی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے تو بتلایئے اسکو روپیہ کیونکر مل جاوے گا۔ بلکہ اس کی نظر کے بعد اس کا نگاہ نہ اُٹھانا اور دوسری طرف متوجہ رہنا قاعدہ سے موجب عتاب وطرد ہوگا۔

ہاں ایک دوسری قسم کی توجہ یہ بھی ہے کہ کریم سائل کی نظر کا انتظار نہ کرے۔ بلکہ اس کی بے خبری میں روپیہ جیب میں ڈال دے۔ مگر اس توجہ کا کچھ قانون نہیں۔ بلکہ یہ وہب محض ہے۔ قانون وہی ہے جو صورت اول میں مذکور ہوا کہ ان کی توجہ کے وقت تم بھی اُدھر متوجہ ہو تو دولت مل جائے گی۔ رہا وہب تو اس کے لئے کچھ ضابطہ نہیں چنانچہ نبوت امور وہبیہ میں سے ہے۔ جس کی حالت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو نبوت عطاء ہوئی ہے تو اُن کو پہلے سے اس کا علم نہیں ہوا کہ میں نبی ہونے والا ہوں۔ گو آثار پہلے سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ مگر یہ خبر بھی بعد ہی میں ہوتی ہے کہ یہ آثار مقدمۂ نبوت تھے۔

نیز کسی نبی سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے اپنے لئے نبوت کی دعا کی ہو۔ ورنہ کہیں تو ثبوت ہوتا بلکہ حدیث میں تو اس کے خلاف آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نبوت عطا ہوئی تو آپ حیرت زدہ ہوگئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت دفعۃً مل گئی

تھی۔ پہلے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم نہ تھا۔ کہ میں نبی ہونے والا ہوں۔ پھر اس عطاء کے بعد بھی آپ کو اجمالاً نبوت کا علم ہوا۔ باقی تفصیل اس وقت بھی مخفی رہی جس کا علم دوسرے ذرائع سے ہوا۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو حیرت واستعجاب کے ساتھ بیان فرمایا۔ تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ سو اس کا تو وہم بھی جائز نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطائے نبوت کے بعد اپنے نبی ہونے میں کچھ شبہ رہا تھا۔ نعوذ باللہ! یہ تو محال ہے کیونکہ سب سے پہلے نبی پر اپنی نبوت پر ایمان لانا لازم ہے بلکہ منشا اس کا وہی تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے آثار و علامات کی تفصیلی اطلاع نہ تھی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم سب وحی سے ماخوذ ہیں نہ کہ کتب سے تو اوّل وحی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جملہ آثار و کیفیات کیسے معلوم ہو جاتے۔ اور ورقہ بن نوفل کُتب سماویہ کے عالم تھے وہ کتابوں کے ذریعے سے آثار و علاماتِ نبوت کی تفصیل معلوم کئے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ سُن کر فوراً سمجھ گئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہوئی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تفصیلی حالات عرض کئے۔ چنانچہ ان حالات میں یہ بھی عرض کیا کہ نبوت کے لئے قوم کی مخالفت کرنا۔ ایذاء پہنچانا ضروری ہے۔ مگر انجام کار نبی کو غلبہ ہوا کرتا ہے۔ اور یہ بھی عرض کیا۔

يَالَيْتَنِيْ كُنْتُ فِيْهَا جَذَعًا يَا لَيْتَنِيْ اَكُوْنُ حَيًّا اِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ قَالَ اَوَمُخْرِجِيَّ هُمْ قَالَ نَعَمْ لَمْ يَاْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهٖ اِلَّا عُوْدِيَ ۔

(ترجمہ) کاش! میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظہور نبوت کے وقت جوان ہوتا۔ کاش! میں اس وقت تک زندہ رہوں جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی قوم (مکہ سے) نکالے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ کیا وہ مجھ کو نکالنے والے بھی ہیں۔ ورقہ نے کہا ہاں جو کوئی بھی نبوت سے ممتاز ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ عداوت ضرور کی جاتی ہے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہؓ کے کہنے سے ورقہ کے پاس اس غرض سے چلے گئے تھے کہ یہ کتب سماویہ کے عالم ہونے کی وجہ سے آثار نبوّت و حالات انبیاء کو زیادہ جانتے ہیں۔ ان سے کچھ معلومات زیادہ حاصل ہوں گی جو موجب زیادت طمانیت و سکون ہوں۔

مگر اس سے ورقہ کی فضیلت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر لازم نہیں آتی۔ نعوذ باللہ! کیونکہ اس کی تو بلاتشبیہ ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کو دفعۃً ڈپٹی کلکٹر بنا دیا جائے اور وہ کسی قانون داں سے جو کسی عہدہ سے ممتاز نہیں۔ اس منصب کے لوازم و وظائف کی تحقیق کرے کہ فلاں کام کس

طریقہ سے اور فلاں انتظام کس صورت سے کرنا چاہئے۔ مگر کیا محض اتنی بات سے وہ قانون داں درجہ میں اُس سے افضل ہوسکتا ہے۔ ہر گز نہیں۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ بعض دفعہ ایک بادشاہ کو نابالغی کی حالت میں گدی نشین کیا جاتا ہے اور وزیر کو اُس کا اتالیق بنایا جاتا ہے۔ بتلایئے درجہ میں کون افضل ہے یقیناً بادشاہ افضل ہے۔ گو اس وقت معلومات امور سلطنت میں وزیر اُس سے بڑھا ہوا ہے مگر وزیر نوکر ہے اور وہ نابالغ شہزادہ آقا ہے۔ بلا تشبیہ یہی مثال یہاں سمجھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نبوت کا تو پورا یقین وعلم تھا مگر اوّل وحی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے آثار و لوازم و کیفیات زیادہ معلوم نہ تھے۔ ورقہ کو کتب سماویہ کے مطالعہ سے یہ امور زیادہ معلوم تھے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے ملنے گئے تاکہ عہدہ نبوت کے آثار و لوازم کا علم حاصل کر کے اطمینان وسکون زیادہ ہو جائے۔ بہر حال وہب کے لئے کوئی قاعدہ نہیں وہ دفعۃً ہوتا ہے۔ جس میں انسان کے کسب و اختیار و علم کو دخل نہیں ہوتا۔ پھر وہب کے بھروسہ پر رہنا غلطی ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی توجہ کا عام طریق سلوک ہی ہے اور جذب و وہب کا طریق عام نہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے حصول اولاد کا عام طریق نکاح اور زوجین کا ہمبستر ہونا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ بدوں شوہر کے اولاد ہوگئی۔ جیسے مریم علیہا السلام کے عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور کبھی بدوں ماں باپ کے بھی تکون ہوا ہے۔ جیسے آدم علیہ السلام بدوں ماں باپ کے ہوئے۔ مگر یہ طریقے عام نہیں۔ ان کے بھروسہ پر بدوں نکاح کے اولاد کی تمنا میں رہنا غلطی ہے۔

سلوک کے عام اور وہب وجذب کے خاص ہونے کی تائید ایک آیت سے بھی ہوتی ہے۔

اَللّٰهُ يَجْتَبِىٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِىٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے اور جو شخص اللہ کی طرف رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دیتا ہے)

اجتباء بمعنی جذب ہے یہاں اصطلاح لغت کے موافق ہے یہاں حق تعالیٰ نے جذب کو تو اپنی مشیت پر رکھا ہے کہ جس کو ہم چاہتے ہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں وہ وعدہ عام نہیں فرمایا اور ہدایت کو انابت پر مرتب فرمایا ہے جو مرادف ہے سلوک کا۔ اور فعل ہے عبد کا۔ حاصل یہ ہوا کہ جو شخص بھی حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور اپنے اختیار سے اعمال قُرب کو اختیار کرتا ہے۔ حق تعالیٰ اُس کو وصول الی المقصود سے کامیاب فرمادیتے ہیں اور یہ عام طریقہ ہے اس میں کسی کی خصوصیت نہیں۔

سلوک وجذب

یہاں یہ حقیقت سمجھنے کے قابل ہے کہ اس جگہ ہدایت سے مراد ایصال ہے جس سے معلوم ہوا کہ انابت سلوک پر ایصال ضرور مرتب ہوتا ہے اور ایصال کا حاصل بھی وہی ہے جو

اجتباء کا حاصل ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ اجتباء عمل سے مقدم ہے اور اُس میں عمل کو کچھ دخل نہیں اور ایصال عمل سے مؤخر ہے اس میں انابت وسلوک عبد کو بھی بظاہر کچھ دخل ہے تو معلوم ہوا کہ جذب ہی کی دو قسمیں ہیں ایک قبل العمل ایک بعد العمل۔ مگر زیادہ وقوع جذب بعد العمل کا ہے عادۃ اللہ یہی ہے کہ سلوک یعنی عمل مقدم ہوتا۔ اور جذب مؤخر ہوتا ہے اور کبھی اس کا بھی وقوع ہوا ہے کہ عمل سے پہلے ہی جذب ہوگیا اور جذب کے بعد عمل مرتب ہوا سو اس جذب قبل العمل کے واقعات دیکھ کر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ سلوک وعمل بے کار ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ عمل علت تامہ وصول کی نہیں۔ بلکہ شرط اکثری ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی یوں کہے کہ علاج کو صحت میں دخل نہیں۔ اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ علت نہیں تو صحیح ہے کیونکہ صحت علاج کے بعد ضروری نہیں ممکن ہے کہ ایک شخص علاج کرے اور صحت نہ ہو اور اگر مطلق سببیت کی نفی مراد ہے تو غلط کیونکہ سببیت فی الجملہ مشاہد ہے۔ یہی حال اعمال کا ہے کہ ان کو وصول وقرب میں علیت کا تو دخل نہیں باقی سببیت کی نفی نہیں ہوسکتی۔

یہی مطلب ہے حدیث لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ اَحَدُ بِعَمَلِهٖ کا نہیں داخل ہوگا۔ کوئی جنت میں عمل کے استحقاق کی بناء پر۔ کہ اس میں بھی علیت اعمال کی نفی ہے اور مقصود اس سے عجب کا علاج ہے کہ کوئی شخص عمل کر کے اترائے نہیں کہ میں نے اپنے عمل سے جنت لے لی کیونکہ اوّل تو عمل کے بعد بھی جذب کی ضرورت ہے اور جذب کا مدار مشیت حق پر ہے۔ سلوک کے بعد بھی وہی پہنچتا ہے جس کو حق تعالیٰ پہنچا دیں۔ کیونکہ وصول عبد کے اختیار سے خارج ہے۔ اس کا مدار ایصال حق پر ہے۔ جو حق تعالیٰ کا فعل ہے اور گو سلوک پر ایصال کا ترتب عادۃً ضرور ہوتا ہے۔ مگر جو شئے عادۃً ضروری ہو اور عقلاً لازم نہ ہو اُس کو عمل کا معلول نہیں کہہ سکتے۔ اگر وہ عمل کا معلول ہوتا تو عقلاً بھی علت کے بعد اُس کا وجود لازم ہوتا۔ اور یہاں ایسا نہیں ورنہ فعل واجب کا معلل ہونا لازم آئے گا۔ اور یہ دلائل سے باطل ہے دوسرے علت ومعلول میں مناسبت بھی شرط ہے۔ جزاء عظیم کا ترتب عمل عظیم ہی پر ہوسکتا ہے۔ تو جس درجہ جزاء عظیم ہے عمل بھی اُسی درجہ عظیم ہونا چاہئے تو اب دیکھ لو کہ جنت کس درجہ عظیم ہے اور تمہارا عمل کیسا ہے۔ جنت تو کماً وکیفاً ہر طرح عظیم ہے کماً تو اس کی عظمت یہ ہے کہ غیر متناہی ہے اور کیفاً اُس کی یہ شان ہے کہ

لَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ (کسی انسان کے وہم وگمان میں بھی نہیں گزرا)

اور ہمارے اعمال کی یہ حالت ہے کہ کماً تو متناہی ہیں اور کیفاً ناقص نماز ہے تو اُس میں

توجہ نہیں۔ تعدیل ارکان نہیں۔ نسیان اور سہو کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ روزہ ہے تو اس میں غیبت شکایت ہے جھوٹ سے احتراز نہیں ذکر ہے تو اس میں خلوص نہیں۔ بزرگ بننے کا شوق ہے کیا اس حالت میں جنت کو عمل کا معلول کہا جاسکتا ہے کہ عمل سے جنت ملی ہرگز نہیں بلکہ یہ کہا جائے گا کہ عمل میں تو تاثیر نہ تھی محض فضل سے جنت مل گئی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عمل بیکار ہے۔ ہرگز نہیں کیونکہ عادۃ اللہ یہی جاری ہے کہ حق تعالیٰ عمل کے بعد توجہ فرماتے ہیں چنانچہ ہمارا اُدھر متوجہ ہونا بھی ایک عمل ہے اور اگر بندہ کو توجہ وطلب نہ ہو تو اس کے متعلق صاف ارشاد ہے۔

اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ

(کیا تمہارے چپکا دوں درانحالیکہ تم اس کو مکروہ سمجھتے ہو)

کیا ہم اپنی رحمت کو تمہارے سر چپکا دیں گو اس کی طرف رغبت نہ ہو۔ نہیں بلکہ اُس سے کراہت ہو۔ ہاں کبھی بطور وہب کے ایسا بھی ہوا ہے کہ باوجود بندہ کی کراہت کے اس کے سر رحمت کو چپکا دیا گیا جس کا یہ اثر ہوا کہ اوّل اُس کو رغبت پیدا ہوئی پھر عمل کا صدور ہونے لگا۔ جیسا حدیث میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَضْحَكُ اِلٰى رِجَالٍ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ فِى السَّلَاسِلِ

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں جو بیڑیوں میں باندھ باندھ کر جنت کی طرف کھینچے جاتے ہیں۔

یہ وہ کفار ہیں جو مسلمانوں سے لڑنے آئے اور جنگ میں قید ہوگئے۔ پھر مسلمانوں کی صحبت سے ان کے قلب میں اسلام آگیا اور مسلمان ہو کر جنت کے مالک ہوگئے۔ مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں۔ بلکہ ظاہر میں تو اسلام کا مقابلہ کرنا زیادہ طرد ولعن کا سبب ہے لیکن بطور وہب کے حق تعالیٰ کسی کے حق میں اس کو بواسطہ رحمت کا سبب بنا دیتے ہیں۔ باقی اصل قاعدہ حصول رحمت کا یہی ہے کہ بندہ بھی حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو۔ اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ حق تعالیٰ کی توجہات تمہاری طرف ہوتی رہتی ہیں تو تم بھی اُن سے غافل نہ رہو۔ بلکہ اُدھر متوجہ رہو جیسے سائل کریم کے ہاتھ کو تکتا رہتا ہے۔ تا کہ تم کو بھی دولت مل جائے۔

حق عظمت

صاحبو! اوّل تو اللہ تعالیٰ کا ہماری طرف متوجہ ہونا ایسا امر ہے کہ اگر اس کے بعد ہم کو اُدھر متوجہ ہونے کا حکم بھی نہ ہوتا تب بھی ہم کو خود متوجہ ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی عظمت کا مقتضاء یہی ہے کہ ہم اُدھر متوجہ ہوں گو وہ ہماری طرف متوجہ بھی نہ ہوں۔ تب بھی اُن کی عظمت کا مقتضاء یہ ہے کہ ہم

ہی اوّل اُدھر متوجہ ہوں کیونکہ بعض حقوق تو احسان وانعام کی وجہ سے ہوتے ہیں اور بعض حقوق محض عظمت کی وجہ سے ہیں۔ صاحبو! حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا یہ اُن کی عظمت کا حق ہے۔ گو اُدھر سے کوئی احسان بھی نہ ہوتا۔ اس کو صوفیہ نے سمجھا ہے وہ اکثر اعمال میں حق عظمت ہی کا خیال رکھتے ہیں۔

چنانچہ تفویضؔ وتسلیم کے متعلق محققین کا قول ہے کہ تفویض اس نیت سے اختیار نہ کرے کہ اس سے راحت ہوتی ہے بلکہ محض اس لئے اختیار کرے کہ یہ حق تعالیٰ کا حق عظمت ہے یعنی تم یہ سمجھ کر تفویض کرو کہ تم غلام ہو اور وہ آقا ہیں۔ اور آقا کا حق ہے کہ غلام اپنے سب امور اُس کو مفوض کر دے۔ اُس میں کسی اور مصلحت ومنفعت کا خیال نہ کرو پھر وہ مصالح ومنافع بھی خود بخود حاصل ہو جائیں گے کیونکہ وہ تو تفویض کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ لیکن اداءِ حق عظمت کے ارادہ کے ساتھ وہ منافع مع ثواب ورضاء کے حاصل ہوں گے اور اس کے بغیر گو منافع مرتب ہوں مگر اُس میں رضاء وقرب زیادہ نہ ہوگا۔

اسی طرح تواضعؔ کے باب میں فرماتے ہیں کہ تم یہ سمجھ کر تواضع اختیار کرو کہ حق تعالیٰ کی عظمت کا حق یہی ہے کہ اُن کے ہر شخص پستی اور تواضع کو اپنی صفت بنائے اور اپنے آپ کو لاشئ محض سمجھے اس پر حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو اس طرح تواضع اختیار کرے گا۔ ہم اُس کو رفعت عطا کریں گے۔ لیکن تم رفعت کی نیت سے تواضع اختیار نہ کرو۔ گو ایک طرح کی رفعت اس طرح بھی حاصل ہو جائے گی۔ کیونکہ تواضع میں خاصیت ہے گو کسی نیت سے ہو کہ وہ قلوب کو کشش کرتی ہے۔ مگر اس صورت میں حقیقی رفعت یعنی قرب ورضاء حق حاصل نہ ہوگی۔

اسی طرح مسئلہ زیر بحث میں حق تعالیٰ کے صفات وکمالات خود ایسے ہیں کہ اُن کا کمال اس کو مقتضی ہے کہ اُن کی طرف توجہ کی جائے اور ان کی یاد دل میں بسائی جائے اور حق تعالیٰ کے کمالات کا مقتضاء یہ کیوں نہ ہو جب کہ ہم ادنیٰ ادنیٰ مثالوں میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کہ کمال فی نفسہٖ توجہ کو مقتضی ہوتا ہے۔ دیکھئے اگر ایک خوبصورت پھول ہو جس کے ہاتھ آنے کی بھی اُمید نہ ہو کیونکہ وہ ایسے شخص کے باغ میں لگا ہوا ہے جس نے پھول توڑنے کی ممانعت کر رکھی ہے مگر جب اس پر نظر پڑتی ہے تو وہ اپنی خوبصورتی سے آپ کے دل کو اپنی طرف کشش کرتا ہے کہ مجھے دیکھو ایسی ہی کوئی عمدہ عمارت بنی ہوئی ہو جس پر آپ کی ملک قائم ہونے کا بعید سے بعید احتمال بھی نہیں مگر محض اُس کی عمدگی کی وجہ سے لوگ اس کی سیر کو جاتے ہیں کوئی ان سے پوچھے کہ اُسے دیکھ کر تم کو کیا مل جائے گا۔ مگر پھر بھی لوگ اس کی سیر کرتے ہیں۔ آخر وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے تاج بی بی کا روضہ دیکھنے کا عام طور پر سب کو اشتیاق ہے۔ بجز اس کے اور کوئی سبب نہیں

ہوسکتا۔ کہ اس کا کمال ہی سیر کو مقتضی ہے۔ اور اُس کی خوبصورتی ہر شخص کے قلب کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یا کوئی حسین جمیل آدمی ہو تو خواہ مخواہ ہر شخص کا دل اُسے دیکھنے کو چاہتا ہے۔ غرض جو چیز بھی کامل ہے اُس کے کمال کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ اپنی طرف دل کو کشش کرتی ہے اور توجہ کو مقتضی ہے۔

اب یہ الگ بات ہے کہ توجہ مفید ہے تو جائز ہے۔ ورنہ ناجائز ہے۔ جیسے نظر الی غیر المحارم و نظر الی الامارد۔ اسی طرح کسی کے مال کو حسرت سے تکنا وغیرہ کو ان توجہات سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ. وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ. (اے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی آنکھوں کو نیچے رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں) وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ (اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان عورتوں سے فرمادیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں)

مگر اس نہی سے اُس خاصیت اقتضاء للتوجہ کی نفی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے تو حسین صورت دیکھ کر انجذاب نہیں ہوتا۔ بلکہ مجھے وہ اور ایک حبشی دونوں مساوی ہیں تو یہ اس شخص کی بے حسی کی دلیل ہے حس صحیح کو حسین صورت کی طرف ضرور انجذاب ہوگا لیکن وہ حکم شرعی کی وجہ سے نظر کو نیچی رکھے گا۔ اب سمجھئے کہ جب ادنیٰ ادنےٰ مخلوق کا کمال کہ یقیناً ناقص ہے توجہ کو مقتضی ہے تو حق تعالیٰ کے کمالات کی کیا شان ہونا چاہئے جن کے متعلق صوفیہ تو یہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی میں کچھ کمال ہے ہی نہیں۔ اور اگر کسی میں کچھ کمال نظر آتا ہے تو وہ بالذات نہیں بلکہ بالعرض ہے۔ جیسے ضوء شمس کہ زمین سے اس کا تعلق بالعرض ورنہ دراصل ضوء صفت شمس ہے اور زمین سے صرف عطا کا تعلق ہے۔

پھر بعضے صوفیہ تو یہ کہتے ہیں کہ جتنے بھی کمالات ہیں وہ سب فی نفسہ حق تعالیٰ ہی کے کمالات ہیں اور مخلوق کے ساتھ اُن کو ویسا تعلق ہے جیسا جالس فی السفینہ کے ساتھ حرکت کا تعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ جالس سفینہ خود متحرک نہیں۔ بلکہ سفینہ متحرک ہے بلکہ اس کی طرف حرکت کرنا بالعرض منسوب کردیتے ہیں۔

اسی طرح مخلوق کی طرف کمالات کی نسبت بالعرض ہے۔ ورنہ یہ سب کمالات بالذات حق تعالیٰ کے کمالات ہیں اور بعض صوفیہ کہتے ہیں کہ مخلوق میں بھی اوصاف کمال ہیں۔ مگر وہ حق تعالیٰ

کے عطا کردہ ہیں اور کمالات حق کے سامنے وہ اس درجہ ضعیف ہیں کہ اُن کے سامنے ان کو کمال کہنا بھی دشوار ہے پہلا قول وحدۃ الوجود کی طرف راجح ہے۔ اور دوسرا قول وحدۃ الشہود کی طرف۔ غرض حق تعالیٰ کے کمالات ایسے ہیں کہ یا تو اُن کے سوا کسی میں کمال ہی نہیں یا اگر ہے تو ضعیف ولا شئے ہے۔ جب حق تعالیٰ اس درجہ کامل ہیں تو کیا اُن کا حق عظمت یہ نہ ہوگا۔ اُن کی طرف توجہ کی جائے۔

چنانچہ عارفین محققین جو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اُس توجہ میں اُن کو بجز ادائے حق عظمت کے اور کوئی قصد نہیں ہوتا۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ حضرات اغراض سے مستغنی ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اغراض کی طرف التفات نہیں۔ باقی استغناء تو ایک دعویٰ ہے اور صوفیہ دعوے سے بالکل ہی بری ہیں اور اگر کسی کے کلام میں جنت و دوزخ سے بے پروائی ظاہر ہوتی ہے تو اُس سے مراد بے التفاتی ہے نہ کہ دعویٰ استغناء اور اگر کسی کے کلام میں دعویٰ ہی ہو تو وہ غلبہ حال پر محمول ہے۔ بہرحال صوفیہ کا مذاق یہ ہے کہ وہ محض حقِ عظمت کے ادا کی نیت کرتے ہیں اور توجہ الی الحق کے وقت کسی غرض پر التفات نہیں کرتے۔ نہ ثمرات کے طالب ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اس پر بھی راضی ہیں۔ کہ عمل پر کچھ ثمرہ نہ ملے۔

مذاقِ عشاق

ان حضرات کی اور دوسرے عابدوں کی ایسی مثال ہے جیسے ایک حسین جمیل محبوب نے دعوت کی ہو لوگ یہ سمجھ کر چلے کہ دعوت بھی کھائیں گے اور اس کی صورت بھی دیکھیں گے۔ پھر سب کے مجتمع ہونے کے بعد وہ یہ کہہ دے کہ دعوت نہیں محض جلوہ ہے تو شکم پرور تو یہ سُن کر لوٹ آئیں گے اور عشاق ہرگز نہ ٹلیں گے کیونکہ وہ تو محض جلوہ ہی کے مشتاق ہیں۔ وہ محبوب کو دیکھ کر پھر کسی چیز کی طرف التفات نہیں کرتے۔ عشاق کا تو مذاق یہ ہے کہ اگر ان کو یقیناً معلوم ہو جائے کہ ہم جنت میں نہ جائیں گے جب بھی وہ عمل میں کوتاہی نہ کریں گے اور یوں کہیں گے ؎

ملنے کا اور نہ ملنے کا مختار آپ ہے پر تجھ کو چاہئے کہ تگ و دو لگی رہے

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض حق عظمت ادا کرتے ہیں اور طالب ذات ہیں وہ ثمرات کے لئے عمل نہیں کرتے۔ بلکہ یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ ذاتِ حق کے کمالات کا اقتضاء یہی ہے کہ ان کی طرف متوجہ رہا جائے۔

درجاتِ توجہ

آگے اس توجہ کے چند درجے ہیں۔ ایک توجہ الی الصفات اور ایک توجہ الی الذات۔ توجہ الی الصفات کہ سمیع علیم، بصیر کا تصور کیا جائے جیسا کہ مشائخ بعض کو

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى (کیا اس شخص کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے) کا مراقبہ بتلایا کرتے ہیں اور توجہ الی الذات یہ ہے کہ محض ذات کا تصور ہو کہ اس وقت صفات پر بھی نظر نہ ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کو تصور بالکنہ ہوتا ہے یہ تو محال ہے ۔

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں کایں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

(جال اٹھائے عنقا کسی کے جال میں نہیں پھنستا کہ اس جگہ ہمیشہ جال میں ہوا کے سوا کچھ نہیں آتا)

بلکہ جس کو بھی ہوتا ہے۔ تصور وجہ کا ہوتا ہے۔ مگر وہ وجہ کو مرآۃ ذات کا بناتا ہے۔ اور ملتفت الیہ خود ذات ہوتی ہے بس یہی توجہ الی الذات ہے اور ایسے تصور کے لئے کنہ کا علم شرط نہیں اور یہ ممکن بھی ہے۔ آخر اتنی بات کا تو ہر شخص حکم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہیں اور تمام کائنات کے وہی خالق ہیں اور ظاہر ہے کہ اس حکم کے وقت تصور موضوع کا ضروری ہے۔ پس یہی درجہ تصور کا توجہ الی الذات کا کافی ہے۔ بس اسی موجود کی طرف ذہن کو متوجہ کرلو۔ یہی سرسری التفات کافی ہے اور اگر اس سے زیادہ بھی کچھ ہوا تو وہ بھی ناقص ہی ہوگا کیونکہ حق تعالیٰ وراء الوراء ہیں۔ وہ تمہارے تمام تصورات سے پاک ہیں۔

کل ما خطر ببالک فھو ھالک واللہ اجل من ذٰلک

پھر اس تصور میں بھی درجات غیر متناہی ہیں۔ ہر شخص کا تصور الگ ہے اور دوسرا اُس سے بھی آگے پہنچا ہوا ہے ۔

اے برادر بے نہایت در گہیست ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

(بھائی صاحب اس کی درگاہ کے اختتام کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ جس منزل پر تیری رسائی ہو اسی پر قناعت کر)

مگر ان میں سے تصور کامل کسی کا نہیں۔ بلکہ سب کا تصور ناقص ہی ہے۔

نفع مراقبہ

رہا یہ کہ جب سب کا تصور ناقص ہے تو صوفیہ کو مراقبات سے کیا نفع ہوا۔ تصور ناقص تو عوام کو بھی حاصل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مراقبات کا نفع یہ نہیں ہے کہ ان سے تصور کامل ہوتا ہے۔ بلکہ یہ نفع ہے کہ ان سے تصور ناقص راسخ ہوجاتا ہے۔ اور اسی رسوخ میں مشائخ عوام سے ممتاز ہیں۔ سو عوام سے ہم کو یہ شکایت نہیں کہ اُن کو تصورِ حق کامل طور پر کیوں نہیں ہے۔ بلکہ شکایت اس کی ہے کہ یہ تصور ناقص راسخ کیوں نہیں ہے۔ کہ کسی وقت تو خدا تعالیٰ کی یاد ہے اور کسی وقت غفلت ہے اور رسوخ ذکر کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ذات بحت کا تصور راسخ ہو جائے اور یہ پیدا ہوتا ہے کثرتِ ذکر سے مع تصور ذات بحت کے۔

ذکر اِسم ذات

اور اگر ذکر میں بھی صرف اسم ذات کا ذکر اختیار کیا جاوے تو اہلِ طریق کے تجربہ سے

اُس تصور کا زیادہ معین ہوتا ہے۔ جس کو بعض علماء بدعت کہتے ہیں۔

چنانچہ علامہ ابن تیمیہ نے بھی ایک رسالہ میں ذکر اسم ذات کو بدعت لکھا ہے اور اُن کے مقابلہ میں بعض بے علم صوفیہ نے اس کو ثابت بالقرآن اور ثابت بالسنۃ کہہ دیا ہے۔ چنانچہ بعض نے قرآن سے اس ذکر کو ثابت کیا ہے۔ اور وہ دلائل ایسے کمزور ہیں کہ اُن کو ہم خود بھی رد کر دیتے ہیں۔ ابن تیمیہ تو کیوں ردّ نہ کرتے وہ تو بڑے محتاط ہیں۔ متشدد کا لفظ نہ کہوں گا۔ کیونکہ خلاف ادب ہے چنانچہ بعض صوفیہ نے اس کو

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِم يَلْعَبُوْنَ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے پھر انکوان کے مشغلہ میں بیہودگی کے ساتھ لگا رہنے دیجئے)

سے ثابت کیا ہے کہ دیکھو اس میں حکم ہے کہ اللہ کہو نہ مبتداء ہے نہ خبر ہے بس صرف اللہ۔ کہنے کا امر ہے اُن سے کوئی پوچھے کہ پھر اَللّٰهُ کو نصب کیوں نہ ہوا رفع کیوں ہے۔

اوّل اس کے سباق کو دیکھو پھر سبق پورا ہوگا۔ اوپر ایک آیت میں ذکر ہے مقولہ کفار کا وہ آیت یہ ہے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ

(ان لوگوں نے جیسا اللہ کی قدر پہچاننا واجب تھی ویسی قدر نہ پہچانی جبکہ یوں کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی)

وہ کہتے تھے کہ خدا نے بشر پر وحی کبھی نازل نہیں کی۔ حق تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں۔

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِيْرًا وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ.

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ علیہ السلام لائے تھے کہ وہ نور ہے اور لوگوں کیلئے ہدایت ہے جس کو تم نے متفرق اوراق میں چھوڑا ہے جن کو ظاہر کر دیتے ہو اور بہت سی باتوں کو چھپاتے ہو اور تم کو بہت سی باتیں تعلیم کی گئی ہیں نہ جانتے تھے نہ تمہارے باپ دادا)

جواب کا حاصل یہ ہے کہ کہ اگر انسان پر خدا نے کچھ نازل نہیں کیا تو بتلاؤ وہ کتاب کس نے نازل کی تھی جو موسیٰ علیہ السلام لائے تھے۔ جس میں لوگوں کے لئے نور و ہدایت ہے۔ یہ جواب اس لئے دیا گیا کہ

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ (اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی) کہنے میں یہود بھی مشرکین کے ہمنوا ہو گئے تھے۔ حالانکہ دونوں کا مسلک جُدا جُدا تھا۔ مگر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے دونوں متحد ہو گئے تھے۔ گویا کچھ دنوں کو ہندو مسلم کا سا اتحاد ہو گیا تھا۔ مگر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ صاحب حق صاحب باطل میں مدغم ہو جاتا ہے۔ صاحب باطل اہل حق میں مدغم

نہیں ہوتا۔ اوراس کا راز یہ ہے کہ حق دشوار ہے کیونکہ نفس کے خلاف ہے۔ اور باطل سہل ہے اس لئے کہ وہ نفس کے موافق ہے اور اتفاق اس طرح ہوتا ہے کہ ایک اپنے مسلک کو کسی قدر چھوڑے تو صاحب باطل سہل کو چھوڑ کر دشوار کو کیوں اختیار کرے۔ اس لئے اتحاد کا یہی انجام ہوتا ہے کہ صاحب حق کو کسی قدر اپنا مسلک چھوڑنا پڑتا ہے چنانچہ یہاں بھی اتحاد ہندو مسلم کا یہی انجام ہوا تھا کہ کفار تو اپنے مذہب سے ذرا بھی نہ ہٹے اور مسلمان اتحاد کی خاطر کہیں سے کہیں پہنچ گئے اور یہی انجام یہود و مشرکین کے اتحاد کا ہوا کہ یہود بعض ایسے اقوال میں مشرکین کے ہمنوا ہو گئے جو خود ان کے مذہب کے بھی خلاف بلکہ اُن کے مذہب کی بنیاد منہدم کرنے والے تھے۔ جیسے یہی دعویٰ کہ حق تعالیٰ نے بشر پر کبھی کچھ نازل نہیں کیا جس سے لازم آتا ہے کہ توراۃ بھی خدا کی نازل کی ہوئی کتاب نہیں۔ حق تعالیٰ نے یہود سے یہی سوال کیا ہے کہ ہاں ذرا یہ تو بتلاؤ کہ توراۃ کو موسیٰ علیہ السلام پر کس نے نازل کیا ہے؟ یہ سوال قائم کر کے پھر خود ہی جواب دیتے ہیں قُلِ اللّٰهُ ای قُلْ اَنْزَلَهُ اللّٰهُ۔ یعنی کہہ دیجئے کہ خدا ہی نے اس کو نازل کیا۔ اب سباق پر نظر کر کے اُن بے علم صوفیہ کے قول کو دیکھا جائے جو اس کے معنی یہ کرتے ہیں کہ اللہ اللہ کہو۔

دوسرے یہ کہ تفسیر قرآن میں قواعد عربیہ ہرگز متروک نہیں ہو سکتے اور قاعدہ عربیہ یہ ہے کہ قول کا مفعول جملہ ہوتا ہے جس کو مقولہ کہتے ہیں۔ مفرد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے لامحالہ قُلْ کا مقولہ صرف لفظ اللہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لئے مبتداء یا خبر یا فعل مقدر ماننا پڑے۔ اگر قواعد عربیہ کا لحاظ نہ کیا جائے تو پھر ہر شخص جو چاہے قرآن کی تفسیر کر دے گا۔ جیسے ایک جاہل نے کہا تھا کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ کے معنی یہ ہیں من ذل جس نے ذلیل کیا ذل کو بمعنی اذل لیا۔ اول تو یہی حماقت۔ آگے فرماتے ہیں ذی اس نفس کو یشف وہ شفا پائے گا۔ کوئی پوچھے کہ فا کو فتح کیوں ہوا اور اس کے معنی شفا پائے گا کدھر سے ہوئے۔ بلکہ یشف بسکر فاء کے معنی ''تو شفا دے گا'' ہیں۔ اس کے بعد کہتے ہیں ع اس کو یاد رکھو اس احمق سے کوئی پوچھے کہ عٓ میں عین کو ضمہ کیوں ہوا یاد رکھنے کے معنی ہیں۔ وعی یعی آتا ہے جس سے امر کا صیغہ عٓ بکسر العین ہے۔ مگر شاید تے کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے ع ع کہا۔

اب یہ کوئی تفسیر ہے ہرگز نہیں۔ بلکہ صریح تحریف ہے جو قواعد عربیہ اور رسم خط کے بالکل خلاف ہے۔ مگر جہلاء میں یہ باتیں رموز میں شمار ہوتی ہیں۔ جیسے ایک فقیر نے ماموں صاحب سے کہا تھا کہ بتلاؤ رزق بڑا یا محمد۔ اُنہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہیں کیونکہ آپ اوّل کائنات ہیں تو کہا بے پیرا معلوم ہوتا ہے۔ پھر خنکا سر پر گھما کر کہا دیکھو۔

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً ارَّسُوْ لُ اللّٰه.

اَنَّ پہلے آیا محمد پیچھے آیا۔ اور اَنَّ کہتے ہیں ہندی میں اناج کو۔ تو رزق کا رتبہ بڑا ہوا۔

رسوخ مدلول ذکر

اسی طرح ایک فقیر نے وَالضُّحٰی کی تفسیر کی تھی۔ وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی۔ اے نفس تیری یہی سجا (سزا) تو ایسے ایسے استدلات واقعی لغو ہیں۔ ابن تیمیہ اگر زد نہ کرتے کیا کرتے۔ مگر محققین صوفیہ اس کا اصل صحیح منشاء بتلا سکتے ہیں۔ وہ اسم ذات کے ذکر کو ذکر مسنون اور ثابت بالقرآن نہیں کہتے۔ بلکہ اس کے اختیار کا منشاء یہ ہے کہ اصل مقصود اس ذکر سے اس کے مدلول کا رسوخ فی القلب ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ رسوخ کے لئے تکرار مؤثر ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے تجربہ کافی ہے۔ نقل ضروری نہیں۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ رسوخ کے ذریعے جو طریقہ اختیار کیا جائے وہ طریقہ سنت سے ثابت ہو۔ مثلاً میں نے آج نماز فجر کے بعد ایک شخص کو تلاوت کرتے ہوئے سُنا وہ

اِذَ االسَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (جب آسمان پھٹ جائے گا، پھٹ جائے گا، پھٹ جائے گا) پڑھ رہا تھا۔ طاء اپنے مخرج سے صاف نہ نکلی تو وہ فطرت فطرت کو مکرر کہہ رہا تھا۔ اب میں پوچھتا ہوں کیا اس کا فَطَرَتْ فَطَرَتْ کہنا بدعت تھا۔ اگر یہ بدعت ہے تو دنیا سے حفظ قرآن اور تجوید قرآن کا علم ہی اُٹھ جائے گا اور ان دونوں کی تحصیل غیر ممکن ہو جائے گی۔ کیونکہ حفظ کے لئے بعض دفعہ ایک کلمہ کا تکرار ضروری ہوتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ جزوکلمہ کو تکرار کیا جاتا ہے۔ اب اگر ان کو اسی پر مجبور کیا جائے کہ پوری آیت کا تکرار کیا کرو۔ ایک کلمہ یا جزوکلمہ کو مکرر کیا کرو تو حفظ اور تجوید دُشوار ہو جائیں گے۔ اور یا ان سب کو تکرار کلمہ وجز کلمہ سے گنہگار کہنا پڑے گا۔ ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ ابن تیمیہ ایسے غیر محقق ہیں کہ جو فَطَرَتْ فَطَرَتْ کے تکرار کو بھی حرام کہیں گے۔ ہاں یہ مسلم کہ اس صورت میں فَطَرَتْ فَطَرَتْ کا تکرار تلاوت قرآن میں داخل نہ ہوگا۔ مگر تہیؤ للتلاوۃ میں تو ضرور داخل ہے۔

حضرات صحابہؓ اور ذکر

ہاں یہ سوال کہ صحابہؓ سے رسوخ کے لئے یہ ذکر اللہ اللہ کیوں ثابت نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ سے فَطَرَتْ فَطَرَتْ (پھٹ جائیگا پھٹ جائیگا) کہنا بھی کہاں ثابت ہے۔ تو کیا عدم ثبوت کی وجہ سے تم اس کو حرام کہہ دو گے اور جب یہ حرام نہیں تو عدم ثبوت کی بناء پر اللّٰہ اللّٰہِ کو بدعت کیوں کہا جاتا ہے۔ بات یہ کہ صحابی کی استعداد کامل تھی۔ ان کو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہی میں توجہ کامل ہو جاتی تھی۔ اس لئے وہ اختصار کے محتاج نہ تھے۔ اور ہماری توجہ بدوں ایک ایک کلمہ کے تکرار کے کامل نہیں ہوتی۔ جیسے بعض لوگ تو پوری آیت کا اعادہ کر کے اُس کو یاد کر لیتے ہیں۔ اُن کو ایک ایک کلمہ کے تکرار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور بعض لوگ پوری آیت کے تکرار سے حفظ نہیں کر سکتے۔ اُن کو ایک ایک بلکہ بعض دفعہ جزوکلمہ کے اعادہ کی حاجت ہوتی ہے۔ اور یہ بالاتفاق جائز ہے چنانچہ حفاظ کو عموماً اسی پر عمل ہے اور کسی نے آج تک اس کو حرام یا گناہ یا بدعت

نہیں کہا۔ حالانکہ صحابہ سے یہ صورت بھی کہیں ثابت نہیں۔ پھر اگر ذکر اللہ اللہِ کو اسی غرض سے اختیار کیا جائے تو وہ بدعت و حرام کیوں ہو جائے گا۔ ہاں ایک بات البتہ لازم آئی وہ یہ کہ اس صورت میں اللہ اللہِ کہنا ذکر نہ ہوا۔ جیسے فَطَرَتْ فَطَرَتْ کہنا تلاوت نہیں۔ سو یہ ہم کو مسلم ہے۔ بے شک یہ ذکر نہیں مگر بحکم ذکر ضرور ہے کیونکہ یہ تہیؤ للذکر ہے۔ اور جو شخص مقدمات ذکر میں مشغول ہے۔ وہ گو حقیقۃً ذاکر نہ ہو مگر حکماً ذاکر ضرور ذاکر ہے جیسے حدیث میں ہے کہ انتظار صلوٰۃ بحکم صلوٰۃ ہے۔ اور جو شخص سفر حج میں ہوا۔ اُس کے سب افعال بحکم حج ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِراً اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۔

(اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کے ارادہ سے نکلے پھر اس پر موت واقع ہو جائے تو اس کا اجر و ثواب اللہ کے ہاں ہے)

جس سے معلوم ہوا کہ جو شخص مقدمات ہجرت میں مشغول ہے وہ حکماً مہاجر ہی ہے۔ علیٰ ہذا۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے لئے گھوڑا پالے تو اس کا کھانا پینا لید کرنا اور دوڑنا بھاگنا سب میزان عمل میں حسنات شمار ہوگا۔ گویا اسی وقت سے یہ شخص حکماً مجاہد ہو گیا۔ پھر استعداد و رسوخ ذکر کے لئے اللہ اللہِ کرنا یا ذکر اِلَّا اللہ کرنا بحکم ذکر کیوں نہ ہوگا۔ صاحب اگر آپ سے کوئی شخص یہ پوچھے کہ یہ کھانا کتنے میں تیار ہوا ہے۔ تو اُس وقت آپ حساب میں سوختہ کی قیمت بھی شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ سوختہ کھانے کی چیز نہیں۔ مگر اسی واسطے حساب میں شمار کرتے ہیں کہ وہ مقدمات میں داخل ہیں۔

اجر ذکر

پس میں نے جو اوپر کہا ہے کہ اللہ اللہِ کرنا ذکر نہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس پر ثواب ذرہ بھی نہ ملے گا۔ بلکہ صرف یہ مطلب ہے کہ وہ ذکر حقیقتاً نہیں۔ ذکر حقیقۃً وہی ہے جو سنت سے ثابت ہے باقی رہا ثواب سو اس کے لئے ذکر ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ وہ تو بعض اوقات محض رحمت سے ضد پر بھی مل جاتا ہے۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں ایک بندہ حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگا۔ حق تعالیٰ اپنے انعامات جتلا کر اُس کے گناہ جتلا کر اُس کے گناہ اُسے یاد دلائیں گے۔ کہ تو نے فلاں دن ایسا کیا اور ایسا کیا۔ اور اوّل چھوٹے چھوٹے گناہ گنائیں گے وہ بڑا گھبرائے گا کہ یہ تو چھوٹے گناہ ہیں اگر بڑے گناہوں کا تذکرہ ہوا تو پھر کیا حال ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ اوّل اُس کے چھوٹے چھوٹے گناہ جتلائیں گے پھر ارشاد ہوگا۔ اچھا جاؤ ہم نے تم کو بخشا۔ اور ہر گناہ کے عوض ایک حسنہ دیا۔ اب وہ بندہ خود اپنے گناہوں کو بیان کرے گا۔ کہ اے

الٰہ! میں نے تو اور بھی گناہ کئے ہیں جو ان سے بڑے ہیں ان کا تو یہاں تذکرہ بھی نہیں ہوا۔ مجھے اُن کے عوض بھی نیکی دلوایئے۔ غرض ثواب کا کچھ ضابطہ نہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کے فضل پر ہے۔ وہ ذکر پر بھی ثواب دیتے ہیں اور غیر ذکر پر بھی ثواب دے سکتے ہیں۔ تو محققین صوفیہ نے اس راز کو سمجھا کہ اللہ اللہ کرنا گو ذکر نہیں۔ مگر مقصود کے لئے تیار ہونا ہے تو اس واسطے بحکم ضرور ہے۔

مشاہدہ و معائنہ

پس جس طرح ایک قسم توجہ کی یہ تھی کہ صفات کا تصور کیا جائے اور اس کو مشاہدہ کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک قسم اُس کی یہ ہے کہ ذات بحت کا تصور کیا جائے اور اس کو معائنہ کہتے ہیں جس کے ذکر اسم ذات ایک سہل طریقہ ہے۔

اور یہ مشاہدہ و معائنہ اصطلاحی الفاظ ہیں اس سے یہ مت سمجھنا کہ یہ فقیر لوگ خدا تعالیٰ کو دیکھتے ہیں۔ کیونکہ صحیح مسلم میں حدیث موجود ہے۔

اِنَّكُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّكُمْ حَتّٰى تَمُوْتُوْا (مرنے سے پہلے تم حق تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے) کہ مرنے سے پہلے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے اور یہ جو بعض جہلاء نے اس کے جواب میں کہا ہے۔ قَدْ مِتْنَا فَرَاَيْنَا رَبَّنَا کہ ہم تو مر چکے۔ اس لئے ہم خدا تعالیٰ کو یہیں دیکھ لیتے ہیں اور موت سے مراد وہ موت لی ہے جو مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا میں ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ معنی موت کے صوفیوں کی خاص اصطلاح ہے اور قرآن و حدیث صوفیوں کی اصطلاح میں وارد نہیں ہوئے۔ مگر آج کل یہ الٹا دستور نکلا ہے کہ قرآن و حدیث کو اپنی اصطلاح کے تابع کرتے ہیں۔

جیسے ایک جاہل نے کہا تھا کہ یہ مولوی جو فاتحہ کا انکار کرتے ہیں بڑے جاہل ہیں۔ دیکھو خود قرآن میں ایک خاص غرض کے واسطے اتری ہے اور اسی واسطے اس کا نام سورۃ فاتحہ ہے۔ واہ رے جاہل! ارے یہ احتمال ہی نہ ہوا۔ کہ اس اختراعی عمل کا نام فاتحہ اس صورت کے نام پر رکھ لیا ہو۔

اسی طرح ایک جاہل نے قرآن میں جو سُلْطَانًا نَّصِيْرًا وَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا آیا ہے۔ اُس کو صوفیہ کے بعض اشغال کا نام سمجھا ہے۔ اب کوئی اس سے پوچھے کہ جس جگہ قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں وہاں ان کے مراد ہونے کے بعد مطلب بھی کچھ بن سکتا ہے۔ اسی طرح حدیث اِنَّكُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّكُمْ حَتّٰى تَمُوْتُوْا میں لغوی موت مراد ہے۔ اصلاحی موت مراد نہیں۔ پس مشاہدہ و معائنہ سے رویت کے قبل الموت کا دھوکہ نہ کھایا جاوے۔ اُس میں اصطلاحی معنی مراد ہیں یعنی توجہ الی الصفات و توجہ الی الذات اور رویت مراد نہیں۔

اور مسئلہ کی موٹی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ ممکن ہوتا تو ان صوفیوں سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام اس کے مستحق تھے۔ اور نص میں تصریح ہے کہ اُن کو رویت نہیں ہوئی۔ قَالَ لَنْ تَرَانِیْ اور اس کے بعد جو ارشاد ہے۔

وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرَانِیْ

(لیکن پہاڑ کی طرف نظر کر اگر پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہا تو تم عنقریب مجھے دیکھ لوگے)

اس میں رویت کو ایک شرط سے مشروط کیا ہے۔ یعنی استقرار جبل سے اور آگے تصریح ہے کہ جبل مستقر نہیں رہا۔ اس سے بھی مشروط کی نفی ہوگئی۔

ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں رویت ہوئی ہے اور وہ حدیث مذکور کے خلاف نہیں کیونکہ حدیث میں اس عالم کا حکم مذکور ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے عالم میں رؤیت ہوئی ہے۔ کیونکہ فوق السمٰوٰت عالم آخرت ہے یہ شیخ ابن عربی کی تحقیق ہے اور عجیب تحقیق ہے۔ (للّٰدرہ ۱۲) وہ فرماتے ہیں کہ زمان آخرت تو مستقبل ہے لیکن مکان آخرت فی الحال حاضر ہے۔

شعراء کی بیباکی

آگے شعراء کی یہ زیادتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیت اور موسیٰ علیہ السلام کی عدمِ رؤیت میں موازنہ کرتے ہیں اور بُری طرح موازنہ کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جملہ انبیاء پر فضیلت ہے۔ مگر اس طرح موازنہ کرنا منہی عنہٗ ہے جس سے دوسرے حضرات کی تنقیص کا ابہام ہو جیسے ایک شاعر نے کہا ہے

موسیٰؑ ز ہوش رفتہ بیک جلوۂ صفات ۔۔۔ تو عین ذات می نگری در تبسمی

(حضرت موسیٰ علیہ السلام صفات کی ایک ہی تجلی میں ہوش کھو بیٹھے اور تو عین ذات کو دیکھ کر بھی مسکراتا رہا)

اول تو اس شاعر کو جلوۂ صفات و جلوۂ عین ذات کی تقسیم کا کیا حق تھا۔ کیا وہ دونوں جلوؤں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو وجہ فضیلت ظاہر کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰ علیہ السلام کی طرح تجلی کے وقت بے ہوش نہیں ہوئے۔ حالانکہ جس عالم میں موسیٰ علیہ السلام پر تجلی ہوئی تھی دنیا میں ممکن ہے۔ وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی بے ہوش ہو جاتے۔ جیسے دنیا میں آپ جبرئیل علیہ السلام کو بھی دیکھ کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ اور جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بے ہوش نہیں ہوئے یعنی عالم آخرت وہاں ممکن ہے۔ موسیٰ علیہ السلام بھی بے ہوش نہ ہوتے یہ تو ہر عالم کا الگ الگ اثر ہے یہ شعراء بڑے بیباک ہوتے ہیں۔ بعض شعراء تو اپنے

محبوب کو مدح میں انبیاء علیہم السلام سے بڑھا دیتے ہیں۔ جیسے ایک شاعر کہتا ہے ؎

برآسماں چہارم مسیح بیمار است — تبسم تو برائے علاج درکار است

(چوتھے آسمان پر عیسیٰ علیہ السلام بیمار ہیں اُنکے علاج کے لئے تیرا تبسم درکار ہے)

عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام پر شعراء کی سب سے زیادہ مشق ہے اور یہ محبوبوں کی مشق میں اتنا مبالغہ کرتے ہیں جو حد سے نکل جاتا ہے

کرانہ میں ایک حکیم علی اکبر صاحب تھے۔ اُنہوں نے بعض اشعار سُن کر خوب جواب دیا۔ ایک دفعہ اُن کے سامنے کسی نے نعتیہ غزل پڑھی۔ جس کے اخیر میں تھا۔ بُلا لو یَا رَسُوْلَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) تو حکیم صاحب کہتے ہیں کہ بے تمیز کہتا ہے بلالو یا رَسُوْلَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے نا بڑا لاڈلا بھیجیں گے تیرے واسطے پالکی تو کیوں نہیں چلا جاتا۔ ایک دفعہ کسی نے کہا ؎

فلک پر دھوم تھی احمد رسول اللہ آتے ہیں۔

فرمایا بالکل جھوٹ وہاں تو کسی کو بھی خبر نہ تھی۔ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ جب حضرت جبرائیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر آسمانوں پر پہنچے تو ہر آسمان کے دربانوں نے دروازے کھولنے سے پہلے سوال کیا۔

مَنْ قَالَ جِبْرِیْلُ وَ مَنْ مَّعَکَ قَالَ مُحَمَّدٌ قَالَ اُرْسِلَ اِلَیْهِ قَالَ نَعَم

یعنی تم کون کہا جبریل ہوں۔ پوچھا تمہارے ساتھ کون ہیں۔ کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پوچھا کیا آپ کے پاس معراج میں بلانے کو پیغام بھیجا گیا ہے۔ کہاں ہاں اتنے سوالوں کے بعد تو کواڑ کھلے تھے اور تو کہتا ہے کہ فلک پر دھوم تھی۔ رسول اللہ آتے ہیں جھوٹا ہے وہاں تو کسی کو کچھ بھی خبر نہ تھی۔ واقعی یہ شاعر تو محض تک بندی کا اتباع کرتے ہیں۔ جائز ناجائز سے کچھ بحث نہیں۔

گنگوہ میں ایک شاعر تھے ان کی یہ حالت تھی کہ نماز میں اگر کوئی مصرع موزوں ہو جاتا تو فوراً نماز توڑ کر اُسے لکھ لیتے اور یوں کہتے کہ نماز کی تو قضا ہے لیکن مصرع ذہن سے نکل جاتا تو اس کی قضا کیوں کر ہوتی۔

عطاء کی ناقدری

یہ مضمون شعراء کے متعلق تبعاً ذکر ہو گیا ہے۔ میرا مقصود یہ ہے کہ دنیا میں رؤیت حق شرعاً محال ہے۔ اور مشاہدہ و معائنہ یہ اصطلاحی الفاظ ہیں۔ معائنہ توجہ الی الذات کو کہتے ہیں اور توجہ الی

الذات کے معنیٰ یہ ہیں کہ التفات بالقصد صفات وغیرہ کی طرف نہ ہو گو بلا قصد کے سامنے آجائیں۔ جیسے لکھتے ہوئے زَیْدٌ قَائِمٌ میں سے صرف زید کو دیکھنا چاہیں تو قصداً الفظ زید کو دیکھیں گے تو تبعاً قائم بھی بلا قصد نظر آئے گا۔ کیونکہ اس کے پاس ہی ہے تو جب عشاق کی یہ حالت ہے کہ وہ خود ذات کا تصور اس طرح کرنا چاہتے ہیں کہ صفات کی طرف بھی نظر نہ ہو جو کہ ذات کے ساتھ لا عین لا غیر کا تعلق رکھتے ہیں اور مثل ذات کے قدیم ہیں تو وہ حق تعالیٰ کی طرف عطاواجر کی وجہ سے توجہ کریں گے اور اُن کی طرف اُن کو التفات کیونکر ہوگا۔ اس لئے کہ عطاء واجر تو افعال ہیں اور افعال حادث ہیں۔

غرض حق تعالیٰ کی طرف توجہ کرنا خود اُن کی عظمت کا حق ہے اگر چہ وہ ہماری طرف بھی توجہ نہ فرما دیں چہ جائیکہ ایک دوسرا مقتضی بھی موجود ہے۔ یعنی ان کا بندہ کی طرف توجہ فرمانا اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بتلا دیا کہ اگر تم حق عظمت کی وجہ سے متوجہ نہیں ہوتے دوسرے ہی مقتضی کی وجہ سے اُدھر متوجہ ہو جاؤ کیونکہ وہ خود تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس وقت تم بھی اُدھر نگاہ رکھو گے تو کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔ مگر افسوس ہم کو عطائے حق کی اتنی بھی قدر نہیں جتنی ایک لیڈر کو چار پیسوں کی قدر تھی۔

قصہ یہ ہے کہ پہلے یہ رسم تھی کہ دُلہن کے ڈولے پر منصوری پیسے بکھیرے جاتے تھے اور اس کے لوٹنے والے بھنگی ہوتے تھے اور بھنگی اس کام کے لئے دو لاٹھیوں کے بیچ میں کپڑا لے کر اس طرح بناتے تھے جیسے کشتی کا پردا ہوتا ہے۔ اور اس میں پیسوں کو روکتے تھے۔ تو جس زمانہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کا چندہ ہو رہا تھا اُس وقت جھنجانہ میں ایک لیڈر آئے اور یہاں اُنہوں نے یونیورسٹی کے لئے چندہ کی تحریک کی پھر اُسی زمانہ میں ایک شادی ہوئی اور دُلہن کے ڈولے پر پیسے بکھیرے گئے تو بھنگیوں کے ساتھ یہ لیڈر بھی اُن پیسوں کے لوٹنے میں شریک تھے۔ حالانکہ دُلہن والوں کو اُن کے پیسے دینا مقصود بھی نہ تھا۔ بلکہ بہت سوں کو اُن کی یہ حالت پسند بھی نہ تھی۔ مگر اُس نے پرواہ نہ کی اور یہ سمجھا کہ جب بکھیر ہوگی تو کوئی پیسہ تو میرے کپڑے میں بھی آہی گرے گا۔ غرض بھنگیوں کی طرح آپ بھی پیسے لوٹنے میں شریک ہوئے اور جو پیسے آئے ہیں وہ کالج کے چندہ میں داخل کئے۔ اس پر قوم نے بڑی مدح کی کہ یہ ایسے فدائے قوم ہیں کہ خدمت کالج کے لئے ذلت کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

واقعی مولوی اگر ایسی حرکت کریں تو ذلت ہے اور لیڈر کریں تو عزت ہے کیونکہ یہ جو کچھ کرتے ہیں شاندار لباس پہن کر کرتے ہیں اور مولوی جو کچھ کرتے ہیں معمولی لباس پہن کر کرتے ہیں۔ پھر

اس میں ایک اور لطیفہ ہوا۔ یہ لیڈر صاحب پیسے لوٹ کر جب نماز کے لئے مسجد میں آئے اور ایک شخص سے مل کر صف میں کھڑے ہونے لگے تو اُس نے کہا اُدھر ہٹو میرے کپڑوں سے کپڑے نہ ملانا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اُس وقت بھنگیوں کو پسینہ آ رہا تھا۔ اُن کے کپڑے سب تر تھے اور تم اُن کے کندھے سے کندھا ملائے ہوئے چل رہے تھے۔ خیر حکایت تو ہنسی کی ہے مگر مجھے یہ بتلانا ہے کہ ہم لوگوں کو عطائے حق کی اتنی بھی قدر نہیں جتنی اس لیڈر کو چار پیسوں کی قدر تھی کہ وہ اُن کے لوٹنے کو بھنگیوں کی طرح دامن پھیلائے ہوئے تھا۔ اور بھنگیوں کے ساتھ چلنے میں بھی عار نہ کرتا تھا۔

صاحبو! اسی طرح ہم کو چاہئے کہ ہر وقت حق تعالیٰ کے سامنے دامن پھیلائے رہیں۔ کیونکہ نہ معلوم کس وقت بکھیر ہونے لگے۔ اگر ہر وقت دامن پھیلائے رہو گے۔ تو انشاء اللہ کچھ نہ کچھ تمہارے دامن میں بھی ضرور ہی آ جائے گا۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی ۔۔۔ شاید کہ نگا ہے کند آگاہ نباشی

(ایک آن کے لئے بھی اس بادشاہ سے غافل نہ ہو بہت ممکن ہے کہ وہ نگاہِ کرم فرمائیں اور تو بے خبر رہے)

پھر اس لیڈر کو تو بھنگیوں کی رفاقت حاصل تھی اور تم کو رفاقت حاصل ہوگی۔ انبیاء و شہداء کی۔

اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ۔

(وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعامات فرمائے حضرات انبیاء علیہم السلام، صدیقین اور شہداء اور نیک لوگوں کے ساتھ)

سبقت توجہات

اب میں مثنوی کے چند اشعار پڑھتا ہوں۔ مولانا نے اُن میں اسی حدیث کا ترجمہ کیا ہے۔ دفتر اوّل داستان پیر چنگی کے قصہ میں فرماتے ہیں ؎

گفت پیغمبر کہ نفحتہائے حق ۔۔۔ اندریں ایام می آرد سبق

(نبی نے فرمایا کہ عنایاتِ حق تعالیٰ ان دنوں میں تمہاری طرف سبقت کرتی ہیں)

یعنی حق تعالیٰ کی توجہات ہماری طرف سبقت کرتی ہیں ؎

گوش ہشد ارید ایں اوقات را ۔۔۔ دررہائیدایں چنیں نفحات را

(ان اوقات کا خاص خیال رکھو اور سبقت کر اسقم کی خوشبوؤں کے حاصل کرنے کی)

یعنی اُن نفحات کو حاصل کرو ؎

نفحۂ آمد شمارا دید و رفت ہر کرامی خواست جاں بخشید و رفت

تم پرعنایت کی گھڑی آئی اور گزر گئی جو شخص اس کا جویاں تھا اس کو جاوید زندگی بخش گئی)

یعنی ایک نفحہ اور ایک توجہ ہوئی اور جس میں اُس نے طلب دیکھی اس کو جان بخش دی۔ یعنی اُس کی روح کو تازگی دیدی یا اُس میں جان ڈال دی اور چل دیا۔ ایک تم غافل تھے تم محروم رہ گئے۔ آگے غافلوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ ایک نفحہ سے محروم رہ گئے تو نفحہ ثانیہ کی طرف توجہ کرو اور اس کو ہاتھ سے نہ دو ۔

نفحۂ دیگر رسید آگاہ باش تا ازیں ہم وانہ مانی خواجہ باش

(ایک جھونکا توجہ الٰہی کا پھر آیا خبردار رہ تاکہ اس مرتبہ بھی عاجز نہ رہ جائے اپنے ہم مشربوں سے)

یہ حضرات زبان فہم ہیں چونکہ حدیث میں نفحات اور ساعات بصیغہ جمع وارد ہے جس سے تکرار مفہوم ہوتا ہے کہ مختلف اوقات میں مختلف توجہات ہوتی ہیں۔ اس لئے مولانا نے نفحۂ دیگر رسید فرمایا۔

تاثیر توجہ

آگے اس نفحۂ کی تاثیر و فیض کو بیان کرتے ہیں اور اس کی کیفیت کو ۔

جاں آتش یافت زاں آتش کشے جاں مُردہ یافت از وے جنبشے

(جاں نے گرمی پائی اس آگ بجھانے والے سے جاں مردہ نے بھی اس سے حرکت حاصل کی)

جاں ناری یافت از وے الطفا مردہ پوشید از بقائے او بقاء

(سوختہ جاں نے اس سے ٹھنڈک پائی اس سراپا زندگی سے مردہ نے بھی لباس زندگی حاصل کرلیا)

تازگی و جنبش طوبیٰ ست ایں ہمچو جنبشہائے خلقاں نیست ایں

(یہ تازگی اور زندگی کیفیت سے مسرت ہیں اور یہ (حرکت دنیا) مخلوق کے افعال کی طرح نہیں ہیں)

یعنے حق تعالیٰ کی نفحات میں حادث و مخلوق کی طرح جنبش و حرکت نہیں وہ ان آثار سے پاک ہیں۔ آگے اثر کا بیان ہے ۔

گر در افتد در زمین و آسماں زہرۂ شاں آب گرد و در زماں

(اگر توجہات الٰہیہ زمین و آسمان پر نزول فرماویں تو اس وقت ان کا پتہ پانی ہوجاوے)

یعنی اگر یہ توجہ پہاڑ وغیرہ پر ہوجاتی تو اُن کا پتہ پانی ہوجاتا یہ اشارہ ہے آیت۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ

کی طرف ۔ کہ اگر یہ قرآن پہاڑ پر نازل ہوتا کہ وہ بھی حق تعالیٰ کی ایک توجہ ہے تو وہ خوف الٰہی سے پست ہو جاتا۔ اور پھٹ جاتا۔

یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ جب قرآن میں یہ اثر ہے تو انسان پر یہ اثر کیوں ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسان میں تاثر کی استعداد نہیں تو اس صورت میں اس کا عذر تو ظاہر ہے۔ مگر سیاق آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون انسان کو غیرت دلانے کے لئے سُنایا گیا ہے۔ کہ تم ایسے سنگدل ہو کہ قرآن سُن کر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ حالانکہ وہ اگر پہاڑ پر نازل ہوتا تو اُس کی یہ حالت ہو جاتی ۔ تو اگر انسان میں تاثر کی استعداد نہیں تو اس حالت میں غیرت دلانا بیکار ہوگا۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھ میں یہ استعداد ہوتی تو میری بھی وہی حالت ہوتی ۔ اور اگر انسان میں استعداد تاثر ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اُس پر یہ اثر کیوں ظاہر نہیں ہوتا۔

جواب یہ ہے کہ انسان میں تاثر کی استعداد تو موجود ہے ۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس میں تحمل کی قوت بھی پہاڑ سے زیادہ ہے۔ اگر پہاڑ پر حق تعالیٰ کا کلام نازل ہوتا تو اُس میں خشوع تاثر کے ساتھ انشقاق و تصدع بھی ہوتا ۔ کیونکہ اُس میں قوت تحمل نہیں ہے۔ تم میں اگر بوجہ تحمل و انشقاق و تصدّع نہیں ہے۔ تو کم از کم تاثر و خشوع تو ہونا چاہئے۔ تو شکایت اس کی نہیں کہ قرآن سُن کر تمہارے دل پھٹ کیوں نہیں گئے ۔ بلکہ شکایت اس کی ہے کہ خشوع کیوں نہیں پیدا ہوا۔

اور انسان میں قوت تحمل کا جبال سے زائد ہونا دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۔

(بلاشبہ ہم نے یہ امانت (احکام) آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی بس انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا تھا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اپنے ذمہ لے لیا بیشک وہ ظالم ہے)

اسی کو عارف اسی طرح فرماتے ہیں ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

(جس بار امانت کو زمین و آسمان نہ اٹھا سکا اُس کا قرعہ میرے جیسے دیوانہ کے نام نکل آیا)

دوامِ توجہ

بہر حال مولانا نے اس جگہ ان نفحات کی تاثیر بیان کر کے یہ فرمایا ہے کہ ہم کو ان توجہات کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ شکایت اس کی ہے کہ ہم حق تعالیٰ سے غافل ہیں۔ حالانکہ ہم کو ہر وقت ان کی طرف دائمی توجہ رکھنا چاہئے تھی۔ کیونکہ ان نفحات سے متمتع وہی ہوسکتا ہے جو ہر وقت ادھر متوجہ رہے اس لئے کہ ان کا کوئی خاص وقت معین نہیں۔

اس پر اگر کوئی یہ کہے کہ حق تعالیٰ کی طرف دائمی توجہ کیونکر رہے کیا کھائیں پئیں نہیں اور بیوی بچوں کو چھوڑ دیں کیونکہ دائمی توجہ تو اس طرح ہوسکتی ہے کھانے پینے اور بیوی بچوں میں لگنے کے ساتھ توجہ دائمی حق تعالیٰ کی طرف سے کیونکر ہو تو میں کہتا ہوں کہ ابھی طاعون کا زمانہ گزرا ہے۔ انصاف سے بتلاؤ اس زمانہ میں اگر اپنے کسی عزیز کی بیماری کی اطلاع آئی تھی اور جانے میں دو چار دن کی دیر ہوگئی تو یہ دن کیسے گزرے تھے۔ یقیناً دل ہر وقت اس عزیز کی طرف رہا تھا ۔گو ظاہر میں کھانا پینا بھی ہوتا تھا۔ یہاں آپ کو کبھی اشکال نہ ہوا کہ کھانے پینے کے ساتھ عزیز کی طرف دل کیونکر لگا رہا۔ بس بات یہ ہے کہ اس کی محبت دل میں رچی ہوئی تھی۔ اس لئے کوئی کام بھی اس کی طرف توجہ قلب سے مانع نہ ہوا۔ خدا کی قسم پھر خدا کی قسم تم کو خدا تعالیٰ کی طرف دائمی توجہ رکھنے پر اشکال صرف اسی واسطے ہے کہ تم نے خدا تعالیٰ کو اپنے دل میں رچایا نہیں اگر وہ دل میں رچ جاتے تو پھر تمہارے نکالنے سے بھی نہ نکلتے۔ دیکھو آمدن کے معنے تمہارے دل میں جمے ہوئے ہیں۔ بھلا اس کو کوئی بُھلا تو دے۔ ہرگز نہیں بُھلا سکتا۔ تو صاحب جو چیز دل میں جم جاتی ہے وہ نکالنے سے بھی نہیں نکل سکتی۔ بس شکایت اسی کی ہے کہ تم نے خدا تعالیٰ کو اپنے دل میں اتنا بھی نہیں رچایا۔ جتنا آمدن کے معنی کو رچا رکھا ہے۔

مرغوب و مرہوب

یاد رکھو دو چیزیں دل سے نہیں نکل سکتیں ایک مرغوب، ایک مرہوب۔ ہمارے اُستاد فرماتے تھے کہ شوق علم تپ دق ہے یا تو ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے تو پھر دل سے نکلتا نہیں تو یہ شوق علم جنم روگ ہے۔ بلکہ محبت و رغبت کسی شئے کی ہو جنم روگ ہی ہے۔ جب کسی سے ایک بار محبت ہو جاتی ہے پھر وہ مرتے دم تک نہیں نکلتی ۔مگر محبت ہونا چاہئے۔

پھر اگر محبوب سے وصال بھی نہ ہو تو اس کے ذکر میں وہ لذت آتی ہے کہ یاد ہی کافی ہو

جاتی ہے۔ لیلیٰ کا قصہ ہے کہ وہ کسی وقت میں مجنوں کے سامنے آئی تو مجنوں نے اُس کو پہچانا نہیں
۔ پوچھا کون ہے کہ میں لیلےٰ ہوں مجنوں نے کہا۔

اِلَیْکَ عَنِّیْ فَاِنَّ حُبُّکَ شَغَلَنِیْ عَنْکَ

جاؤاب مجھے تمہاری ضرورت نہیں تیری محبت نے مجھے تیرے وصال سے مستغنی کر دیا۔
پھر یہ یاد دل میں ایسی پیوستہ ہوتی ہے کہ اگر اس سے روکا جائے تو وہ باز نہیں آتا۔ مجنوں ہی کا قصہ ہے کہ اُس کا باپ اُس کو مکہ معظمہ لے گیا۔ اور کہا کہ بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر دُعا کرو کہ خدا تیرے دل سے لیلیٰ کا خیال نکال دے تو وہ کہتا ہے ؎

یَا رَبِّ لَا تَسْلُبَنِّیْ حُبَّهَا اَبَدًا وَیَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ آمِیْنًا

(اے اللہ اُس کی محبت کبھی میرے دل سے مت نکالئے اللہ تعالیٰ اُس شخص پر رحم فرماوے جو اس پر آمین کہے)

اِلٰهِیْ تُبْتُ مِنْ کُلِّ الْمَعَاصِیْ وَلٰکِنْ حُبُّ لَیْلٰی لَا اَتُوْبُ

(اے اللہ میں تمام گناہوں سے معافی مانگتا ہوں لیکن لیلےٰ کی محبت سے توبہ نہیں کرتا۔)

جب عشق مجازی میں یہ کیفیت ہوتی ہے تو حق تعالیٰ کی محبت میں کیا حال ہونا چاہئے۔ حقیقت میں عارفین کو حق تعالیٰ سے محض اُن کے کمالات کی وجہ سے محبت ہوتی ہے۔ اگر اُن کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ہماری توجہ وطلب کے بعد بھی حق تعالیٰ توجہ نہ کریں گے یا وصال سے مشرف نہ فرمائیں گے۔ تب بھی وہ محبت وطلب سے نہیں رُکتے کیونکہ حق تعالیٰ کے کمال کا مقتضی ہی یہ ہے کہ اُن کو ہر حال میں چاہا جاوے اور یاد کیا جائے۔ بس عارفین تو ہر وقت زبان حال سے یوں کہتے ہیں ؎

ملنے نہ ملنے کا تو وہ مختار ہے آپ پر تجھ کو چاہئے کہ تگ و دو لگی رہے

چہ جائیکہ وہ خود سبقت فرماتے ہیں۔

مُراقبہ محبتِ حق

چنانچہ اس حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے اِنَّ لِرَبِّکُمْ فِیْ دَهْرِ کُمْ نَفَحَات اَلَا فتعرضوا لها ۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو متوجہ ہونے کا امر اس بناء پر فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ ساعاتِ دہر میں ہمارے اوپر خود توجہ فرماتے رہتے ہیں۔

اور آیت اَنُلْزِمُکُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا کٰرِهُوْنَ سے اس کے تعارض کا شبہ نہ کیا جائے کیونکہ یہ تو اُن کی توجہ اوّل کے بعد تمہاری کراہت کے متعلق ہے کہ جب وہ توجہ فرمائیں اگر تم اُس وقت بھی اُدھر

رُخ نہ کرو۔ بلکہ اعراض ہی کئے جاؤ تو اُس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کیا ہم اپنی رحمت تمہارے سر چپکا دیں۔ حالانکہ تم اُس سے کراہت ہی کئے جاتے ہو۔ پھر اُن کی اس سبقت اور توجہ اوّل کے بعد جب تم اُدھر متوجہ ہوتے ہو تو وہ اس معاوضہ پر قصہ ختم نہیں کردیتے۔ کہ ہم نے اُس کو دیکھا تھا اُس نے ہم کو دیکھ لیا۔ جاؤ بدلہ ہوگیا۔ بلکہ اس کے بعد مکرر پھر توجہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ ذِرَعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ بَاعًا وَّ وَمَنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُ اِلَیْہِ ھُر وَلَةً ۔ الحدیث ۔

''جو مجھ سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے۔ میں اُس سے ایک ہاتھ قریب ہو جاتا ہوں اور جو ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے اُس سے ایک گز قریب ہو جاتا ہوں اور جو میری طرف چل کر آتا ہے۔ مَیں اُس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں''۔

پھر اس دوسری توجہ کو وہ خالی نہیں چھوڑتے۔ بلکہ اس سے بندہ کو اپنا مقرب بنا لیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ایسے محبوب کو بھی تم یاد نہیں کرتے۔ کیا خدا تعالیٰ سے زیادہ یا برابر کسی کو صاحب کمال صاحب جمال صاحب نوال تم نے دیکھ لیا ہے جو اُسے چھوڑ کر اغیار میں مشغول ہو۔ بخدا ہر گز نہیں خدا تعالیٰ سے بڑھ کر یا برابر حسن و جمال عطاء و نوال رحم و کرم کسی میں یہ ہے نہ ہوسکتا ہے۔ پھر حیرت ہے کہ ہم اُدھر متوجہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ وہ بار بار ہماری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

شاید تم کہو کہ صاحب توجہ و ذکر فرع ہے محبت کی اور افسوس ہم کو محبت ہی حاصل نہیں تو میں کہتا ہوں کہ اوّل تو آپ کو اس حالت پر رونا چاہئے کہ آپ کو حق تعالیٰ سے محبت نہیں اور دنیا مُردار سے محبت ہے دوسرے میں آپ کو اطلاع کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ سے محبت تو آپ کو ہے مگر آپ کو خبر نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کسی چیز سے بھی آپ کو محبت ہے یا نہیں۔ یقیناً ہر شخص کو کسی نہ کسی چیز سے ضرور محبت ہے۔ پھر میں پوچھتا ہوں کہ اس چیز سے محبت کیوں اور کس وجہ سے ہے یقیناً کسی کمال کی وجہ سے ہوگی۔ اور اگر کسی کو کسی سے بالذات محبت ہے جس کا مقتضاء یہ ہوگا کہ خواہ اُس میں اسباب مبغوضیت کے بھی پیدا ہو جائیں تب بھی محبت باقی رہے تو وہ محبت خود بدذات ہے۔ دوسرے ایسے بہت کم ہیں۔ عموماً ہر محبوب کے ساتھ کسی کمال کی وجہ سے محبت ہوا کرتی ہے۔ خواہ حُسن ہو یا جمال یا اور کوئی وصف ہو اور ظاہر ہے کہ تمام کمالات کی اصل حیات و وجود ہے۔

کیونکہ بدوں حیات و وجود کے کوئی کمال اور کوئی وصف ظاہر نہیں ہوسکتا (بلکہ محققین کا تو قول یہ ہے کہ صفت کمال بس ایک وجود ہی ہے اور باقی تمام صفات کمال اُسی کے مظاہر مختلفہ ہیں۔۱۲) اور وجود کسی مخلوق کی صفت ذاتی نہیں یعنی کسی کے گھر کا نہیں۔ بلکہ تمام مخلوقات کا وجود

اُن کی صفت عرضی ہے اور در حقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ذاتی ہے۔ تو جس چیز میں بھی آپ کسی کمال کا مشاہدہ کرر ہے ہیں۔ وہ حقیقت میں حق تعالیٰ کا کمال ہے پھر جب اُس سے آپ کو محبت ہے وہ حقیقت میں حق تعالیٰ ہی سے محبت ہوئی۔ مگر آپ کو خبر نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے زمین پر دھوپ کو دیکھ کر کوئی شخص زمین کا عاشق ہو جائے تو حقیقت میں وہ آفتاب کا عاشق ہے کیونکہ ضیاء دراصل اُسی کے ساتھ قائم ہے مگر اس شخص کو آفتاب کی خبر نہیں۔ اس لئے دھوپ کو زمین کا کمال سمجھ کر اُس کو یاد کرتا۔ اور اُسی کا نام زبان سے رٹتا ہے۔ جس وقت اُس کو حقیقت کی خبر ہوگی کہ دھوپ تو آفتاب کی صفت تھی اُس وقت اپنی غلطی پر افسوس کرے گا اور جس کو اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا ہے وہ تو ہر چیز میں کمالِ حق کا مشاہدہ کر کے یوں کہتا ہے ؎

حسنِ خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ　　پس بچشمِ عاشقاں خود را تماشا کردۂ

(محبوں کی شکل میں تو نے اپنے کو ظاہر کیا ہے اور چشمہ عاشقاں کو تو نے اپنے لئے تماشا بنایا ہے)

پرتو حسنت نگنجد در زمین و آسمان　　در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جا کردۂ

تیرا پر تو ے حسن جب زمین و آسمان میں نہ سما سکا تو میں حیران ہوں کہ تو نے خانہ دل میں کس طرح جگہ کر لی۔

شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ پھر تو ہر حسین کو دیکھنا چاہئے خواہ امرد ہو یا نامحرم۔ کیونکہ سب مظہرِ حق ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک تمام مخلوق مرایائے حق ہیں۔ مگر محبوب نے ایک آئینہ میں سے نظر کرنے کو منع کر دیا ہے۔ اگر کہو کیوں تو تم کو غلام و عاشق ہو کر کیوں کا حق نہیں۔ ہمارے اُستاد فرماتے تھے ہر درویشے کہ چوں و چرا کند و ہر طالب علمے کہ چوں و چرا نکند۔ ہر دو را در چراگاہ باید فرستاد۔ (ہر وہ درویش جو چون و چورا کرتے اور ہر وہ طالب علم جو چون و چورا کرے دونوں کو نکال دیا جائے درویش کو خانقاہ سے اور طالب علم کو مدرسہ سے) یہ نہ سمجھا کہ حاکمانہ جواب دے کر خاموش کر دیا بلکہ میرے پاس اس کا حکیمانہ جواب بھی ہے۔ مگر طالب و عاشق کو جواب و سوال کا عادی نہ ہونا چاہئے اس لئے میں نے اول وہ جواب دیا جو آپ کے مناسب حال ہے۔

وہ حکیمانہ جواب یہ ہے کہ جن مرایا میں نظر کرنے سے ممانعت کر دی گئی ہے ان مرایا میں خاصیت یہ ہے کہ یہ ناظر کی نظر کو اپنے ہی تک مقصود کر لیتے ہیں ان کو دیکھ کر آگے نظر بہت کم پہنچتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے امارد و غیر محارم کی طرف نظر کرنے سے منع فرما دیا۔ کیونکہ واقعی ہم نے ایسا بہت کم دیکھا ہے کہ کوئی شخص امارد و غیر محارم پر نظر کر کے خدا تک پہنچا ہو اور اُن سے مرآۃ کا کام لیا ہو۔

بلکہ یہ مرایارائی کونظر کواپنے ہی تک روک لیتے ہیں۔ بہر حال یہ کہنا غلط ہے کہ ہم کوخدا تعالیٰ سے محبت نہیں۔ یقیناً ہر شخص کو جس چیز سے بھی محبت ہے وہ درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے محبت ہے مگر آپ کو خبر نہیں۔اب آپ کو یہ چاہئے کہ جس چیز سے کسی کو محبت ہو۔ اُس میں یہ غور کرے کہ یہ کمال اس کے اندر کہاں سے آیا۔ مسلمان کا دِل فوراً جواب دے گا کہ حق تعالیٰ نے پیدا کیا تو اب دل کو سمجھانا چاہئے ۔

چہ باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگا رہا

(وہ کتنا حسین ہوگا کہ جس نے اپنی مخلوق کو ایسا حُسن بخشا)

کہ جس نے ایسی ایسی چیزیں پیدا کی ہیں وہ خود کیا کچھ ہوگا۔ اوراس کے ساتھ ہی محبوب مجازی کے فناء ونیست ہونے کو بھی ذہن میں حاضر کیا جائے کہ یہ چند روز میں فناء ہوکر خاک ہو جائے گا۔اس کا کمال وحسن عارضی ہے اورحق تعالیٰ کا کمال ذاتی و باقی ہے اور ۔

عشق با مردہ نبا شد پائدار عشق رابا حی و با قیوم دار

(تعلق حقیقی مرنیوالے کے ساتھ ناپائیدار ہے محبت کا تعلق تو صرف حی وقیوم ہی کے لئے شایان ہے)

اس مراقبہ سے حق تعالیٰ کے ساتھ محبت کے تعلق کا احساس ہو جاوے گا۔ اور سب سوالات رخصت ہوجائیں گے۔

نقصِ طاعات

اوراس کے بعد میں تنزل کر کے کہتا ہوں کہ فرضاً اگر آپ کو محبت نہیں ہے تو رہیبت ہی سے کام لو۔محبوب کو تو کبھی بھول بھی جاتے ہیں مگر مرہوب کو تو کوئی کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔جس کے لئے پھانسی کا حکم ہو چکا ہو گو وہ کھائے گا بھی پئے گا بھی ۔ ہنسے گا بھی۔سوئے گا بھی۔ کیونکہ مشہور ہے کہ نیند سولی پر بھی آتی ہے۔ مگر پھانسی کا خیال کسی وقت دل سے نہ اُترے گا۔اس کا خیال آرہ کی طرح ہر وقت دل کو چیرتا رہے گا۔ چنانچہ آج کل گو طاعون سے کچھ بے فکری سے ہوگئی ہے ۔ کیونکہ بہت دن کا قصہ ہو گیا ہے۔ اس لئے اب لوگ کاروبار بھی کرتے ہیں۔ ہنستے بولتے بھی ہیں۔مگر اس کا خیال دل سے نہیں اُترتا۔ ہر وقت موت ہی پیش نظر ہے۔اسی طرح اگر تم حق تعالیٰ سے خوف اپنے دل میں پیدا کرلو تو اس سے بھی اُن کی یادوں میں جم جائے گی۔ اور خوف پیدا کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس کے اسباب ہر وقت ہمارے سامنے ہیں۔ چنانچہ گناہ تو ہیں ہی ڈر کی چیز۔ ہماری تو طاعت بھی ڈرنے کی چیزیں ہیں۔چنانچہ جب آیت

وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ

نازل ہوئی تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے خدا تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور واقعی عجیب سوال کیا۔ اور حضرت صدیقہؓ کے تمام سوالات عجیب ہی ہوتے تھے۔ جن سے اُن کی فہم و ذکاوت ظاہر ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ وہ لوگ ہیں جو زنا و سرقہ کر کے حق تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا لا یا موفقة ۔

بل هم الذين يصلون و يصومون و يتصدقون و قلو بهم وجلة يخافون ربهم ان لا يقبل منهم او كما قال ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز روزہ صدقہ وغیرہ سب کچھ کرتے ہیں اور پھر ڈرتے رہتے ہیں کہ شاید قبول نہ ہو۔

اسی لئے اہل اللہ کہتے ہیں کہ ہماری طاعت بھی سیئات ہیں کیونکہ ناقص ہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے باورچی نے کھانا پکایا اور نمک تیز کر دیا۔ جس سے کھانا تلخ ہو گیا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے خدمت کی مگر واقع میں آقا کی لاگت ہی ڈبو دی۔ پھر تماشا یہ کہ آقا کہتا ہے کہ نمک تیز ہے اور وہ اصرار کرتا ہے کہ نہیں تیز نہیں۔ جیسے ایک بھولے بزرگ کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے بیوی سے کہا کہ کھانے میں نمک تیز ہے۔ اُس نے انکار کیا۔ آپ نے دھمکایا کہ نمک بہت تیز ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ بالکل تیز نہیں۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ یا تو خطا کا اقرار کرو ورنہ میں تیرے مقابلہ میں فوج لاتا ہوں وہ سمجھی کہ ویسے ہی مذاق کرتے ہیں۔ ان کے پاس فوج کہاں دھری ہے۔ اور وہ اپنی بات پر جمی رہی اور کہاں جس کو چاہو بلا لو میں اقرار نہ کروں گی۔ تو آپ نے فوراً حاکم شہر کے نام کو جو کہ اُن کا معتقد تھا۔ خط لکھا کہ ہم کو ایک غنیم کے مقابلہ کے لئے فوج کی ضرورت ہے۔ جلدی ایک دستہ فوج کا بھیج دیا جائے۔ حاکم نے خط دیکھتے ہی فوراً فوج روانہ کر دی۔ جب فوج گھر پر آ گئی تو بیوی سے کہا کہ اب بھی خطا کا اقرار کر لے ورنہ فوج کو فیر کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ اب تو وہ ڈر گئی کہ ان حضرات سے یہ بھی کچھ بعید نہیں۔ فوراً اقرار کر لیا کہ ہاں واقعی نمک تیز ہے۔ آپ نے فوج کو واپس کر دیا۔ اور حاکم کو جواب لکھ دیا کہ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ مگر غنیم نے صلح کر لی ہے۔ اس لئے فوج واپس کرتا ہوں۔ خیر یہ حکایت تو ہنسی کی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی باورچی نمک تیز کر کے اصرار کرے کہ تیز نہیں تو کیا وہ خادم کہلائے گا۔ ہرگز نہیں اور نہ یہ خدمت اس قابل ہے کہ اس کو خدمت کہا جائے۔ اب تو معلوم ہو گیا کہ ہماری طاعات بھی معاصی ہیں۔ کیونکہ وہ سراپا ناقص

ہیں اور ہم کو نقص کی خبر بھی نہیں بلکہ ہم اپنے دل میں خوش ہیں کہ آج اتنی رکعتیں پڑھیں۔ اتنا ذکر کیا تو ہم اُسی باورچی کی طرح ہیں جو نمک تیز کر کے کہتا ہے نمک تو اچھا ہے۔ اہل اللہ اس حقیقت کو جانتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی طاعات پر کبھی نازاں نہیں ہوتے۔ حضرت غوث الاعظمؒ فرماتے ہیں ؎

من نگویم کہ طاعتم بپذیر قلم عفو بر گنا ہم کش

(میں نہیں کہتا کہ میری عبادات قبول فرمایئے بلکہ گناہوں پر قلم پھیرنے کی درخواست کرتا ہوں)

اور فرماتے ہیں ؎ سحر گہ خروشاں کہ وا ماندہ اند

(صبح کے وقت گڑگڑا کر معذرت کرتے ہیں کہ ہمارا عجز قبول فرما) رات بھر مجاہدہ کر کے صبح کو ہاتھ ملتے ہیں کہ ہائے منزل تک نہ پہنچے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھو کہ یہ ناقص نماز روزہ بیکار ہے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ گو یہ حسنہ بھی ایک درجہ میں سیئہ ہے۔ مگر ترک صلوٰۃ و ترک صوم اس سے بھی اشد سیئہ ہے اور یہ اس سے اخف ہے کیونکہ ایک تو وہ شخص ہے جو بادشاہ کے بُلانے پر دربار ہی میں نہ آیا یہ تو باغی ہے اور ایک وہ ہے جو بُلانے پر تو آ گیا۔ مگر وہاں جا کر اِدھر اُدھر دیکھنے اور تاکنے لگا۔ یہ باغی نہیں مگر ہاں کسی قدر مجرم ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ اکثر تو حق تعالیٰ اس ناقص طاعت کو قبول ہی فرما لیتے ہیں کیونکہ ان کا کرم بہت ہی وسیع ہے۔ بعض اہل اللہ نے فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ کی یہی تفسیر کی ہے کہ حق تعالیٰ ہماری طاعات کو جو واقع میں سیئات ہے اپنے کرم سے طاعات ہی شمار کر لیتے ہیں۔ نیز جماعت کی حکمتوں میں سے ایک حکمت علماء نے یہ بیان کی ہے کہ بہت سے نمازیوں میں سے کسی ایک کی نماز تو ضرور قبول ہوگی اور پیش ہوئی ہیں سب ساتھ ہی۔ سو حق تعالیٰ کے کرم سے امید قریب یہی ہے کہ مجموعہ میں سے اگر ایک کو بھی رکھ لیں گے۔ تو باقی کو واپس نہ کریں گے۔ جب کامل کو رکھیں گے تو اس کے ساتھ ناقص کو بھی رکھ لیں گے۔ بہرحال ان طاعات ناقصہ کو بھی بیکار نہ سمجھو۔ مگر کامل بھی نہ سمجھو۔ خلاصہ یہ کہ ڈرنے کی چیزیں بہت موجود ہیں۔ گناہ بھی اور طاعات بھی۔ اور جو کسی وقت دونوں سے بیکار ہو تو وہ غفلت بھی ایک درجہ میں ڈر ہی کی چیز ہے۔ غرض ان اسباب خشیت کے مطالعہ سے اپنے اندر خوف ہی پیدا کرو۔ کہ اگر حق تعالیٰ گناہوں سے اور طاعات کے نقص سے سوال کرنے لگے تو کیا ہوگا۔ اور اس خوف ہی کے ذریعہ سے توجہ پیدا کر لو۔ انشاء اللہ اسی طرح خدا کا دھیان دل میں جم جائے گا۔

تعیین طرق

مقصود یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے لو لگ جائے۔ جس کے مختلف طریقے ہیں۔ کہیں محبت قائد ہوتی ہے کہیں خوف سائق ہوتا ہے اور دونوں طریقے مقبول ہیں۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا
(وہ اپنے پروردگار کو ڈرتے ہوئے اور امید سے پکارتے ہیں)

پھر محبت کے بھی مختلف طُرق ہیں کسی کو بواسطہ بشارات کے ہوتی ہے۔ اور کسی کو خود کمالات سے ان سب مذاقوں کی اصل نصوص میں موجود ہے۔ اور سب کا مرجع ایک ہی ہے۔ یعنی توجہ و تعلق اس لئے جو طریقہ حاصل ہو جائے۔ خواہ وہب سے خواہ اکتساب سے۔ اسی کو غنیمت سمجھ کر شکر کرو۔ یہاں سے میں اُن لوگوں کے کان کھولنا چاہتا ہوں جو دوسروں کی کیفیات دیکھ کر تمنا کیا کرتے ہیں کہ ہائے ہم کو بھی اسی نوع کی توجہ حاصل ہوتی۔ یہ غلطی ہے میاں جو تمہارے کرنے کا کام ہے تم وہ کرو پھر جو کچھ عطا ہو جائے اُس کو دولت سمجھ کر خوش رہو۔ طُرق کا معین کرنا حق تعالیٰ کا کام ہے جس کے لئے جو طریق مناسب ہوتا ہے۔ اُس کو وہی عطا فرماتے ہیں۔ اس میں تم دخل دینے والے کون ہو۔ پھر یہ اختلاف تو محض طُرق ہی میں ہے۔ باقی مقصود وہ تو سب میں مشترک ہے۔ یعنی توجہ اِلَی اللہ اور تعلق مع اللہ چاہے تم کو حق تعالیٰ سے بلا واسطہ محبت ہو جائے یا بواسطۂ وعدہ حور و قصور کے یا جہنم کے خوف سے۔ ہر حالت میں توجہ اِلَی اللہ تو حاصل ہے پھر اختلاف طرق سے کیا ضرر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ۔

اختلاف خلق از نام اوفتاد ۔۔۔ چوں بمعنی رفت آرام اوفتاد

(مخلوق کا اختلاف (خالی) نام سے واقع ہوا ہے۔ جب نام والے تک رسائی ہوگئی تو (تمام جھگڑوں سے) فراغت پائی۔

اور خوب کہا ہے ۔

عَبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُکَ وَاحِدٌ ۔۔۔ وَکُلٌّ اِلٰی ذَاکَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

اسلئے عارفین ان سب اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی مقصود کو پہچان لیتے ہیں اور یوں کہتے ہیں ۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ۔۔۔ من انداز قدرت رامی شناسم

(جس طرح کا تو چاہے لباس پہن لے میں تو تیرے قد و قامت سے تجھ کو پہچانتا ہوں)

اس لئے وہ مختلف حالات والوں کی جدا جدا تسلی کرتے رہتے ہیں کیونکہ وہ مقصود کو پہچان کر دیکھ لیتے ہیں کہ ہر حالت اور ہر صورت کا منتہی توجہ الی اللہ اور تعلق مع اللہ ہی ہے۔

اختلاف الوان

اور اختلاف طرق کی ایسی مثال ہے جیسے مساکین کو پلاؤ دیا گیا۔ مگر کسی کو تانبے کی رکابی

میں کسی کو چینی کی رکابی میں اور کسی کو ہاتھ میں دیدیا گیا صورتیں اور الوان عطا کے گو مختلف ہیں۔ مگر حقیقت مقصود کی متحد ہے کہ سب کو پلاؤ ہی ملا ہے۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں اس وقت میں نے ایک چھوٹی سی بات بیان کی ہے تاکہ یاد رہے۔ کیونکہ مختلف مضامین بیان کرنے سے سامع کو تشویش ہوجاتی ہے۔ اس لئے میں نے قصداً ایک ہی مضمون بیان کیا ہے اور اس کی کوشش کی ہے کہ سارا بیان اسی کے متعلق ہو چنانچہ بقدر ضرورت بحمد اللہ بیان ہوگیا۔ اس کو یاد رکھئے۔ خلاصہ پھر عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق حاصل کرو اور ہر وقت اُن سے لو لگائے رکھو کسی وقت غافل نہ ہو کیونکہ وہ وقتاً فوقتاً تمہاری طرف متوجہ ہوتے رہتے ہیں۔ تو ایسے وقت تمہارا غافل ہونا ستم ہوگا اور نظم میں سارے بیان کا خلاصہ یہ شعر ہے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی   شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک گھڑی کیلئے بھی اس مالک حقیقی سے غافل نہ ہو، بہت ممکن ہے کہ وہ نگاہ فرماویں اور تجھے خبر بھی نہ ہو)

باقی اس کا طریقہ یہ کہ لو کس طرح لگے اجمالاً تو میں بتلا چکا ہوں۔ تفصیلاً ایک جلسہ میں کیونکر بیان کردوں۔ تفصیل کاملین سے پوچھو اور تفصیل ہو بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ ہر شخص کے لئے تعلق مع اللہ کا طریقہ جدا ہے کیونکہ امراض ہر ایک کے جدا ہیں تو ایک جلسہ میں ہر شخص کے لئے الگ الگ طریقہ بیان کرنا اس مثل کا مصداق ہے ایک انار وصد بیمار۔ پس تفصیل کو دوسرے وقت پر رکھو اور کاملین سے مل کر الگ الگ اپنے لئے تعلق مع اللہ کا طریقہ دریافت کرلو۔ اس وقت تو مجھ کو اجمالاً متنبہ کرنا مقصود تھا کہ یہ ایسا ضروری مضمون اور ہم کو اس پر مطلق توجہ نہیں۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنی طرف متوجہ ہونے کی توفیق عطا فرماویں اور ہماری غفلت کو دور فرماویں۔ (آمین)

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(اشرف علی)

۱۹ رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ